رجسٹرڈ نمبر

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ، ڈی،

مولانا اسلم جیراجپوری

نمبر ۱	جنوری سنہ ۱۹۲۷ عیسوی	جلد ۸

فہرست مضامین

فہرست مضمون نگاران رسالہ جامعہ

جلد ششم از جنوری تا جون ۱۹۲۷ء

فہرست مضامین

رسالہ جامعہ

نمبر ۱	ماہ رجب المرجب ۱۳۴۵ھ مطابق جنوری ۱۹۲۷ء	جلد ۲

یونیورسٹی اور حیات قومی

ہم نے ماہ دسمبر کے پرچہ میں تعلیمی کانفرنس کے حالات لکھتے ہوئے جس قابل قدر مقالہ کا ذکر کیا تھا وہ قبل اس کے کہ کانفرنس کی سالانہ رپورٹ کیساتھ شائع ہو ہمیں اشاعت کیلئے مل گیا ہے۔ ہم کارکنان کانفرنس اور فاضل مقالہ نگار کی اس عنایت کے شکرگذار ہیں +

(مدیر)

ہمیں تعلیمی مسائل میں بار بار اس بات کی ضرورت پڑتی ہی کہ جزویات اور عملی تفصیلات سی کنارہ کش ہوکر اساسی و بنیادی اصولوں پر غور کریں اسکی وجہ یہ ہی کہ تعلیم کا تعلق انسانی زندگی سے ہی جو ایک ساکن یا اپنی جگہ پر قائم چیز نہیں بلکہ لحظہ لحظہ بدلتی رہتی ہی۔ نئے مسائل اٹھاتی اور نئی نئی صورت حال پیش کرتی ہی برخلاف علوم طبیعی کے جو اٹل قدرتی قوانین کی بنیاد پر استحکام کیساتھ قائم ہیں تعلیم کو ایسی قوتوں اور ہستیوں سے سابقہ پڑتا ہی جو بذات خود نشو و نما اور ارتقائے پیہم سی عبارت ہیں اسلئے ان نئے مسائل کی روشنی میں جو

وقتاً فوقتاً پیدا ہوں تعلیم کے بنیادی اصولوں، اس کی غرض و غایت اور اسکے مفہوم پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ اس کے متعلق ہم کسی بالکل ہی نئی حقیقت کا انکشاف کر سکیں لیکن ترقی کے معنی عام طور پر یہ ہوتے ہیں کہ پرانے حقائق کو نئے معنی پہنائے جائیں اور معلوم شدہ اصولوں کی ضروریات زمانہ کے مطابق پیروی کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس قسم کا ایک بنیادی مسئلہ اٹھانے کی جرأت کی ہے کہ یونیورسٹی اور اس کی تعلیم کا کیا مفہوم ہے اور ہمیں اس سے کن فوائد کے مترتب ہونے اور کن فرائض کی ادائگی کی توقع ہے۔ ہندوستان کی موجودہ تعلیمی حالت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کی خاص طور پر ضرورت ہے کیونکہ آج کل یونیورسٹیوں کی تعداد سال بسال زیادہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اگر ہم نے بنیادی اصولوں کو قائم کئے یا ان پر غور کئے بغیر اسی طرح ملک میں یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھا لی تو اس کا ہرگز یہ مقصد نہ ہوگا کہ ملک کی تعلیم بہتر ہو گئی ہے۔ البتہ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ سطحی نظر رکھنے والے لوگ تعداد کی زیادتی کو ترقی کا مرادف قرار دیں گے اور ایک ناجائز خوش فہمی میں مبتلا ہو کر قوم کی تعلیم کو نقصان پہنچائیں گے۔ اس بات کا ثبوت دینے کی چنداں ضرورت نہیں کہ صرف یونیورسٹیوں کا زیادہ ہونا تعلیم کی نوعیت کو اعلیٰ نہیں کر سکتا۔ ہم آئے دن چاروں طرف سے یہ شکایت سنتے ہیں کہ آج کل کے تعلیمیافتہ نوجوان اتنی عمدہ اخلاقی اور علمی تربیت لیکر نہیں نکلتے جسقدر نظام قدیم کے طلبہ جن کی تعلیم نہ اسقدر قیمتی تھی نہ اس قدر پر تکلف۔ یا یہ کہ آج کل کی تعلیم نے ہم میں کوئی نہایت جید اور مستند ماہرین علوم یا صاحبان تحقیق پیدا نہیں کئے اور جو چند کئے ہیں وہ اس قدر کم ہیں کہ بہر صورت انکا ایک ایسے وسیع ملک میں ہونا لازمی تھا۔ ہمیں ان دعاوی یا شکایات کی صحت سے بحث نہیں۔ یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ لوگ بالعموم موجودہ یونیورسٹی کی تعلیم سے مطمئن نہیں ہیں۔ اور اس کو نہ صرف معمولی روزگار کے نقطۂ نظر سے بلکہ اور لحاظ سے بھی ناقص سمجھتے ہیں۔

کارلائل کا ایک مشہور قول ہے کہ "اس زمانہ میں یونیورسٹی کا صحیح مفہوم ہے کتابوں کا ایک معقول ذخیرہ"۔ اس قول میں ایک حد تک صداقت ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن اس سے یونیورسٹی کی ایک جامع تعریف نہیں نکلتی۔

اگر آپ اس قول پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کارلائل یونیورسٹی کو ایک اعلیٰ درجے کے کتب خانہ کا مرادف قرار دیتا ہے لیکن کتاب بذات خود کیا چیز ہے؟ وہ بقول حکیم انگریزی بیکن کے "وہ ایک استاد کامل کا خون جگر ہے جسے آئندہ نسلوں کی رہبری کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے" - (It is the life blood of a master-spirit treasured up and embalmed on a purpose to life beyond life) لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کتابیں بجائے خود زندگی اور زندہ شخصیت کی قائم مقام ہوسکتی ہیں یا نہیں؟ مانا کہ وہ بڑے بڑے اساتذہ اور صاحبان علم کے خون جگر سے پیدا ہوئی ہیں لیکن وہ خون جو سالوں سے بوتلوں میں محفوظ ہوتا ہے اتنا حیات بخش نہیں ہوسکتا جتنا وہ تازہ اور گرم خون جو زندہ انسان کی رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔ علاوہ اس کے، ہر زمانے میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ گذشتہ علمی خزانوں کا بھید کھولنے اور انکے پوشیدہ پیغامات کو سمجھانے کے لئے اس یونیورسٹی میں زمانے کی (Master-Spirit) افراد کامل موجود ہوں جو نہ صرف انکی تشریح کرسکیں بلکہ زمانہ حال کی ضروریات کے مطابق انکے مطالب و معانی میں ترمیم کرسکیں اور ان کو نئے معیاروں پر اور نئے مقاصد کی روشنی میں جانچ سکیں - اور جو ماضی کے علوم کو محض پارسل مزدوروں کی طرح سے ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچا کر مطمئن نہ ہوجائیں بلکہ حقیقی آرٹسٹ کی طرح سے ان کو اپنا نقطۂ آغاز یا خام مواد سمجھکر اپنی خلاقی کے ذریعے سے ایک مکمل تر، واضح تر اور حسین تر مرقع پیش کرسکیں۔ یہ محض دل خوش کن الفاظ نہیں ہیں بلکہ ان صاحبان علم کے اصل فرائض کی صحیح تشریح ہے جو علمی تحقیق اور رہنمائی کا گرانمایہ فرض اپنے ذمہ لیں۔ ایسے لوگوں کے بغیر کوئی کتاب خواہ وہ کتنی ہی قدیم اور قیمتی کیوں نہ ہو ایک دوسرے زمانے کی زندگی کو والا اور پر معنی نہیں بنا سکتی۔ اگر یونیورسٹی کا مقصد ہے کہ وہ اپنے زمانے کو "زندگی دے اور فراوانی کے ساتھ دے"، تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ علاوہ ایک مکمل کتب خانہ ہونیکے اپنے ملک اور زمانے کے علما اور فضلا کی آماجگاہ ہو جو اپنی شخصیت اور علم کے اثر سے طلبہ میں صحیح علمی مذاق اور شوق خدمت پیدا کرسکیں۔ کیونکہ اگر تعلیم کے عمل کا تجزیہ کیا جائے اور اس کے سادہ ترین

انتہائی عناصر معلوم کئے جائیں تو اسکا مطلب ہے دو شخصیتوں کا باہمی تعامل۔ دو روحوں کا تصادم دو دماغوں کی باہمی تاثرپذیری۔ کتابیں، سامان، خارجی نظام ضمنی چیزیں ہیں جو اس روحانی داد وستد میں مدد دے سکتی ہیں لیکن اس کی قائم مقامی نہیں کر سکتیں معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے ہم زیادہ وثوق کیساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یونیورسٹی ایک ایسی افادہ گاہ کا نام ہے جہاں ایک معقول تعداد مختلف علوم و فنون کے ماہروں کی جمع ہو جائے جو خود بھی مطالعہ اور تحقیقات علمی میں مصروف رہیں اور درس و تدریس کے ذریعے علم کے متلاشی نوجوانوں کی بھی اپنے اپنے فن میں رہنمائی کر سکیں۔ اس طرح سے وہ ایک جانب یونیورسٹی کے علمی نصب العین یعنی "تحقیق حق" کے ساتھ وفادار رہیں گے اور دوسری جانب "نشر حق" میں حصہ لیکر خدمت خلق اور رفاہ عام میں معین ہوں گے۔ یعنی یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کا متفقہ طور پر یہ دوسرا فرض ہے کہ وہ ایک جانب تحقیقات علمیہ کا انتظام کریں اور دوسری جانب علوم و فنون کی ترقی اور اشاعت کے ذریعے ملک کی خدمت کریں۔ یہ دونوں فرائض ایک دوسرے کیساتھ بالکل وابستہ ہیں جبتک علمی تحقیق کا تمام کام محنت اور بےنفسی کے ساتھ جاری نہ رکھا جائے ہم کامیابی کے ساتھ ان تمام مسائل سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جو زندگی کے ارتقاء اور تبدیلیوں کیوجہ سے نئی نئی شکلوں میں ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ انسان کی ترقی کا اصلی باعث یہی ہوا ہے کہ وہ اپنے مقاصد اور نصب العین کو زیادہ وضاحت اور تکمیل کے ساتھ سمجھتا جاتا ہے اور جوں جوں اسکے علم کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے وہ تمام موجودہ ذرائع اور وسائل سے کام لے کر بالارادہ اپنے مقاصد کے حصول کی سعی کرتا ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کا دوسرا فرض بھی اتنا ہی اہم ہے اگر نئے علوم کا ربط اور تعلق انسانی زندگی سے پیدا نہ کیا جائے تو وہ محض مجرد اور نظری ہو کر رہجائیں گے اور انکا ردعمل گردوپیش کے حالات اور واقعات پر نہ ہوگا۔ اور صاحبان علم

کی حالت ان بے بس پودوں کی سی ہو جائے گی جو خاص "گرم خانوں" میں پرورش پاتے ہیں اور قدرت کی کھلی ہوا اور روشنی میں مرجھا کر ختم ہو جاتے ہیں اور جنکا ٹھکانا سوائے ایک کتابی ماحول یا بقول میرے ایک ظریف دوست کے شیشہ گل خانوں کے اور کہیں نہیں ہوتا۔ اقبال نے اپنے معنی خیز انداز میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

من آں علم و تعلیم با برکاہے نمی آرزم۔ کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را۔ وہ ایسی تعلیم کو بے کار اور بے قدر سمجھتے ہیں جو انسان کو زندگی کے تمام شعبوں سے بے نیاز اور اسکی کشمکش اور جدوجہد میں حصہ لینے سے معذور کر دے۔ نہ وہ اس خون کے قائل ہیں جو رگوں میں دوڑتا پھرے اور لہو بنکر آنکھ سے نہ ٹپکے اور نہ اس علم کے جو عمل سے بے نیاز ہو اور سکون و دوام کو "زندگی سوز و ساز" پر ترجیح دے۔ عام فہم الفاظ میں اس سے یہ مراد ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ وہ تعلیمیافتہ لوگوں کو عملی زندگی کے مختلف شعبوں میں فاعلانہ طور پر حصہ لینے کے لئے تیار کرے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں کو ان اصولوں کی روشنی میں کریں جو انہوں نے یونیورسٹی میں رہ کر سیکھے ہیں حاصل کئے ہیں۔ کیونکہ علم بغیر عمل کے ایک اپاہج شخص کی حد تک ہے اور عمل بغیر علم کے ایک اندھے کی تگ و دو۔ اسی نکتہ کو جامعہ ملیہ کے قابل پروفیسر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

جامعہ یعنی یونیورسٹی کی تعلیم میں "علم کو ایک شمع سمجھنا چاہیے جس کی روشنی میں طالب علم انسانی زندگی بلکہ ساری کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے پیچ در پیچ راستوں میں جو مظاہر بھول بھلیاں کا سماں پیش کرتے ہیں اپنی راہ ڈھونڈتا ہے"

اب ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی میں پہلی چیز یعنی علمی تحقیق اور ذوق کو پیدا کرنے اور ایک صحیح علمی فضا قائم کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اور اپنے خیالات کو زیادہ واضح طور پر

پیش کرنے کیلئے اپنے دارالعلوم یعنی علیگڑھ یونیورسٹی کو مثال اور تشریح کے لئے لیتے ہیں۔ اس میں اندیشہ ہے کہ بعض ایسے مسائل آجائیں جن میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ لیکن میرے خیال میں ان مسائل کو محض اختلافاً سپرد فراموشی کر دینا کم ہمتی اور اخلاقی کمزوری ہے۔

علیگڑھ کی جو کچھ عمدہ روایتیں اسکے دوراول میں صورت پذیر ہوئیں انکا بڑا سبب یہی تھا کہ سرسید نے اپنی کشش اور جذب سے اپنے گرد چند ایسی قابل قدر ہستیاں جمع کرلی تھیں جنہوں نے نہ صرف ہر کام میں انہیں مدد دی بلکہ اپنے ذاتی اثر سے علیگڑھ میں ایک علمی اور اسلامی فضا پیدا کر دی، طالب علموں کی زندگی کو ایک خاص رنگ اور چاشنی دی اور اپنے نمونہ اور عمل سے انکے سامنے زندگی کے لئے بہترین نصب العین اور بہترین قدروں پیش کیں۔ میں ماضی کے زمانے کو خواہ مخواہ ایک خوشنما رنگ میں رنگ کر نہیں دکھانا چاہتا لیکن نا ممکن تھا کہ کوئی اس اثر بھری ہوا میں سانس لے، اس سنجیدہ لیکن پرجوش ماحول میں اپنی زندگی کے نہایت اثر پذیر سال گذارے اور یہاں سے کچھ قوم کا درد، کچھ عزت نفس کا خیال، کچھ ترقی کا جوش لے کر نہ جائے۔ ایسی بدنصیب ہستیاں تو ہر جگہ اور ہر زمانے میں ہوتی ہیں جن کی بدنصیبی انہیں عمدہ مواقع سے فائدہ اٹھانے نہیں دیتی۔ لیکن یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ علیگڑھ کے اس متین اور خوش نصیب دور میں اکثر طالب علم عمدہ روایات کے حامل اور عمدہ مقاصد کے حامی ہو کر اس تعلیم گاہ سے باہر جایا کرتے تھے۔ اس وقت چونکہ اسکا درجہ محض ایک کالج کا تھا اس لئے تحقیق اور علمی ترقی کی زیادہ توقع اس سے نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن جو طلبہ اس نے پیدا کئے انہیں کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ علیگڑھ نے وہ شہرت حاصل کی جس کے سود پر ہم آج بھی گذارہ کر رہے ہیں۔

میں ان بزرگوں کی کوئی مکمل فہرست نہیں دینا چاہتا جنہوں نے سرسید کے ساتھ اشتراک عمل کر کے علیگڑھ کی فضا اور روایات کی تشکیل میں حصہ لیا۔ لیکن اس ضمن میں معاً سید محمود وقار الملک، محسن الملک، حالی، شبلی، نذیر احمد، چراغ علی وغیرہ کا خیال آتا ہے۔ ان میں سے

بعض نے اپنی زندگی کا معتد بہ حصہ یہیں گزارا اور مستقل طور پر اس دارالعلوم کی خدمت کی دوسرے اصحاب باوجود علیگڈھ سے باہر رہنے کے اس تحریک کے روح رواں تھے۔ انہوں نے اپنے علمی کام علیگڈھ کی خاطر اور علیگڈھ کے زیر اثر کئے ان کو علیگڈھ کی جانب منسوب کیا۔ ان سے دارالعلوم کو اور دارالعلوم کو ان سے عزت اور شہرت حاصل ہوئی وہ بذات خود بھی وہاں آتے تھے، رہتے تھے، طالب علموں سے ملتے تھے اور ان کی تعلیم میں حصہ لیتے تھے۔ نہ وہ تعلیم جو محض نصاب درس کے مطالعہ تک محدود سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ وہ بلند تر تعلیم جس کے معنی ہیں طالب علموں کو اونچے مقاصد سے روشناس کرانا۔ اور ایک صحیح نظام قدر کو ان کی زندگی میں ترتیب دینا تاکہ وہ انکی رہبری میں اپنے کاموں کو باحسن وجوہ پورا کر سکیں۔ مثال کے طور پر شبلی کو لیجیے۔ انہوں نے اپنے وجود سے نہ معلوم کالج کے کتنے طالب علموں کو ایک صحیح ادبی ذوق سے آشنا کیا اور انہیں ایک ایسی معنی خیز زندگی کی جھلک دکھائی جو تمام و کمال علم کی خدمت میں بسر ہوئی۔ علاوہ اس کے ان کی ہستی اس اعتبار سے بھی غنیمت تھی کہ انہوں نے دنیائے علم میں علیگڈھ کے نام کو روشناس کرایا اور اپنی اعلیٰ تاریخی تحقیقات سے نہ صرف اپنے بلکہ اپنے دارالعلوم کے لئے خراج تحسین وصول کیا کسی تعلیم گاہ میں ایک مستند عالم کی موجودگی اس کی علمی زندگی کی کامیابی کے لئے بہترین ضامن ہوتی ہے۔

لیکن علیگڈھ کے دور جدید میں، دارالعلوم کے زیر سایہ ایسی قابل شخصیتوں کا اجتماع نہ ہو سکا جو ایک جانب تو علیگڈھ کی اندرونی زندگی کو اپنے فیض سے مالا مال کرتیں اور دوسری جانب علمی دنیا میں اس کی شہرت قائم کرتیں۔ قابل پروفیسر ہمیں بے شک ملے اور اب بھی ہیں لیکن وہ زیادہ تر یہی کر سکتے تھے اور کر سکتے ہیں کہ اپنے اپنے شعبہ میں طالب علموں کو تیار کریں اور ان کی دلچسپی کو ابھاریں۔ مثلاً ادب یا سائنس یا فلسفہ وغیرہ میں صحیح مذاق پیدا کریں۔ لیکن کا اثر اتنا وسیع اور عام نہیں ہو سکتا جتنا ان لوگوں کا جو تمام عمر طالب علمانہ طریق سے تحقیقات علمی، مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں بسر کریں اور محض لیکچروں کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی مثال اور

نمونہ سے اپنے گرد و نواح کی نوخیز شخصیتوں کو متاثر کریں۔ باقاعدہ اساتذہ کا کام زیادہ تر اصطلاحی اور خصوصی ہے۔ طلبا کی تربیت دماغی و اخلاقی میں ایک صحیح توازن قایم کرنے کے لئے اساتذہ کے علاوہ ایسے افراد کی ضرورت ہے جو زندگی کے مسائل پر اپنے وسیع تر اور جامع تر نقطۂ نظر سے روشنی ڈال سکیں۔ ماہرین خصوصی کی جداگانہ اور شعبہ وار تعلیم میں یہ اندیشہ ہے کہ مبادا طلبہ زندگی کے اجزا کی تشریح اور ان کو فرداً فرداً سمجھنے کی کوشش میں کل کی جانب سے غافل نہ ہو جائیں۔ ان کی توجہ تاریخ اور جغرافیہ اور فلسفہ اور سائنس کی جانب اس طرح راغب ہو جائے کہ وہ ان سب کے مخرج اور منبع یعنی انسان اور انسانی زندگی کے اصل کاموں اور معنی کی جانب سے غافل اور بے خبر رہیں اور بقول ایک انگریزی محاورہ کے درختوں کی کثرت کی وجہ سے جنگل کو نہ دیکھ سکیں! اگر تعلیم کو صرف علوم سیکھنے کے مرادف سمجھا جائے تو انسانی دماغ بجائے ایک تربیت یافتہ اور اخلاقی ہستی ہونے کے، جو مختلف اغراض و مقاصد میں، نیکی اور بدی میں کامل اور ناقص میں تمیز کر سکتی ہے محض مختلف قسم کی اطلاعات اور واقفیت کا ایک کم و بیش منتظم گودام بن کر رہ جاتا ہے علاوہ بریں زیادہ تر درسی علوم، واقعات اور حقائق پر مشتمل ہوتے ہیں۔ وہ براہ راست کسی قسم کی قدر پر زور نہیں دیتے یعنی یہ نہیں بتاتے کہ ان بے شمار قوتوں اور چیزوں میں سے جو انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور اس کی عقیدت کی طلبگار رہیں کونسی زیادہ اہم ہیں اور کونسی کم۔ کن کے آستانہ پر جبیں سائی کرنے میں اس کی شخصیت کا ارتقار پوشیدہ ہے اور کن کی تحریص میں آجانے سے اس کی روحانی موت کا اندیشہ۔ اس پریشان کن کثرت میں انسانی شخصیت کا توازن قائم کرنے کے لئے ایک مرکز ثقل کی ضرورت ہے جو اس کثرت میں وحدت اور یک جائی پیدا کرے۔ اور یہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک طالب علم ایسے لوگوں کے علمی اور اخلاقی فیض سے مستفید نہ ہوں جو زندگی کے جامع اور اہم پہلوؤں پر عبور رکھتے ہوں، جن کو اس

کے کسی خاص شعبے میں ایک ماہر خصوصی اور مستند عالم کی حیثیت حاصل ہو اور اپنی وسعت نظر اور تجربہ کی پختگی سے طلبہ کو راہ دکھا سکیں۔

قحط الرجال ایک دائمی چیز ہے۔ اس معنی میں کہ ہر زمانے کے آدمیوں کو اس کی شکایت رہی ہے۔ اور اگر ہم اس کی شکایت کریں تو کم از کم اتنے حق بجانب ضرور ہیں جتنے اور زمانوں کے لوگ۔ تاہم اس دور انحطاط میں بھی ہمیں چند ایسی ہستیاں نظر پڑتی ہیں جن کی موجودگی اور تعلق ہمارے دارالعلوم کے لئے از بس غنیمت ہوتی زندہ لوگوں میں سے ناموں کو منتخب کرنا مختلف آرا کے لوگوں کو دعوت جنگ دینا ہے۔ اس قسم کی فہرست ہر شخص کے لئے علیحدہ ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے ذاتی معیار کے مطابق لوگوں کی اہمیت اور قدر واقعی کا اندازہ لگاتا ہے۔ میں مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ اس قسم کے صاحبان علم و خیال جیسے اقبال۔ یا یوسف علی۔ یا عبدالقادر یا ابوالکلام یا عبدالحق یا امیر علی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انکا تعلق یونیورسٹی کے ساتھ سرکاری قسم کا ہو یعنی وہ سب اس کے تنخواہ یاب عہدہ دار یا خادم ہوں۔ یہ صریحاً ناممکن ہے وہ اپنا تمام وقت علیگڈھ میں بسر نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ لوگ اپنے علمی اثر سے علیگڈھ کو مستفید کریں، اپنے کاموں کو اس کے نام سے منسوب کریں اور اپنی زندگی کے اس زمانے میں جب وہ ملازمت یا کاروباری زندگی سے دستبردار ہو جائیں اور اطمینان قلب کے ساتھ محض تصنیف و تالیف یا تعلیم و تعلم میں عمر کا باقی حصہ گذارنا چاہیں، تو علیگڑھ خود کو انکے نشیمن کے طور پر پیش کرے۔ اور ان کے لئے ایسی آزادیاں اور آسانیاں بہم پہنچائے کہ وہ اپنا علمی کام فارغ البالی کے ساتھ انجام دے سکیں میں اس خاص امر کا اس لئے ذکر کرتا ہوں کہ مجھے ایسے لوگوں کے متعلق علم ہے جو اپنی زندگی بسر کرنیکے لئے کوئی علمی ماحول تلاش کرنا چاہتے ہیں اور جن کا وجود ہمارے دارالعلوم کے لئے نہایت قابل قدر ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کو موقع نہیں ملتا۔ اور موقع مل بھی کیسے سکتا ہے

جب سیاسی اور مقامی مصالح کو علمی ضروریات پر ترجیح دیجائے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج جن کے ہم دیدہ اور نادیدہ ثناخواں ہیں اپنی شہرت اور علمی اقتدار کے لئے کس چیز کے مرہون منت ہیں؟ اپنے رہائشی نظام کے نہیں کیونکہ وہ تو اور بھی بعض جگہ موجود ہے لیکن ویسے نتائج مترتب نہیں ہوتے۔ نہ اپنی عالیشان عمارتیں اور ساز و سامان کے جو وہاں کی مخصوص نظر فریب فضا کو پیدا کرنے میں معین ہوتے ہیں لیکن بذات خود کافی نہیں۔ ان کی شہرت اور مرکزیت کی بڑی وجہ صرف یہی ہے کہ انہوں نے ملک کے بہترین دماغوں کو اپنی یونیورسٹی میں جمع کرلیا ہے اور خاص طور پر ذہین اور ہونہار نوجوانوں کے لئے ریسرچ اور علمی مشاغل جاری رکھنے کے سامان بہم پہنچائے ہیں۔ ان کو وظائف دے کر فکر معاش سے آزاد کر دیا ہے تاکہ وہ اساتذہ کی اس ممتاز جماعت کی سرکردگی میں جو یونیورسٹی میں موجود ہے اپنے علمی کارناموں کو تیار کریں اور اپنے اور اپنی مادر تعلیمی کے لئے خراج تحسین وصول کریں۔ پروفیسروں اور فیلوز کی یہ محدود جماعت ان یونیورسٹیوں کی امتیازی شان کی ذمہ دار ہے

اس بیان کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی میں ایک علمی فضا پیدا ہو اور طلبہ کے لئے بہترین تربیت دماغی و اخلاقی کا انتظام ہو سکے تو ہمیں اس ماحول میں ایسے سنجیدہ اور ذوق علم رکھنے والے اصحاب کی ایک جماعت کو مجتمع کرنا چاہیئے جو خود علمی مشاغل میں مصروف ہو، تحقیق کا کام کرے، تصنیف و تالیف جاری رکھے، اپنے اپنے علوم میں طلبہ کی رہبری کرے اور شخصیت کے اثر سے ان طلبہ میں ایک ایسی روح پیدا کر دے کہ وہ اساتذہ کے شریک کار ہو کر خود تحقیق حق اور تحصیل علم میں مصروف ہو جائیں۔ گویا یونیورسٹی ایک کارخانہ علم ہے جہاں استاد اور شاگرد کے فاعلانہ اتحاد عمل سے موجودہ علوم و فنون کی تشریح و تفصیل ہوتی ہے۔ ان کی اشاعت کیجاتی ہے۔ اور انکی بنیاد پر تحقیق و تفتیش کے ذریعے، ایک بلند تر عمارت قائم کی جاتی ہے جب تک

یونیورسٹیوں میں اس بنیادی اصول کو راہ نہ دیجائے گی اور اس پر کاربند ہونے کے لئے سامان فراہم نہ کیا جائے گا جزدی اصلاحات سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بیسویں صدی "بسیار سازی" (Large Scale Production) کا زمانہ ہے۔ اس میں ہر چیز میکانکی ہوتی جاتی ہے۔ لوگوں میں انسانی یعنی روحانی عنصر کم ہوتا جا رہا ہے اور مشین کی سی خاصیت زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ گذشتہ پچاس سال سے تمام دنیا کا تعلیمی رجحان بھی بدقسمتی سے اسی طرف ہے۔ تعداد اور مقدار کی زیادتی یعنی طلبہ اور سکولوں کی کثرت، بڑے پیمانے پر انتظام وغیرہ کی وجہ سے سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم و تربیت بے جان اور جامد سی ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ بات نہایت ہی اندیشہ ناک ہے کیونکہ ہماری تعلیم گاہیں ہی ایسی جگہ ہیں جہاں ملک و قوم کی روحانی زندگی محفوظ رہتی ہے، جہاں ہر نسل اپنے بہترین اخلاقی، علمی اور صنعتی کارناموں کو امانت رکھتی ہے تاکہ آنے والی نسلیں ان سے مستفید ہو سکیں۔ اگر ان میں بھی انسانی شخصیت اور انفرادیت کا عنصر کمزور ہوگیا تو انسانی نسل ضرور وہ امتیاز کھو بیٹھے گی جس کی وجہ سے اس کو دیگر حیوانات پر تفوق حاصل ہے۔ یعنی فوری نفسانی ضروریات اور حوائج سے بلند تر ہو کر ایسے بے غرضانہ مقاصد کے لئے جدوجہد کرنا جو کچھ عرصہ میں تمام انسانی زندگی کا معیار بڑھا دیں۔ یورپ اور امریکہ بھی جہاں "بسیار سازی" کا جنون ہمارے ہاں سے بہت زیادہ ہوگیا ہے اپنے ہاں کی تعلیمی حالت سے غیر مطمئن ہیں، وہاں کے بہترین دماغ اس فکر میں ہیں کہ اپنی یونیورسٹیوں کو محدود علمی جماعتیں بنا دیں جہاں ہر فرد کی حیثیت واقعاً ایک فرد کی ہو ایک مشین کے پرزے کی نہ ہو۔ اور تعلیم کا کام صرف یہ نہ رہ جائے کہ ایک مقررہ سانچے میں تمام نوآغا ہستیوں کو ڈھال دے۔ ابھی حال میں لندن کے تعلیمی ماہرین کی ایک مقتدر جماعت سے سوال کیا گیا تھا کہ چھ سو طلبہ کے کالج میں معقول طور پر انگریزی پڑھانے کے لئے کتنے استادوں

کی ضرورت ہے۔ انکا جواب آیا کہ کم از کم تیس قابل اشخاص ہونے چاہئیں اور اگر وہ سب Genius یعنی غیر معمولی دماغ رکھتے ہوں تو شاید بیس بھی کافی ہوجائیں! جب محض ایک مضمون کی تعلیم دینے کے لئے طلبہ اور اساتذہ میں اس نسبت کی ضرورت ہو اور اس قدر قابلیت درکار ہے تو ایک یونیورسٹی کی تعلیم اور تربیت کے لئے واقعاً کیسی صلاحیت اور شخصیت کے افراد کی ضرورت ہوگی۔ اور ہم کسقدر غلط راستے پر چل رہے ہیں کہ ایک طرف تو طلبہ کی تعداد بڑھانے کو کامیابی کا ہم معنی قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اساتذہ کی جماعت کو نہ بلحاظ مقدار نہ بلحاظ نوعیت اس گرانمایہ فرض کا اہل بناتے ہیں جو ان پر عائد ہوا ہے۔ اور پھر یہ شکایت کرتے ہیں کہ آج کل کے طلبہ ایسے نہیں ہوتے جیسے پہلے زمانے میں ہوتے تھے۔ جو جواب شاعر کو عرفی کی تربت سے ملا تھا وہی ہمارے لئے چراغ ہدایت ہے۔ اس نے شکایت کی تھی کہ۔

نہیں ہنگامہ عالم میں اب سامان بیتابی

مزاج اہل عالم میں تغیر آگیا ایسا — کہ رخصت ہوگئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی

کسی کا شعلہ فریاد ہو ظلمت ربا کیونکر؟ — گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسمان تابی

صدا تربت سے آئی وہ شکوہ اہل جہاں کم کن — نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

اب مجھے مختصراً یونیورسٹی کے دوسرے مہتم بالشان فرض کیطرف اشارہ کرنا ہے۔ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ یونیورسٹی کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ تحقیقات علمیہ کا انتظام کرے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسرا وابستہ فرض یہ ہے کہ وہ علوم و فنون کی ترقی اور اشاعت کے ذریعے ملک کی خدمت کرے۔ اس جملہ میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یونیورسٹی ایک ایسی تقدس مآب علمی انجمن نہیں ہے جو اپنے ماحول سے بالکل بے نیاز اور دامن کشاں

رہ سکتی ہے جس کا اس روزمرہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں جو غم اور خوشی، جد و جہد زبردست
ایثار اور وحشیانہ خود غرضی، غرض ہر قسم کے کاموں اور جذبات سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارے
نقطہ خیال سے یونیورسٹی کو معاشرتی زندگی کا مرکز ہونا چاہئیے جہاں سے ترقی کی لہر دوڑے اور
روشنی کا پیام ان بے شمار بستیوں کو پہنچایا جائے جن کی زندگی تاریکی اور جہالت اور خود ناشناسی
میں گذر رہی ہے۔ فرانس کے معجز نگار اہل قلم، روماں رولاں نے اپنے ایک جدید ناول
جین کرستوف میں جو ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے ایک نہایت (Dynamic Personality)
اثر آفریں ذات کی تصویر کھینچی ہے جس کی شخصیت کا اثر اس کے گرد و پیش کے افراد اور ماحول
پر پڑتا تھا اور ان کو بالکل تبدیل کر دیتا تھا۔ یہ شخص کرسٹوفر ایک نئے شہر میں آکر رہا تھا جہاں کے
لوگوں میں نہ زندگی تھی نہ جوش نہ ہمدردی۔ اُس کے اثر کو بیان کرتے ہوئے روماں رولاں ایک
مقام پر لکھتا ہے :-

"آدمیوں پر الفاظ کے ذریعے اثر نہیں ڈالتا بلکہ اپنی زندگی کے ذریعے۔
بعض لوگ اپنی آنکھوں اور اپنے اشاروں سے امن کی فضا پھیلاتے ہیں اور اپنی
پرسکون روح کی قربت سے۔ کرسٹوفر (یہ اس شخص کا نام ہے) زندگی بخشتا تھا۔ آہستہ آہستہ
بہار کی بھیگی ہوئی ہوا کی طرح اُن پرانے، خواب آلود مکانوں کی دیواروں اور بند
کھڑکیوں میں سرایت کر گئی۔ اس نے ان مردوں اور عورتوں کے دلوں کو نئی
زندگی بخشی جنکو صدموں کی کمزوریوں اور تنہائی نے گھلا دیا تھا۔ یہانتک کہ وہ سوکھکر
مردہ ہو گئے تھے۔ ایک روح دوسری روح پر کسقدر تسلط رکھتی ہے!"

حضرات، میرا عقیدہ ہے کہ ایک زندہ یونیورسٹی بحیثیت ایک منظم جماعت کے ایسی ہی اثر آفریں
شخصیت ہونی چاہئیے جیسی کرسٹوفر کی روح جس کا اثر جسکا حیات بخش اثر، بہار کی بھیگی ہوئی ہوا

کی طرح ان لوگوں کی زندگی میں سرایت کر جائے جن کے حصے میں ابتک نہ ہوا آئی ہے نہ روشنی۔ نہ علم نہ احساس تعفس اور جن کے لئے ہر قسم کی بلند پایہ دلچسپیوں کے دروازے بند ہیں۔ یونیورسٹی علم کا مرکز ہے۔ علم کا خزینہ ہے اور علم قوت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ قوت مخفی یا خوابیدہ نہ رہے بلکہ اپنا اظہار عام لوگوں کی زندگی کو بہتر بنا کر کرے۔ اگر یونیورسٹی نے اپنے علوم وفنون کو محض اپنی چار دیواری میں بند رکھا تو وہ اپنا معاشرتی فرض ادا نہیں کرے گی یہ سچ ہے کہ ملک کے تمام لوگ یونیورسٹی کی تعلیم سے براہ راست بہرہ مند نہیں ہوتے اور نہیں ہوسکتے لیکن جو محدود تعداد طلبا کی یونیورسٹیوں میں بھیجی جاتی ہے وہ اس لئے نہیں بھیجی جاتی کہ وہ خدا کے خاص طور پر محبوب بندے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کی دماغی قوتوں سے توقع ہوتی ہے کہ وہ وہاں کی تعلیم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے اور پھر اس روپیہ اور محنت کے صلے میں جو ملک اور قوم نے ان پر صرف کیا ہے وہ مختلف طریقوں سے ملک اور قوم کی خدمت انجام دیں گے۔ اس موقع پر یہ امکان نہیں کہ میں ان بے شمار طریقوں کی تشریح کروں جن سے یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ لوگ قوم کی ہیئت اجتماعی کی خدمت کر سکتے ہیں۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ہر شعبہ عمل اور پیشہ میں ہر شخص کے لئے امکان خدمت موجود ہے بشرطیکہ احساس فرض کے ساتھ قوت ارادی موجود ہو۔ لیکن ہم واقعاً یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری تعلیم یافتہ جماعت کا ایک معتدبہ حصہ اپنی اعلیٰ تعلیم اور دماغی قابلیت سے قوم کو فائدہ نہیں پہنچاتا۔ اپنا وقت بلکہ اپنی فرصت بھی اپنے ہم جنسوں کی بہبودی پر صرف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ یاد رہے کہ جب میں "خدمت" کا گرانمایہ لفظ استعمال کرتا ہوں تو میری مراد اس سے وہ "لیڈری" نہیں جو اپنے نام کے عروج میں قوم کی ترقی اور اپنی بے قدری میں قوم کی بدبختی دیکھتی ہے۔ میرا مطلب اس خاموش، سنجیدہ بلکہ آج کل یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ اس گمنام اور گونگی خدمت سے ہے جس کا پھل عملی اور بقول شخصے تعمیری صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً لوگوں کی جہالت کو کم کرنا، انکی بیہودہ اور فضول رسومات

کی اصلاح، ان کے گھروں میں صفائی اور حفظانِ صحت کو دخل دینا، ان کے لئے کام کی شاہراہیں کھولنا اور بیکاری سے بچانا، ان کو ایسے اعلیٰ مقاصد کی جھلک دکھانا جو انکو روزمرہ کے نجس جھگڑوں کم مایہ خودغرضیوں، کمینہ خصلتوں، تنگ نظری، تعصب سے بیزار کر دیں اور اس روحانی قدر و قیمت کا احساس دلائیں جو روزمرہ کے ان فرائض اور غیر دلچسپ اعمال میں پوشیدہ ہے جو دیانتداری راستی اور خلوص سے انجام پائیں۔

اب اگر آپ مجھ سے سوال کریں کہ یونیورسٹیاں طلبہ کو اس قسم کی خدمت کی بجاآوری کے قابل کیوں نہیں بناتیں تو میں عرض کروں گا کہ ان کو ابتک اس ضرورت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنے نظامِ تعلیم و تربیت میں اس خیال کو نہ کوئی جگہ دی ہے نہ اس بارِ عظیم کے لئے طلبہ کو تیار کرنے کا کوئی انتظام کیا ہے۔ وہ تعلیم کو معاشرت، سیاست، مذہب، صنعت و حرفت وغیرہ کی زندگی سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی تعلیم کے اصولوں اور طریقوں کے ذریعے انہوں نے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ گروہوں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج قائم کر دی ہے۔ ان میں نہ باہمی تعامل ہے نہ مکالمہ۔ تعامل اس لئے نہیں کہ دونوں کی دلچسپیوں اور اغراض کی دنیا جدا جدا ہے اور مکالمہ اور ربط اس لئے نہیں کہ دونوں کے زبان اور محاورات تک جدا جدا ہیں۔ دماغ کا کام کرنے والے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ لوگ جن کو عرفِ عام میں دماغ کا کام کرنے والے لوگ کہا جاتا ہے ہاتھ کا کام کرنے والوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ معاشرتی زندگی کا پیچیدہ نظام قائم رکھنے کیلئے دونوں جماعتوں کی یکساں ضرورت ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو علوم و فنون یا تخلیقی خیالات یونیورسٹیوں کی چاردیواری میں نشوونما بھی پاتے ہیں انکا ردِعمل عام لوگوں کی روزمرہ کی زندگی پر نہیں ہوتا اور نظامِ معاشرت میں وہ خطرناک تقسیم پھیلتی جاتی ہے جو قوم میں متضاد اور مخالف اغراض رکھنے والے فرقے اور گروہ پیدا کرتی ہے۔ آزادانہ میل جول اور تبادلۂ خیالات کو روکتی ہے۔ باہمی ہمدردی

کے بجائے پوشیدہ لیکن زبردست باہمی مخالفت کی پرورش کرتی ہے اور جب پوری طرح نشو ونما پاچکی ہے تو اس قسم کی مہلک صورت میں ظاہر ہوتی ہے جیسے انقلاب روس۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں یہ تقسیم اور زیادہ راہ نہ پائے تو ہماری یونیورسٹیوں کو قومی زندگی میں زیادہ مستعدی اور توجہ کے ساتھ حصہ لینا پڑے گا تاکہ عام طور پر لوگ یونیورسٹی کے اس صحیح انسانیت آفریں اثر کو قبول کر سکیں جو تعصب، تنگ نظری، خود غرضانہ جد وجہد کے خلاف ہے اور باہمی اشتراک عمل کی دعوت دیتا ہے۔

ایک ماہر تعلیم کا یہ قول مجھے بہت پسند ہے "اگر تم تمام لوگوں کو یونیورسٹی میں نہیں لا سکتے تو تمہیں چاہئے کہ یونیورسٹی کو تمام لوگوں کے پاس لے جاؤ"۔ ہمارا سب سے زیادہ اہم مسئلہ اس وقت یہی ہے کہ ہم یونیورسٹی کو کس طرح تمام لوگوں کے پاس لے جا سکتے ہیں؟ اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کیلئے ہمیں اول تو یونیورسٹی کا نصب العین تبدیل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ طلبا اور تعلیم یافتہ جماعت جو یونیورسٹی سے نکلے وہ اپنے حقیقی فرائض کا احساس رکھتی ہو اور سرکاری ملازمت یا وکالت کو زندگی کا مطمح نظر خیال نہ کرے اس خاص مسئلہ پر بہت کافی بحث ہو چکی ہے۔ اس لئے میں اسکی طرف محض اشارہ کر کے اس کو چھوڑتا ہوں۔

دوسرے ہمیں اس نفسیاتی اصول کو سمجھنا چاہئے کہ کسی کام کو سیکھنے یا اس کی طرف میلان خاطر پیدا کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ اس کو کیا جائے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری یونیورسٹیوں کے طلبا اپنی دنیاوی زندگی میں تمام شہری اور قومی فرائض کو ادا کریں تو صرف لکچر دینا کافی نہیں۔ ہمیں ایسے مواقع فراہم کرنے چاہئیں کہ وہ عملاً ان فرائض کو ادا کرنا سیکھیں۔ انکا مطالعہ اور لکچرار کو بتائیں کہ ان کا کیا کام ہے اور انکی روزمرہ کی زندگی انہیں سکھائے کہ اس کام کو کیوں کرنا چاہئے۔ وہ اپنے گاؤں یا اپنے شہر کی زندگی میں شریک ہو کر اصلاح و بہبود کی ضرورت محسوس کریں اپنے

مباحثوں اور انجمنوں میں ان وسائل پر غور کریں جن کے ذریعے اصلاح اور بہبود کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس طرح علم اور عمل کے ربط سے وہ اس تعمیر نو میں حصہ لے سکیں گے جن کے لئے مستقبل چشم براہ ہے۔

میں بہت مختصر طور پر بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کس قسم کے مشاغل سے "یونیورسٹی کو لوگوں کے پاس لے جا سکتے ہیں"

(۲) اپنی زبان اور ادب کی ترقی۔ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تمام علوم ایک غیر زبان کی وساطت سے پڑھائے جاتے ہیں۔ اس زبانی غلامی کی وجہ سے ملک کے ادب کو کافی نقصان پہنچ رہا ہے علوم یونیورسٹی میں پڑھائے جاتے ہیں وہ عوام الناس کے لیے قابل استعمال نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تصنیف تالیف، تراجم کے ذریعے مختلف علوم کو سہل اور عام فہم اسلوب سے پیش کیا جائے تاکہ جو لوگ اپنی زبان میں انکا مطالعہ کرنا چاہیں ان کو آسانی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ فی الحال ہمارے ہاں پڑھنے والوں کی تعداد بہت محدود ہے لیکن اس کو زیادہ کرنے کا ایک کارگر طریقہ یہ بھی ہے کہ اعلیٰ قسم کا ادب، دلچسپ انداز میں لکھا ہوا، معقول چھپا ہوا، رائج کیا جائے۔ آج کل ہماری علمی کم مائگی اور بے شوقی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمیں پڑھنے کے لئے عمدہ قسم کی کتابیں اپنی زبان میں آسانی سے نہیں ملتیں۔

(ب) دوسرے یونیورسٹیاں اس وقت تک ملک میں جڑ نہیں پکڑ سکتیں جب تک انکی بنیاد عام خواندگی پر قائم نہ ہو۔ وہ نظام تعلیم جس میں اعلیٰ تعلیم گاہوں کی تعداد بڑھتی جائے لیکن عوام میں سے ۹۰ فیصدی لوگ معمولی نوشت و خواند بھی نہ جانتے ہوں گویا ایک بھاری چھت ہے کمزور دیواروں پر۔ اس سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لئے ملک میں صحیح قسم کی ابتدائی تعلیم کو عام طور پر رائج کرنا لازمی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے یونیورسٹیوں کو ایک جہاد نوشت و خواند کا انتظام

چاہیئے جو بالغوں کی تعلیم کا ذمہ لے۔ اگر سکولوں کے ذریعے بچوں ہی کو تعلیم دیجائے اور اس کی تعداد میں موجودہ نسبت سی اضافہ ہوتا رہے تو تمام ملک کو خواندہ ہونے کے لئے محض سات یا آٹھ صدیوں کی ضرورت ہوگی جس کے لئے شاید ہمارے سکون پسند ہندوستانی بھی تیار نہ ہوں! برخلاف اس کے اگر صحیح اصولوں پر تعلیم دیجائے اور مدارس شبینہ کا ایک جال ملک میں پھیلا دیا جائے تو چند ہی سال میں معتدبہ فائدہ ہونے کی امید ہے۔

(ج) لیکن صرف خواندگی کو عام کر دینا کافی نہیں۔ بذات خود وہ کوئی صفت نہیں ہے۔ وہ محض ایک صلاحیت ہی جو اچھی طرح بھی استعمال ہو سکتی ہے اور بری طرح بھی۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک تو ملک میں عمدہ قسم کا عام پسند ادب موجود ہونے کی ضرورت ہی جو تجویز نمبر ا پر عمل کرنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ دوسرے خواندگی سے اور آگے بڑھ کر یونیورسٹی کی تحقیق و تعلیم کے نتائج کو عوام میں رائج کرنا چاہیئے۔ اسکے لئے ہمیں کسی اس قسم کی تحریک کو ہاتھ میں لینا چاہیئے جیسی انگلستان میں توسیع یونیورسٹی کی تحریک (University Extension) ہے یا روس میں [illegible] یعنی مزدور پیشہ اور کاروبار کرنے والے لوگوں کی یونیورسٹی ہے۔ اس میں ان لوگوں کی تعلیم کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں جو اعلیٰ تعلیم کا شوق رکھتے ہیں لیکن مالی یا دیگر ضروریات کی وجہ سے قبل از وقت تعلیم ختم کرنے پر مجبور ہو گئے تھے اور کام شروع کر دیا تھا۔ ان لوگوں کے لئے یونیورسٹی خاص طور پر اپنے لکچرار اور استاد مختلف مقامی مرکزوں میں بھیجتی ہے اور شام کے وقت ہفتہ میں چند مرتبہ ان کو ایسے مضامین کی تعلیم دلاتی ہے جن میں ان کو دلچسپی ہے۔ یہ اساتذہ اپنے ان پختہ عمر طلبہ کے ساتھ مل کر ایسے مباحث اور مسائل پر گفتگو کرتے ہیں جنکا تعلق سیاسیات حاضرہ سے ہے۔ یا اقتصادی نظام سے یا ان کی شہری اور ملکی زندگی سے۔ انکو ان کے حقوق اور فرائض سے آگاہ کرتے ہیں۔ انکے پوشیدہ امکانات اور ترقی

کی صلاحیتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ مختلف علوم کا مطالعہ کرنے کے لئے ان کو مستند کتابوں اور رسالوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ امر کہ مثلاً انگلستان میں ایک پورا سلسلہ کتب (Everyman's Library) کے نام سے موجود ہے اس بات کی شہادت ہے کہ وہاں عام لوگ اپنے مطالعہ کیلئے عمدہ کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس تلاش میں انکے یہ اساتذہ انہیں مدد دیتے ہیں۔ لیکن اس نظام کا فائدہ صرف ان لوگوں ہی کو نہیں پہنچتا۔ بلکہ اسی قدر اساتذہ کو بھی پہنچتا ہے۔ کیونکہ وہ تبادلہ خیال کے ذریعے عوام الناس کے مسائل، ضرورتوں، امنگوں اور رکاوٹوں سے واقف ہوجاتے ہیں اور جب یونیورسٹی میں واپس جاتے ہیں تو زیادہ پختہ تجربہ اور وسیع نظر ساتھ لاتے ہیں۔ ان کو اپنے علم پر زیادہ عبور ہوجاتا ہے کیونکہ ان علوم کو عوام الناس کے لئے قابل فہم بنانے کے واسطے محض الفاظ کو یاد کرلینا اور انکے ذریعے اپنے نفس کو دھوکہ دینا کافی نہیں۔ بلکہ الفاظ سے گذر کر معانی تک پہنچنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح سے یونیورسٹی اور عام زندگی کا یہ تعلق دونوں کے لئے مفید ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کا مفہوم لوگوں کے دلوں کے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ہماری اپنی افادہ گاہ ہے جس کی ذات سے ہمیں براہ راست اور بدیہی طور پر فائدہ پہنچ رہا ہے اور یونیورسٹی کے اپنے پاؤں زمین پر استحکام کے ساتھ قائم ہوجاتے ہیں۔

(د) ان سب چیزوں کے علاوہ یونیورسٹیوں کے طلبہ کو براہ راست ملک کی تنظیم اپنے ہاتھ میں لینی چاہیئے۔ اور شہری اور دیہاتی زندگی میں بذات خود شریک ہوکر اس کے منتشر ارادوں کو مجتمع اور اس کے غیر مفید شعبوں کو درست کرنا چاہیئے۔ یہ کوئی نئی یا غیر ممکن تحریک نہیں ہے۔ چھوٹے پیمانے پر اس کے تجربے ہندوستان میں بھی کئے گئے ہیں اگرچہ بڑی بڑی یونیورسٹیوں نے جنہیں اپنے تقدس کا دعوےٰ ہے کبھی اس فرض کو قبول نہیں کیا۔ البتہ یورپ میں خصوصاً جنگ عظیم کے بعد، ہر ملک میں اس تحریک کو اٹھایا گیا اور اس سے بڑے بڑے فائدہ مند کام انجام

پائے۔ میرے پاس وقت نہیں کہ میں ان عظیم الشان خدمات کی تفصیل کروں جو یورپ کی مختلف طالبعلموں کی انجمنوں نے جنگ کے بعد انجام دیں۔ یونیورسٹیوں کے طلبہ تعطیلات کے ایام میں فلاکت زدہ محلوں میں جا کر رہے جہاں نہایت ہی غریب اور جاہل اور غیر مہذب لوگ رہتے ہیں ان میں اپنا اعتماد قائم کیا۔ ان کی تعلیم، تفریح اور معاشرتی تنظیم جس میں صفائی، حفظان صحت خوراک کی درستی، طریقہ بود و باش شامل ہیں غرض سب چیزیں اپنے ذمہ لیں۔ اور اس ماحول کی عام حالت کو صریحاً بہتر کر دکھایا۔ کیمبرج یونیورسٹی نے فرانس کے ورڈون شہر کو اپنا متبنیٰ بنایا یہ شہر جنگ کے دوران میں بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ طلبہ نے اس کو از سر نو تعمیر کیا۔ ان میں سے جو لوگ فن تعمیر کی تعلیم پاتے تھے انہوں نے مکانات بنائے۔ سڑکیں بنائیں، باغ لگائے اور جو کھنڈر وہاں پڑے ہوئے تھے ان کو قابل رہائش عمارتوں میں تبدیل کر دیا۔ جو طلبہ فن تعلیم کا مطالعہ کرتے تھے انہوں نے سکولوں اور کالجوں کا نظام درست کیا جنکو معاشیات سے دلچسپی تھی انہوں نے اس کے کاروبار اور اقتصادی ضروریات کا سامان فراہم کیا۔ جو طلبہ ڈاکٹری کی تعلیم پا رہے تھے انہوں نے شہر میں حفظان صحت کے اصول رائج کئے اور اسپتالوں میں زخمیوں اور بیماروں کی خبر گیری کی وغیرہ وغیرہ۔

حضرات میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک کی حالت آج فرانس کے اس مسمار شدہ شہر کی سی ہے۔ بلکہ اس سے بدتر ہے۔ کیونکہ اس کی صرف مادی حالت خراب ہوئی تھی ہماری مادی حالت کے ساتھ علمی اور اخلاقی حالت بھی خراب ہے۔ اسکے مکانات شکستہ ہو گئے تھے ہمارے ملک کے اسّی فی صدی مکانات جو شکستہ بھی نہیں انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں۔ نہ انمیں ہوا کا انتظام ہے نہ روشنی کا۔ نہ نشست و برخاست کا آرام ہے نہ مطالعہ کا۔ اسمیں عارضی طور پر حفظان صحت کا نظام خراب ہو گیا تھا اور بیماریاں پھیل گئی تھیں ہمارے ہاں یہ حالت مستقل ہے۔ اور علاوہ

ان خرابیوں کے ہماری ملک اور قوم کے اخلاق میں خود غرضی، تعصب، تنگ نظری، بیکار نفس پرستی کے جراثیم جڑ پکڑ گئے ہیں۔ کیا ہماری یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیم گاہوں کے طلبہ کے لئے یہ حالت ایک زبردست دعوت عمل نہیں؟ کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم اپنی قوم کی تعمیر نو میں اس سے زیادہ جوش اور خلوص اور تندہی سے کام کریں جتنا کیمبرج والوں نے ایک غیر قوم اور غیر شہر کے لوگوں کے لئے کیا؟ کیا ہم کم از کم تعطیلات کے لئے ایسا انتظام نہیں کر سکتے کہ ہمارے طلبہ جاکر گاؤں اور شہروں میں رہیں اور ان کی اجتماعی زندگی کی تنظیم کو اپنے ہاتھ میں لیں۔

ممکن ہے کہ میری یہ تجاویز لوگوں کو مضحکہ خیز معلوم ہوں۔ یا آپ اپنی ہمدردی کی وجہ سے انکو خوش آئند لیکن ناممکن العمل خیال کریں۔ پہلے خیال سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ وہ ایک جائز اختلاف رائے ہے جسے دور کرنا میرے خیال میں ضروری ہے۔ لیکن دوسرا نقطہ نظر بہت ناگوار اور خطرناک ہے۔ اکثر عمدہ تحریکوں کی موت اسی طرح ہوتی ہے کہ لوگوں نے ان کو اصولاً عمدہ اور مفید خیال کیا لیکن یہ کہہ کر سبکدوشی حاصل کر لی کہ ان پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا۔ میں اس طرز خیال کا سخت مخالف ہوں۔ اگر آپ ہم سچائی اور خلوص سے محسوس کرتے ہیں کہ ایک تجویز مفید ہے تو اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔ حیلہ سازی سے کبھی کسی قوم کی فلاح نہیں ہوتی۔

ہمیں کامیابی کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اول اس نئے نقطہ نظر کو تسلیم کر لیں کہ یونیورسٹی محض ایک درسگاہ نہیں ہے جہاں چند مضامین پر سبق پڑھائے جاتے ہیں بلکہ وہ قومی زندگی میں ایک مرکزی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ان تمام عمدہ اور متحرک اثرات کا سرچشمہ ہے جو قوم کی زندگی کی اصلاح کرتے ہیں۔ میں اصولاً تشبیہوں کا قائل نہیں لیکن میرے خیال میں یونیورسٹی کو جائز طور پر ایک بجلی گھر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جس طرح بجلی گھر کا کام ہوتا ہے کہ وہ

مخصوص آلات کے ذریعے اس بجلی کو جمع کرے جو منتشر طور پر تمام کائنات میں موجود ہے۔ اس کو ایک قابل استعمال شکل دے اور اپنے اندر کام کرنے والوں کو اور تمام گرد و نواح کو روشنی پہنچائے۔ اسی طرح بالکل اسی طرح یونیورسٹی بھی ان تمام علوم کو جمع کرتی ہے جو دنیا میں موجود ہیں اور تحقیق علمی کے ذریعے مظاہر قدرت اور انسانی زندگی میں چھپے ہوئے قوانین کو مرتب کر کے نئے علوم کی تدوین کرتی ہے۔ ان علوم کو ایسی شکل میں ترتیب دیتی ہے کہ وہ علم کے تلاش کرنے والوں کے لئے قابل استعمال ہوں اور پھر اپنے علوم اور اپنی تحقیقات سے صرف ان ہی لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچاتی جو اسکی چار دیواری میں تعلیم پا رہے ہیں بلکہ بجلی گھر کی طرح اس کے فیوض کو گرد و نواح کے لوگوں تک پہنچنا چاہیے۔ قوم کی زندگی کے ہر شعبے پر اثر ڈالنا چاہیے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ایک یونیورسٹی کی تحقیقات علمیہ کے نتائج عام فہم انداز میں پبلک کے سامنے پیش کئے جائیں اور دوسری جانب یونیورسٹی کے طلبہ ملک کی اصلاح میں حصہ لیں۔

جاحظ اور تاریخ طبعی

ڈاکٹر بذل الرحمن صاحب پروفسر لکھنؤ یونیورسٹی نے اس موضوع پر ایک مقالہ انگریزی زبان میں لکھکر اپنی یونیورسٹی کی کسی انجمن کے جلسہ میں پڑھا تھا اور بعد کو اسے چھپوا بھی لیا تھا۔ اسکی ایک مطبوعہ نقل ہمارے پاس بھی پہنچی چنانچہ رسالہ جامعہ کے گذشتہ نمبر میں اس کے ایک حصہ کا ترجمہ قارئین "جامعہ" کی نظر سے گذرا ہوگا بقیہ مضمون کا ترجمہ اب ہدیۂ ناظرین ہے (عبدالعلیم)

ہم کتاب الحیوان کی غرض وغایت، اس کے مضامین کی ترتیب، اس کے اسلوب بیان اور ماخذ سے بحث کر چکے اب ہم بعض ان اہم امور کو پیش کرنا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے یہ کتاب اپنے عہد کی دوسری کتابوں سے جو اس موضوع پر لکھی گئی تھیں، ممتاز خیال کیجاتی ہے۔ کوفے اور بصرے کے نحویوں نے طبعی تاریخ پر کئی کتابیں لکھی ہیں لیکن ان کی قدر وقیمت ایک ایسی فرہنگ سے زیادہ نہیں جس سے زمانہ جاہلیت کے قصائد اور امثال کے سمجھنے میں مدد لیجا سکتی ہو۔ ابو عبیدۃ[۱] اور اصمعی کے متعلق ابن خلکان نے ایک حکایت[۲] نقل کی ہے جس سے ان تصانیف کی کیفیت کا بہت کچھ اندازہ ہو سکتا ہے :- اصمعی کا بیان ہے کہ میں اور ابو عبیدہ فضل بن ربیع سے ملنے گئے۔ اس نے مجھ سے سوال کیا کہ گھوڑوں کے متعلق جو کتاب تم نے لکھی ہے وہ کتنی جلدوں میں ہے۔ میں نے جواب دیا کہ "صرف ایک جلد میں" اس نے یہی سوال ابو عبیدہ سے کیا انہوں نے کہا کہ "پچاس جلدوں میں"۔ اب فضل نے ابو عبیدہ سے کہا کہ اُس گھوڑے کے پاس جاؤ اور اپنا ہاتھ اسکے

---

[۱] ترجمہ ڈی سلین جلد ۳ صفحہ ۱۲۴
[۲] ابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۲۶۸ - ۲۷۱

تمام حصوں پر پھیرو اور ساتھ ہی ساتھ انکے نام بھی بتاتے جاؤ۔ ابو عبیدہ نے جواب دیا کہ میں کوئی نعلبند یا سلوتری تو ہوں نہیں بلکہ جو کچھ میری کتاب میں ہے وہ میں نے بادیہ نشین عربوں سے حاصل کیا ہے۔ فضل نے مجھ سے بھی یہی درخواست کی چنانچہ میں گھوڑے کے پاس گیا اور ایال پکڑ کر اس کے مختلف اعضا پر ہاتھ پھیرتا گیا اور نام بتاتا گیا۔ جب میں اس سے فارغ ہوا تو فضل نے کہا جاؤ یہ گھوڑا تمہارا ہے۔ اسکے بعد جب کبھی میں ابو عبیدہ کو چھیڑنا چاہتا تو اسی گھوڑے پر سوار ہو کر اُن سے ملنے جایا کرتا تھا۔

جاحظ پہلا شخص تھا جس نے اس قسم کی تصانیف میں کوئی سائنٹفک بات بھی پیدا کی۔ ابھی تک وہ زمانہ نہیں آیا تھا کہ تاریخ طبعی ایک علم کی صورت اختیار کر لیتی یا اسکو لوگ اسی طرح سمجھنے لگتے جس طرح آج کل کے لوگ سمجھتے ہیں۔ اور نہ تشریح الابدان کے متعلق کسی جدید تفتیش یا اکتشاف کا خیال بھی کسی کے ذہن میں آیا تھا۔ جاحظ خود بھی طبعی ہونے کا دعوےٰ نہیں کرتا بلکہ اس کی کوشش صرف یہی رہی ہے کہ لوگوں کے سامنے بعض ان حقائق کو پیش کر دے جنہیں اس نے یا تو ذاتی مطالعہ سے یا بعض ان ذرائع سے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں معلوم کیا تھا۔ توہم اور تخیل سے وہ کسی طرح بچ نہیں سکتا تھا اس لئے کہ نہ تو سائنٹفک تصانیف موجود تھیں اور نہ اس زمانہ کے اسالیب نقد کا اُسے علم تھا اس لئے حیوانات کے خصائل و عادات کو بہ نسبت علمی حقائق کے اس کے یہاں زیادہ جگہ ملی ہے۔ لیکن با ایں ہمہ اس کے بعض خیالات طبعی تاریخ کے ان اہم نظریوں کا پتہ دیتے ہیں جنکی تکمیل اب آکر ہمارے زمانے میں ہوئی ہے۔

جاحظ کی تحریروں میں غیر متعلق باتیں اس کثرت سے آجاتی ہیں کہ کسی خاص موضوع پر اس کے خیالات معلوم کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے تو اس کی تصانیف کی ضخیم جلدوں کی ورق گردانی کیجائے اور دو دو چار چار فقرے کچھ یہاں سے اور کچھ وہاں سے جمع کئے جائیں۔ اسکے خیالات

ممکن ہے کہ آج کل کے ماہرین علم الحیوان کو طفلانہ نظر آئیں لیکن اُس کے زمانہ کا خیال رکھتے ہوئے بہت اہم ہیں بحیثیت ایک مسلمان کے وہ تخلیق کے متعلق کن فیکون، کے قدیم الایام نظریہ پر ایمان رکھتا تھا۔ مذہبی عقائد کے لحاظ سے تو وہ ہر بات کو قدرت خداوندی پر محمول کر سکتا تھا لیکن جاحظ کی فطرت میں جیسا ہیں ابتدا ہی سے تھی اور اس نے اُسے غور و فکر پر مجبور کیا۔ مکھیوں کے متعلق بالخصوص وہ بہت سے قصے اور اپنے دوستوں کے تجربے بیان کرتا ہے لیکن اُنکی پیدائش کا مسئلہ اسے اب بھی حیران رکھتا ہے۔ وہ ان تمام نظریوں کا ذکر کرتا ہے جو اس کے ساتھیوں یا ہمعصروں نے پیش کئے ہیں لیکن خود اسکی رائے ہے کہ وہ گندے اور غلیظ مادہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ ایک ایسے شخص کی مثال دیتا ہے جو ویران صحرا میں سفر کر رہا ہے۔ یہ آدمی قضائے حاجت کیلئے ایک ایسی جگہ تجویز کرتا ہے جہاں نہ تو نباتی زندگی کا پتہ ہے اور نہ حیوانی زندگی کا لیکن جوں ہی وہ مڑ کر دیکھتا ہے غلیظ پر اسے مکھیاں بھنبھناتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اب جاحظ کے خیال کے مطابق کئی صورتیں ممکن ہیں یا تو یہ مکھیاں کہیں اسی جگہ قریب پاس موجود تھیں یا اس شخص کے پیچھے پیچھے انسانی آبادی سے آئی تھیں یا فوراً وہیں کی وہیں پیدا ہو گئیں۔ پہلی دو صورتوں کو وہ تسلیم نہیں کر سکتا اس لئے اب آخری صورت ہی رہجاتی ہے اسی طرح وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جوں انسانوں کے بدبودار پسینے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز اور دلچسپ اس کا ایک اور نظریہ ہے جسے خود اپنے اور اپنے احباب کے تجربات اور مشاہدات کو پیش کر کے وہ ثابت کرنا چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر سیم کی پھلی کو سڑنے دیا جائے تو اس سے مکھیاں پیدا ہونے لگیں گی۔ اس کے خیال کے مطابق علاوہ معمولی طریقے کے پیدائش خود بخود بھی ہو سکتی ہے لیکن اس خیال کو ظاہر کرتے کرتے اسے قرآن کی ایک آیت یاد آجاتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے ہر چیز کو ایک نر اور ایک مادہ کے ذریعہ سے پیدا کیا۔ چنانچہ متکلمین کے خاص انداز میں

وہ اس آیت کی کئی صفحوں میں بحث کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بعض ایسی مثالیں پیش کرکے جو اسکے خیال میں "آپ روپ پیدائش" کی دلیل ہیں اپنے نظریہ کو مضبوط بنانا چاہتا ہے۔ اب نہ تو وہ کلام اللہ کو غلط کہہ سکتا ہے اور نہ اس نتیجہ میں شک کرسکتا ہے جس پر وہ بہت غور و خوض کے بعد پہنچا ہے اس لیے اس کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ پیدائش کے ہر موقع پر دو عناصر کارفرما ہوتے ہیں جن میں سے ایک نر کا قائم مقام ہوتا ہے اور دوسرا مادہ کا۔ توضیح کے لئے وہ مینڈک کی مثال پیش کرتا ہے جو بارش کے بعد یک بیک پیدا ہو جاتے ہیں اور بتاتا ہے کہ مٹی اور تری نر و مادہ کا کام دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ابھی تھوڑے دنوں پہلے تک (Abiogenesis) یا آپ روپ پیدائش کا نظریہ صحیح سمجھا جاتا تھا جانوروں کے چولی بدلنے (Recapitulation) کا خیال نسبتاً نیا ہے لیکن کتاب الحیوان کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس حقیقت کا مشاہدہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔ بھنورے کے متعلق جاحظ لکھتا ہے کہ ابتدائی عمر میں اسکے پر نہیں ہوتے بلکہ چیونٹی کی طرح بہت بعد کو لگتے ہیں[1]۔ اسی خیال کو لیکر ذرا بھونڈے طریقے سے وہ پسوؤں کے متعلق بھی ظاہر کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ پسو آخری عمر میں مچھر بن جاتے ہیں۔ معمولی مکھی کے متعلق بھی اس کی رائے ہے کہ ایک بھنگے سے ترقی کرکے اس حالت کو پہنچتی ہے[2] اس قدیم زمانے میں بھی ہمارے مصنف کی نظر قدرت کی حفاظتی رنگ آمیزی (Protection Colouration) پر پڑ چکی تھی اور اسے یہ حقیقت زیادہ واضح طور پر جوں اور چلّوؤں میں نظر آئی جنکا رنگ باختلاف مواقع بدن، بال یا کپڑوں کے رنگ میں بالکل مل جاتا ہے[3] یہی بات اس نے مختلف قسم کی مکھیوں میں بھی دیکھی[4]۔

---

[1] جلد ۵ صفحہ ۱۵۲

[2] جلد ۳ صفحہ ۱۵۶

[3] جلد ۵ صفحہ ۱۱۲ - [4] جلد ۳ صفحہ ۱۲۱

جاحظ بہت شدت سے اس نظریہ کا قائل معلوم ہوتا ہے کہ حیوانوں میں تحریک طبعی Instinct موجود ہے اور اسکی دلیل یہ ہے کہ وہ پیدا ہوتے ہی اپنے ماں باپ کی طرح رہنے لگتے ہیں مثال میں وہ چھوٹے سے چھوٹے جانور مثلاً مکڑی، چوزے یا چھپکلی وغیرہ کو پیش کرتا ہے۔ اپنے خیالات کی تشریح کے لئے وہ ذرا تفصیل سے قمری کی زندگی کی کیفیت بیان کرتا ہے[1]۔ انکے جارہ بدلنے کے ذکر سے شروع کرکے وہ یہ بتاتا ہے کہ کس طرح نر مادہ کے انڈا دینے سے پہلے ایک معقول جگہ کی تلاش میں نکلتا ہے اور کس طرح دونوں مل کر آشیانے کے لئے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کرتے ہیں جو آب و ہوا کے مضر اثرات سے بالکل مامون ہو اور پھر کس طرح آشیانے میں تنکے اور پتیاں جاتے ہیں کہ ایک خاص درجے کی حرارت پیدا ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال رہتا ہے کہ انڈے نیچے نہ گر سکیں اور وہ آرام سے بیٹھ بھی سکے۔ جب انڈوں کے سینے کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے اور بچے نکل آتے ہیں تو وہ انکو کھلانا شروع کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ نوزائیدہ بچے کے منہ میں پھونکتے ہیں تاکہ حلق کی نلی کھل جائے پھر اپنے پوٹوں کی رطوبت انکے منہ میں ڈالتے ہیں۔ اسکے بعد انکو آدھے چبائے ہوئے دانے دیتے ہیں اور آخر میں پورے دانے اتنے پانی کے ساتھ دیتے ہیں جو انکی خوراک سے زیادہ نہ ہو جائے۔ یہ تمام مشکل اور پیچیدہ طریقے انہیں خود بخود معلوم ہو جاتے ہیں۔ اپنے اس خیال کی تائید جاحظ کو ان جانوروں کے طرز عمل سے بھی ملتی ہے جو کثرت کے زمانے میں خوراک اس موسم کیلئے جمع کر لیتے ہیں جب کھانے کو کچھ نہیں ملتا[2]

یہ ثابت کرنیکی کوشش میں کہ فطرت نے چھوٹے چھوٹے جانوروں کو تحریک طبعی عطا کی ہے جاحظ کو یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کو کچھ سمجھ بھی عنایت ہوئی ہے۔ زندگی کی پیچیدگیوں سے محفوظ

---

[1] جلد ۳ صفحہ ۴۶ و ۴۷

[2] جلد ۴ صفحہ ۲

رہنے کے لئے صرف تحریک طبعی کافی نہیں ہے اس لئے انسان کی طرح چھوٹے درجے کے حیوانوں کو بھی سمجھ کا ایک حصہ ملا ہے اگرچہ یہ سمجھ مختلف جانوروں میں مختلف درجے کی ہوتی ہے جیسا کہ عربی امثال سے ظاہر ہوتا ہے لیکن ہر جانور کچھ نہ کچھ سمجھ ضرور رکھتا ہے۔ اس بیان کو اور واضح کرنے کے لئے جاحظ ایک پیشہ ور شکاری کا تجربہ بیان کرتا ہے[۱] ۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک چڑیا دیوار پر بیٹھی ہے اور صرف اسے ڈرانے کے لئے شکاری چلاتا یا ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن چڑیے پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اب وہ جھکتا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نے ایک پتھر اٹھالیا ہے اور ہاتھ کو اس طرح حرکت بھی دیتا ہے جس سے معلوم ہو کہ وہ چڑیے کو مارنا چاہتا ہے مگر پھر بھی وہ دیوار سے نہیں ہلتی ۔ مگر جب وہ واقعی ایک پتھر اٹھالیتا ہے تو چڑیا فوراً اڑ جاتی ہے ۔ دوسری دلچسپ مثال جاحظ چیونٹیوں کی پیش کرتا ہے ۔ انہیں تحریک طبعی اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ خوراک جمع کریں لیکن ایک دفعہ کے تجربہ کے بعد انہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ غلے کو اچھی حالت میں رکھنا بھی ضروری ہے ۔ چنانچہ چیونٹی اس کا خیال رکھتی ہے کہ ایک موسم میں کئی بار تمام ذخیرہ کو اپنے سوراخ سے باہر نکالکر پھیلا دے تاکہ وہ سڑنے نہ پائے یا اسمیں پھپوند نہ لگ جائے ۔ اس کے علاوہ ہر دانے کے دو ٹکڑے کرکے جمع کرتی ہے تاکہ وہ جم کر اُگنے نہ لگیں[۲] ۔

جاحظ نے جو طویل باب خصی کے متعلق لکھا ہے وہ اگرچہ بہت سی غیر متعلق باتوں سے بھرا ہوا ہے لیکن پھر بھی مصنف کی زبردست قوت مشاہدہ پر دلالت کرتا ہے ۔ اس نے اس مسئلہ پر مختلف جہات سے غور کیا ہے اور صرف یہی ایک باب ہے جسمیں انسانوں کو بھی اس کے مشاہدات سے کچھ حصہ ملا ہے[۳] ۔ اس عمل کا جو اثر افراد پر پڑتا ہے اس سے بحث کرتے ہوئے جاحظ کی رسائی بہت

---

[۱] جلد ۲ صفحہ ۱۲۱

[۲] جلد ۴ صفحہ ۲ ۔ [۳] جلد ۱ صفحہ ۶۱ و ۷۲ و ۷۷

ہم نتائج تک ہوئی ہے۔ اسکا بیان ہے کہ مرد خصی کئے جانے کے بعد عورت کے خصائل و عادات کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اور طبیعت، حرکات، حتیٰ کہ آواز میں بھی ایک نمایاں تغیر ظہور پذیر ہونے لگتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ حیوانات میں صنف مخالف کے خصائل ثانوی حیثیت سے موجود ہوتے ہیں اور اس عمل کا ان ثانوی خصائل پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ خصی کئے جانے سے ترکیب جسم میں جو اور تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں انکے متعلق جاحظ کے خیالات کچھ واضح نہیں ہیں اور نہ کوئی قطعی بات اس نے بیان کی ہے[۵]۔

خنازیر سے بحث کرتے ہوئے جاحظ قرآن کی وہ آیت نقل کرتا ہے جس میں بعض کفار کے متعلق کہا گیا ہے کہ سزاءً انکی صورتیں بندروں اور سؤروں کے مثل کر دی گئی تھیں اب وہ غور کرتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے لیکن چونکہ خدا کے کلام میں شبہے کی گنجائش نہیں اس لئے اسے بہت سی تاویلیں کرنی پڑتی ہیں اسکے متعلق اس کے بعض دلائل تاریخ طبعی کے مطالعہ کرنے والے کیلئے کافی دلچسپ ہیں۔ جاحظ کو یہ یقین تھا کہ ماحول انسان پر اثر ڈالتا ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ خدا تعالے نے وہاں کی آب و ہوا میں کچھ ایسی تبدیلیاں کر دی ہونگی جن کے اثر سے ان لوگوں کے چہروں میں یہ تغیر پیدا ہو گیا۔ اپنے نظریے کے ثبوت میں جاحظ اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ دنیا کی مختلف اقوام کے چہرے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور اسکے خیال میں اسکی وجہ یہی اختلاف ماحول ہے۔ چنانچہ ان عربوں میں جو اپنے ملک کو چھوڑ کر خراسان میں جا بسے ہیں بعض اسی قسم کے تغیرات رونما ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگوں نے ہمارے مصنف سے یہ بھی بیان کیا تھا کہ نبطیوں کے ملک میں انھوں نے دو مدار انسان دیکھے ہیں خود اس نے ایک نبطی جہاز راں کو دیکھا تھا جس کی صورت بالکل بندر کے ایسی تھی۔ اس لئے قدرتاً اس کے دل میں یہ خیال پیدا

---

[۵] جلد ا صفحہ ۶۰ و ۶۲۔

ہو اکہ ان کنفا رکا ماحول بھی ویسا ہی کر دیا گیا ہوگا جیسا ان نبطیوں کا تھا۔ وہ یہیں بس نہیں کرتا بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ چونکہ ایک قسم کے حالات سے صرف ایک ہی قسم کے نتائج مترتب ہو سکتے ہیں اسلئے یہ دونوں تبدیلیاں یا تو دو مقامات پر ہوئی ہونگی یا کم از کم دو زمانے میں[۵۰] اس خاص مسئلہ کے متعلق اسکی بعض توجیہات کو نظر انداز کر دینے کے بعد کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اس زمانہ کی تعریف ان مشاہدات کے لئے کیوں نہ کریں جنہیں صرف چند صدیوں سے ذرا ایک گہرا علمی رنگ دیدیا گیا۔ یہاں یہ بھی کہہ دینا چاہئے کہ کتاب الحیوان میں "تنازع للبقا" کا خیال حیوانات کی باہم دشمنی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ جاحظ اس نزاع کو تمام عالم میں جاری و ساری نہیں سمجھتا بلکہ اسکا تذکرہ حیوانات کی بعض جنسوں کے سلسلے میں کرتا ہے۔

مسئلہ تولید پر جاحظ نے سب سے زیادہ توجہ کی ہے۔ جن جن حیوانات سے اس نے اپنی کتاب میں بحث کی ہے انکے متعلق اس مسئلہ کی روشنی میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہے۔ لیکن اکثر اوقات یہ تمام مواد بیانیہ (Description) ہے اور کہیں کہیں بحثیں بالکل طفلانہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بعض پرند مثلاً مرغیاں تیتر وغیرہ کبھی کبھی بغیر نر سے ملے ہوئے انڈے دیتے ہیں[۵۲]۔ اسکے خیال میں یہ چار صورتوں میں ممکن ہوسکتا ہے لیکن اس کے تمام دلائل دور از کار ہیں۔ اس سلسلہ میں جو قابل ذکر بات وہ ہمیں بتاتا ہے یہ کہ اس قسم کے انڈوں سے بچے پیدا نہیں ہو سکتے۔ گویا یہاں وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انڈے اس وقت تک نہیں بنتے جبتک کہ نر انہیں سیراب نہ کرے اور غیر سیراب شدہ انڈے بچوں کی صورت کبھی اختیار نہیں کر سکتے۔

ان مشاہدات کے پہلو بہ پہلو جو کمزور بحثیں علمی کہے جا سکتے ہیں۔ کتاب الحیوان میں شدید ترین

---

[۵۰] جلد چار صفحہ ۲۴ - ۲۵

[۵۲] جلد ۳ صفحہ ۵۳

توہمات بھی ملتے ہیں بعض کو تو اس نے صرف اسلئے داخل کر لیا کہ وہ عوام کے مذاق کی پابندی کرنی چاہتا تھا بعض مذہبی عقائد کا سائنٹفک خیالات سے تطابق کچھ آسان کام نہیں تھا تاہم ہمیں جاحظ کی اس لئے تعریف کرنی چاہئے کہ اس نے ان توہمات کو بھی کچھ نہ کچھ علمی رنگ دیدیا اگرچہ یہ رنگ آمیزی آج کل جبکہ معلومات میں بہت اضافہ ہو گیا ہے کارگر نہیں ہو سکتی لیکن جاحظ اس زمانے میں اپنے ہم مذہبوں میں ضرور کامیاب رہا تھا۔ مثلاً اس زمانے میں سورج اور تارے ایک قسم کے چراغ سمجھے جاتے تھے جو ضرورت کے وقت شیطانوں کے مارنے کیلئے پھینکے بھی جا سکتے تھے۔

جاحظ ان سے بحث کرتا ہے اور انہیں اجسام مانکر یہ کہتا ہے کہ ضروری نہیں کہ یہ بیان تمام تاروں کے متعلق ہو اور چونکہ آسمان میں بے شمار ستارے ہیں اس لئے یہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ اگر انمیں سے ایک تارہ شیاطین پر پھینک دیا جائے تو وہاں اسکی کمی محسوس ہوگی۔ اس کی رائے میں قرآن کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں ہے کہ پورا تارہ گرا دیا جاتا ہے بلکہ یہ ممکن ہے کہ کسی تارے کا ایک حصہ گرایا جاتا ہو۔

اس کتاب میں جسکا موضوع علم الحیوانات ہے ہر قسم کے توہمات موجود ہیں جیسا تیات (Biology) کے طالب علم کو تو یہ باتیں مضحکہ انگیز معلوم ہوں گی لیکن ایک ماہر علم الانسان (Anthropology) کے لئے اسمیں کافی دلچسپ مواد موجود ہے اسلئے کہ وہ ان سے تاریخ نسل انسانی کے مختلف ادوار کا پتہ چلا سکتا ہے جنوں کے بارے میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ صحیح نمونہ ہیں جاحظ کی رائے کا ان مسائل کے متعلق جنکی کوئی تاویل اس زمانے

"Margoliouth's "Development of Mohammadanism" ے Pages 226.

میں ممکن نہ تھی وہ خود ہی انکے وجود کا یقین نہیں رکھتا بلکہ دوسروں کو بھی یقین دلانے کے لئے اس نے ایک خاص باب میں ان لوگوں کے حالات بیان کئے ہیں جو جنوں سے ملے تھے[۱]۔ یہی نہیں بلکہ اپنے انس و جن کے باہم ازدواج کے حالات بھی بیان کئے ہیں[۲] اور اسکا خیال ہے کہ بنی جرہم ایک فرشتے کی اولاد میں جو معمولی عورت کے بطن سے پیدا ہوئے تھے[۳]۔ اس کی رائے میں اونٹوں کے اندر شیطان کا خون موجود ہے[۴]۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف قسم کی خبیث روحیں قہر خدا کے مختلف درجوں کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً کوئی جن اگر خدا کی نافرمانی کرتا ہے یا اسکے بندوں کو ستاتا ہے تو شیطان بن جاتا ہے۔ اگر وہ اب بھی باز نہیں آتا تو "عفریت" ہو جاتا ہے۔ اس پر بھی اگر اسمیں اصلاح نہ ہوئی تو "عبقری" کی صورت اختیار کر لیتا ہے[۵]۔ اُس زمانے میں یہ مسئلہ عوام کے لئے بہت پریشان کن تھا اس لئے جاحظ نے اپنے تمام خیالات کو الگ ایک رسالے کی شکل میں جمع کیا تھا اور اسکا نام "کتاب فرق ما بین الانس والجن" رکھا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس رسالے میں اس فرق کا بیان تھا جو انس و جن، اور جن و ملک میں ہے[۶]۔ اس میں ارواح خبیثہ کا بھی ذکر تھا اور اسکا بھی کہ کس طرح حضرت سلیمان نے یا دوسرے ان لوگوں نے جن کو "کتاب کا علم تھا" ان ارواح کو زیر کیا اگرچہ "کتاب الحیوان" میں جاحظ نے انسانوں سے بحث نہیں کی ہے لیکن پھر بھی اس نے تاریخ طبعی کے اصول کا ضرور لحاظ رکھا ہے۔

"کتاب الجوارح" میں جو بدقسمتی سے ہم تک نہیں پہنچی، اسنے انسان کے مختلف اعضا اور انکے امراض[۷] سے بحث کی تھی۔ اسکے علاوہ مختلف چھوٹے چھوٹے رسائل بھی تھے مثلاً "المرحان البرصان"

---

[۱] جلد ۶ صفحہ ۵۳۔ [۲] جلد ۱ صفحہ ۸۲۔ [۳] جلد ۱ صفحہ ۸۶

[۴] جلد ۱ صفحہ ۷۰۔ [۵] جلد ۱ صفحہ ۱۴۱ [۶] جلد ۱ صفحہ ۳

[۷] کتاب البیان جلد ۱ صفحہ ۵۳

جسمیں لنگڑوں اور جذامیوں کا ذکر تھا یا "الحول والعور" جس میں بھینگی آنکھ والوں اور اندھوں کا بیان تھا۔ جاحظ کو سب سے زیادہ جس چیز سے دلچسپی تھی وہ مسئلہ جنس تھا۔ اس موضوع پر اسکی اہم ترین تصنیف غالباً "کتاب فضل مابین الرجال والنساء وفرق مابین الذکور والاناث"[۱] ہے جو ضائع ہو گئی اس کتاب میں اس نے مرد عورت کے فرائض سے اور اس تعلق سے جو ان کو بچوں کے ساتھ ہونا چاہئے بحث کی تھی اور یہ بتایا تھا کہ صنف نازک کیساتھ کیسا برتاؤ ہونا چاہئے اور یہ کہ کون کون سے اعمال عورتوں سے مخصوص ہیں۔ اس کی ایک اور تصنیف کتاب النساء تھی جس میں صرف عورتوں کا بیان تھا اور جو اصل میں کتاب الحیوان کے ضمیمہ کی صورت میں تھی اب اسکا صرف ایک حصہ مجموعہ رسائل مطبوعہ مصر میں ملتا ہے جو دس صفحوں سے زیادہ نہیں اس جزو میں محبت کا بیان ہے اور مصنف نے معمولی محبت اور جنس مخالف کی محبت کا فرق دکھانیکی کوشش کی ہے۔ حاجی خلیفہ[۲] نے "کتاب العرس والعرائس" کو بھی جاحظ سے منسوب کیا ہے۔ یہ رسالہ مشرق کی ایک بہت مشہور کتاب "رجوع الشیخ الی صباہ فی القوۃ علی الباہ" کے مختلف مآخذ میں سے ایک ہے۔ اس کے گمنام مصنف نے دیباچے میں یہ لکھا ہے کہ اس نے جاحظ کے مذکورہ بالا رسالے سے استفادہ کیا ہے حالانکہ نہ تو خود جاحظ نے اسکا کہیں ذکر کیا ہے اور نہ کسی دوسرے مورخ نے۔

قبل اسکے کہ یہ بیان ختم کیا جائے جاحظ کی ایک دوسری قسم کی تصانیف کا بھی ذکر کر دینا چاہئے اسلام اور اسلامی فتوحات نے مختلف اقوام کے آدمیوں کو یکجا کر دیا تھا اور ایک دیدہ ور انکے فرق کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مذہب شعوبیہ نے اسمیں سیاسی نقطہ نظر سے بھی ایک دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ ایسی حالت میں جاحظ جیسے تیز طبع انسان کے لئے یہ کوئی

[۱] الحیوان جلد ا صفحہ ۲ [۲] جلد ۵ صفحہ ۱۱۵

مشکل بات تھی کہ وہ ایک علم سے گذر کر اپنی توجہ دوسرے علم کی طرف مبذول کرلے۔ علم الانسان، بہاتنک حیاتیات، پرمبنی ہے اور موخرالذکر کی تفتیش و ترقی سے اول الذکر کے مختلف دور پایہ تحقیق کو پہنچتی ہیں۔ اُس ابتدائی زمانے میں جبکہ جاحظ کی تصانیف نکل رہی تھیں تاریخ طبعی کا مطالعہ عربوں نے ابھی ابھی شروع کیا تھا اس لئے یہ انداز ہو سکتا ہے کہ علم الانسان، پر کس قسم کی کتابیں لکھی گئی ہونگی۔ جاحظ عرب اور اُنکی روایات کا حامی تھا چنانچہ اس نے ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے پر ترجیح دینا شروع کیا اور آخر میں شمالی اور جنوبی قبائل کی بحث میں پڑگیا۔ [۱] انساب کی بحث کے سلسلے میں جو عربوں کے لئے بیحد اہمیت رکھتی تھی اس نے مخلوط النسل قبائل کا بیان شروع کردیا اس کی کتاب الصرحاء والھجناء، ہمیں نہیں ملی لیکن خود اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں اس نے نسلی اثرات سے بحث کی تھی۔[۲] اس کی کتاب السودان والبیضان سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے جاحظ نے علم الانسان کا مطالعہ کس حد تک کیا ہے۔ مختصراً یہ کتاب کالے، اور گورے، کو ایک درجے پر لانا چاہتی ہے۔ بحث بہت محدود ہے وہ کالے، اپنی قوم سے ان اشخاص کا نام گناتے ہیں جنہوں نے مختلف مواقع پر کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ شاذونادر ہی ایسے خیالات ملیں گے جو آج کل کے ماہر علم الانسان، کے کام کے ہوں اور وہ بھی بالکل ابتدائی قسم کے۔

تاریخ طبعی سے متعلق جاحظ کے مشاغل علمی کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہ ماہر حکمیات نہیں تھا اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے وہ طبیبی ہونے کا خود بھی مدعی نہیں ہے۔ علم اور فلسفہ کی ترقی سے مسلمانوں کے دلوں میں بہت شبہات پیدا[۳] ہو چلے تھے

---

[۱] الفخر بین عبد شمس ومخزوم اور فخر القحطانیہ والعدنانیہ

[۲] کتاب السودان والبیضان صفحہ ۵۷، [۳] صفحہ ۱۰۱-۱۱۶ و ۱۳۶-۱۵۲

جن کا ذکر تفصیل کے ساتھ جاحظ نے اپنی تصانیف "د کتاب
میں کیا ہے اس نے ان تمام شبہات کے ازالے کی کوشش کی ہے اور ان مباحث پر اس
کی جتنی تصانیف ہیں انکا مقصد حکمیات کی تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ پڑھنے والے کے دلوں میں شوق
پیدا کرنا اور اس مضمون کو اس کیلئے دلفریب بنانا ہے۔ اسکا درجہ نحویین مثلاً اصمعی اور ابو عبیدہ
(جنکی تصانیف کا ذکر آچکا ہے) اور حکمائے اسلام مثلاً الفارابی۔ ابن اسد کے (جنہوں نے یونانی فلسفہ
کی تشریح کی ہے یا اس پر کتابیں تصنیف کی ہیں) بین بین ہے۔ جاحظ کے سر اس کا سہرا ہے کہ
وہ متکلمین میں سب سے پہلا آدمی تھا جس نے اس نئے میدان میں قدم رکھا اور مسلمانوں میں ان نئے
علوم کو حاصل کرنے کا شوق پیدا کیا۔

سفر حجاز

اثنائے سفر اور حج سے واپسی کے بعد مجھے یہ خیال رہا کہ اپنے تجربات سے لوگوں کو مستفید ہونیکا موقع دوں۔ اور اُن ضروری باتوں کو ظاہر کر دوں جنکی وجہ سے حج کے سفر میں سہولت پیدا ہو، اور وہ باتیں جن سے تکلیف پہنچتی ہے بیان کر دوں کہ آئندہ جانیوالے اُن سے احتیاط کریں، ممکن ہے جن لوگوں نے حج فرض ہونیکے باوجود اسکی طرف توجہ نہ کی ہو وہ اس فریضہ کو ادا کرنے کیلئے مستعد ہو جائیں۔ اور جو خیالات اُن کے لئے اس سفر سے مانع ہوں اُن پر نظر ثانی کریں۔

حج کے سفر کو عام طور پر عجائب الاسفار اور مصائب و شدائد کا منبع سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے اکثر مستطیع حضرات اس فرض کو ادا کرنے سے قاصر ہیں، کچھ ایسے حاجی بھی ہیں جو واپس آکر معمولی اور غیر اہم امور کو اہم و اعظم بنا کر دوسروں کو پریشان کر دیتے ہیں۔ بلکہ پریشانیوں کا ایسا غیر متناہی سلسلہ پیش کر دیتے ہیں جنکی حقیقت عند التحقیق نہایت حقیر ہوتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہر زمانہ اور ہر ایک حج کے موسم میں ایسی ہر سہولت و آسائش اور امن حاصل تھے جیسا کہ امسال حجاج کو نصیب ہوئے۔ تاہم یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ جسقدر ہولناک خیال کیا جاتا ہے اور جانے سے قبل جس قدر پریشانی مجھے خود تھی محض مبالغہ اور وسوسہ ہے۔ اب نسبتہً بہت پرامن و پرسکون ہو گیا ہے، امید قوی ہے کہ آئندہ اور بھی ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچیں گی انشاءاللہ تعالیٰ مجھے اپنے اور دیگر صدہا مسافروں کے تجربوں کی بنا پر بلا مبالغہ یہ حقیقت ظاہر کرنے کی جرأت ہوتی کہ "حجاز" کے سفر میں معمولی سفروں سے ہرگز زیادہ تکلیف و دشواری نہیں ہے بعینہٖ جس طرح ہندوستان میں سفر کرتے وقت بالخصوص ایسے مقامات پر جہاں ریل نہ ہو کچھ صعوبت ضرور ہوتی ہے، یہی صعوبت سفر حجاز میں ہوگی، مگر حجاز میں زیادہ سہولتیں ہیں، راستہ میں

چند میل کے فاصلہ سے ہوٹلیں (قہوہ خانے) ہیں جہاں ٹھنڈا پانی چائے اور دیگر سامان خورونوش حسب ضرورت بہم پہنچتا ہے۔

جس قسم کی سواری (اونٹ، گدھا، گھوڑا) وہاں ہے بافراط ہر وقت میسر ہے۔ پھل ترکاری اور تمام اشیا بکثرت اور نرخ میں ہندوستان سے معمولی فرق پر دستیاب ہوتی ہیں۔ خدا کی قدرت ہے کہ صرافہ کا انتظام بھی ایسا عمدہ ہے کہ کسی جگہ نہ ہوگا۔ جس قسم کا سکہ، نوٹ لیجاؤ، جتنی بڑی یا چھوٹی رقم ہو باسانی اُسے رائج الوقت سکہ میں تبدیل کرا سکتے ہو۔

اگر کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو وہ گرمی اور پانی کی قلت کی سو یہ بھی محض اعتباری ہے اور تھوڑے سے انتظام سے انسان اسے دور کر سکتا ہے۔

اگرچہ بدو اور مطوف و تجار ہندوستان کی زبانیں سمجھتے ہیں، مگر تھوڑی بہت عربی جاننے والے کے لئے بہت کچھ سہولت حاصل ہوگی۔

سب سے پہلے حج کے سفر میں جس چیز سے سابقہ پڑتا ہے وہ جہاز ہے۔

راستہ کی تمام شکایتوں میں جہاز کا معاملہ قابل بحث اور اصلاح طلب ہے حجاز میں پختہ سڑک نہیں جس کی وجہ سے بخوبی موٹر فٹن وو کٹوریہ و تانگہ نہیں چل سکتے، مگر یہ شکایت وہاں آج پیدا نہیں ہوئی ترکوں کی خلافت میں بھی یہی حالت تھی، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ آج سے بہت ابتر حالت تھی تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر یہ شکایتیں ابھی آہستہ آہستہ اصلاح پذیر ہوں گی، فوری اصلاح کی ضرورت یہاں ہے جو کافی رقم لینے کے باوجود مسافروں کو پریشان کرتے ہیں، جو منظم سلطنت کہلاتی ہے جس کے انتظام کا چرچا ہے، مگر حالت یہ ہے کہ ریل کے معمولی سفر میں ہمیشہ تیسرے درجہ سے مسافر وہ پریشانیاں اور تکالیف اٹھاتے ہیں جن کی انتہا نہیں، ہر جگہ جانوروں سے بدتر حالت میں دیکھے جاتے ہیں۔ کیا اسٹیشن پر، اور کیا ریل میں۔

جہاز کے متعلق جو پریشانیاں ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔ ٹکٹ حاصل کرنا، اس کے واسطے کوئی نظام نہیں۔ نہ قیمت ہی مقرر کی گئی ہے۔ دلال ہر طرف پریشان کرتے ہیں اور حجاج کے جیبوں کی تلاشی لیتے رہتے ہیں۔ بمبئی۔ کراچی۔ جدہ ہر ایک جگہ یہ بدانتظامی جاری اور پریشان کن حالت میں قائم ہے۔ اگر ایک قاعدہ مقرر ہو جائے جہاز کے لئے خاص وقت مقرر ہو، پاسپورٹ اور ٹکٹ معقول طریقے سے حاصل ہوں جس میں کسی دلال اور واسطہ کی ضرورت نہ ہو تو بہت کچھ پریشانی رفع ہو سکتی ہے۔ اگر تیسرے درجہ کا ٹکٹ ہی تو ریل کی طرح یہاں بھی پریشانی اور بےچینی سے سابقہ پڑے گا۔ ایک غلط طریقہ یہ ہے کہ جہاز پر سامان لدوانے کے لئے ایک دن پہلے سے مقرر کیا گیا ہے جس کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ نیز جہاز میں جگہ کی تعین نہیں کی گئی، اس لئے ہمیشہ جنگ وجدل کا سلسلہ رہتا ہے۔ اگر فی مسافر ایک پلنگ مقرر کیا جاتا تو یہ تمام جدال رفع ہو جاتا۔

حج کے واسطے گورنمنٹ کیطرف سے محافظ حجاج بھی مقرر ہیں۔ مگر وہ حضرات بہت آسودہ حال ہیں اس لئے غرباء کی تکلیف انکو معلوم ہی نہیں ہوتی۔ نہ انہیں کبھی تیسرے درجہ میں سفر کا موقع ملا جس سے وہ اندازہ کر سکیں کہ یہاں کیا دشواریاں ہوتی ہیں، وہ تو بمشکل تیسرے درجہ کے مسافروں سے بات کرنا اور مصافحہ کرنا بھی پسند کرینگے۔

حج کے واسطے جو جہاز مقرر کئے گئے ہیں ان میں مسافروں کی آسائش کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ نہ روشنی کافی ہے، نہ ہوا کا راستہ۔ صفائی کے لئے صرف اوپر کا حصہ مخصوص ہے، باقی کسی جگہ مسافروں کے قیام تک کوئی صفائی نہیں ہوتی۔ مسافروں کو بے تعداد ڈک میں اس طرح بھر دیا جاتا ہے کہ شاید جانور بھی اس طرح نہ بھرے جائیں۔ تمام ڈک میں کسی قسم کی پنکھوں کا انتظام نہیں صرف اوپر سے چند مقام پر کچھ ہوا کے نل لگے ہوئے ہیں، مگر ان سے ہوا آنا کارے دارد۔

دنیا کے کسی خطہ میں ایسے جہاز نہیں جاتے ہوں گے، نہ ایسی بیقاعدگی سے مسافروں کو بھرتے ہوں گے جیسے حاجیوں کے جہاز ہیں، نہ انکے کرایہ کا کوئی صحیح معیار مقرر ہوتا ہے، نہ وقت روانگی کی تعین، اور مسافروں کی تعداد تو انکی مرضی پر موقوف ہی. برائے نام کہا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کیطرف سے مسافروں کی تعداد مقرر ہے، اگر کسی خاص جہاز کے جیسا کہ پہلے اسکے قواعد بھی سرکاری طور پر شائع ہوئے تھے مسافروں کی تعداد مقرر ہے تو اُسکا امتحان ہونا چاہئے۔ ان جہازوں میں مسافروں کے واسطے چولھے رکھنے کے لئے چھت پر ایسی جگہ مقرر کی گئی ہے جو ہر طرح مضر ہے قاعدہ کے مطابق ضروری سامان جہاز میں نہایت عمدہ حالت میں ہونا چاہئے مگر چولھوں کا انتظام نہیں ہے، صرف بڑے سے بڑے جہاز میں چار یا پانچ چولھے یا باورچیخانے ہوں گے جنمیں ۱۶ سو اور دو ہزار مسافر ہرگز اپنا کھانا نہیں پکا سکتے، پائخانے، غسل خانے کی کمی بھی نہایت پریشان کن ہے صفائی کا مطلق انتظام نہیں، اتنی بڑی جماعت کے لئے اگر پانچ دس غسلخانے ہوئے تو وہ کیونکر راحت دہ ہو سکتے ہیں، انکی صفائی ہر دو یا تین گھنٹہ میں ہونی چاہئے، پانی ہر وقت کھلا رہنا چاہئے۔ مگر ہم نے جاتے آتے بسا اوقات نل بند دیکھے۔

جہاز میں میٹھے پانی کا انتظام بھی غلط طریقے پر ہوتا ہے۔ ہر مسافر اپنا پیپہ یا مشک لیکر ایک جگہ سے پانی لاتا ہے۔ اتنے بڑے مجمع کے لئے ایک جگہ سے پانی لانا اور وقت معین میں کسقدر بار عظیم ہے؟ اگر دیر ہو گئی پانی بند ہو گیا، پھر اس سفر میں ہر قسم کے لوگ جاتے ہیں جبکہ اُن سے پانی، ایندھن کی رقم لیجاتی ہے اور مزدور جہاز میں ہوتے ہیں یہ انتظام کیوں نہیں کیا جاتا کہ ہر حاجی کو میٹھا پانی با افراط ملے، اور کھاری پانی کا متعدد جگہ اس طرح سے انتظام ہو کہ کسی وقت، وقت محسوس نہ ہو، ہر جگہ نل ہوں اور کھلے رہیں۔

یہ امر بھی مسافروں کی پریشانی میں اضافہ کن ہے کہ جہاز اور دیگر مقامات میں عام طور پر

مسافر بھی تنگ مزاجی، جنگ وجدل سے کام لیتے ہیں، اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں، میں نے اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ اپنے ساتھیوں سے معمولی باتوں پر لڑ بیٹھتے تھے، ذرا کوئی ان کی جگہ پر آیا اُسے پھاڑ کھانے کو موجود، کسی نے پانی مانگا اگرچہ انکے پاس بافراط ہو انکار کر دیا۔ بلکہ کچھ صلواتیں سُنا دیں حج جیسے مبارک سفر میں اور ہر ایک سفر میں ایسے اخلاق نہایت نازیبا اور شرعاً گناہ ہیں، اخلاق ولطف ومدارات سے پیش آنا نیک سلوک کرنا نہایت اہم اور ضروری ہے اور اسی عزم کے ساتھ گھر سے نکلنا چاہئے کہ حتی الامکان خیر واحسان کروں گا، اور شر سے بچونگا اور لوگوں کو اپنے شر سے بچاؤں گا۔

حجاج کی سب سے بڑی غلطی جو جہاز اور حجاز کے دیگر مواقع پر تکلیف دہ ہوتی ہے، کثرت سامان اور جا و بیجا چیزوں کو ساتھ لینا ہے۔ اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ چاول، آٹا، دال گھی وغیرہ اجناس کا کافی ذخیرہ ساتھ لیجاتے ہیں، اسکی وجہ سے بار برداری اور حفاظت کی پریشانی ہر وقت انکے واسطے ایک مصیبت کی طرح ساتھ ہو جاتی ہے، پھر اس محنت سے نفع معدوم بلکہ مضرت ونقصان لازم ہوتا ہے، غالباً اجناس پر اس قدر محصول ومصارف کا بار پڑتا ہے کہ اصل قیمت سے دوچند سہ چند ہو گا۔

بہتر یہی ہے کہ ہر شخص بارہ پندرہ روز کا سامان بمبئی یا کراچی سے ساتھ لیلے، باقی تمام چیزیں جدہ یا مکہ مکرمہ سے حاصل کر سکتا ہے بعض ضروری سامان جیسے ہر حاجی کو ساتھ لینا چاہئے کچھ جوڑے کپڑوں کے۔ احرام کی چادریں یا تولئے۔ بعض معمولی دوائیں مثلاً بخار، دردسر، متلی وغیرہ کی سکنجبین، املی یا املی کا مربہ، چٹنی، لیموں۔

جہاز میں ہر قسم کا کھانا، چائے، سوڈا وغیرہ ملتا ہے۔ اگر حاجی اپنا انتظام خود کر سکتا ہے کر لے ورنہ جہاز کے ہوٹل سے معقول انتظام ہو سکتا ہے۔

بعض آدمیوں کو جہاز میں کسی قسم کی شکایت نہیں ہوتی بعض کو متلی، قے اور معمولی بخار کی شکایت چند روز رہتی ہے، کبھی طغیانی کے زمانہ میں یہ شکایت زیادہ ہوجاتی ہے مگر عموماً یہ شکایتیں دو تین روز میں خود بخود زائل ہوجاتی ہیں، ان سے کسی قسم کا خدشہ نہ کرنا چاہئے۔ ایسے وقت لیموں، نارنگی کھانا، سکنجبین اور رائی کا پینا پلانا مفید ثابت ہوا ہے، زیادہ تشویش ہو تو شفاخانہ کیطرف رجوع کیا جاوے، جو ہر جہاز میں ہوتا ہے۔

شفاخانہ کے متعلق بھی یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یونانی اور ڈاکٹری دونوں قسم کے ہونے چاہئیں، کیونکہ اکثر حجاج ایسے ہیں جو یونانی طبابت کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور چونکہ یہ سلسلہ حجاج کی آسایش و منفعت کے لئے مقرر کیا گیا ہے اسمیں ایسے مخلص مسلمان، نیک مزاج، ڈاکٹر ملازم رکھے جاویں جنکو خود بھی حجاج کے آسایش کی فکر ہو اور وہ اس خدمت کو اچھی طرح انجام دیں۔ اکثر عیسائی وغیرہ ڈاکٹر دیکھے گئے ہیں جو اُس درد سے کام نہیں کرتے۔ نیز حج کے لئے جانے والوں میں بڑی جماعت عوام کی ہے جو ایسے ڈاکٹروں سے غیر مانوس ہوتے ہیں، اور اسلئے قسم قسم کے اوہام کرتے ہیں، شفاخانہ کے متعلق جہاز میں ہر جگہ اعلان چسپاں کئے جاویں تاکہ ہر حاجی کو اطلاع ہوجائے۔

کامران۔ بمبئی سے روانگی کے بعد مسافر کو جہاز میں گو نہ اطمینان ہوجاتا ہے مگر کامران کا بے معنی اور لغو قرنطینہ اس اطمینان میں خلل انداز ہوتا ہے جو غالباً دسویں روز آتا ہے، کراچی کے مسافر آٹھویں نویں روز یہاں پہنچتے ہیں، پہلے کبھی طاعون کی وجہ سے اسے جاری کیا گیا تھا، اب بلاوجہ حاجیوں سے رقم وصول کیجاتی ہے جس کے ساتھ پریشانی کا ایک اضافہ ہے، جگہ پر فضا صحت بخش ہے مگر بلا ضرورت اترنا چڑھنا اور برائے نام غسل کرکے تاروں کے جنگلے میں ۲۴ گھنٹہ مقید ہونا بالکل فضول معلوم ہوتا ہے۔ ہم لوگ جمعرات کی شب چلکر اتوار کو یہاں پہنچے، ہمارے

ساتھ جمعیت خلافت، اور جمعیتہ علمار کا وفد بھی تھا، بعض نیکدل حضرات نے اس موقع پر پردیسی حجاج (عرب افغانی، بخاری وغیرہ) کو دعوت دینے کی فکر کی، اور اس کے واسطے چندہ کرکے بلا کسی قسم کے انتظام کے شام کی دعوت مقرر کردی، اکثر لوگ اس سے پریشان ہوئے، انتظار ہی انتظار میں بارہ بجگئے، بچارے سوگئے، صبح دعوت کرنیوالوں کی شکایت کرتے تھے۔ کھانا بھی بہت سا بچ گیا، کچھ لوگوں کو بلا بلا کر کھلایا گیا۔ برف وغیرہ اس دعوت کی وجہ سے عام طور پر نہ مل سکا۔

صبح سویرے قطار قطار کا شور مچا۔ آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر برائے نام معائنہ کرتا ہے ٹکٹ بھی یہاں وصول کئے جاتے ہیں، مگر ڈاکٹر کے آنے سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے لوگوں کو پریشان کیا گیا اور صف بندی کے بہانے سے کھڑا کر دیا گیا۔ اکثر لوگ پریشان کھڑے تھے، میں اور میرے ساتھی بیٹھے رہے، ڈاکٹر آگیا تو میں بیٹھا رہا، اس پر وہ بولا تم صف میں کیوں کھڑے نہیں ہوئے؟ میں نے کہا کہ ہم اس طرح پریشان ہونیکے واسطے نہیں آئے ہیں، نہ بیکار کھڑے رہنے کیلئے۔ اگر لوگوں کا معائنہ کرنا ہے تو ڈاکٹر کے پہنچنے کے بعد صف بندی کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اس پر وہ بولا اگر کھڑے نہ ہوگے تو یہاں سے جانیکی اجازت نہ ملیگی، میں نے کہا اگر اسی پر فیصلہ ہے تو مجھے یہاں رہنا منظور ہے، پھر وہ دوسری طرف سے واپس آیا اور کہنے لگا اب کھڑے ہو جاؤ۔ میں نے کہا مجھے صرف اس طرز عمل سے شکایت ہے باقی کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں، میرے احباب و دیگر اشخاص نے مجھے اصرار سے کھڑا کر دیا۔ اور ڈاکٹر چلا گیا۔

کامراں میں اترتے وقت نہایت مختصر بستر اور سامان خور و نوش ساتھ لینا چاہیئے غسل کے وقت اپنے اور اپنے ساتھیوں کے کپڑے مضبوط باہم باندھکر بھپارہ میں دینے چاہئیں، ورنہ تلاش کے وقت بڑی دقت ہوگی۔ رقم یا کوئی ایسی چیز ہو جس کی حفاظت درکار ہو اُسے اپنے ساتھ رکھے یا جہاز پر کسی محفوظ صورت میں چھوڑدے، غسل کے وقت اُسے غسلخانہ کے کسی طاق یا محفوظ مقام پر

رکھدے۔ اتفاقاً کوئی چیز ضائع ہو تو دوسری بات ہے، نیز رقم وغیرہ کا ضائع ہونا ممکن ہے کیڑے عموناً ملجاتے ہیں، میرا تولیہ یہاں رہگیا تھا، مغرب سے قبل تلاش کے لئے آیا تو دروازہ کے پاس ایک انبار ملا جمیں حاجیوں کے بھولے ہوئے کپڑے اور دیگر اشیا تھیں، میں نے اسمیں سے اپنا تولیہ بھی تلاش کر کے حاصل کیا۔

عصر تک ہم لوگ کامراں میں اُتر چکے تھے، پیر کے روز دس بجے کے قریب سوار ہونے کا حکم ملا، اڑہائی بجے کے قریب جہاز نے لنگر اُٹھایا، اور ہم سب احرام کے لئے تیاری کرنے لگے کیونکہ ۳ اور ۴ کے درمیان یمنی میقات "یلملم"، کے محاذی ہمارا جہاز ہونے والا تھا، میں نے یمن کے بعض عربوں سے دریافت کیا کہ وہ یہاں سے دکھائی دیتا ہے، اکثر نے کہا نہیں بعض نے کہا کچھ آثار دکھائی دیتے ہیں۔ بہرحال ہم نے غسل کر کے احرام کا لباس پہنا، عطر وغیرہ بدن پر ملا اور نماز عصر پڑھکر لبیک اللّٰہم لبیک، لبیک عمرۃً کہی دوسرے روز ہم گیارہ بجے جدہ پہنچ گئے۔ احرام کے وقت سے جو سرور و لطف اور جو لبیک کے نعرے ہر طرف سے آتے تھے اُس کی عجیب و غریب کیفیت سے ہر شخص بیحد متاثر نظر آتا تھا۔

جدہ کے قریب کچھ فاصلہ پر جہاز ٹھہرا، ایک عرب ناخدا آیا اور اُسکے اشارہ پر جہاز چلنے لگا یہ ایک قدیم رسم ہے جو ابتک جاری ہے۔

مجھے خوف تھا کہ اسقدر سامان اور اتنی کثیر تعداد مسافروں کی ساحل کے دو تین میل فاصلہ سے نہ معلوم کتنی مدت میں اُتریگی، لیکن اپنے ساتھیوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بہت جلد سب سامان و مسافر ساحل پر پہنچ جاویں گے چنانچہ جب ہمیں اُترنیکی اجازت ملی اُس کے بعد تین گھنٹہ کے اندر ہی سولہ سترہ سو مسافر مع سامان کے ساحل پر اُتر چکے تھے، شراعی کشتیاں پچاس ساٹھ اسی کام کے واسطے تیار تھیں اور آناً فاناً انہوں نے سب مسافروں کو مع سامان

اُتار دیا کشتیوں پر ٹیکس ۱۰ ار مقرر تھا جو ساحل پر سرکاری آدمی لیتے تھے، ملاح کو کسی قسم کی رقم لینے کا حق نہ تھا۔ یہاں سلطنت نجد و حجاز کا علم اسلامی بھی دیکھا جس پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا تھا۔

ہم کشتی سے اترے ہی تھے کہ ایک شیخ نے دریافت کیا۔ تم نے ملاح کو کچھ اجرت تو نہیں دی ملاح ہم سے پہلے ہی کہ چکا تھا کہ میں اجرت نہیں لے سکتا، کچھ بطور انعام دو تو دے سکتے ہو ہم نے بطور انعام کچھ دیدیا تھا۔

جدہ میں چنگی کا سلسلہ بھی ہے، مگر بمبئی و کراچی سے سخت نہیں، معلوم نہیں کس قسم کے سامان پر چنگی لیجاتی تھی، حجاج کے سامان پر چنگی نہ تھی، آٹا چاول اور دیگر اجناس کے بورے لوگ لیجا رہے تھے اور کسی قسم کی چنگی اُن پر نہ تھی ممکن ہے بعض تجار حاجیوں کے نام سے یا اُنکے ذریعہ سامان منگواتے ہوں، یا تمبا کو وغیرہ پر کوئی مخصوص ٹکس ہو۔

مطوف ۔ یہاں سے مطوف کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، اسمیں شبہ نہیں کہ مطوفی کے سلسلہ کی بہت اصلاح درکار ہے، مگر فی الحقیقت حاجی کو اس کے بعد چارہ بھی نہیں، عموماً مطوف علاوہ انعام دس روپیہ لیتا ہے، وہ حاجی کا خادم، اُسکا معلم اور سفر و اقامت میں ہر کام کا منتظم ہوتا ہے، بلکہ حاجی کی جان و مال کا وہی ذمہ دار اور محافظ خیال کیا جاتا ہے، جو شخص پہلے حج کر چکا ہو اگر وہ مطوف نہ کرے تو کوئی حرج نہیں، لیکن جو راحت چاہتا ہو یا پہلے پہل وہاں گیا ہو اُسے ضرور مطوف کی خدمت حاصل کرنی چاہیئے۔

میں نے مطوفوں کی بہت برائیاں سُنی تھیں، نیز انکے اعمال خلاف سنت کے متعلق بہت کچھ معلوم کر چکا تھا، میرے ساتھ جو عرب جہاز سے رفیق و صدیق بنگئے تھے انمیں بعض دو دفعہ بعض ایک دفعہ حج کر چکے تھے، اس لئے ہم سب کی یہ صلاح ہوئی کہ ہمیں مطوف کی ضرورت نہیں، میں اپ

سے پہلے باہر آیا مجھے مطوف کی بابت سوال کیا گیا، میں نے کہا مجھے اس کی حاجت نہیں، چنانچہ بغیر کسی مطوف کے چلا آیا، مگر بعض رفقاء نے صالح الجبالی نقیب المطوفین کا نام لیلیا پھر سب اسی سلسلہ میں شامل ہو گئے۔ اسکی وجہ سے (یا) وہاں ہمیں ہر قسم کی سہولت پہنچی۔ اور مکہ مکرمہ میں ہر قسم کی خدمت اُس کے سپرد کی گئی حتی الامکان اُس نے بخوبی انجام دی۔

رفقاء کا ذکر آگیا اس لئے چند جملے انکے متعلق بھی لکھنا ضروری سمجھتا ہوں، سفر اور بالخصوص جہاز کے سفر میں رفقاء کی از بس ضرورت ہے، اگر نیک مخلص رفیق کسی کو مل جائیں تو اُسے چاہئے کہ اُنکی بہت قدر کرے اور جان سے زیادہ عزیز رکھے۔ بمبئی سے یہ اکر جہاز میں سوار ہوا تو یہ چاہا کہ رفیق ملیں، اور کھانے کا انتظام بھی کسی معقول صورت میں ہو جائے۔ مگر جہاز پر سوار ہو جانے سے پہلے کچھ نہ ہو سکا، سوار ہو جانیکے بعد بھی کوئی ایسی صورت نہ نکلی کہ میں کسی کے ساتھ اپنا انتظام کر لیتا۔ اس لئے ہوٹل سے انتظام کیا، جو دو وقتہ ناشتہ اور کھانا ۳؍ یومیہ پر دیتا تھا، نماز کے لئے ہم لوگ جہاز کے اگلے حصہ پر جاتے تھے اور ہر ملک کے آدمی وہاں جماعت میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک روز عربوں نے مغرب کی نماز پڑھائی اور مغرب کے بعد ہی عشا کی نماز بھی پڑھی اس پر بعض آدمی اعتراض کرنے لگے میں نے سمجھایا کہ یہ جمع بین الصلوتین ہے جو مسنون ہے۔ ان عربوں سے بھی میری گفتگو اسی وقت ہوئی، صبح کے وقت زیادہ گفتگو ہوئی، اور وہ مجھے اپنے مقام پر لیگئے چائے، قہوہ اور بخور سے میری خاطر کی، انہوں نے بعض اشعار پڑھکر سنائے اور مشکل مقامات حل کئے جو اُسی وقت اپنے نوٹ بک میں لکھ لئے، پھر نوٹ بک سے بعض نحوی مسائل پڑھکر سنائے، جس پر میں نے کچھ اضافہ کیا، اسی سلسلہ میں انہوں نے بعض مسائل پر گفتگو کی، اور حدیث میں درس لینا شروع کیا۔ اُس وقت انکے پاس بلوغ المرام تھی وہی سنائی۔ دوسرے روز انہوں نے مجھے مدعو کیا، پھر مجھسے دریافت کیا کہ کھانا کہاں کھاتے ہو؟ میں نے اطمینان ظاہر کیا اور کہا کہ

ہوٹل سے نہایت عمدہ کھانا ملتا ہے، مگر وہ لوگ راضی نہ ہوئے اور مجھے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کیا، چنانچہ کبھی وقت انکا آدمی آتا اور بلالیجاتا، میں نے بھی انکے حسن اخلاق اور علمی شغف کے اعتبار سے انکی رفاقت قبول کی۔ انکی وجہ سے پھر سفر سفر ہی نہ معلوم ہوا، اور واپسی میں کراچی تک وہ میرے ساتھ رہے، یہ لوگ شارقہ کے باشندے ہیں، موتی کی تجارت کرتے ہیں، علم کے بیحد شوقین، مگر افسوس کہ علمی مدارس کے فقدان۔ اور فراغ بال نہ ہونیکی وجہ سے محروم ہیں، آپس کے نزاع و عداوت کا سلسلہ الگ پریشان کن ہے، اجنبی مکر و دسائس کا جال الگ بچھا ہوا ہے نسأل اللہ العافیہ۔

جدہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسلامی ساحل ہے بعض روایات میں وارد ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اہل مکہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ موجودہ ساحل (شعیبہ) یا اور کوئی ہم سے بہت فاصلہ پر ہے، اس لئے کسی قریب جگہ پر ساحل تجویز فرمائیے، چنانچہ وہ کسی حج کے موقع پر آئے تو دریافت کیا کہ تم لوگ کہاں ساحل تجویز کرتے ہو، انہوں نے جدہ کے مقام کو پسند کیا یہاں حضرت عثمان نے غسل کیا، اور فرمایا یہ جگہ عمدہ معلوم ہوتی ہے، آج سے اسے ساحل بناؤ عام طور پر جو مشہور ہے کہ اس مقام کو جدہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں حضرت حواؑ کی قبر ہے یہ محض قصہ ہے، ایک طویل عریض قبر بھی بنی ہوئی تھی جسکی لوگ خوش اعتقادی سے زیارت کرتے اور مطوف نذریں چڑھوایا کرتے تھے، اب یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

یہاں سے ترکی عمارت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے، مکانات سہ منزلہ چہار منزلہ ہیں، سڑکیں تنگ و تاریک بعض سڑکوں پر سائبان بھی ہے جو غالباً دوپہر کی دھوپ کے بچاؤ کے لئے ڈالا گیا ہوگا۔ باوجود تنگ و تاریک سڑک اور گلیوں کے یہاں ساحل دریا ہونیکی وجہ سے ہوا کے جھونکے خوب آتے ہیں، جاتے وقت کچھ خنکی معلوم ہوئی تھی، آتے وقت جبکہ مکہ مکرمہ میں گرمی نے بیچین کر دیا تھا یہاں

کسی قسم کی گرمی نہ تھی۔

جس روز ہم اترے شب کو آل فضل کے یہاں گئے، شیخ عبد العزیز عتیقی وغیرہ سے ملاقات ہوئی، بصبح شیخ محمد نصیف صاحب سے ملاقات کے لئے گئے، یہ صاحب ذی علم، علم دوست اور شریف النفس آدمی ہیں، انکے یہاں مطبوعہ و مخطوطہ کتابوں کا عمدہ ذخیرہ ہے، ابھی ابھی کتاب علل ابن ابی حاتم کا نسخہ انہوں نے مصر سے شائع کیا تھا جسکا ایک نسخہ مجھے بھی عنایت کیا، انکے یہاں علمار مصر کی بھی اسیوقت ایک جماعت آئی تھی جن سے ملاقات کی چونکہ وقت زیادہ گذر گیا تھا۔ اسلئے ہم جلد واپس ہوکر موٹروں کے مقام پر گئے جہاں سے ایک موٹر اپنی جائے اقامت پر لائے، اور ساڑھے نو بجے کے قریب جدہ سے روانہ ہوکر ۱۰ بجے بحرہ پہونچے، اسے بحرۃ الدنفار بھی کہتے ہیں، مکہ وجدہ کے وسط میں واقع ہے، اور یہاں تمام قافلے نزول کرتے ہیں، اس جگہ پانی کے کنوے، اور ہر قسم کی اشیار کے لئے دکانیں، قہوہ خانے بکثرت ہیں، ابن ہشام وغیرہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ ٹھہرے تھے، اور اس نسبت سے ہم نے ایک مسجد خام بھی دیکھی جس کی چھت گر گئی تھی، لوگ کہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں نماز پڑھی تھی، علماء سیر کی ایک جماعت اس سے انکار کرتی ہے انکا قول ہے کہ آپ اس راستہ سے کسی غزوہ میں نہیں آئے۔ واللہ اعلم۔

ہم نے یہاں قیلولہ کیا غسل کیا، کھانا کھایا، اور ۳ بجے کے بعد چائے پی کر یہاں سے روانہ ہوئے موٹر نیا تھا، مگر راستہ درست نہونیکی وجہ سے کبھی کبھی ریت میں دھس جاتا تھا بعض وقت ہم سب کو اتر کر آگے دھکیلنا پڑتا تھا، اکثر اوقات دوسرے موٹروں کی مدد کے واسطے ہم لوگ ٹھہر جاتے تھے اس لئے کچھ دیر زیادہ ہوگئی، راستہ میں حدہ یا ہدہ کے پاس ایک شیریں کنواں ملا جس سے ہم نے اپنے شکیزے بھر لئے، پھر شمیسیہ کی چوکی آئی جہاں سے حدیبیہ قریب ہے، یہ وہی مقام ہے جہاں کفار قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنہ ۶ھ میں روک دیا تھا، اس جگہ آپنے وہ صلح نامہ لکھوایا جو

حق و باطل کی تمیز اور صراط مستقیم پر چلنے والوں کا امتحان تھا، یہاں بیعت رضوان لیگئی، حدہ میں کھجور کا جھنڈ دیکھا جس کے متعلق ہمارے موٹر میں ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اُسکا یہ مقولہ ہے کہ یہ کھجوریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لگائی تھیں، مگر میری یاد میں یہ بات نہ تھی کہ آپنے کوئی درخت یہاں لگایا ہو، اسلئے میں نے انکار کیا۔

راستہ میں اعلام حرم آتے ہیں چھوٹے لاٹ کی طرح سفید ستون ہیں، یہاں سے حرم شروع ہوتا ہے جہیں شکار کرنا، جنگ وجدل کرنا، جانوروں کو اپنی جگہ سے بھگانا، درختوں کو کاٹنا ممنوع ہے۔

مکہ مکرمہ پہنچنے سے قبل ایک چوکی پر جہاں کنواں تھا ہم نے غسل کیا، یہ غسل مسنون ہے، بزدی طوی کی بہت جستجو کی، مگر اُس وقت کسی کو معلوم نہ تھا، غروب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل ہم مکہ مکرمہ پہونچے، سامان مطوف کے یہاں چھوڑ کر سیدھے بیت اللہ الحرام پہنچے، دیکھتے ہی تمام سفر کے مصائب ومتاعب بھول گئے۔ اور حجر اسود کا استلام کر کے طواف شروع کیا، فراغت کے بعد نماز کا وقت قریب تھا اس لئے نماز مغرب کے بعد باب صفا سے نکلکر سعی بین الصفا والمروہ کی عمرہ ختم ہوگیا، اور ہم نے سر منڈوا کر احرام کھولدیا، مطوف کہیں طواف کی نیتیں، سعی کی نیتیں اور عمرہ کھولنکی نیتیں پڑھواتا ہے، نیز بہت سی غیر ضروری دعائیں بھی پڑھواتا ہے، جنکے متعلق میں نے منع کردیا اور ہم نے مطابق سنت یہ عمل ادا کیا، والحمد للہ رب العلمین۔

ہندو فلسفہ پر ایک نظر

رام چندرن صاحب، ڈاکٹر ٹیگور کے مشہور دارالعلوم شانتی نکیتن کے ایک لائق فارغ التحصیل طالب علم ہیں، ایک سال تک آپ سابرمتی آشرم میں بھی رہ چکے ہیں اور آج کل آپ اسلامی فلسفہ کا مطالعہ کرنے کی غرض سے ہماری جامعہ میں مقیم ہیں، ہندو فلسفہ آپ کا خاص موضوع ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین رسالہ کی خدمت میں ہندو فلسفہ پر چند ایک مضامین ترجمہ کر کے پیش کریں۔ چنانچہ ذیل کا مضمون اس کی پہلی قسط ہے۔ امید ہے کہ اسی طرح آئندہ بھی مختلف مباحث پر ہم مضامین پیش کر سکیں گے۔

(سعید)

جب کبھی کوئی مضمون کسی ایسی جماعت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جو اس سے ایک حد تک ناواقف ہو لیکن ساتھ ہی اسکے وہ ذہین اور سمجھدار ہو تو اُس وقت وہ ہر چیز کو ناقدانہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کریگی، اس لئے کہ ہر ہر قدم پر اس کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا ہوں گے، ہر ہر قدم پر اسے خامیاں اور کمزوریاں نظر آئیں گی جہاں ایک آشنائے فن کے لئے کوئی دشواری نہیں ہوتی اور یہ سب باتیں ہندو فلسفہ میں اور بھی زیادہ پیش آئیں گی۔

ہندو فلسفہ کے اکثر مسائل ایسے ہیں جو تقسیم و تحلیل کی کوششوں سے آزاد ہیں۔ اس میں کوئی ایسا خاص مسئلہ یا نظام نہیں ہے جسے ہم کہہ سکیں کہ یہ تمامتر مابعد الطبعیات سے تعلق رکھتا ہے یا اخلاقیات و نفسیات سے۔ اکثر مستشرقین یورپ اور انہی کی دیکھا دیکھی ہمارے بعض ہندوستانی علماء بھی یہ کہتے ہیں کہ بدھ مت کا فلسفہ تمامتر اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ بدھ مت اور فلسفۂ بدھ میں بہت بڑا فرق ہے۔ اسی طرح شنکراچاریہ کو بہت بڑا فلسفی اور منطقی کہا جاتا ہے، اس لئے

کہ اس نے اپنے ادویت کے فلسفہ کو منطقی حیثیت سے اس آخری حد تک پہنچا دیا ہے جہاں تک کسی اور شخص نے خواہ وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں کبھی نہیں پہنچایا تھا۔ یہ اگر ایک طرف شنکراچاریہ کی تعریف ہے تو دوسری طرف اسکی سب سے بڑی توہین بھی ہے اور پھر بھلا ہمارے مسائل فلسفہ کی کوئی اس طرح تقسیم و تحلیل کیوں نہ کرے۔ اس لئے کہ ہمارے ہندوستانی متفکرین جب کبھی کسی مسئلہ کے متعلق غور وفکر کرتے تھے تو وہ کبھی اسکی تحلیل و تقسیم میں خود کو بھول نہیں جایا کرتے تھے۔ جب کبھی وہ بحر تفکر میں غوطہ زن ہوتے تو وہ اسمیں کبھی غرق نہیں ہو جاتے تھے۔ جب وہ تقسیم و تحلیل کرتے ہوئے جزو لایتجزیٰ کی حد کو پہنچتے جو ان کی اصطلاح میں ابتدا و انتہا اور مکان و زمان کی قید سے پاک ہوتا تو وہ اسی کے ساتھ اس وسیع اور ہمہ گیر عالم کیطرف بھی پلٹ کر آتے تھے جسے وہ 'پرم آتمن' سمجھتے تھے۔ یورپ میں بعض ایسے ہی دماغ کے لوگ گزرے ہیں مثلاً ارسطو، کانٹ اور ان سے بھی بڑھکر ہیگل۔ لیکن انکے دماغ کا میلان اس طرح کا نہیں رہا ہے۔ انہیں سے بیشتر اسی تقسیم و تحلیل میں پڑکر راہ سے بے راہ ہو گئے ہیں تو وہ مسائل کی تقسیم در تقسیم کرتے چلے گئے ہیں اور اخیر میں 'پرم آتمن' کی اس وسیع حقیقت کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے لیکن ہندوستانی ارباب فکر اس گورکھ دھندے سے ہمیشہ محفوظ رہتے تھے۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندی فلسفہ میں جو کچھ بھی اختراعات و ایجادات ہوئی ہیں وہ سب جسم و دماغ کے باہمی نظم و تربیت کا نتیجہ ہیں۔ اگر دماغ اس حرم کی شمع ہے تو جسم بھی وہ حرم ہے کہ صرف جسمیں یہ شمع روشن رہ سکتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ویدوں ہی کے زمانہ میں یہ آواز بلند ہونے لگی تھی کہ 'پُرش' 'پراکرت' کے اندر جلوہ نما ہوتا ہے، یعنی خدا کا جلوہ قدرت میں ظاہر ہے اور جسم جو ہے وہ خدا کا جلوہ گاہ ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ اُس وقت یہ بھی خیال تھا کہ اگر یہ حرم ناصاف اور ناپاک ہو تو اس شمع کی روشنی بہت دھندلی ہوتی ہے، لہٰذا حقائق کے سننے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ایک ایسا جسم بھی ہو جس کی اصلاح و تربیت بہتر طریقہ سے کی گئی ہو۔ یہ نظم و تربیت اسقدر اہم اور ضروری ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو نظام عالم

کہ تمام شیرازہ بکھر جائے۔ اس سے مراد وہ فوجی نظم و تربیت نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم یکجہتی و یکسانی ہے۔ گو بعض اوقات اسکا بہت غلط مطلب سمجھا گیا ہے اور قرون وسطیٰ میں تو اس نظم و تربیت کی ہیئت سب سے زیادہ مسخ کر دی گئی تھی۔ یہ اسوقت ایک بالکل جسد بے روح ہو گئی تھی جس سے زیادہ شرمناک اور بدنما کوئی شئے نظر نہ آتی تھی۔ صحیح نظم و تربیت سے زندگی پیدا ہوتی ہے لیکن قرون وسطےٰ کی نظم و تربیت سے حیات انسانی میں ایک قسم کی مردنی اور جمود پیدا ہو گیا تھا۔ اس کہنے سے مراد ان تمام رسوم و عادات سے ہے جو جسم انسانی کو طرح طرح کی تکلیف و ایذا پہنچانے کے لئے برتی جاتی تھیں۔ جب ان پر بعض غیر ہمدرد معترضین نے اعتراضات کئے تو سوامی ویویکانند نے یہ جواب دیا کہ اگر ہم اپنے جسم کو ایذا پہونچاتے ہیں تو آخر یہ ہمارا ہی جسم ہے، یورپ کی طرح ہندوستان نے تو کبھی احتساب کلیسائی کی آگ اپنے ہاں روشن نہیں کی"! جہاں تک جواب کا تعلق ہے یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے لیکن بحیثیت واقعہ کے یہ اپنی جگہ پر نہایت مذموم اور قبیح افعال میں سے ہے اور کسی طرح محکمہ احتساب کلیسا سے کم نہیں ہے برعکس اس کے اپنشد اور یوگ میں نظم و تربیت کا جو تخیل ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں اس کا مقصود ونگرہ، اور تپسیہ، کرنا ہے۔ زندگی کی قوت ارادی کو پاک و صاف کرنا، تمام حواس انسانی میں یکسوئی اور یکجہتی پیدا کر کے اسمیں مضبوطی و استحکام پیدا کرنا، ایک آزاد اور غیر آلودہ دماغ سے اس کی رہنمائی کرنا اور ایک ایسے جسم کے ساتھ اسے وابستہ کرنا جو تمام عوارض و لواحق سے پاک و صاف ہو۔ اسی کا نام تپسیہ اور نظم و تربیت ہے۔ ہمارے ارباب فکر تمام حواس کو اپنے قابو میں رکھکر اور دماغ کو تمام افکار و وساوس سے پاک و صاف کر کے غور و فکر شروع کرتے تھے۔ وہ جس مسئلہ پر چاہتے تھے، اپنے دماغ کو لگا سکتے تھے اور دماغ بھی نفس کی تمام قیود اور پابندیوں سے آزاد ہو کر ایک تیر کی طرح نشانہ پر جا لگتا تھا۔ یہ ہے وہ اصل نظم و تربیت جو جسم کی ایذا رسانی اور تکلیف دہی سے کہیں زیادہ دشوار اور مشکل ہے۔ "کتھا اپنشد"

میں ایک جگہ اس طریقہ کا ذکر آتا ہے جس سے انسان حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ لکھا ہے کہ "وہ راستہ مثل استرے کی دھار کے تیز ہے جس سے گذرنا سخت دشوار ہے"۔ لیکن یکے بعد دیگرے بہت سے رشی مثلاً ایگنہ والکیہ، گارگی، میتریہ، آترپہ، سانلدیہ، اس راستہ سے گزرتے گئے اور انکے بعد شنکراچاریہ رامانج، کمارل، مادہو، واچسپتی اور دوسرے لوگوں کا گروہ آیا۔ انہوں نے فلسفہ کے بڑے بڑے نظامات تعمیر کئے۔ انہوں نے اس استرے کی دھار جیسے تیز راستہ کو طے کیا، اور زندگی کے بہت سے حقایق و معارف کا پتہ لگایا۔ اسی سلسلہ میں ایک قصہ بھی ہے جسکا ذکر کر دینا ناظرین کے لئے فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہندوستانی فلاسفہ میں واچسپتی مصرا ایک بہت بڑا شخص گذرا ہے جس کی فلسفیانہ تصانیف اپنا نظیر نہیں رکھتیں، جس زمانہ میں وہ ویدانت درشن پر اپنی تفسیر لکھ رہے تھے، اسی زمانہ میں انہوں نے بھامتی نامی ایک دوشیزہ حسین لڑکی سے شادی کرلی جو خود بھی انکی طرح نہایت فاضل عورت تھی۔ لیکن شادی کے بعد بھی واچسپتی کی تمام توجہ اور انکا سارا وقت اسی تصنیف میں صرف ہوتا تھا اور انکی یہ بیوی انکے کام میں ہاتھ بٹاتی تھی، غرض میاں بیوی دونو ملکر اس کام میں برسوں تک لگے رہے۔ واچسپتی فقیروں کی طرح ایک نہایت سیدھی سادی زندگی بسر کرتے گھنٹوں تک ہر روز وہ استغراق کی حالت میں رہتے، اور بھامتی انکے بازو میں بیٹھی رہا کرتی۔ ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ بھامتی اپنے شوہر کے بازو میں بیٹھی بیٹھی سوگئی۔ اسی اثنا میں واچسپتی اپنی تصنیف کی آخری سطر لکھکر بیدار ہوئے لیکن یہ بیداری نیند سے نہ تھی بلکہ برسوں کی محنت شاقہ اور مشقت تامہ سے تھی جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے اپنی عزیز اور رفیق کار بیوی کو تلاش کرنا شروع کیا جو بازو میں پڑی سو رہی تھیں یکایک انکی نظر ان پر پڑی تو دیکھا کہ بھامتی کا شباب گذر چکا ہے اور انکے بال سفید ہو چلے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنے اوپر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ بالکل ضعیفی کا عالم آگیا ہے۔ دیر تک وہ اسی حالت میں محو تھے کہ یکایک بھامتی کی آنکھ

کھل گئی۔ اور اس نے سب سے پہلا سوال جو کیا وہ اس تصنیف کے متعلق تھا۔ اس سے پہلے شوہر نے نہایت حسرت سے کانپتے ہوئے لہجہ میں جواب دیا کہ "بھامتی! تم پر بھی ضعیفی آگئی!" میں بھی بوڑھا ہو گیا لیکن جو کام ہم دونوں نے ملکر کیا ہے اس پر کبھی ضعیفی نہیں آنے کی۔ تمہارا نام کبھی نہیں مٹنے کا اور ہماری اس تصنیف کا نام "بھامتی" ہوگا" چنانچہ آج اسکا وہی نام ہے اور نا ممکن ہے کہ ہندو فلسفہ کا کوئی طالب علم جو ویدانت جاننے کا دعویٰ کرتا ہو اور "بھامتی" سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔

اس مختصر سے قصہ سے آپ کو بہت سی باتیں معلوم ہوں گی۔ سب سے پہلی بات تو آپ کو یہ نظر آئیگی ہمارے ہندو ارباب فکر کے نزدیک فلسفیانہ مسائل پر غور وفکر کرنا محض ایک ذہنی اور دماغی کاوش کی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کے ساتھ وہ حقیقت اور صداقت کی تلاش میں اپنی تمام روح اور اپنے پورے وجود سے کام لیتے تھے۔ پھر ایسی صورت میں یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ اپنشد، گیتا، اور یوگا کے ارباب فکر کو جلوت میں وحدت اور وحدت میں جلوت نظر آتی تھی۔ وہ انو یعنی اس جزو لایتجزیٰ کی تلاش میں "پرم آتمن" یعنی اس عالمگیر وجود میں محو ہو جاتے تھے۔ معاشرتی، اخلاقی، طبیعی، نفسیاتی غرض تمام معاملات میں وہ تقسیم و تحلیل کی آخری حد تک پہونچتے تھے لیکن وہ اس کے پیچھے اس تعلق کو بھول نہ جاتے جو اس مسئلہ کو بقیہ کائنات سے ہوتا تھا یہی انکا سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ تھا اور یہ خصوصیت اپنشد کے زمانہ کے ارباب فکر میں ان سے کہیں زیادہ ہوتی تھی، جو بعد میں آئے لیکن یہ دعویٰ کرنا فضول ہے کہ تمام ہندی ارباب فکر میں یہ بات پائی جاتی تھی۔ اس سے غرض صرف اتنی ہے کہ ان میں یہ میلان ایک بڑی حد تک موجود تھا۔

اس موقع پر نہایت ضروری ہے کہ ہندو فلسفہ کی ایک نہایت اہم اصطلاح سے ناظرین کو واقف کرا دیا جائے، اس لئے کہ ہندو فلسفہ کے سمجھنے کا دارومدار بڑی حد تک اس اصطلاح پر ہے یہ اصطلاح "درشن" کی ہے جو سنسکرت کے ایک لفظ "درش" سے نکلا ہے جس کے لفظی معنی ہیں

دیکھنا۔ وژن، کے لغوی معنی دیکھنے یا منطقیانہ تلاش و تفحص کے ہیں لیکن اپنشدوں کے فلسفہ میں اسکا مفہوم بہت زیادہ گہرا اور وسیع لیا جاتا ہے۔ فلسفہ میں ہمیں ہمیشہ دو چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے، ذہن یعنی سمجھنے کی قوت اور وجدان یعنی بلا واسطہ اخذ کرنیکی طاقت سے، اور بیشتر ان دونوں میں تصادم ہوتا ہے لیکن ہمارے ہندی ارباب فکر کے ہاں ان دونوں کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے مغربی فلاسفہ میں وجدان کی بہترین مثال برگساں کے ہاں ملتی ہے لیکن وہ ہمارے اپنشد کے زمانہ کے ارباب فکر کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ذہن اور وجدان کے فرق کو ایک مثال کے ذریعہ سے اور واضح کر دیا جائے۔ فرض کرو ہمالیہ پہاڑ ہے جسکا فوٹو مختلف فوٹوگرافر لینا چاہتے ہیں، چنانچہ ہر ایک ان میں سے اپنے اپنے نقطہ سے لیگا جو اس عظیم الشان سلسلہ کا صرف ایک رخ ظاہر کریگا لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پورے پہاڑ کا فوٹو ہے۔ اب ایک دوسرے مصور کو لیجئے جو ایک ہوائی جہاز میں بیٹھکر اوپر جاتا ہے اور اوپر سے اس پہاڑ کی تصویر لیتا ہے۔ یہ نہ صرف یہ کہ پورے پہاڑ کی تصویر ہوگی بلکہ اس سے اس کے موقع و محل اور اس کے اطراف و جوانب کا بھی اندازہ ہوگا۔ اس میں صرف ایک چیز کی کمی رہجاتی ہے اور وہ اسکی تفصیلات ہیں۔ لیکن اگر ہم ان دو فوٹو کو ملاکر دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے سامنے اب پورے پہاڑ کی تصویر آگئی ہے اسی طرح سے ذہن بھی اس مصور کی طرح ہے جو اپنی تصویر کسی ایک رخ سے کھڑا ہو کر لیتا ہے لیکن وجدان کی مثال اس مصور کی سی ہے جو ایک شے کو اوپر سے بحیثیت مجموعی دیکھتا ہے۔

آئیے پہاڑ کی بجائے ہم کوئی مسئلہ لے لیں، فرض کرو وہ بقائے روح کا مسئلہ ہو ایک صاحب ذہن اس مسئلہ کے صرف ایک رخ پر نظر رکھے گا لیکن ایک صاحب وجدان اپنے تخیل کی پرواز سے اس مسئلہ کو بحیثیت مجموعی دیکھے گا، اور اسکی پوری اہمیت کو ملحوظ رکھے گا لیکن ان دونوں میں سے جہاں ایک پہلو بھی نظر انداز ہوا، وہ شے ناقص اور نامکمل رہ جائیگی اور اصل حقیقت کبھی نظر کے

سامنے آ جائیگی۔ چنانچہ ودرشسن کے طریقہ تصور میں ہم کو اس ذہن اور وجدان کا ایک بہترین امتزاج نظر آتا ہے اور اسمیں ان دونوں چیزوں کی باہم ایک عجیب و غریب آمیزش دکھائی دیتی ہو لیکن یہ طریقہ تصور صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ انسان کی بہترین نظم و تربیت ہوئی ہو اور جبکہ تمام قوائے انسانی میں ایک طرح کی یکجہتی اور یکرنگی پیدا ہو چکی ہو جبکہ ذہن تمام افکار دوساوس سے پاک و صاف ہو، اور جبکہ انسان کی قوت ارادی پاک و صاف جسم کی مدد سے نہایت مضبوط اور مستحکم ہو گئی ہو۔ فلسفہ اور تخیل میں بڑے سے بڑا کمال پیدا کرنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ زندگی میں صفائی اور یکرنگی پیدا نہو جہاں ہم میں یہ صفائی پیدا ہوئی اور جب ہم نے اپنے اندر تمام مختلف عناصر میں ایک طرح کی یکسانیت اور ہمرنگی پیدا کر لی، اسوقت ہماری زبان سے جو کچھ نکلیگا، وہ محض دماغی کاوشوں کا نتیجہ نہوگا بلکہ وہ اس نور اور روشنی کا پرتو ہوگا جو ہمارے اندر جھلک رہی ہوگی، اسوقت ہماری زبان سے خیالات نہ نکلیں گے بلکہ وہ حقایق و معارف ہونگے چنانچہ ہندو فلسفہ کا جو اصل پیام ہے وہ انسان کو "تاریکی سے روشنی کی طرف، فنا سے بقا کیطرف اور دنیا یعنی باطل سے 'دتریا' یعنی حق کی طرف" لانا چاہتا ہے اور کیا اس سے بھی بہتر کوئی اور پیام ہو سکتا ہے؟

غزل

مصورِ جذبات مرزا ثاقب لکھنوی

دل مردہ کبھی جینے کا طلبگار نہ تھا
ہوشیاری کو سمجھتا تھا پہ ہشیار نہ تھا

اک چمن دل میں نہاں تھا جسے دکھلا نہ سکا
ضبطِ الفت سے کوئی داغ نمودار نہ تھا

صاحبِ خانہ ہوا یا کہ مری دل کی زمیں
ورنہ پہلے تو کہیں عشق کا گھر بار نہ تھا

عام لوگوں میں بھلا کیا دلِ مجروح کی قدر
یہ بھی یوسف تھا مگر قابلِ بازار نہ تھا

عرصۂ حشر میں کیوں ہے مجھے تکلیفِ حساب
مجھ سے اور راحتِ دنیا سے سروکار نہ تھا

اضطرابِ شبِ فرقت کو بتاؤں کیونکر
رات یوں گذری کہ بستر پہ مرا بار نہ تھا

یہ گوارا نہ کیا دل نے کہ مانگوں تو ملے
ورنہ ساقی کو پلانے میں کچھ انکار نہ تھا

دل بھی کانٹا تھا محبت میں رگِ جاں کیلئے
اب میں کس کو کہوں جو درپئے آزار نہ تھا

آمد و رفتِ شب و روز نے بدلا مرا رنگ
ورنہ جب دہر میں آیا تھا تو بیمار نہ تھا

میں نے آنکھوں میں بسر کی ہیں وہ غم کی راتیں
کہ بجز چشمِ حوادث کوئی بیدار نہ تھا

روشنی ڈال کے دنیا کا دکھانا تھا مآل
یہ چراغِ سرِ تربت مرا بیکار نہ تھا

پائے مجرم میں قیامت کی ہے لغزش دمِ حشر
بار قاتل ہے وہی سر جو مجھے بار نہ تھا

قدردانِ سخن اب دہر سے گم ہیں ثاقب
اپنے موتی کو جو لایا میں تو بازار نہ تھا

نیا مکان

انسان کو خدا مصیبت یاد آتا ہے۔ جب اس پر کوئی آفت نازل ہوتی ہے۔ ایوب خاں تعلقدار تیئے پیر اسے کئی برس سے سمجھا رہے تھے۔ لیکن اُس نے اپنی زندگی کا ڈھنگ بدلنے کا ارادہ اسی وقت کیا جب اسکی جوان لڑکی اور دس برس کا لڑکا ایک ہفتہ کے اندر انتقال کر گئے۔ اور اسے اپنی داڑھی میں سفید بال کثرت سے نظر آنے لگے۔

"نئی زندگی۔ نیا مکان" اس نے اپنے دل میں سوچا "جس گھر میں سات پشتوں سے عیاشی ہو رہی ہو وہاں ایک اللہ والا کیسے بسر کر سکتا ہے۔ یہاں رہا تو میں دن بھر میں اپنے ارادے سب بھول جاؤں گا!"

پرانے مکان میں اُس نے رات گذارنا بھی پسند نہ کیا۔ فوراً ایک کوٹھی کرایہ پر لی، اور خاندانی گھر اپنی آخری "ساقی" نجیا کو بخش دیا۔ نجیا کو اب اپنی صورت شکل پر اتنا بھروسا بھی نہیں رہا تھا۔ وہ خوشی سے اس پر راضی ہو گئی۔ اور مچھلی کو جال سے چھوڑ دیا۔

ایوب خاں کا نیا مکان بننے لگا۔ اسکے دل پر دوزخ کا خوف طاری تھا۔ مگر جب نماز پڑھتے پڑھتے ٹانگیں تھک جاتیں تو جی بہلانے کے لئے وہ اپنے نئے مکان کو دیکھنے چلا جاتا۔ مکان بنتے اور بڑھتے دیکھ کر اسے ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے اسکی دعائیں قبول ہو رہی ہیں۔ اور اسکے کندھوں پر گناہوں کا بوجھ ہلکا ہوتا جاتا ہے۔ مکان اور اسکی روحانی زندگی میں ایک رشتہ سا پیدا ہو گیا جس پر اُسے اکثر تعجب ہوتا تھا۔ لیکن وہ اسے کبھی سمجھ نہ سکا۔

مکان کا بنوانا اُس نے اپنے مختار محمد میاں کے سپرد کیا تھا۔ اور وہ روز جا کر اس سے کہتا تھا۔ کہ جتنی جلدی ممکن ہو مکان تیار کرا دے۔

محمد میاں روپیہ کا بالکل خیال نہ کرو۔ جتنے مزدور ملیں اس پر لگا دو۔ ضرورت ہو تو میں قرض لینے پر تیار ہوں۔ میرا ارادہ اب سیدھی سادی زندگی بسر کرنے کا ہے۔ جتنا بھی قرض ہو سب ادا

ہو جائے گا۔ محمد میاں تم پھرتی سے کام کراؤ۔ مزدور بہت سے لگا دو۔ میں نئے مکان کی ہوس
میں مرا جاتا ہوں

ہر شام کو ایوب خاں اور محمد میاں میں وہی سوال و جواب ہوا کرتے تھے۔

"ہاں تو چھتیں ۔۔۔۔؟"

"حضور بس ۔۔۔ پندرہ روز میں"

"اور دیواروں کی لیپ پوت ؟"

"اس میں بھی کچھ زیادہ وقت نہیں لگیگا۔"

"محمد میاں ذرا جلدی کروائیے ! آپ تو ہر روز وہی پندرہ دن کا قصہ سناتے ہیں"

"جی ہاں حضور ۔۔۔ اب تو کچھ دیر نہیں ہوگی"

یہ سوال جواب مختار کی کوٹھری کے سامنے ہوا کرتے تھے۔ ایوب خاں روز بے صبری میں
اپنی لکڑی سے ایک خاص اینٹ کے ٹکڑے کو توڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور پھر ادھر اُدھر دیکھکر
موٹر کیطرف چلا جاتا۔

ایک دن جب ایوب خاں دیکھ بھال کیلئے آیا تو مختار نے کہا۔

"حضور اب نواب صلح گنج کی نئی کوٹھی تیار ہو گئی۔ وہاں کے چند مستریوں اور مزدوروں کو میں نے
پکڑ لیا ہے۔ مستری اچھے ہیں۔ اور اب کام بھی تیز ہوگا۔"

"اچھا"

دونوں مکان کا چکر لگانے لگے۔ کل اور آج کا فرق مختار بڑھاوے کیساتھ بتا رہا تھا

"حضور یہ نئے مستری ہیں"

مستری اُٹھے۔ اور جھک کر سلام کیا۔

"حضور اچھے تو ہیں ۔۔۔ ؟" ایک مستری نے پوچھا۔

ایوب خاں نے اُس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ اسکی نظر اور توجہ دوسری طرف تھی ۔۔۔ مستریوں کے

پاس ایک جوان لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے بجائے آداب بجا لانے کے ایوب خاں کیطرف غور سے دیکھا۔ اور اسکے منہ پر کچھ مسکراہٹ سی آگئی۔ ایوب خاں کا بدن کانپ گیا چہرہ لال ہوگیا۔

"حضور مستری شکایت کرتے ہیں کہ یہ چونا خراب ہے۔ میرے خیال میں کسی اور ٹھیکہ دار سے معاملہ کرنا چاہیئے"

"ہاں"

ایوب خاں مختار کی تقریروں کے جواب میں صرف ہوں ہاں کرتا رہا۔ مکان کو بھی وہ اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ جسطرف وہ دیکھتا اُس لڑکی کی شوخ آنکھیں اس کی نظر کا مقابلہ کرتیں۔ اور اُسکے کان میں کہیں سے ایک آوازسی آتی۔

"حضور اچھے تو ہیں؟"

ایوب خاں شرما کر سر جھکا لیتا۔ اگرچہ اُسے معلوم تھا کہ وہ لڑکی اور مستری سب اپنے کام میں مشغول ہیں۔ اسکا دل دھڑک رہا تھا طبیعت پر قابو بالکل نہیں رہا۔ شراب پینے سے اُسی اختلاج کی شکایت ویسے بھی ہوگئی تھی۔ اس نئے واقعہ نے جو خیالات اور جذبات اُس کے دل میں پیدا کئے تھے، اُن کے جھونکوں میں وہ ایک تنکے کی طرح اِدھر اُدھر چکر کھا رہا تھا۔

لیکن ان خیالات اور جذبات کی اصلیت کیا تھی؟ ایوب خاں کئی مرتبہ "عاشق" ہوچکا تھا، خوبصورتی اور حسینوں کے انداز کو وہ خوب سمجھتا تھا اور پہچانتا تھا۔ کیا اسی شیطان نے ایک نیا روپ لیکر اُسپر پھر حملہ کیا؟ نہیں یہ عشق نہیں۔ یہاں نہ حسن تھا نہ عاشق کی طلب۔ گھر پہونچتے پہونچتے ایوب خاں کو بالکل یقین ہوگیا تھا کہ وہ عاشق بھی نہیں ہوا ہے۔ مگر پھر یہ گھبراہٹ کیسی؟ یہ لاچاری کیوں؟

گھر پہونچتے ہی ایوب خاں نے دو رکعت نماز پڑھی۔ خدا کی یاد میں وہ کبھی اتنا نہ ڈوبا تھا جتنا اس نماز میں، اور یہ عجیب بات تھی کہ ہر دم اُس نوجوان مزدورنی کی شوخ آنکھیں اُسے تکتی رہیں۔ اُسکا دل دھڑکتا رہا طبیعت کچھ پریشان رہی۔ لیکن عبادت میں کوئی فرق نہ آیا، خدا خفا

نہ ہوا۔ وظیفہ کے بیچ بیچ میں وہ خوشی کی آہیں بھرتا جاتا تھا، آنکھوں میں آنسو آرہے تھے، اس مریض کیطرح جو کسی لمبی بیماری سے اچھا ہوکر اپنی صحت کی واپسی کی خوشی منا رہا ہو۔

"عجیب بات ہے... عجیب بات ہے..." اسکے سوا ایوب خاں کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

سویرے جب وہ سوکر اُٹھا تو اپنے آپ کو اس نے ایک بالکل دوسرا آدمی پایا۔ وہ سادہ لباس جسے وہ روزہ نماز اور وظیفہ کی زنجیروں میں ایک کڑی اور اپنے لئے ایک سزا سمجھتا تھا اُسے بہت پسند آیا۔ نوکر جب ناشتہ لایا تو آدمی اسے وہ بہت پیار سے بولا، اسطرح کہ نوکر گھبرا گیا، کیونکہ وہ ایک سوکھا چہرہ اور سرخ آنکھیں دیکھنے کا عادی تھا۔ دو چار لوگ ملنے آئے وہ بھی خوش ہوئے اور یہ رائے واپس لیکر گئے کہ تعلقہ دار صاحب واقعی اللہ والے ہوگئے ہیں۔ ایوب خاں جب مکان دیکھنے گیا تو اُس نے بجائے مختار کے ساتھ گھومنے کے مزدوروں سے باتیں کرنا شروع کیں، بالکل اسطرح جیسے وہ خود بھی مزدور ہو۔ ایک بڈھا مستری، جسے اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اُسے اس دن بہت پسند آیا، یہاں تک کہ وہ اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور بے تکلفی سے گفتگو چھیڑ دی۔

"بھئی تم کیا آج سے کام کر رہے ہو...؟"

"ناہیں ہجور، ہم تو بہت دن سے ہیاں هن" مستری نے جواب دیا

"میں تو تمہیں آج ہی دیکھ رہا ہوں"

"ہجور گریب آدمن کا کون دیکھت ہے، اوی کی کا نجر آوت ہیں؟" مستری نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں بھائی.. ٹھیک کہتے ہو" ایوب خاں بجائے اس طعنہ پر ناراض ہونے کے اور خوش ہوا دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اُسکے اور مستری کے درمیان میں جو فاصلہ ہے وہ کم کر دے، جو دیوار ہے وہ گرا دے۔ پہلے اگر وہ اسکی کوشش کرتا تو اُسکی سمجھ کام نہ دیتی، آج اُسے سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"ہاں بھئی ٹھیک کہتے ہو،" اُس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "تم یہاں کوئی ایک ماہ سے کام

کر تے ہو، اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تم ہو بھی یا نہیں . . . لیکن اب دھیرے دھیرے میری طبیعت بدل رہی ہے ۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ نے کیوں فرمایا ہے کہ امیروں کے لئے جنت میں جانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکلنا ۔ میں نے اپنی جوانی بڑی بُری طرح گذاری ہے ۔ ابھی کچھ دن ہوئے جب میرے دو بچے ایک ہی ہفتہ کے اندر مر گئے تب مجھے خیال آیا کہ خدا بھی ایک چیز ہے ، اور جو خدا کو بھول جاتا ہے اُسکا نقصان ہی نقصان ہے "

" ہاں ہجور جب ساری دیئے کھُدائی کی ہے تو کھدائے کو بھوٹ سے دنیا کیسے ملے " مستری نے اطمینان سے کہا

" ہاں ٹھیک کہتے ہو . . . اسلئے میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ اپنا بڑا مکان جہاں میں امیروں کی طرح رہتا تھا چھوڑ دوں گا ۔ اور اس نئے مکان میں بیٹھکر اپنے خدا کی عبادت کروں گا "

مستری کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رُک گیا ۔ ایوب خاں نے سلسلہ جاری رکھا ۔

" میں اب یہاں بالکل غریبوں کی زندگی بسر کروں گا . . . غریبوں کے ساتھ رہونگا . . . سب کا دوست ، سب کا بھائی . . . "

ایوب خاں کچھ دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا ۔ دل کی بات زبان پر آتنی آسانی سے نہیں آتی ۔ مستری نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کام شروع کر دیا ۔ لیکن دونو کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان میں اب دوستی ہو گئی ۔ اور دونو اس سے بہت خوش ہوئے ۔ ایوب خاں میں اب کسی قسم کی جھجک نہیں باقی رہی ۔

گھومتے گھومتے وہ اُس جگہ پر بھی پہونچا جہاں وہ نوجوان مزدورنی کام کر رہی تھی جسکی آنکھوں اور مسکراہٹ کے کارن ایوب خاں میں یہ جوش پیدا ہوا تھا لڑکی نے ایوب خاں پر صرف ایک سرسری نظر ڈالی اور اپنے کام میں لگی رہی لیکن ایوب خاں کو یہ نظر بھی بہت پیاری معلوم ہوئی ۔ برسوں کی محبت ، ہمدردی ، دلی دوستی سے بھری تھی ۔ اس نے ایک دم میں وہ ظاہر کر دیا ، جو مہینوں کی دوستی میں نہیں بتایا جا سکتا ۔ اور پھر زبان میں وہ قوت ادا کہاں جو نگاہوں

میں ہوتی ہے۔ کم از کم ایوب خاں اُسے یوں ہی سمجھا کہ اس باہمی رازداری کی کوئی وجہ نہیں تھی اس کے دماغ میں آیا ہی نہیں۔ آج وہ سب کا بھائی، سب کا دوست تھا۔ اُسے ایک طرح سے اُسکا انتظار بھی تھا ہر مرد اور عورت اُس سے اپنی محبت کا اظہار بھی کرے اور اسمیں اُن کو کسیطرح کی مایوسی نہیں ہوئی۔

مستری اس سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے اور ہر روز اُن سے باتیں کرنے میں ایوب خاں کو نیا لطف آتا تھا۔ ہر روز وہ نئے جذبات دل میں سمیٹ کر گھر جاتا۔ جیسے لوگ قیمتی چیز بغل میں دبا دبا کر لیجاتے ہیں، اور اس دولت کو اپنے خدا کے سامنے پیش کرتا۔ عبادت اس کے لئے ایک ملاقات سی ہوگئی جس کو وہ دلچسپ اور پر لطف بنانے کیلئے ہر دن نئی خبریں لاتا، نئی ہنسی ہنستا، اور نئے آنسو روتا تھا۔ مستریوں سے گفتگو کرتے ہوئے اُسے ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسی بات سُنائی دیتی جو اُسے سچائی اور پریم سے بھری ہوئی معلوم ہوتی، اُس جوان مزدورنی کی آنکھوں میں جذبات کا ایک ایسا خزانہ تھا کہ ایوب خاں کے دل میں ہر روز ایک نیا ہنگامہ پیدا ہوتا اور اُسے سکون اُسی وقت ہوتا جب وہ عبادت میں اپنے خدا کو دل کا سارا حال سنا دیتا۔

....

ایک روز جب مکان تیار ہو چکا تھا اور مستری اندر دیواروں پر چونا لگا رہے تھے تو بڈھے مستری نے، جو ایوب خاں سے بالکل آزادی سے گفتگو کرتا تھا مُسکرا کر کہا

"دیکھو صاحب اب بیاہ کب ہوئی ہے"؟

"کیوں"؟

"ہم کہا کہ پانچ گھرے ہیں۔ اُن ماں کون رہی ہے۔ آپ تو دن رات نماز پڑھت ہیں۔۔۔"

ایوب خاں مُسکرایا اور کچھ جواب نہ دیا۔ اُسکی بیوی کا انتقال کوئی پانچ برس پہلے ہو چکا تھا، لیکن اُس زمانہ میں وہ عیاشی میں ایسا پھنسا ہوا تھا کہ اُسے دوسری شادی کا خیال کبھی نہیں آیا، اور نہ کوئی ایسا باپ ملا جو اُسے بیٹی دینے پر راضی ہو۔ مستری کے سوال کو اُسوقت تو وہ ٹال

گیا۔ مگر دل میں یہ بات جم گئی۔ کمروں میں آخری مرتبہ گشت لگاتے ہوئے اُس نے سوچا۔
"کہتا تو دراصل ٹھیک ہے مکان خالی خالی سا رہے گا۔ اور پھر دوسری شادی میں گناہ کیا ہے؟ عیاشی تو میں نے چھوڑ ہی دی ہے۔۔ پہلی بیوی کو میں نے جو تکلیف دی ہے، اُس کے بدلے اگر ایک دوسری عورت کو خوش کر سکوں تو۔۔۔۔"
اُسے یکبارگی اُس جوان مزدورنی کا خیال آگیا ایوب خاں سے وہ اب اسقدر مل گئی تھی کہ دونوں میں خوب باتیں ہوا کرتی تھیں لیکن اُسکی پہلی نگاہ کا جو اثر پڑا تھا، اُسے وہ کبھی نہیں بھولا اور دل میں اس معمولی مزدورنی کی بہت عزت کرتا رہا۔ آج شادی کی فکر نے اُسکے تعلقات کا رنگ بدل دیا۔ اُس نے اپنے آپ کو بہت یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسا نہیں لیکن اس کے پیر بے اختیار اسی کمرے کیطرف لے چلے جہاں وہ مزدورنی کام کر رہی تھی۔ اسوجہ سے نئے ارادوں کے ساتھ ایک نئے دیدار کا شوق پیدا ہوا۔ اور ایوب خاں کی آنکھیں یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ مزدورنی اگر اُس کی بیوی ہوئی تو کیسی معلوم ہوگی۔ کمرے میں پہنچکر اُس نے مستریوں سے باتیں شروع کردیں، کچھ اپنی گھبراہٹ دور کرنے کے لئے، کچھ اس ڈر سے کہ کہیں کسیکو خیال نہو جائے کہ وہ مزدورنی کو دیکھنے آیا ہے۔ لیکن ان ترکیبوں نے زیادہ دیر تک کام نہیں دیا۔ اور چند جملوں کے بعد وہ خاموش ہوگیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک نئے مکان اور نئی زندگی کی تصویر تھی کبھی تو وہ عبادت کر رہا ہے۔ اور اُسکی بیوی تھوڑی دیر بعد اُس کے کمرے میں ایک نظر ڈال جاتی ہے۔ اور ایوب خاں مزدورنی کی طرف دیکھتا کہ یہ نظر کیسی ہوگی۔ کبھی وہ دونوں کھانے پر بیٹھے ہیں وہ مختلف چیزیں اُسکے سامنے پیش کر رہی ہے۔ اور ایوب خاں اُس مزدورنی کی طرف دیکھتا کہ یہ تواضع کیسی ہوگی۔۔ کبھی وہ دونوں شام کے وقت سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اُسکا ہاتھ ایوب خاں کے ہاتھ میں ہے۔ دونوں خاموش ہیں۔ اور ایوب خاں پھر اس مزدورنی کی طرف دیکھتا کہ یہ خاموشی کیسی ہوگی۔ مزدورنی کی چال، اُسکے انداز، اُس کی محبت سے بھری ہوئی نگاہیں۔ گھر کے سجانے اور زندگی کے خوش کرنے کے لئے اس سے زیادہ کس چیز کی ضرورت تھی؟ پھر دیں سے وہ روحانی

تعلق غریبوں سے وہ دوستی جسکا اُس نے کچھ دن پہلے ہی اقرار کیا تھا۔ اس سب کے قائم رکھنے کی اور کون سی ترکیب ہو سکتی تھی۔؟ ایوب خاں کا جی چاہنے لگا کہ کسیطرح سے وہ کود پھاند کر اپنی موجودہ حالت سے اس زندگی تک پہونچ جائے جس کی ایک جھلک اُسے ابھی نظر آئی تھی۔ اپنی امیدیں پوری کرے۔ اور دل کی بے چینی دور کرے۔ لیکن جب وہ گھر پہونچا۔ اور کھانے کے بعد آرام کر کے نماز پڑھنا چاہا۔ تو اُسے ایک عجیب سستی سی محسوس ہوئی۔ جہاں وہ شوق سے جاتا تھا۔ وہاں آج معلوم ہوتا تھا کہ کوئی زبردستی لئے جا رہا ہے۔ نماز تو اُس نے کسی نہ کسی طرح سے ختم کر لی۔ مگر اُسے اِس تبدیلی پر حیرت ہوئی۔

"آخر مجھے ہو کیا گیا؟ کیا اب بھی اپنے خدا سے مُنہ پھیر لوں گا؟" اُسنے اپنے آپ سے گھبرا کر پوچھا۔ مگر اِسکا کہیں سے جواب نہ ملا۔ اور آخر کار عاجز آ کر وہ وظیفہ کو چھوڑ چھاڑ اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ اپنی شادی کی سوچ میں تھا۔ اور اُسی جوان مزدورنی کی آنکھیں جنھوں نے اُسکی عبادت ایسی رسیلی کر دی تھی، آج اُسے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ ایوب خان نے عیاشی سے توبہ کی تھی، اسطرح کہ محبت سے نہیں جو مرد اور عورت کو میاں بیوی بناتی ہے۔ اور ان کو خوش رکھتی ہے لیکن پھر خدا اور اُسکے ایک دیندار بندے کے درمیان میں یہ پردہ کیسا پڑ گیا، یہ بیگانگی کیسی ہو گئی؟ ایوب خاں اسوقت اپنی آیندہ زندگی کی تصویریں بنانے میں ایسا مشغول تھا کہ اُس نے اس سوال پر زیادہ غور کرنے سے بچنا چاہا۔ مگر یہ اندیشہ اُسکے دل میں کانٹے کیطرح چبھنے لگا کہ شاید وہ زندگی جسکا وہ اب ارادہ کر رہا تھا، خدا کو پسند نہو جب صرف اُسکے خیال نے عبادت سے جی ہٹا دیا تو اُسکی اصلیت کہاں پہونچائے گی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایوب خاں کی طبیعت میں جھنجلاہٹ سی پیدا ہو گئی، اُسکی خیالی تصویریں سب دھواں بن کر اڑ گئیں۔ اور اُسکے دماغ میں اس مسئلہ پر بحث چھڑ گئی کہ اُسے مزدورنی سے شادی کرنی چاہئے یا نہیں۔ اُسکی اپنی رائے تو شادی کے موافق تھی لیکن پھر سوچا کہ اور لوگ کیا کہیں گے۔ رشتہ داروں اور عزیزوں کی زبان سے خدا بچائے۔ وہ تو بے گناہوں کو بھی ردنہ

سولی پر چڑھاتے ہیں، ایسی حرکت کی تو وہ دھجیاں اُڑا دینگے، نام مٹی میں ملا دیں گے۔ رشتہ دار تو خیر خدا نے اسی لئے پیدا کئے ہیں۔ اُن کو چھوڑ یئے۔ مزدورنی سے نکاح ہونے کی خبر سنکر کون چپ ہیگا گلی گلی لوگ ہنسی اُڑائیں گے۔ اور یہ نوکر چاکر، یہی لوگ جو اسوقت خوف زدہ اور تابعدار معلوم ہوتے ہیں، یہ بھی خوب دانت دکھائیں گے۔ مزدورنی دنیا میں سب سے بدصورت عورت بنجائے گی۔ وہ سب سے بیوقوف آدمی۔ اور کیا کوئی ڈنڈا لیئے لوگوں کی رائے بدلتا پھرے گا۔ ایوب خاں کے خیالات کا دیر تک یہی رنگ رہا۔ اور جب نوکر نے چائے لانے میں دیر کی تو اُسے بالکل یقین ہوگیا کہ شادی کا نتیجہ یہی ہوگا۔

ساری شام اور آدھی رات تک ایوب خاں کی طبیعت پریشان رہی کبھی امید نئی زندگی کو اُس کے سامنے دلربا شکلوں میں پیش کرتی تھی کبھی لوگ اُسکی حماقت پر ہنستے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ بھی نہیں ممکن تھا کہ وہ عبادت میں محو ہوکر ان سب جھگڑوں کو بھول جائے کیونکہ اس پر اُسکا جی کسی طرح سے راضی نہیں ہوتا تھا۔ آخر کار نیند نے آکر بحث ملتوی کردی۔

دوسرے دن سویرے جب نئے مکان کو دیکھنے کے لئے جانیکا وقت آیا تو ایوب خاں کا عجیب حال تھا۔ "پہلے تو نئی زندگی کے طریقہ کو طے کرلینا چاہیئے" اُسنے سوچا "ورنہ یہ مکان وغیرہ تو سب مذاق ہے۔ وہاں کوئی جاکر کیا کرے"۔ مگر نئی زندگی کا مسئلہ طے ہی نہیں ہوسکتا، اسلئے وہ دل بہلانے کیلئے چلا گیا۔

مکان کے اندر مستریوں میں کسی بات پر بڑے زور شور سے بحث ہو رہی تھی۔ ایوب خاں کو دیکھتے ہی بڈھے مستری نے اُسکی طرف مخاطب ہوکر کہا۔

"اور سنیو میاں صاحب۔ وہ سندوریا بھاگ گئی۔ ڈیڑھ دن کی مجوری چھوڑ چلی گئی۔۔۔"

"کون سندوریا کون؟" ایوب خاں کو اُس جوان مزدورنی کا نام تو معلوم تھا۔ لیکن وہ یہ خبر سنکر ایسا گھبرایا کہ اُسکی سمجھ میں اور کوئی سوال نہ آیا۔

"ارے وہی صاحب جی کی اُس بگلا جیسی انکھیاں رہیں۔ آپ تو وہی کا جانت ہیں"۔

"کیوں، کیسے بھاگ گئی ؟"

"ہم کا جانن صاحب . . . ای منگل تو کہت ہین کہ وہ عاشک ہوئی گئی رہی ۔انہن سے پوچھو۔"
مستری منگل نے اطمینان سے کہا۔

"صاحب۔ سے وہ ہیاں آئی رہی تب سے یو منھو، دہی جی کیساتھ وہ چلی گئی ہے ۔ وی سے روج کہت رہے کہ ہمرے پاس کان پور مال مکان ہے۔ ہمرے ساتھ ہوا ں بھاگ چلو ہم مجبوری کربا، تم روٹی پکایو۔ وہ سارکڑی کا جانے ، نہ ماتے۔ نہ باپ جی سے صلاح لے، کانپور کا نام سنکروی کے ساتھ بھاگ گئی . ."

"لیکن آخر مزدوری کیوں چھوڑ گئی ؟"
منگل نے کچھ ناراض ہوکر کہا

" اب یو صاحب ہم کا جانن"
بڈھا مستری بول اٹھا۔

سارکہہ ڈبس ہوئی ہے کہ کان پور کی گاڑی آجو جات ہے ، پھر کبھوں نہ ملی ہے۔"

ایوب خاں کا سر چکر کھانے لگا ۔منہ پر بیماروں کی سی مسکراہٹ آگئی۔ بغیر اور کچھ کہے سنے وہ گھر کے باہر نکل آیا۔ اور موٹر میں جاکر بیٹھ گیا۔

"بھئی گھر چلو" اُس نے ڈرائیور سے کہا" ذرا گھومتے گھامتے چلنا۔"

موٹر پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ اور ایوب خاں نے پیچھے پھر کر نئے مکان پر نظر بھی بھی نہ ڈالی۔

کلام راسخ عظیم آبادی

غزل

ہوا دیوانہ ہر فرزانہ تیرا
بہت فرزانہ ہے دیوانہ تیرا

ہمارا حال سنکر قیس بولا
جنوں آور ہے کیا افسانہ تیرا

یہ چاہوں ہوں کہ تجھ سی بھی زیادہ
وفا بیگانہ ہوں جانانہ تیرا

مرا ہو شمع بالیں ایک شب تو
کہ ہوں سو جان سی پروانہ تیرا

تہی دستی ست اپنی خوش ہوں آخر
کہیں معمور ہو پیمانہ تیرا

کدہر کعبہ کہاں کا عرش اعظم
دل بشکستہ ہے کاشانہ تیرا

غزل

متصل دل کو اضطراب رہا
جان پہ تجھ بن اک عذاب رہا

بے حجابی کے بعد بھی مجھ سے
انکو اک طور کا حجاب رہا

ہم مصیبت کشوں کے دن نہ پھرے
گو زمانے کو انقلاب رہا

دل کو کیا کوفت تھی نہیں معلوم
دیدہ اپنا سدا پر آب رہا

زور ہی سر میں کچھ نشا سا تھا
جب تلک موسم شباب رہا

بے گنہ ہم گناہ گار رہے
بے سبب ہم پہ یہ عتاب رہا

وے رہے ہم شراب غیر کے ساتھ
راسخ اپنا جگر کباب رہا

غزل

تم بن اب واں پہ ہے عذاب بہت　　صبر کم اور اضطراب بہت
غیر ہیں وردِ کرم صاحب　　بندہ ہی پر ہے کچھ عتاب بہت
رخ برافروختہ ہی رہتے ہیں وے　　تیز ہے اب تو آفتاب بہت
وجہ کیا اس حجاب کی، کیوں تم　　منہ پہ رکھنے لگے نقاب بہت
ہیں مئے بیخودی سے راسخ مست
لے گئی ان کو یہ شراب بہت

غزل

سر سے پا تک وفا ہوئے ہو تم　　کسو پر مبتلا ہوئے ہو تم
عذر خواہی کا اب دماغ نہیں　　خوش رہو گر خفا ہوئے ہو تم
خاک چھنوا کے ہاتھ آتے ہو　　نسخۂ کیمیا ہوئے ہو تم
آپ سے ہو گئے ہیں بیگانے　　جن سے ٹک آشنا ہوئے ہو تم
پھرتے ہو گھر گھر آئینہ کی مثال　　کس قدر خود نما ہوئے ہو تم
حسن والوں میں کون ہے تم سا　　قہر آفت بلا ہوئے ہو تم
جاتے ہو ہر دم آپ سے راسخ
کیا کسو سے جدا ہوئے تم

غزل

صبح سے بیتابی ہے دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے
دیکھئے کیا ہو شام تلک، جی آج بہت گھبراتا ہے

چشمِ تر کی وسعت داماں ہم دکھلا دیں جی میں ہے
ابر بہت پھیلاؤ اب اپنے دامن کا دکھلاتا ہے

سبزہ صفت سر یاں نہ اٹھا تو، دیکھ روش یہ خوب نہیں
ہوتا ہے پامال وہ آخر سر جو کوئی اٹھاتا ہے

ہونٹھ ہیں سوکھے تر ہیں آنکھیں زرد ہے چہرہ رنج آہ
بندے سے صاحب حال تمہارا اب نہیں دیکھا جاتا ہے

تنقید و تبصرہ

محشرِ خیال۔ شائع کردہ شرکت ادبیہ دہلی مجلد و مطلا حجم ۱۵۶ صفحہ تقطیع ۲۰ × ۳۰/۸ قیمت عہ۔ ہماری ادبی دنیا میں آج کل ایک تحریک "ادب لطیف" کے نام سے پیدا ہوئی ہے جو بظاہر نئی معلوم ہوتی ہے۔ اگر ہم مختصر الفاظ میں اس "ادب لطیف" کی تعریف کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں "وہ طرزِ خیال جو زندگی کے تمام شعبوں کو خالص "جمالی" (aesthetic) نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہے۔ ادب لطیف کے حامی ابتدا اس سے کرتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ کو مذہبی اخلاقی اور دوسرے بیرونی مقاصد سے آزاد کر کے صرف "جمالی" مقصد کا پابند رہنے دیں اور انتہا اس پر کہ تمدن کے دوسرے شعبوں میں بھی خوشنمائی اور بدنمائی یا "لطافت" اور "کثافت" کے فرق کو تسلیم کریں اور نیک و بد کے امتیاز کو بے بنیاد ٹھہرائیں۔

اس طرزِ خیال پر تنقید کرنے میں لوگ انصاف کو مدنظر نہیں رکھتے وہ "ادب لطیف" کا اطلاق چند بازاری رسالوں کے گندہ مضامین پر کرتے ہیں جن سے لطافت کیا کثافت بھی شرماتی ہے۔ انصاف کا تقاضہ ہے کہ موضوعِ تنقید اس قسم کے مضامین کو قرار دیا جائے جیسے "محشرِ خیال" میں جمع کئے گئے ہیں۔

"محشرِ خیال" سجاد علی صاحب انصاری مرحوم کی نظم و نثر کا مجموعہ ہے جسے خواجہ منظور حسن صاحب ایم۔ اے (علیگ) نے چھپوا کر شرکت ادبیہ کی طرف سے شائع کیا ہے۔ کتاب کی نظر فریب لکھائی چھپائی، خوشنما جلد اور سلیقہ مندانہ ترتیب سے خواجہ صاحب کی نفاست مذاق ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ اگر ہم مضامین کی ادبی خوبیوں پر بھی نظر کریں تو بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب اور شرکت ادبیہ نے محشرِ خیال کو شائع کر کے ادب اردو پر بڑا احسان کیا۔

محشرِ خیال ''ادبِ لطیف'' کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ قریب قریب کل مضامین پر وہ تعریف صادق آتی ہے جو ہم ابتدا میں کر چکے ہیں خصوصیت کے ساتھ ''ادبِ لطیف'' کا طرزِ خیال ''مذہب و اخلاق''، ''عفتِ نسوانی''، اور ''پیامِ زلیخا'' اور غزلوں میں پایا جاتا ہے۔

نمونہ کے طور پر چند جملے ملاحظہ ہوں۔

''کسی مسئلہ کی خشک اور سنجیدہ تشریح کرنی انتہائی حسن کشی ہے''۔

''جوان صالح اور زاہدِ خشک کے لئے غیر دلچسپ فرائض مخصوص کر دئے گئے ہیں اور مسلم بردارانِ حسن و شباب کے لئے حسن ہی اُس کی جزا ہے اور ایک بدمذاق کے لئے وہی اسکی سزا''۔

محشرِ خیال کو پڑھنے کے بعد ''ادبِ لطیف'' پر تنقید کرنا جائز ہے۔ سجاد مرحوم کے گل کار قلم نے اپنے شگفتہ اثر خیز اور ظرافت آمیز انداز میں خالص جمالی طرزِ خیال کا مرقع پیش کیا ہے۔ جن لوگوں کے خیالات میں ہمارے موجودہ طرزِ معاشرت اور کاروباری زندگی نے تنگی، افسردگی اور دہشت پیدا کر دی ہے وہ محشرِ خیال کو پڑھ کر تھوڑی دیر کے لئے خواہ وہ چند لمحے سے زیادہ نہ ہو اپنے دل میں پھر جوانی کی تازگی بےچینی اور شوریدگی محسوس کرنے لگیں گے۔ اور یہی اس کتاب کی غرض ہے۔

البتہ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ''ادبِ لطیف'' اور اُسکا یہ نمونہ ''محشرِ خیال'' عہدِ شباب کی مخصوص قلبی کیفیت کا آئینہ ہے اور اُسکا فلسفۂ زندگی یکطرفہ اور عارضی ہے۔ عہدِ شباب میں جمالی ذوق جوش کے اعتبار سے اپنی انتہا پر ہوتا ہے۔ نوجوان آدمی دنیا کو اسی عینک سے دیکھتا ہے اُسے سب کچھ سرا نظر آتا ہے۔ طبیعت کی بےچینی اُسے غور و فکر کی اجازت نہیں دیتی وہ ذہنی تحقیق کا کام دل کی تڑپ سے لینا چاہتا ہے، مذہب، علم، سیاست، معاشرت وغیرہ کی خصوصیتوں کو وہ نہیں سمجھ سکتا وہ ہر چیز میں شعریت ڈھونڈتا ہے اور نہیں پاتا تو جھنجھلاتا ہے خفا

ہوتا ہے، شعریت کے علاوہ کسی قدر کو وہ تسلیم نہیں کرتا۔ رفتہ رفتہ جب خیالات میں پختگی پیدا ہوتی ہے تو ذہن قدروں کے امتزاج سے آشنا ہو جاتا ہے اور شورش تخئیل معرفت و عقیدت کے سکون سے مانوس ہو جاتی ہے۔ اسکا نمونہ بھی محشر خیال میں "مسلمانان ہند اور تحریک اصلاح" کے نام سے موجود ہے۔

بات بڑھتی جاتی ہے نظم کے حصہ کے متعلق مفصل اظہار رائے کا موقعہ نہیں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ جن خیالات اور طرز ادا کی خصوصیات نے سجاد مرحوم کی نثر میں انتہائی دلکشی پیدا کر دی ہے وہ نظم کے جامہ میں اور بھی حسین معلوم ہوتے ہیں ہم چند شعر نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

بہار حسن کو بیگانہ وار دیکھا تھا
نگہ نے چھیڑ دیا مسئلہ محبت کا

پھر التفات حسن نے مجبور کر دیا
مجھکو سکون یاس پہ کتنا غرور تھا

اللہ ری میرے ذوق نظر کی تجلیاں
جس ذرہ پر نگاہ پڑی طور ہو گیا

رہی آوارگی میں بھی وہی پابندی صحرا
جنون سے بھی مجھے رسم جنوں نے بیخبر رکھا

حسن بھی مایۂ سکوں نہ ہوا
گل میں اظہار رنگ و بو کی خلش

(ع۔ح)

خطوط شبلی:۔ یہ مولانا شبلی نعمانی کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مرحوم نے بمبئی کی دو مسلمان خواتین عطیہ فیضی بیگم اور زہرا فیضی بیگم کے نام لکھے تھے۔ محمد امین صاحب زبیری اور محمد یوسف صاحب قیصر نے اس مجموعہ کو ترتیب دیکر بھوپال سے شائع کیا ہے اور شروع میں مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کا ایک نہایت دلچسپ مقدمہ بھی ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت کی غرض

غایت جیسا کہ مرتب صاحب اپنے "التماس" میں فرماتے ہیں، باوجود مالی بے بضاعتی کے مکاتیب شبلی کی ایک بڑی کمی کو پورا کرنا تھا، لیکن اگر ایسا ہی تھا تو انہیں اسکی طباعت و اشاعت میں بھی اسی اہتمام اور خوش سلیقگی سے کام لینا چاہئے تھا جو مکاتیب کی دو جلدوں یا مولٰنا کی دیگر تصانیف میں ملحوظ رکھی گئی ہے لیکن نہایت معمولی کاغذ پر اور ادنٰے درجہ کی کتابت و طباعت کیساتھ اسے شائع کرنے سے بجز اس کے اور کیا خیال کیا جاسکتا ہے کہ انہیں ان خطوط کی اشاعت سے اُردو خواں طبقہ میں ایک عارضی دلچسپی پیدا کرنے اور تھوڑی دیر کی واہ واہ سے زیادہ اور کچھ مقصود نہ تھا۔

نہ جانے مولٰنا شبلی کے وہ کون ایسے "ارادتمند فاضل دوست تھے جنکی" ذراسی توجہ اسکی اشاعت کی کفیل ہوسکتی تھی، لیکن انہوں نے "بعض وجوہ سے ان خطوط کی اشاعت مناسب تصور نہ فرمائی"۔ میں نہیں سمجھتا کہ انکی اشاعت میں وہ کون سے "وجوہ" مانع تھے۔ یہ خطوط ادب اُردو کے بہترین جواہر پارے ہیں اور ہماری انشاپردازی کے اعلیٰ ترین نمونہ، لیکن نہ اس حیثیت سے کہ "ایک علامہ دوران نے خواتین کے نام لکھے ہیں"، بلکہ صرف اس لحاظ سے کہ وہ ایک انشاپرداز کے قلم سے نکلے ہیں اور اسکے دیگر خطوط کی بہ نسبت اور زیادہ بے تکلفانہ اور فطری رنگ میں لکھے گئے ہیں۔

مولانا شبلی علماء کے طبقہ سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ اس زمانہ کے مولویوں کی طرح خشک مزاج اور تنگ نظر نہ تھے بلکہ وہ ایک نہایت وسیع الخیال، لائق ادیب، اچھے انشاپرداز اور شاعر بھی تھے۔ وہ سوسائٹی میں عورتوں کا ایک خاص مرتبہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ان تحریروں سے مولٰنا شبلی کی زندگی کا یہی پہلو خاص طور سے نمایاں ہوتا ہے۔ عطیہ فیضی اور زہرا فیضی سے واللہ اعلم انہیں وہ "حقیقی خلوص و محبت" رہی ہو یا نہ رہی ہو جس کے اظہار کی اس مجموعہ کی ملحقہ تحریروں میں خاص طور سے کوشش کی گئی ہے لیکن ان سے انکا ان ہر دو خواتین کے ساتھ تعلق ضرور ظاہر ہوتا ہے اور یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ ان خواتین کا ذکر مولٰنا شبلی کے مکاتیب میں اس سے پہلے بھی آچکا ہے، ان کی شگفتہ مزاجی

اور شاعرانہ طبیعت کے لئے انکے بمبئی کے خطوط اور اکثر نظمیں و غزلیں کافی سے زیادہ ثبوت ہیں۔
اس بنا پر یہ خطوط جنہیں مرتب صاحب نے "ہزاروں اطمینان و لاکر" مکتوب الیہا کی آہنی الماریوں"
سے حاصل کیا ہے اور جنمیں ہمارے مقدمہ نگار صاحب کو جا بجا "محبت کے ولولے" اور "رازو نیاز
کی سرگوشیاں" نظر آرہی ہیں ہمارے لئے کچھ بہت زیادہ حیرت و استعجاب کا باعث نہیں ہیں بلکہ تعجب
تو اس پر ہے کہ ایسی پرائیوٹ تحریروں میں بھی مولانا شبلی جادۂ مستقیم سے بال برابر ہٹے ہوئے نظر نہیں
آتے ہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ انکی پرائیوٹ سے پرائیوٹ تحریریں بھی آج اس لایق ہیں کہ وہ منظر عام
پر لائی جاسکیں اور جن کے متعلق ہمارے فاضل کہنہ مشق، مقدمہ نگار جیسے لوگ یہ فرمائیں کہ میں نے
انہیں بڑے شوق سے پڑھا اور جبتک شروع سے آخر تک سب نہ پڑھ چکا میں نے انہیں ہاتھ سے
نہ چھوڑا، لیکن کتنے لوگ ایسے ہیں جنکی پرائیوٹ زندگی کا ایک ورق بھی پبلک میں اس طرح پیش
کرنے کے لایق ہوگا؟

بہر حال یہ خطوط شائع ہوگئے، اچھا ہوا۔ ادب اردو میں اس سے ایک بہت بڑا اضافہ ہوا
لیکن مکتوب الیہا کو اگر یہ "ہر چیز سے زیادہ عزیز" چیز اپنے سے جدا کرنی ہی منظور تھی تو سب سے
پہلے وہ اسے اپنی "آہنی الماریوں" سے نکالکر دار المصنفین کو دیتیں جو اس ترکہ کے سب سے
بڑے حقدار ہوسکتے تھے، لیکن اگر ایسا نہ ہوا اور خود دار المصنفین نے کسی غیر ضروری تامل اور مصلحت
کی بنا پر اسے شائع نہ کیا تو اب آئندہ اسے اپنے ہاں سے اسی اہتمام اور خوش سلیقگی کے ساتھ
شائع کرنا چاہیے جس سے وہ مولانائے مرحوم کی دوسری تصانیف کو شائع کرتا ہے۔

مجموعہ زیر نظر چھوٹی تقطیع کر ۱۱۲ صفحوں پر ہے۔ شروع میں مولانا کی ایک تصویر بھی ہے قیمت
ایک روپیہ (عہ)

(س-ا)

شذرات

خان بہادر مولانا سید علی محمد شاد عظیم آبادی کا انتقال پر ملال ایسا حادثہ ہے کہ جس پر دنیائے ادب جس قدر بھی ماتم کرے کم ہے۔ کیونکہ آپ کے اٹھ جانے سے اردو شاعری کو ایک ایسا عظیم الشان نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی مشکل ہے۔

مولانا ئے مرحوم پرانے اہل کمال کی یادگار تھے اور اس زمانے میں کم سے کم مشرقی ہند میں ادب اردو کا چراغ آپ ہی کے دم سے روشن تھا۔ آپکی زبان میں لطافت، ترکیب میں متانت اور کلام میں پختگی ایسی تھی کہ کمتر شعراء کو میسر آتی ہے۔

آپ نے فارسی اور عربی کی اچھی تعلیم پائی تھی۔ خاصکر فارسی کہ اسکو ایرانی استادوں سے حاصل کیا تھا۔ حاجی محمد رضا اصفہانی اور ناخدا شیرازی جو کہ مرزا حبیب قاآنی کے ہم صحبت تھے عظیم آباد میں سکونت گزیں ہو گئے تھے انھیں دونوں بزرگوں سے کسب کمال کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کا فارسی کلام بھی ایرانی معلوم ہوتا تھا۔

شاعری کو بحیثیت فن کے حاصل کیا تھا۔ یہاں تک کہ شوق شعر میں ہندی کا پنگل (عروض) بھی ایک استاد کالی چرن نامی سے سیکھا اور ہندی اشعار کا بھی ایک دیوان مرتب کیا۔

مولانا کی ولادت جنوری ۱۸۴۶ء میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے تقریباً ۸۲ سال کی انہوں نے عمر پائی۔ لیکن اپنی زندگی کا کوئی حصہ بیکار نہیں کھویا۔ ادبی اور علمی ذوق میں کتب بینی، شعر گوئی اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔

آج سے چند سال پہلے ایک استفسار کے جواب میں انہوں نے خود لکھا تھا کہ انکی تصنیف سے ڈیرہ لاکھ سے زیادہ اشعار اور چار سو جزوں سے زیادہ کتابیں ہیں۔ مثلاً تاریخ صوبہ بہار

مشتمل بر چہار جلد و فرہنگ مصطلحات جدیدہ و فارسی تعلیم وغیرہ۔ ان تصنیفات کے علاوہ ہزار ہا شاگرد بھی چھوڑے ہیں۔

۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ نے قدر دانی فرما کر خان بہادر کا خطاب دیا۔ نیز ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ بھی گورنمنٹ سے آپ کو ملا کرتا تھا۔

خاندانی لحاظ سے آپ حسینی سید اور امام زین العابدین کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کے جدِ امجد سید حسین فیروزی خواجہ حافظ کے ممدوح اور شیراز کے حکمراں تھے۔ ہندوستان میں بھی آپ کا خاندان بہت نامور اور معزز رہا۔ خود آپ تیس سال تک آنریری مجسٹریٹ اور ۱۴ سال تک میونسپل کمشنر رہے۔

آپ جامعہ کے بڑے ہمدرد اور رسالہ جامعہ کے محسن تھے۔ چنانچہ اکثر اپنا کلام رسالہ میں اشاعت کے لئے بھیجتے رہتے تھے۔ دیوان شاد بھی خود مطبع جامعہ سے چھپ کر شائع ہوا افسوس ہے کہ ادب اردو کی یہ شمع آج گل ہو گئی۔ خود انہیں کا شعر ہے اور کیا خوب ہے ؎

ہے دل کی حکایت جائے عجب کیا اول و آخر اسکا کہیں
اک خاک کا تودہ لائے تھے ہم، سوئے قیامت لیکے چلے

گزشتہ دسمبر میں ایک اور جان فرسا حادثہ پیش آیا جس کے سبب سے ادب اردو کو ناقابلِ تلافی صدمہ پہنچا ہے۔ مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم کی وفات نے ہمیں اپنے مشہور ترین فسانہ نویس، تاریخ داں اور انشا پرداز کی ذات سے محروم کر دیا ہے، مرحوم کی ادبی خدمات کا احصاء چند سطروں میں ناممکن ہے۔ آپکی تصانیف کی تعداد کا اندازہ ایک سو کے قریب کیا جاتا ہے جس میں وہ مفید اور دلچسپ ادبی اور تاریخی مضامین داخل نہیں جو دلگداز میں نکلتے رہتے تھے۔ آپ کے

ناولوں میں متعدد ناول مثلاً فتح اندلس، ایام عرب، منصور موہنا وغیرہ ایسے ہیں جو غالباً صدیوں تک اُردو داں طبقہ میں مقبول رہیں گے۔ تاریخ میں بھی مرحوم کی متعدد تصانیف یادگار رہیں گی مگر افسوس ہے کہ سلسلۂ تاریخ اسلام جس کی تصنیف میں مرحوم اس زمانہ میں مصروف تھے اور جو ختم ہونے پر یقیناً مرحوم کا اہم ترین کارنامہ اور ادب اردو کا مایۂ ناز خزانہ ہوتا، ناتمام رہ گیا خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور مرحوم کے عزیزوں اور دوستوں کو صبر جمیل اور ان کے کام کو جاری رکھنے کی توفیق عطا کرے۔

چین میں برطانوی سیاست نے قومیت کی روح کو اُسی طرح بیدار کر دیا ہے جس طرح دوسرے ایشیائی ممالک میں۔ برطانوی مدبر چین کے معاملہ میں عجب متناقض باتیں کہہ رہے ہیں کینٹن والے کوئی قوت اور اثر نہیں لیکن انہوں نے تمام ملک میں فساد برپا کر دیا ہے اور اُن انگریزوں پر ظلم کر رہے ہیں جو چین میں مقیم ہیں۔ انکی پالیسی سے چینی قوم بیزار ہے لیکن قریب قریب ساری قوم اُنکا ساتھ دے رہی ہے۔ انکی فوجی مدد بالشویک کر رہے ہیں لیکن بالشویک فوج کا کہیں نشان بھی نہیں اور سب سے بڑھکر یہ بات ہے کہ چین والے اپنی قومی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں لیکن حق پر ہرگز نہیں ہیں۔ ہندوستان والے تو اپنے فطرتی "دیسی پن" کے سبب سے ان پیچیدہ اقوال کے سمجھنے سے ہمیشہ سے معذور تھے لیکن اس بار معلوم ہوتا ہے کہ اس "شرح حکمت آمیز" کو یوروپ اور امریکہ والے بھی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ سب نے چین کی وحشت دور کرنے کے لئے جنگ کرنے سے انکار کر دیا ہے اور تمدن و تہذیب کی حمایت کا بار صرف انگلستان کی گردن پر ڈالدیا ہے۔

جامعہ ملیہ کا ایک وفد ڈاکٹر ذاکرحسین خاں صاحب شیخ الجامعہ کی سرکردگی میں بہار کا دورہ کررہا ہے اب تک جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بہار میں قومی تعلیم کے شوق کو پھر زندہ کردیا ہے اور تمام صوبہ میں جامعہ کی ہمدردی کا جوش پیدا کردیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لوگوں سے جامعہ کے لئے چندہ مانگنے کو اپنا تنہا مقصد نہیں سمجھتے بلکہ مقاصد تعلیم اور قومی زندگی کے متعلق اپنے قیمتی خیالات کی اشاعت فرمارہے ہیں۔ آپ یہ کوشش بھی کررہے ہیں کہ بہار کے قومی مدارس اور مکاتب ایک سلسلہ میں منتظم ہوجائیں اور ایک اعلیٰ تعلیمی نصب العین کے ماتحت کام کرسکیں۔ اگر اس میں کامیابی ہوئی تو انشاءاللہ صوبہ بہار مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی اصلاح میں سب صوبوں پر تقدیم حاصل کریگا۔

جامعہ کے سچے حامی مولوی شفیع داؤدی صاحب ایم۔ ایل۔ اے وفد کو کامیاب بنانیکی امکانی کوشش کررہے ہیں۔ خدا کرے آپ کی سعی مشکور ہو اور جامعہ اور بہار میں خلوص و محبت کا ایک مستقل رابطہ قائم ہوجائے۔

ڈاکٹر ذاکرحسین خانصاحب کی مدد کے لئے عبدالعلیم احراری صاحب اور حامد علیخانصاحب بھیجے گئے ہیں۔ عبدالعلیم احراری صاحب جامعہ کے مایہ ناز طلبہ میں سے ہیں انہوں نے سال گزشتہ عربیات میں بی۔ اے امتیازی کی سند درجہ اول میں حاصل کی ہے اور اب جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف میں بحیثیت رفیق کام کرتے ہیں۔ حامد علیخاں صاحب بھی ہمارے فارغ التحصیل طلبہ میں سے ہیں۔ اور خلوص سرگرمی اور قومی درد میں جامعہ کی تعلیم کا اعلیٰ نمونہ سمجھے جاتے ہیں

امیر جامعہ مسیح الملک حکیم اجمل خانصاحب مدظلہ العالی مع ڈاکٹر عبد الرحمن صاحب کے ۹ رفروری کو بہار تشریف لیجائیں گے اور ایک ہفتہ تک صوبہ کے اہم مقامات کا دورہ فرمائیں گے۔

جنوری کے آخری ہفتہ میں ایس سری نواس آئنگر صاحب صدر نیشنل کانگرس جامعہ میں انجمن اتحاد کے مہمان ہو کر تشریف لائے آپنے اپنی تقریر میں جامعہ کی حالت پر دلی مسرت کا اظہار کیا اور جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کو اس ثابت قدمی پر داد دی کہ انہوں نے باوجود ملک کی فضا کے بدل جانے کے قومیت اور حب وطن کا دامن نہیں چھوڑا آپنے فرمایا کہ دوسری قومی تعلیمگاہوں میں جہاں آپ تشریف لے گئے ہر طرف مایوسی اور افسردہ دلی چھائی ہوئی دیکھی بر خلاف اس کے جامعہ میں آپ کو ہر جگہ زندگی، جوش اور امید کا روح افزا نظارہ دکھائی دیا

جو وفد ہندوستان سے جنوبی افریقہ گیا تھا وہ جب پرتگالی مقبوضات سے گذرا تو وہاں کے ہندوستانیوں نے وفد کو خیر مقدم کا تار بھیجا ور اسمیں یہ بھی ظاہر کیا کہ اُن لوگوں کو پرتگالی حکومت نے اپنی قوم کے مساوی حقوق دے ہیں۔ خدا جانے یہ پرتگالی کیسے لوگ ہیں کہ آئین حکومت کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ اور واقف کیوں کر ہوں دنیا میں حقیقی حاکم ہونیکے لئے انگریز ہونا لازمی ہے اور مجازی حاکم ہونیکے لئے سول سروس کا امتحان پاس کرنا۔ یہ بیچارے دونوں باتوں سے محروم ہیں۔

---

۲۴ رجنوری کو مسیح الملک حکیم اجمل خانصاحب مدظلہ العالی کی دختر نیک اختر کی تقریب عقد

تھی اس موقعہ پر بھی ممدوح نے جامعہ کو فراموش نہیں کیا بلکہ رقص و سرود کے جلسہ کو جو خاندان میں پشتہا پشت سے چلا آتا تھا موقوف کر کے اُس کے مجوزہ مصارف ایکہزار کی تعداد میں ہماری درسگاہ کو عطا فرمائے۔ حکیم غلام کبریا صاحب نے جن کے صاحبزادے سے جناب مسیح الملک کی صاحبزادی کا عقد ہوا ہے اس بدعت حسنہ میں پدر عروس کی تقلید فرمائی اور اُسی قدر رقم (ایک ہزار روپیہ) جامعہ کو عطا فرمائی۔ اُسی شب کو دلی کے مشہور تاجر حاجی رفیع الدین صاحب نے اپنے بیٹوں کے ختم قرآن کی خوشی میں جو جامعہ میں تعلیم پاتے ہیں پانسو روپیہ کا عطیہ دے کر اس نئے دستور کو مستحکم کر دیا۔ خداوند تعالیٰ تینوں صاحبوں کو جزائے خیر دے اور سب لوگوں کو توفیق دے کہ وہ اس راستہ پر چلیں۔

رسالہ
جامعہ

جلد ۸	ماہ شعبان المعظم ۱۳۴۵ھ مطابق فروری ۱۹۲۷ء	نمبر ۲

ہندو فلسفہ کی خصوصیت

اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آیا ہندو فلسفہ اپنے اندر کوئی ایسی خصوصیت بھی رکھتا ہے جو زندگی کو تر و تازہ اور خوش و خرم بنا سکے؟ یا مغربی فلسفہ کیطرح یہ بھی محض دماغی غور و فکر کا دوسرا نام ہے جس سے زندگی بالکل بے کیف اور بے مزہ رہتی ہے۔ یہ سوال بہت کچھ جواب دئے جانیکے قابل ہے، اسلئے کہ یہ نہ صرف ہندو فلسفہ ہی سے متعلق ہے بلکہ اسکا تعلق تمام فلسفوں سے ہے۔ اس سوال کا یہ جواب دینا کہ فلسفہ دراصل "علم" کا دوسرا نام ہے (علم سے مراد محض علم اشیاء ہی نہیں، بلکہ انکی کنہ و ماہیت کا معلوم کرنا بھی ہے) اور اس سے چونکہ زندگی میں قابل قدر اضافہ ہوتا ہے اسلئے اس سے زندگی میں تر و تازگی اور مسرت و خوشی بھی پیدا ہو سکتی ہے، اگرچہ بالکل صحیح ہے لیکن چنداں مسکت نہیں۔ سائنس اپنے نت نئے انکشافات سے حیات انسانی میں آرام و [illegible]

پیدا کرتی رہتی ہے۔ فنِ لطیف سے حظ و انبساط پیدا ہوتا ہے، جس کے بغیر زندگی ایسی ہی بے لطف و بے کیف ہو گی جیسے موسیقی بغیر نغمہ کے۔ مذہب ایک ایسے خدا کا وجود پیش کرتا ہے جو رحمٰن و رحیم ہے اور ستار و غفار ہے، اسی کے ساتھ حور و قصور کا تخیل بھی آتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس اعتبار سے حیاتِ انسانی کے لئے فلسفہ اپنے دامن میں کیا رکھتا ہے؟ اسکے جواب میں بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلسفہ اپنے اندر وہ شے رکھتا ہے جس کے بغیر سائنس، فنونِ لطیفہ اور مذہب سب باہمدیگر دست و گریباں ہو جائیں گے۔ وہ اصل شے جو فلسفہ کے پاس ہے، اجزائے مختلفہ کا باہمی امتزاج ہے۔ فلسفہ دراصل نام ہے دماغ کی اس حرکت کا جو مختلف عناصر و اجزا میں باہم امتزاج پیدا کرنیکے لئے ہو۔ اگر یہ حرکت نہو تو سائنس کے سامان عیش و راحت، فنونِ لطیفہ کی مسرت و انبساط، اور خدائے تعالیٰ کے رحم و کرم ان سب چیزوں میں باہم ایک اختلال اور بے ضابطگی پیدا ہو جائے جس سے وہ آپسمیں ایک دوسرے سے متصادم اور ٹکرا کر رہ جائینگی۔

اس موقع پر ایک عام سوال یہ کیا جاتا ہے کہ سائنس سے جو آرام و آسایش ہمیں ملتی ہے اسکا فنونِ لطیفہ کے حظ و انبساط یا مذہب کے عقائد و خیالات سے کیوں تصادم ہوتا ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان سب میں باہم ایک امتزاج پیدا ہو۔ اس سوال کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں جس میں سے دوسرے حصہ کا جواب ہم صرف یہ کہکر دیدینا کافی سمجھتے ہیں کہ امتزاج ہی کے دوسرے معنی فلسفہ کے ہیں۔ لیکن ہمیں اس تصادم کی اصل وجہ دریافت کرنی چاہئے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ فلاسفہ نے اس کشمکش و تنازع کا کوئی چھوٹا ہوا بنا کر اس غرض سے نہیں کھڑا کیا ہے کہ اسکے ذریعہ سے وہ اپنی موشگافیوں کا کام لیں، بلکہ یہ تصادم فی الحقیقت موجود ہے اور بالخصوص یورپ میں تو بہت نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اسکا یہ منشا نہیں کہ ہندوستان میں اس کا وجود نہیں ہے بلکہ اس کہنے کی اصل غرض یہ ہے کہ یورپ کے حالات ہمارے یہاں کے بہ نسبت کہیں زیادہ خراب ہیں۔ یورپ کے

بڑے بڑے اہل دماغ اس حقیقت سے واقف ہیں اور اس تصادم کی اصل نوعیت کا صاف طور پر اعتراف کرتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ سائنس سے دست و گریبان ہیں، سائنس مذہب سے دوچار ہو رہی ہے اور مذہب فنونِ لطیفہ اور سائنس دونوں سے برسرِ پیکار ہے۔ مزید وضاحت کے لئے ایک مثال لے لیجئے۔ انسان کو آرام و آسایش کی احتیاج ہوتی ہے، چنانچہ وہ اس غرض سے میز، کرسی، فرش، قالین، لیمپ اور کتابیں وغیرہ خریدتا ہے اور ان تمام سامانِ معیشت کی کیوں ضرورت ہوتی ہے؟ اس لئے کہ ان سب کے پیچھے ایک شے دماغ ہے جس کا ایک خاصہ یہ ہے کہ وہ آرام و آسایش کا طالب ہو۔ یہ احتیاج انسان کی ایک بنیادی احتیاج ہوتی ہے، ایک وحشی کو بھی اس کی ویسی ہی ضرورت ہوتی ہے جیسی ایک متمدن سے متمدن شخص کو۔ جنوبی افریقہ کے ایک بڑے ڈیل ڈول والے بھیانک صورت شخص کو دیکھو جو دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد ایک ہرن کا شکار کرکے اپنے کندھوں پر لاتا ہے اور جب سیر دو سیر گوشت کی مقدار اسکے معدے میں پہنچ جاتی ہے تو وہ ایک درخت کے سایہ تلے پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتا ہے، اسوقت اس پر آرام و راحت کے ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اور یہ کیفیت حقیقت میں بالکل ویسی ہے جو ہم میں سے ہر ایک پر اسوقت طاری ہوتی ہے جب ہم لذیذ اور خوش ذائقہ کھانے کھا کر ایک نہایت نرم اور آرام دہ بستر پر لیٹ جاتے ہیں۔ غرض ہم کو دماغ کے اس خاصہ سے جس کا کام آرام و آسایش طلب کرنا ہے ہر جگہ سابقہ پڑتا ہے۔ اب فرض کرو کہ یہی خاصہ حد سے زیادہ بڑھ جائے تو ہم آرام دہ کرسیاں، گدے دار صوفے اور ہزار ہا طرح کے سامانِ راحت خریدنے لگتے ہیں اور ان چیزوں میں روپیہ پانی کی طرح سے بہا دیتے ہیں لیکن کسی روز صبح کو ہم ذرا شہر کے اس حصہ میں ٹہلتے نکل جائیں جہاں کارخانوں اور ملوں کے مزدور رہتے ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بلوں اور ماندوں میں رہتے ہیں اور جنکا نام انہوں نے مکان رکھ لیا ہے وہ سڑی گلی چیزیں کھاتے ہیں جنہیں وہ کھانوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ غرض جسمانی

اور اکثر وبائی اعتبار سے وہ نہایت ذلیل اور پست حالت میں رہتے ہیں. ایک طرف ہمارے پاس تو عیش و آرام کے تمام سامان موجود ہیں، دوسری طرف وہ غریب اور نادار لوگ ہیں جنکو اپنے سامان معیشت میں سے اگر ہم ایک حصہ دیدیں تو انکے لئے بہت کچھ آرام و آسایش اور مسرت و خوشی کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہی ہے جہاں آرام و آسایش کا تصادم مذہب سے آکر ہوتا ہے اور ایسے ہی موقع کیلئے حضرت مسیح نے فرمایا تھا کہ "اپنے ہمسایہ سے ویسی ہی محبت رکھو جیسی خود اپنے سے" اور اگر اس آرام و آسایش میں فن لطیف اور حسن و جمال کا لحاظ نہ رکھا جائے تو وہی کمرہ بجائے ایک خوشنما اور آرام دہ جگہ ہونے کی ایک اثاثہ البیت کی دوکان بن جائے۔

لہذا اگر دماغ آرام و آسایش، فنون لطیفہ اور مذہب کا ایسا توازن قایم رکھے جس سے ایک طرح کا انیں باہم امتزاج پیدا ہو جائے اور کسی طرح کا تصادم نہونے پائے تو اسوقت یہ کہا جائیگا کہ دماغ نے ایک ایسی حرکت کیطرف قدم بڑھایا ہے جو فلسفہ کی حرکت سے مشابہ ہے اس لئے کہ اگر فلسفہ امتزاج کیطرف قدم نہ بڑھائے تو پھر اسکی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی ہے یہ خیال کم سے کم ہندو فلسفہ میں تو ضرور پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں ہندوستان میں فلسفہ کا مفہوم "آتما ودیا" یعنی علم روح لیا جاتا تھا اور اسکو کائنات کے ان اختلافات کی اندر وحدت میں جلوت اور جلوت میں وحدت کا تماشہ نظر آتا تھا۔

لیکن ہمیں اس امتزاج کے مفہوم کو اور صاف کر لینا چاہئے۔ اسقدر تو یقینی ہے کہ ان مختلف اجزا میں کوئی تصادم نہونا چاہئے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انیں سے کوئی اہم جزو فوت نہ ہو جائے۔ اس امتزاج اور فلسفہ کا مقصد یہ ہے کہ دماغ کی ان تمام مختلف حرکتوں میں سے کوئی حرکت ضائع بھی نہو اور پھر بھی انیں ایک طرح کا باہم اتحاد و اتفاق پایا جائے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی سے یہ کہا جائے کہ خرگوش کے ساتھ بھاگتے جاؤ اور کتوں کے ساتھ شکار میں لگی رہو۔ اس عالم آب و گل میں یہ معجزہ جہاں دو ہی ٹانگوں سے یہ یک وقت

دو طرح کی حرکتوں کا کام نہ لیا جاتا ہو، کم سے کم محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ لیکن دماغ کی دنیا میں یہ کوئی غیر معمولی معجزہ نہیں ہے اور یہی وہ امتزاج ہے جسکا ذکر بالا میں اب تک ذکر ہوتا آیا ہے۔ اسی کے متعلق سری کرشن جی گیتا میں فرماتے ہیں کہ وہ

"اس سمندر کی طرح ہے جس میں تمام زمین کا پانی آکر گرتا ہے اور پھر بھی اس کے کناروں کو کاٹکر یہ نہیں نکلتا۔ اس میں تمام دریاؤں کا پانی آکر جمع ہوتا ہے لیکن اس سے انمیں کوئی غیر معمولی اضافہ نہیں ہوتا۔ اسی سمندر میں تمام عالم محسوسات اپنا اثر ڈالتے ہیں اور جیسا اسے پاتے ہیں ویسا ہی اسے رہنے دیتے ہیں اور اپنی خراج بھی اس سے لے لیتے ہیں لیکن وہ سمندر جوں کا توں رہتا ہے۔"

یہ کیسے صاف اور بہتر الفاظ ہیں جنمیں دماغ کی اس امتزاجی کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اس پر مزید بحث کسی آئندہ مضمون میں کیجائیگی، سردست ہم اسکو یہیں پر چھوڑتے ہیں اور اس اصل موضوع کیطرف رجوع کرتے ہیں کہ آیا ہند و فلسفہ میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ زندگی کو بہ حیثیت مجموعی سنوار سکے؟ نہ یہ کہ وہ صرف دماغی نشو و نما کیلئے ایک آلہ کار ہو۔ بے شک جہانتک ہمارا خیال ہے ہند و فلسفہ کے عمیق میلانات کو اگر صحیح طور پر لیا جائے تو اس سے یقیناً دماغ میں ایک ایسی حرکت پیدا ہوگی جو ہم کو اس امتزاج کیطرف لیجائیگی۔ لیکن یہ بات صرف ہند و فلسفہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام بڑے بڑے فلسفوں میں پائی جاتی ہے۔ پھر بھی صرف تحریک کا پیدا کر دینا ہی کافی نہیں ہے۔ اصل ضرورت یہ نہیں ہے کہ محض منزل مقصود کا پتہ بتا دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ راستہ کو صاف اور ہموار بھی کیا جائے اور خونچکاں پیروں کو خار و خس سے آسانی کیساتھ گزر جانے کا موقع بھی دیا جائے۔ فلسفہ کا صرف یہی کام نہیں ہے کہ وہ روشن ستارے کی طرح آسمان کی بلندی سے چمکتا رہے بلکہ اسکو مثل اس مشعل کے ہونا چاہئے جو سخت اور دشوار گزار راستوں کی رہنمائی بھی کرے پچھلے مضمون

ہیں ہم نے ذکر کیا تھا کہ "کٹھا اپنشد" میں حقیقت کے راستہ کا کیا مفہوم لیا گیا ہے لکھا ہے کہ وہ "استرے کی دھار کی طرح تیز ہے جس سے گذرنا سخت دشوار ہے" ہندوستان کے بڑے بڑے دانوں نے اپنی اسی کیفیت میں "یوگ" کا طریقہ تصور نکالا جو بہ یک وقت ستارے کا کام بھی دیتا ہے اور مشعل کا بھی۔ ستارے کی حقیقت متعدد بار دریافت ہوئی لیکن مشعل کی روشنی سب سے پہلے "یوگ" ہی نے روشن کی۔

لیکن اس پر ہم کو بہت زیادہ مطمئن نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس مشعل سے راستہ بالکل آسان ہو گیا۔ سخت اور دشوار چڑھاؤ اور تیز اور خطرناک آثار ہماری راہ میں اب بھی موجود ہیں۔ یہی "یوگ" کا طریقہ تصور ہے جس میں جسم اور دماغ دونوں کی ترتیب و نظم بتائی گئی ہے۔ حضرت مسیح کا ایک قول ہے "بلائے بہت سے جاتے ہیں لیکن تھوڑے ایسے ہیں جو چنے جاتے ہیں" ہم سب اسی کشمکش میں دانستہ یا بلا دانستہ مبتلا ہیں لیکن ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو کامیاب ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک مختلف نقطہ سے چلتا ہے اور ہر ایک کی حالت یکساں نہیں ہوتی۔ ہم میں سے بعض طبیعت کے لحاظ سے ذہین ہوتے ہیں، بعض جسمانی اعتبار سے مضبوط ہوتے ہیں۔ بعض بہت سریع الحس ہوتے ہیں، بعضوں کی قوت ارادی بہت زبردست ہوتی ہے بعض اس حیثیت سے کمزور ہوتے ہیں۔ عدم مساوات کا یہ مسئلہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ابتدا ہی سے یہ ہمارے سامنے موجود ہے۔

ہمارے ہندوستانی ارباب فکر نے اس دشوار طلب مسئلہ کا نہایت جرأت اور دلیری سے مقابلہ کیا اور اسی بنا پر انہوں نے "کرم" کا قانون دریافت کیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ ہماری موجودہ زندگی ایسی ایسی بہت سی زندگیوں میں سے ایک ہے۔ لیکن یہ قانون بھی اس مسئلہ کی پوری دشواری کو حل نہیں کر سکا۔ اس سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ عدم مساوات کا باہم جو فرق نظر آتا ہے، وہ اتنا بڑا نہیں بلکہ اس سے کم درجہ ہے۔ لیکن اسمیں بھی آگے چلکر ایک نقطہ ایسا آیا جہاں دماغ کی حرکت بالکل رک گئی اور وہ اس سے آگے نہ چل سکا۔ راستہ کا کہیں پتہ

نہ چلتا تھا، قدم کے نشانات اسقدر دھندلے اور ہلکے تھے کہ نظر نہ آتے تھے۔ لیکن یہ قانون کرم بھی ویسا ہی ہے جیسے ارتقا کا قانون ہے۔ سلسلہ ارتقا میں ہم پیچھے ہٹتے چلے جاتے ہیں لیکن سرے کا کہیں پتہ نہیں چلتا، اور ہم صرف قیاس سے کام لیکر بس کر دیتے ہیں۔ لیکن اس سے قانون ارتقا کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس قانون کا عمل ایک حالت سے دوسری حالت کے درمیان برابر دیکھتے ہیں، ہمیں اسکی حرکت کا پورا یقین ہوتا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ حرکت اصلی اور حقیقی ہے۔ یہی حال بالکل قانون 'کرم' کا ہے۔ ہم اس عدم مساوات کا پتہ لگاتے چلے جاتے ہیں اور دیکھتے جاتے ہیں کہ کس طرح ہمارا 'کرم' ہمارے دوسرے افعال و اعمال کا ذمہ وار ہے۔ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔ اور جو کچھ ہوتا ہے حقیقی ہوتا ہے اسی کے ساتھ ہمارے ہندوستانی ارباب فکر نے 'ماورا' کی حقیقت کا بھی نہایت کھلے دل سے اعتراف کیا۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ انسانی دماغ کی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں جاسکتا۔ اس کہنے سے انکی تحقیر منظور نہیں بلکہ یہ انکا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ اس لئے کہ وہ دماغ کی اس آخری حد تک گئے جہاں تک کوئی بڑے سے بڑا دماغ پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ اپنشدوں میں ہم بڑے بڑے دماغوں سے اکثر یہ آواز سنتے ہیں کہ "نیتی نیتی" (یہ نہیں یہاں نہیں) کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسی حد تک پہونچے کہ اس سے آگے جب انہوں نے بڑھنا چاہا تو دماغ یک بیک مڑکر پیچھے ہٹنے لگا اس لئے کہ وہ اس آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔

گذشتہ مضمون میں ایک خاص طریقہ "تسور درشن" کا ذکر کیا گیا تھا جسمیں یہ بتایا گیا تھا کہ ذہن اور وجدان باہم ملکر کیسا اثر پیدا کرتے ہیں آج ہم ایک اور تخیل سے روشناس کرتے ہیں، جو ہندو فلسفہ کی جان ہے۔ اسکا نام 'آتمہ ودیا' ہے اور اگر اسے ہم کسی حد تک بھی ذہن نشین کرلیں تو ہم نہایت آسانی کے ساتھ اس سوال کا جواب دیسکتے ہیں جو ہم نے اس مضمون کے شروع میں کیا ہے۔ 'ودیا' کے لفظی معنی علم کے ہیں اور 'آتمن' کے معنی نفس یا روح کے ہوسکتے ہیں لہذا آتمہ ودیا کے لفظی معنی ہوئے علم نفس یا علم روح۔ لیکن یہاں نفس یا روح کے معنی

'برہید آرانیک' کی اصطلاح میں اس ہمہ گیر احساس کے ہیں جو انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے اگرچہ اسکا صحیح ترجمہ بہت دشوار ہے لیکن پھر بھی 'آتمہ ودیا' کے مفہوم کو اگر کوئی لفظ کسی حد تک ادا کرسکتا ہے تو وہ احساس نفس یا احساس روح ہے۔ فلسفہ کا لفظ کسی ہندوستانی زبان کا لفظ نہیں ہے اسکا اگر کوئی مرادف سنسکرت زبان میں ہوسکتا ہے تو یہی 'آتمہ ودیا' ہوسکتا ہے صدیوں سے ہم سنتے آئے ہیں کہ تمام علوم او فلسفہ کا مقصد انسان میں احساس نفس پیدا کرنا ہے اور احساس نفس دماغ کی ایک اندرونی کیفیت کا نام ہے۔ دماغ کیلئے صرف یہی کافی نہ تھا کہ وہ تمام خارجی اثرات کا استقصا کرتا اور ان میں ایک طرح کا امتزاج پیدا کرتا بلکہ اندرونی حیثیت سے بھی اسے انسان کے احساسات کو قابو میں لانا ضرور تھا۔ اپنشدوں میں دو قسم کے 'آکاشوں' یعنی آسمانوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک خارجی دنیا کا ہے اور دوسرا اندرونی دنیا کا۔ بار بار کہا گیا ہے کہ اس اندرونی عالم میں اتحاد و امتزاج پیدا کرنا اسی قدر ضروری ہے جسقدر خارجی دنیا میں۔ اور نہ صرف یہی بلکہ اندرونی امتزاج کے بغیر خارجی امتزاج ایک بیکار شے ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تمام ہندوستانی فلسفوں میں ایک طرح کی باطنیت پائی جاتی ہے اور اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندو فلسفہ صرف دماغی پرواز ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے دماغ کی پوری کیفیت اور حالت کو بیدار کرنا مقصود ہے۔ سردست 'آتمہ ودیا' کی بحث کو ہم یہیں پر چھوڑے دیتے ہیں اور جب اسکا مناسب موقع آئیگا اسوقت اسپر تفصیل سے نظر ڈالی جائیگی۔ لیکن اگر ہم 'درشن' کے طریقہ تصور اور 'آتمہ ودیا' کے تخیل کو ساتھ ساتھ رکھیں تو اس وقت ہم کسی قدر اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہندو فلسفہ کس حد تک انسانی زندگی سے قریب رہا ہے اور آج بھی ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں

اعلیٰ مغربی تعلیم

ایک پرمغز و پر اثر مضمون جو جناب حمید احمد صاحب بی۔ اے، رجسٹرار جامعہ عثمانیہ نے انجمن مذاکرہ علمیہ حیدرآباد کے ماہانہ جلسہ منعقدہ ستمبر ۱۹۳۶ء میں پڑھ کر سنایا تھا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم اور تہذیبی (Cultural advancement) ترقی کے متعلق میں آپنے ناچیز خیالات حوالۂ تحریر کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ سامعین کو ان سے وحشت نہ ہو۔ یہ خیالات میں اپنے دماغ کی چار دیواری تک محدود رکھتا مگر آپ کے سرگرم معتمد صاحب نے مجھے مجبور کیا ہے کہ اس مضمون پر اہل علم کی اس مجلس میں لب کشائی کی جرأت کروں جس میں میرے سوا ہر شخص کسی نہ کسی شعبہ میں فرد ہے۔ بہرکیف اس مختصر تمہید اور معذرت کے ساتھ میں نفس مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ دور حاضرہ میں ہندوستان کے مسلمان دنیا کی پس ماندہ قوموں سے بھی پیچھے رہ گئے ہیں اور ادبیات، سائنس اور فنون لطیفہ میں انہوں نے کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا ہے جس کے لئے عالم متمدن انکا مرہون منت ہو یعنی بالفاظ دیگر ان کی قوت تخلیقی بالکل سلب ہو گئی ہے۔

اعلیٰ تعلیم سے ہندوستان میں مراد اس منزل تعلیم سے لیجاتی ہے جو منزل فوقانی کے بعد شروع ہوتی ہے اور جس کی انتہا ایم۔ اے کے امتحان پر ہے۔ اس شش سالہ مدت میں سے دو سال انٹرمیڈیٹ کے ہیں، جنکا شمار فی الحقیقت منزل فوقانی میں ہونا چاہئے، کیونکہ اس میں طالب علم میں اس قدر استعداد نہیں ہوتی کہ اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اسکی حالت کم و بیش مدرسوں کے بچوں کی سی ہوتی ہے۔ اسی لئے گزشتہ دس سال سے انٹرمیڈیٹ کی جماعتیں کالجوں سے علیحدہ ہو کر مدارس کی بالائی جماعتوں کے ساتھ ضم کیجا رہی ہیں۔ گویہ اصول بالکلیہ

پسند نہیں کیا گیا ہے اور بعض ماہران تعلیم کو اعتراض ہے کہ اس طرز عمل سے ڈگری کے امتحانوں کے معیار کے گرنے کا اندیشہ ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد دو سال بی اے کی تعلیم میں صرف ہوتے ہیں، بعض یونیورسٹیوں میں سہ سالہ آنرز کورس بھی ہیں مگر ان میں طلبہ کی تعداد بہت کم ہوتی ہے بی اے کے معمولی دو سالہ کورس میں انگریزی لازمی ہے اور اسکے علاوہ طالب علم دو اور مضمون لیتا ہے۔ ان مضمونوں کے متعلق وہ سرسری معلومات حاصل کرتا ہے اور اس کا مبلغ علم مقررہ درسی کتابوں اور اساتذہ کے لیکچروں تک محدود ہوتا ہے جن کے نوٹ وہ اثنائے درس میں صحیح یا غلط اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتا ہے۔ کسب کمال تو کجا، نہ تو استادوں نہ طالب علموں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ کسی خاص علم سے مناسبت حاصل کریں یا اس میں ذوق پیدا ہو۔ سب امتحان کی مشین کے بندے ہیں۔ استادوں کو یہ فکر ہوتی ہے کہ نتائج اچھے ہوں ورنہ بدنامی ہوگی اور حکام مافوق بازپرس کرینگے۔ طلبہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ جلد امتحان پاس کر کے کسی کام سے لگ جائیں۔ اس تگ و دو میں حقیقی تعلیم کی جو گت بنتی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ تعلیمی حلقوں میں عرصہ سے یہ بحث چلی جاتی ہے کہ تعلیم کی حقیقی غایت کیا ہے۔ طالب علم کو دنیا کی کشمکش کے لئے تیار کرنا یا ایسے حقیقی معنوں میں انسان بنانا۔ دونوں خیالات کے حامیوں کی تعداد کثیر ہے اور یہ بحث کبھی ختم نہ ہوگی۔ مگر حقیقت دونوں کے بین بین ہے۔ تعلیم کے اعلیٰ نصب العین سے قطع نظر حصول تعلیم میں طالب علم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دولت، اقتدار، اثر حاصل کرے۔ مگر جامعات ہند میں بی۔ اے تک جو تعلیم ہوتی ہے اس سے ان مقاصد کا حصول دشوار ہے اور طالب علم میں بی اے پاس کرنے سے نہ تو تحقیق اور دانشمندی کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ دماغی توازن حاصل ہوتا ہے جو حقیقی تعلیم یافتہ شخص کا طغرائے امتیاز ہے اسی لئے یورپ کی جامعات کے برعکس، جہاں ایم اے کی ڈگری بغیر کسی مزید امتحان کے، اعزازی طور پر دیدی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ایم۔ اے کا دو سالہ نصاب رکھا گیا ہے تاکہ طالب علم صرف ایک مضمون لیکر اس میں اعلیٰ استعداد بہم پہنچانے کی کوشش کرے یعنی اس درجہ تک پہنچے جو انگلستان کے

نظام تعلیمی میں بی۔اے آنرز کا ہے۔ مگر ہمارا ایم۔ اے کا امتحان بھی محض کتابی ہے۔ طالب علم کا رجحان تحقیق اور اجتہاد کی طرف نہیں ہوتا اور حسب سابق وہ اتنے ہی کو کامیابی کا ذریعہ خیال کرتا ہے۔ حال میں جامعات نے ایم۔ اے میں مقالوں کے پیش کرنے کی اجازت دی ہے جو تحقیقات پر مبنی ہوں۔ مگر مقالوں کا پیش کرنا لازمی نہیں ہے اس لئے ہماری سہل پسندی ریسرچ کی سنگ لاخ راہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

امور مذکورہ بالا سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا اطلاق صرف ایم۔ اے کی ڈگری ہو سکتا ہے اور اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کی ترقی کا حقیقی اندازہ انکی اس تعداد سے ہو سکتا ہے جو اس منزل تعلیمی تک پہنچی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد سات کروڑ سے کچھ ہی کم ہے جن میں پندرہ فی صدی کے اصول کے لحاظ سے قابل تعلیم افراد کی تعداد ایک کروڑ سے کچھ اوپر ہونی چاہئے۔ میں چند اعداد آپ کے ملاحظہ میں پیش کروں گا جن سے معلوم ہوگا کہ آپ کی قوم سے کتنے اشخاص نے اس سال ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ میں نے عربی و فارسی کے ایم۔ اے علیحدہ دکھائے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دیگر علوم میں کتنے مسلمانوں نے ڈگریاں لی ہیں۔ دوسرے مضامین کے مقابلہ میں فارسی اور عربی کے نصاب آسان ہیں اور اکثر اشخاص صرف ڈگری کے لالچ سے عربی خصوصاً فارسی میں امتحان دے دیا کرتے ہیں اور امتحان کچھ ایسا آسان ہوتا ہے کہ اکثر پاس ہو جاتے ہیں۔ سائنس کی تعداد بھی علیحدہ کر دی گئی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ جن طبعی علوم سے ہمارے بزرگوں کو شغف تھا اور جن میں انہوں نے یورپ کی رہنمائی کی تھی، آج انکی طرف ہماری توجہ کس حد تک ہے۔

یونیورسٹی	سائنس	عربی و فارسی	دیگر مضامین
علی گڑھ	۰	۱۷	۴۳
الہ باد	۰	۲	۲
لکھنؤ	۰	۰	۰

یونیورسٹی	سائنس	عربی و فارسی	دیگر مضامین
پنجاب	۴	۲	۱۳
ناگپور	۰	۱	۰
پٹنہ	۰	۱	۷
مدراس	۰	۱	۰
بمبئی	۰	۳	۱
ڈھاکہ	۰	۶	۱۳

اعلیٰ تعلیم کی جو حدود میں نے معین کی ہیں انکے لحاظ سے یہ اعداد مطلق امید افزا نہیں اور ان سے یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ مسلمانوں میں من حیث القوم علوم سے کوئی ایسی دلچسپی نہیں ہے اور تعلیم کی غایت انکے یہاں صرف یہی ہے کہ بی۔ اے پاس کرکے سرکاری نوکریاں کریں یا اس کے بعد قانون پڑھکر وکیلوں کی تعداد کثیر میں اضافہ کریں۔ اگر ہم میں علم کا حقیقی شوق ہوتا تو ہمارے نوجوان بی اے کا امتحان معراج کمال نہ خیال کرتے اور ایک قدم آگے بڑھانے کی کوشش کرتے بلکہ ایم۔ اے پاس کرنیکے بعد بھی علمی مشاغل میں انہماک رکھتے۔

بی۔ اے تک مسلمان تعلیم میں چنداں پس ماندہ نہیں ہیں ۱۹۲۲ء میں آرٹس کالجوں میں طلبہ کی جملہ تعداد ۵۰۲۶۰ تھی جن میں سے مسلمان ۶۴۷۲ یعنی قریب ۱۱ فی صدی تھے اسی طرح فنی مدارس کے ۱۴۹۱۳ طلبہ میں سے ۱۷۲۱ یا قریب ۱۱ فی صدی مسلمان تھے۔ حالانکہ آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کی تعداد کم از کم دگنی ہونی چاہیئے تھی۔ فنی مدارس میں مسلمان زیادہ تر قانونی کالجوں میں ہوتے ہیں۔ دیگر مفید پیشوں مثلاً طب، انجنیرنگ، زراعت وغیرہ کے مدارس میں مسلمان خال خال نظر آتے ہیں۔ اعداد مذکور کا سال گذشتہ کے اعداد سے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان رفتہ رفتہ ترقی کر رہے ہیں جس سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھنے کی بھی کوشش کرینگے۔ مگر ترقی کے آثار زیادہ تر نمایاں پنجاب و

صوبجات متحدہ میں ہیں جہاں کے مسلمان پہلے ہی سے تعلیم کی طرف متوجہ ہوچکے ہیں سنہ ۱۹۲۴ء میں صوبجات متحدہ میں آرٹس کالجوں میں مسلمان طالب علموں میں ۹ء۳ فی صدی کا اضافہ ہوا۔

ایم۔اے کی تعلیم کے علاوہ شغف علمی دریافت کرنیکے دو اور ذرائع ہوسکتے ہیں یعنی علمی امتحانات میں تمغوں اور امتیازات کا حاصل کرنا اور تصنیف و تالیف اور علمی تحقیقات سے علم کی خدمت گزاری یہ ایک نہایت دردناک داستان ہے۔ جامعات کے سال نامے اٹھا کر دیکھئے اور صفحوں کے صفحے الٹ جائیے مگر تمغوں، انعامات، وظائف اور فیلوشپس کی فہرستوں میں مسلمانوں کا نام مشکل سے نظر آئیگا۔ البتہ جو تمغے یا انعام انکے لئے یا عربی فارسی کے لئے مخصوص ہیں انہیں ملجاتے ہیں۔ بمبئی یونیورسٹی کی رپورٹ میرے پیش نظر ہے۔ انعامات کی فہرست چار صفحوں میں ہے مگر اس میں کسی ایسے مسلمان کا نام نظر نہیں آتا جسے غیر مسلموں کے ساتھ مسابقت میں کوئی انعام یا تمغہ ملا ہو۔ اس کے بعد کلکتہ یونیورسٹی پر نظر ڈالیئے۔ اس یونیورسٹی کا اعلیٰ ترین اعزاز (Premchand Roychand - Studentship) ہے جس کے حاصل کرنے والوں کی یہ عزت ہے کہ انکے نام یونیورسٹی کے سال نامہ میں فیلوز کے نام کے بعد رکھے جاتے ہیں اور انہیں چودہ سو روپیہ سالانہ وظیفہ تین سال تک علمی تحقیقات کے لئے مل سکتا ہے اس وقت تک ایک سو اشخاص اس وظیفہ سے مستفید ہوئے ہیں مگر ان میں ایک مسلمان بھی نہیں، حالانکہ اس فہرست میں چار ایسے اشخاص کے نام ہیں جو عیسائی یا اینگلو انڈین ہیں۔ علمی تحقیقات کے متعلق کلکتہ یونیورسٹی میں دو اور انعامات ہیں۔ جوبلی ریسرچ پرائز، جو اتبک کسی مسلمان کو نہیں ملا اور دوسرا گریفتھ میموریل پرائز جو مسلمانوں میں صرف اتبک غلام یزدانی صاحب ایم۔اے کو ان کے مضمون "جہاں آرا" کے صلہ میں ملا ہے۔ مدراس یونیورسٹی میں بھی اب تک کسی مسلمان کو اس قسم کا کوئی انعام نہیں ملا۔ اس یونیورسٹی نے سنہ ۱۹۱۷ء سے لیکر اب تک ۵، سے ۱۵۰

روپیہ ماہوار تک کے ۶۴ وظائف ریسرچ کے لئے دئے ہیں مگر کسی مسلمان کو اب تک کوئی وظیفہ نہیں ملا۔ ہندوستان میں سائنس کی تعلیم اور ریسرچ کی اعلےٰ ترین درسگاہ (Indian Institute of Science, Banglore) ہے جسمیں تین سال کی ریسرچ کے (Associate) کا امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ اسوقت تک ۱۵۳ اشخاص کو یہ امتیاز حاصل ہو چکا ہے جن میں ایک انگریز عورت اور ایک پارسی عورت بھی شامل ہیں مگر وائے برحال ما کہ اب تک ایک مسلمان کو بھی یہ امتیاز حاصل نہ ہوا حالانکہ مستحق طالب علموں کو وظیفے بھی دئے جاتے ہیں۔ ریسرچ کے علاوہ اس درسگاہ کے مختلف شعبوں میں تعلیم پانیکے بعد سندیں بھی دی جاتی ہیں [illegible] میں ایک مسلمان طالبعلم نے علمی کیمیا میں سند حاصل کی تھی، اس کے بعد پھر کسی مسلمان کو توفیق نہ ہوئی کہ اس درسگاہ کا رخ کرتا، حالانکہ ۹۰ غیر مسلم سائنس کے مختلف شعبوں میں سندیں حاصل کر چکے ہیں۔ دوسری یونیورسٹیوں کے متعلق بھی میں اعداد فراہم کر کے پیش کر سکتا مگر نتیجہ وہی ہوگا، یعنی علم کی خدمت سے مسلمان گریز کرتے ہیں۔

علم کی دوسری خدمت جس میں مسلمان کوتاہی کرتے ہیں، یہ ہے کہ اشاعت علم میں ان کا کوئی حصہ نہیں اور کالجوں اور یونیورسٹی کے اساتذہ کی جماعت میں انکی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ سال ناموں میں ہر ایک کالج کے اساتذہ کے نام مندرج ہیں مگر پنجاب کے سوا کہیں کہیں مسلمان استاد اس قدر تلاش کے بعد ملتا ہے جیسے کہ سمندر میں موتی۔ حالانکہ ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کی تعداد روز افزوں ہے اور گورنمنٹ کی موجودہ پالیسی کے لحاظ سے یونیورسٹیوں یا (Indian Educational Service) میں جو جگہیں انگریزوں کی علیحدگی سے خالی ہوتی ہیں انکے لئے قابل ہندو ہر جگہ ملجاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ Indianisation دراصل (Hinduaisation) ہے لیکن ہمیں حرف گیری یا دم مارنے کا موقعہ نہیں ہے کیونکہ از ماست کہ بر ماست۔ نہ ہم گورنمنٹ کو مورد الزام قرار دیسکتے نہ ہندوؤں کو۔ ہم قابلیت پیدا کرنیکی کوشش نہیں کرتے جو ان خدمتوں

نے لئے ضروری ہے، یا اگر قابلیت ہو تو حکومت کا نشہ جو ابتک بدقسمتی سے ہمارے دماغوں میں موجود ہے، ہمیں مجبور کرتا ہے کہ "میاں جی گری" چھوڑ کر کوئی ایسی خدمت تلاش کریں جہاں اپنے سے کم تر درجہ لوگوں پر حکومت کرنے کا موقعہ ملے۔ ہماری غفلت کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کالجوں میں ہمارے بچوں کا کوئی پرسان حال نہیں اور اگر انکے ساتھ سختی کا برتاؤ ہو تو کوئی چارہ کار نہیں۔ اگر عربی فارسی کے کم تنخواہ والے مدرسوں کے علاوہ کالجوں میں مسلمان اساتذہ کی کافی تعداد ہوتی تو مسلمان لڑکوں کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ ناممکن تھا۔ دوسرا نقصان جو ہمیں پہنچتا ہے یہ ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کی جماعت میں ہماری انتہائی کمی کی وجہ سے یونیورسٹیوں کے انتظام میں ہمیں کوئی دخل نہیں۔ کیونکہ انکی مختلف عاملانہ اور نصاب مقرر کرنے والی مجالس میں اساتذہ کی تعداد غالب ہے گورنمنٹ اپنی عنایت سے چند مسلمانوں کو مختلف یونیورسٹیوں کی Senate ممبری کے لئے نامزد کر دیتی ہے، مگر اولاً انکی تعداد نہایت قلیل ہوتی ہے اور ثانیاً اپنی علمی کم مائگی کی وجہ سے مجالس شعبہ Faculties یا مجالس نصاب میں شریک نہیں ہو سکتے اور اگر شریک ہوئے تو ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا یونیورسٹیوں کی اندرونی حالات سے جو اصحاب واقف ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ عدم سرپرستی کی وجہ سے مسلمان طلبہ کو کیا نقصان پہنچتا ہے اور انکے خوش نصیب بھائی جن کے مربی یونیورسٹی کی مجالس میں موجود ہیں، ان سے ہر قسم کی مدد کی امید کر سکتے ہیں۔ سب سے بڑا نقصان جو سر رشتہ تعلیم یا جامعات میں دخل نہ رکھنے سے ہمیں پہنچتا ہے یہ ہے کہ ان درسگاہوں کا نصب العین بالکل ہندوانہ ہو جاتا ہے اور جو تحریر یا تقریر پڑھئے معلوم ہوتا ہے کہ سات کروڑ مسلمان کسی شمار میں نہیں یا ہندوستان میں بستے ہی نہیں۔ ہندوستان کی جامعات کے ذرائع آمدنی زیادہ نہیں، مگر جو کچھ ہیں ان سے ہندوؤں کے علوم وفنون کی اشاعت اور احیاء کا کام لیا جا رہا ہے حالانکہ اگر انکی انتظامی جماعتوں میں ہمارا کوئی اثر ہوتا تو السنہ وعلوم اسلامی کے تحقیقات کے لئے بھی کافی انتظام ہو سکتا ہے سر رشتہ تعلیم کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ اس میں سے انگریزی عنصر روز بروز مفقود ہوتا جاتا ہے،

اور انگریزوں کی جگہ ہندو لے رہے ہیں۔ اسکے علاوہ تعلیم اب منتقل شدہ صیغوں میں سے ہے جو برٹش انڈیا کے مختلف صوبوں میں وزرا کے تحت میں ہے جو زیادہ تر ہندو ہیں اور وزرا پر اگر کسی قسم کا دباؤ ہے تو مجالس واضع قوانین کا جن میں ہندو عنصر غالب ہے۔ اگر مسلمانوں نے ذرا بھی غفلت کی اور اپنے حقوق کی حفاظت نہ کی، تو وہ دیکھینگے کہ جو مدارس گورنمنٹ نے خاص انکے لئے مختلف صوبوں میں قایم کئے تھے، تخفیف اخراجات کی پالیسی کے سب سے پہلے شکار ہونگے مختلف حیلوں سے مسلمان معائنہ کنندہ عہدہ داروں اور مدرسوں کی تعداد، جو پہلے ہی سے کم ہے اور گھٹ جائیگی، نصاب میں ہندوانہ رنگ غالب ہوتا جائیگا یا یہ کہا جائیگا کہ اردو کی تعلیم سے مسلمان طلبہ پر ایک بیجا بار پڑتا ہے۔

اب تصنیف و تالیف کو لیجئے اور دیکھئے کہ ہندوستان کی نشأۃ جدیدہ میں آپ کا کیا حصہ ہے۔ مضمون کا یہ حصہ چار ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ادبیات، علمی تحقیقات، فنون لطیفہ، صحافت اُردو ادب عمر کے لحاظ سے سلطنت انگریزی کا معاصر ہے۔ مگر غور کیجئے کہ جو ادب ہندوستان میں مسلمانوں کے علوم و فنون کا وارث ہے اور جو قریب قریب ڈیڑھ سو سال سے یورپی اثرات سے متاثر ہو رہا ہے، اس کی کل کائنات ایک قطرۂ خون یعنی عاشقانہ شاعری کے علاوہ اور کیا ہے مشرق اور مغرب کے تصادم سے مسلمانان ہند کے خیالات میں جو ہیجان پیدا ہوا، اس کی وجہ سے نشأۃ جدیدہ کے آثار رہویدا ہوئے تھے۔ سید احمد خاں علیہ الرحمتہ نے سلیس اور غیر مقفے اردو نثر کی بنیاد ڈالی جس کی بدولت اُردو میں علمی زبان بننے کی رفتہ رفتہ صلاحیت پیدا ہوگئی حالی نے مسدس لکھکر سوتوں کو جگایا شبلی نے عہد اولین کے مسلمانوں کے شاندار کارنامے زندہ کرکے اُردو میں تاریخ نویسی کی بنیاد ڈالی۔ عبدالحلیم شرر نے تاریخی ناول نگاری کا آغاز کیا۔ مگر افسوس ہے کہ اس نشأۃ سے جو امیدیں تھیں وہ بر نہ آئیں اور جن بزرگوں کے میں نے نام لئے ہیں انہوں نے اپنے جانشین نہ چھوڑے۔ حالی کی نقل اکثر شعر گو اصحاب نے کی مگر ان میں وہ سوزش دروں نہ تھی جو شاعر کے جذبات کی محرک ہے، اس لئے ان کی شاعری کی نہ کوئی

نعت پر اور نہ ہو سکتی ہے۔ شعر کہنے والے اب بھی بہت ہیں مگر سب اپنی کوششیں صرف ایک صنف کلام یعنی تغزل پر صرف کر رہے ہیں اور پرانی لکیر کے فقیر بنے ہوتے ہیں۔ انکے دیوان شروع سے آخر تک دیکھئے مگر ایک نیا خیال یا تشبیہ یا استعارہ نہ مل سکیگا۔ اردو شاعری کا آغاز اس زمانہ میں ہوا جب کہ دہلی کی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ بادشاہ کبھی مرہٹوں کا دست نگر تھا کبھی انگریزوں کا۔ رعایا پریشان اور خراب حال، امن و امان مفقود۔ قدرتی طور پر اس آشوب زمانہ کی شاعری احیاء قومی کا باعث نہ ہو سکتی تھی یعنی وہ کام نہ کر سکتی تھی جو انیسویں صدی کے آغاز کے جرمنی کے شاعروں نے کیا جب کہ نپولین (Napoleon) نے اسے تباہ و برباد کر دیا تھا، یا جو عہد ایلزبیتھ (Elizabeth) کے انگریز شاعروں نے کیا یا اطالیہ میں دانتے (Dante) نے کیا موجودہ اردو شاعری سے قوم کی افسردگی اور مردہ دلی کے بڑھنے کا اندیشہ ہے اور کسی روحانی یا مادی نفع کی امید نہیں۔ اس وقت سلے دے کے ہم میں صرف ایک شاعر یعنی حضرت اقبال ہیں جن کی نظم میں مغرب اور مشرق کی بہترین خصوصیات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اقبال نے جو نظمیں قدیم طرز پر لکھی ہیں ان میں بھی انکے مطالعہ انسانی اور مشاہدہ فطرت کا اثر ظاہر ہے۔ مگر سات کروڑ افراد میں ایک حقیقی شاعر کا وجود اس قوم کے لئے مائہ فخر نہیں ہو سکتا۔ ہندی مثل ہے کہ "نہ ایک پوت، پوت کہاؤنے نہ ایک آنکھ، آنکھ" ناول نویسی کا میدان شرر اور سرشار کے بعد بالکل خالی ہو گیا۔ ناول اور ڈراما، ادب کے دو ایسے اصناف ہیں جن سے قوم کو گوناگوں فوائد پہنچ سکتے ہیں۔ بنگالی اور ہندوستانی کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں صدہا ناول اور ڈرامے لکھے جا رہے ہیں اور لکھے جا چکے ہیں۔ بنگالی ناولوں کے انگریزی ترجموں سے آپ انکی خوبی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اردو میں ناولوں کی تعداد غالباً دوسری زبانوں سے زیادہ ہی ہوگی۔ مگر وہ جس قسم کے ہوتے ہیں، ان سے انکا نہ ہونا بہتر ہے۔ افسوس ہے کہ اچھے انگریزی ناولوں یا ڈراموں کے ترجمے بھی اردو میں نہیں ہوتے کہ ان سے ہمارے ادبی خزانوں میں اضافہ ہو۔ ڈراما کی طرف تو ہم نے مطلق توجہ نہیں کی۔ یہانتک کہ ہم

ہیں سے کسی فرد یا جماعت کو یہ خیال نہ آیا کہ شیکسپیر کے تمام ڈراموں کا نظم میں ترجمہ کیا جائے جہاں تک مجھے علم ہے منشی جوالا پرشاد صاحب برق نے شیکسپیر کے بعض ڈراموں کا اردو نظم میں ترجمہ کیا اور اگر حیات مستعار نے وفا کی ہوتی تو یہ مہم وہ ضرور انجام دیتے حال میں بعض اصحاب نے اس کے بعض ڈراموں کے ترجمے نثر میں کئے ہیں۔ بہرحال قوم کی پستی اور مردہ دلی کا اثر اس کی ادبی ترقی پر پڑ رہا ہے اور سب سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ تعلیم یافتہ افراد دنیا کے دہندوں میں کچھ ایسے لگے ہوئے ہیں کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کی طرف سے بالکل غافل ہو گئے ہیں۔

انگریزی ہندوستان کی علمی زبان ہو گئی ہے۔ ہندوستان کے مختلف اقوام میں اسی کے ذریعہ سے میل جول قائم ہے اور مغربی قوموں سے بھی تبادلہ خیالات اسی کے ذریعہ سے ہوتا ہے ہمارے سرگرم ہندو بھائیوں نے اس زبان میں تحریر و تقریر میں کمال پیدا کر لیا ہے اور آئے دن مختلف مضامین پر متعدد کتابیں لکھ رہے ہیں۔ سیاسیات کے قطع نظر جس پر لکھنے والوں کی تعداد بے شمار ہے۔ ہر مضمون پر ہندو مصنفوں کی کتابیں آپ کو ملجائیں گی، معاشیات کو لیجئے، اسکا کون سا پہلو یا شعبہ ہے جس پر گزشتہ ۲۰ سالوں میں ہندو مصنفوں نے کتابیں نہیں لکھی ہیں۔ ان میں سے اکثر اس پایہ کی ہوتی ہیں کہ انگلستان میں شائع ہوئی ہیں اور انکی کما حقہ ستایش ہوتی ہے۔ فلسفہ اور خصوصاً ہندو اور بودھی فلسفہ کے متعلق ہندو بیشمار کتابیں لکھ رہے ہیں دو ہندو فلسفی پروفیسر داس گپتا اور پروفیسر رادھا کرشن جن کا تعلق کلکتہ یونیورسٹی سے ہے اس وقت ممالک مغرب میں فلسفہ پر لیکچر دے رہے ہیں۔ انگریزی ادب میں بھی ہندوؤں نے دست رس حاصل کی ہے۔ غرض ہر مضمون پر انگریزی میں ہندو مصنفوں کی کتابیں ملیں گی جس کی وجہ سے یورپ انکے مقاصد، انکی تمناؤں اور انکے خیالات سے واقف ہو رہا ہے اور انہیں اور انکے مذہب، تمدن، اور فلسفہ کو وقعت اور ہمدردی کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ اعلیٰ تعلیم میں پستی کی وجہ سے مسلمانوں نے انگریزی میں مفید کتابیں لکھنے کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ کتابوں کے علاوہ ہندوؤں کے بیشمار علمی رسالے ہیں۔ جامعات اور علمی انجمنوں کے بھی متعدد رسالے ہیں انکے

مضمون نویس بھی زیادہ تر ہندو ہی ہوتے ہیں۔

انگریزی تعلیم کی غایت اولاً یہ تھی کہ ادنیٰ خدمات کے لئے کاروان ہندوستانی میسر آسکیں مگر تعلیم خواہ کسی قسم کی ہو اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی تعلیم یافتہ ہندوؤں میں رفتہ رفتہ علوم جدیدہ کے ساتھ مناسبت ہونے لگی اور سائنس، تاریخ، فلسفہ اور دیگر علوم کی تحقیقات کا ہندوستان میں آغاز ہوگیا۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ جس تاریکی میں چھپی ہوئی ہے وہ ہر تاریخ داں پر ظاہر ہے۔ مگر یورپ کے علماء نے تعلیم یافتہ ہندوؤں کو بتایا کہ کاوش اور تحقیق سے یہ تاریکی دور ہوسکتی ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں شروع سے آخر تک افسانوں سے پر ہیں مگر انہیں افسانوں سے محقق کم از کم تمدن کے متعلق قیمتی معلومات حاصل کرتے ہیں رگ وید کے گہرے مطالعہ سے مغربی اور ہندو فضلا کی ایک جماعت یہ معلوم کر رہی ہے کہ آریوں کے قدم ہندوستان میں کس طرح جمے دیسی باشندوں کی کیا حالت تھی، آریوں نے انہیں کیسے محکوم کیا اور پھر دونوں قوموں میں باہم امتزاج کیسے ہوا، آریوں کی تمدنی حالت کیا تھی۔ طرز حکومت کیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک صاحب ڈاکٹر کالی داس ناگ نے رگ وید میں سے (Diplomacy) کے نظریات بھی ڈھونڈھ نکالے ہیں جس کے صلہ میں پیرس یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر کی ڈگری عنایت کی ہے۔ کوئی صاحب یہ ثابت کر رہے ہیں کہ قدیم ہندو جمہوری طرز حکومت سے نا آشنا نہ تھے کسی کا یہ خیال ہے کہ آریا ورت میں بلدیات (Municipalities) موجود تھیں جن میں شہروں کا انتظام خود شہری کرتے تھے۔ نظریات مذکورہ صحیح ہوں یا غلط مگر جس محنت اور کاوش سے ہندو علماء یہ کام کر رہے ہیں قابل داد ہے، کیونکہ اس سے انکی قومی خودداری بڑھتی ہے اور دوسری قوموں کے دلوں میں ان کی عزت ہوتی ہے گو اس میں مسلمانوں کیلئے ایک خطرہ ہے یعنی ان ہندو محققوں اور انکے بعض یورپی استادوں کا یہ رجحان ہے کہ ہندو تہذیب کی ایک اعلیٰ منزل پر پہنچ گئے تھے اور اگر مسلمان بلا کسی اشتعال کے انکے ملک میں داخل نہ ہوئے ہوتے تو انکی علمی اور تمدنی ترقی کا سلسلہ جاری رہتا اور مسلمانوں کی ہشت صد سالہ

حکومت میں ہند پر ایک مردنی چھائی ہوئی تھی جو انگریزوں کے آنے سے رفع ہوئی۔ یہ رجحان تو اہل علم کا ہے جو تعصب سے پاک ہوتے ہیں۔ نیم تعلیم یافتہ ہندؤوں کے جو خیالات ہند کی اسلامی حکومت کے بارہ میں ہیں انکے اعادہ کی ضرورت نہیں تاریخی تحقیقات میں ہند کے ہر گوشہ کے ہندو علما نہایت انہماک کے ساتھ مصروف ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی کے (Post-Graduate Department) میں ہندوستانی تاریخ اور تہذیب (Cul-ture) کا ایک وسیع شعبہ ہے جس میں قدیم ہندوستان کی تمدنی، مذہبی، دستوری اور سیاسی تاریخ اور آثار قدیمہ کے متعلق تعلیم اور تحقیق کا سلسلہ جاری ہے اس شعبہ پر تین ہزار ماہوار سے زیادہ یونیورسٹی خرچ کر رہی ہے اور اساتذہ اور طلبہ کے تحقیقات کے نتائج اس کے رسائل میں طبع ہوتے ہیں۔ مدراس یونیورسٹی کی سرپرستی میں جنوبی ہند کی تاریخ کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ مرہٹے اپنی تاریخوں کے لئے مواد جمع کر رہے ہیں پرانی تحریریں محفوظ کر رہے ہیں اور انہیں طبع کرا رہے ہیں بمبئی میں ایشیاٹک سوسائٹی کی سرپرستی میں بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ جس محنت اور کاوش سے ہندو علما یہ کام کر رہے ہیں قابل تحسین ہے کیونکہ قدیم ہند کی تاریخ یا تمدن کے بارہ میں قابل وثوق حالات دریافت کرنا نہایت دشوار ہے۔ اس لیے قدیم کتابوں کی ورق گردانی اور تنقید کے علاوہ، ایک ایک سکہ ایک ایک کتبہ، ایک ایک تانبے کا پتر جس پر کسی بادشاہ کا فرمان کندہ ہو اور اسلاف کے دیگر آثار باقیہ پر نظر غایر ڈالی جا رہی ہے۔

اب غور فرمائیے کہ آپ اپنی قومی تاریخ کی کیا خدمت کر رہے۔ آپ کی تاریخیں مدون ہیں اور ایسے لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں جو تاریخ نویسی یا کم از کم وقائع نگاری سے بخوبی واقف تھے اظہار حق جن کا شیوہ تھا اور جو دروغ بیانی سے حذر کرتے تھے۔ البیرونی کی کتاب الہند کے متعلق ایک جرمن مستشرق کا قول ہے کہ یونانی اور چینی سیاحوں نے بھی ہند کے حالات لکھے ہیں مگر البیرونی کے مقابلہ میں انکی تحریریں بچوں کی کہانیاں یا جاہلوں کی تالیف معلوم ہوتی ہیں جو توہمات

میں مبتلا ہوں۔ ان تاریخوں کو صحت کے ساتھ چھاپنے ، ان پر حاشیہ چڑھانے ، ان کی بنا پر زمانہ حال کے مذاق کے مطابق جدید تاریخوں کے لکھنے میں کون امر مانع ہے۔ ہندوستان کی ہر تاریخ میں جو غیر مسلموں کی لکھی ہوئی ہے مسلمان بادشاہوں اور اکابر قوم کی مذمت موجود ہے۔ ہم ان بے سرو پا الزامات اور مطاعن کے دفع کرنے کی کیا کوشش کر رہے ہیں ؟ مسلمانوں کے نامور بادشاہوں کی سیرت اخلاق اور کارناموں پر آئے دن اعتراض ہوتے ہیں۔ کیا ہم نے ان اعتراضوں کے جواب دئیے ہیں ان جوابوں کے لئے بھی ہمیں غیر مسلموں کی انصاف پسندی کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے مثلاً جہانگیر پر مدت سے یہ الزام ہے کہ اس نے نورجہاں کے پہلے شوہر شیر افگن خاں کو قتل کرا دیا۔ مسلمانوں نے یہ الزام بالکلیہ تسلیم کر لیا یہاں تک کہ ایک مسلمان ناول نویس احمد حسین خاں صاحب نے ایک ناول بھی لکھ مارا۔ مگر خدا بھلا کرے ایک ہندو عالم ڈاکٹر بینی پرشاد کا کہ انہوں نے جہانگیر کے دامن سے یہ داغ دور کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان میں کئی جامعات ہیں جہاں مسلمانوں کو تاریخی ریسرچ کا موقعہ ہے۔ علیگڈھ خالص اسلامی درسگاہ ہے اور جامعہ عثمانیہ اسلامی سلطنت کی سرپرستی میں ہے۔ ان دونوں سے بہت کچھ توقعات ہو سکتی ہیں ، مگر ابھی تک خدا کا فضل ہے ڈھاکہ یونیورسٹی ایسے صوبہ میں ہے جہاں دو کروڑ مسلمان بستے ہیں اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور احمد فضل الرحمان ایسے اصحاب کی موجودگی سے بیداری کی امید ہو سکتی ہے۔ لاہور ، الہ آباد ، دہلی لکھنو کی جامعات اسلامی تمدن کے مرکزوں میں واقع ہیں۔ کیا ہم انکے مسلمان استادوں اور طالبعلموں سے امید نہیں کر سکتے کہ وہ اپنا فرض ادا کریں۔ تاریخی تحقیقات میں جو مشغول ہیں انکی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں صاحب پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی نے خاصی شہرت حاصل کی ہے مگر انکا موضوع تاریخ اسلام نہیں ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں تاریخی تحقیقات کا کام غلام یزدانی صاحب اور سید ہاشمی صاحب کے ذریعہ سے باسانی شروع ہو سکتا ہے ورنہ اسکے وسیع شعبہ تاریخ سے کوئی عملی نفع نہ ہوگا۔

جس طرح تاریخی تحقیقات سے کسی قوم کا ماضی منور اور شاندار ہوتا ہے ، اسی طرح

Scientific Research اس کی آئندہ مادی ترقی کی ضامن ہے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے ضمن میں میں عرض کر چکا ہوں کہ اس درسگاہ سے اس وقت تک ہماری قوم کا صرف ایک فرد واحد مستفید ہوا ہے۔ سائنس کی درسگاہوں میں بھی یہی حالت ہے۔ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ ۱۹۲۴ء میں صرف چار مسلمانوں نے ایم ایس سی کی ڈگری لی ہے۔ جامعات کی شہرت اور ناموری اب طالب علموں کی تعداد یا شاندار عمارات پر نہیں ہے بلکہ تصنیفات اور انکشافات پر ہے۔ ہندوستان کی جامعات بھی کوشاں ہیں کہ (Scientific Research) کو فروغ دیں۔ اکثر جامعات کے سالناموں میں ان مضامین کی تفصیل ہوتی ہے جو اساتذہ نے اپنی ذاتی ریسرچ کی بنا پر لکھے ہیں اور ہندوستان یا یورپ کے علمی رسائل میں شائع کر دئے۔ ہر یونیورسٹی سے خاصی تعداد ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض ہندی جامعات کی یورپ میں کچھ وقعت ہونے لگی ہے۔ مگر اسمیں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ۱۹۲۴ء کی رپوٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ڈاکٹر ولی محمد (لکھنو یونیورسٹی) نے دو مضمون لکھے جو یورپ کے رسائل میں چھپے۔ مختلف علوم مثلاً ریاضی، کیمیا وغیرہ کے جو رسائل ہندوستان میں شائع ہوتے ہیں، انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریسرچ کرنے والوں میں مسلمان شاذ و نادر ہیں۔

اب فنون لطیفہ کو لیجیے جن میں شاعری، مجسمہ سازی، فن تعمیر اور موسیقی شامل ہیں اور جن پر قوم کی زندہ دلی اور اجتماعی زندگی کا انحصار ہے۔ شاعری کے متعلق میں کچھ پہلے عرض کر چکا ہوں اُردو شاعری کا رجحان کچھ ایسا نہ تھا کہ قوم کو نکبت اور بربادی سے بچا سکتا بلکہ دنیا کی بے ثباتی اور اہل دنیا کی بے وفائی کا سبق پڑھا کر اس نے ہندی مسلمانوں کو بالکل بیکار اور بے ہمت کر دیا۔ الشعراء تلامیذ الرحمٰن۔ مگر یہ مقولہ شاعر پر اسوقت صادق آسکتا ہے جب وہ انسان کے بہترین جذبات برانگیختہ کرے، اسے غیرت حمیت اور شجاعت کا سبق دے اور اولوالعزمی اور حب قوم کی طرف مائل کرے۔ آپ کے کتنے شاعر اس محک پر ٹھیک اتر سکتے ہیں۔

مجسمہ سازی کا تعلق بت پرستی سے اس قدر گہرا تھا کہ مسلمان اسکی طرف توجہ کرنا کفر خیال کرتے تھے اور ملت ابراہیمی کے پیرو شیوۂ آذری اختیار نہ کر سکتے تھے۔ مصوری بھی فقہائے اسلام جائز خیال نہیں کرتے مگر مانی و بہزاد کی سرزمین یعنی ایران میں اسکا اس قدر گہرا اثر تھا کہ اسلام کے بعد بھی اس فن کے ماہر اور قدردان موجود تھے۔ بنی امیہ، بنی فاطمہ اور ہسپانیہ کی بعض عمارتوں میں انسان اور جانوروں کی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ چونکہ ہندوستان اور ایران کے تمدنی تعلقات نہایت گہرے تھے اس لئے ایرانی مصور ہندوستان میں آئے اور ہند کی خیال آفرینی اور ایران کی حسن پرستی کے امتزاج سے شاہان مغلیہ کی سرپرستی میں مصوری کے ایک نئے طرز کا آغاز ہوا جو اصطلاحاً مغل کہا جاتا ہے۔ مگر یہ مصور سلطنت کے وابستہ تھے سلطنت کی تباہی کے بعد مصوروں کا بھی کوئی قدردان نہ رہا اور ہندوستان کی بہترین تصویریں اب یورپ میں ہیں۔ ہندوستان کی نشأۃ جدیدہ کے سلسلہ میں بنگال، بمبئی پنجاب اور اندھرا دیش میں مصوروں کے نئے گروہ پیدا ہوگئے ہیں۔ ان مصوروں کی تصویروں میں محض یورپ کی نقالی نہیں بلکہ ان میں اور خصوصاً بنگالی مصوروں میں ایک نئی روح اور نیا تخیل ہے جس سے آئندہ کے لئے بہت امید ہوسکتی ہے۔ یورپ میں بھی ان تصویروں کی نمائش کی گئی ہے اور پسند کی گئی ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس جدید فنی (Contd.) تحریک میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میں صرف ایک مسلمان مصور عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویروں سے واقف ہوں جو کچھ پسند کی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک دو اور ہوں۔

فن موسیقی کو کسی زمانہ میں حضرات صوفیائے کرام کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا اور اب بھی حضرات صوفیہ کی محفلوں کی رونق اسی سے ہے۔ مگر خیال کیجئے کہ شاہان اسلام کے زمانہ میں اس کے ماہروں کی کیا قدر تھی اور اب انکی کیا حالت اور حیثیت ہے۔ ہندوستان میں اس فن کے اب بھی بعض ماہر موجود ہیں مگر اسکا دم واپسیں ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ چند سال کے بعد مسلمان اس فن سے نابلد ہو جائیں گے۔ ان ماہران فن کے قدردان ہندو

رہیں ہیں ورنہ یہ فن کب کا معدوم ہوگیا ہوتا۔ موسیقی کو قوم کی خانگی اور اجتماعی زندگی میں جو دخل ہے وہ آپ حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ تعلیم اور خصوصاً ابتدائی تعلیم سے بھی اسے گہرا تعلق ہے۔ لندن میں یونیورسٹی کانفرنس کے ایک اہم جلسہ میں حال میں یہ بحث ہوئی تھی کہ کالج کے طالبعلموں میں اس فن سے کس طرح مناسبت پیدا کرائی جائے ۔

فن تعمیر پر مسلمانوں کو ناز اور بجا ناز ہے۔ اس پر تفصیل سے بحث کرنیکی ضرورت نہیں کیونکہ گور (Gaur) سے ہسپانیہ تک انکی شاندار عمارتیں موجود ہیں اور انکے کمال کی شاہد ہیں ہمیں اس وقت صرف اپنی موجودہ پست حالت سے سروکار ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ فن تعمیر کا تعلق سلطنت سے ہے اور جب سلطنت جاتی رہی تو وہ مواقع بھی جاتے رہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ سکونتی مکانات اور مذہبی عمارات کی تعمیر کا سلسلہ اب بھی جاری ہے مکان کے خوبصورت ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس پر زر کثیر صرف ہو، بلکہ اسکا انحصار بنانے والے کے ذوق سلیم اور موروثی فنی (artistic) روایات پر ہے۔ قومی انحطاط کی دلیل ایک یہ بھی ہے کہ ہمیں اپنی بہتر چیزیں بھی غیروں کی بدتر چیزوں سے بدتر معلوم ہوتی ہیں۔ ہم اپنی فنی (artistic) روایات بھول گئے اور انگریزی سررشتہ تعمیرات کے انجنیروں کی بے ہنگم عمارتوں کا طرز ہم نے پسند کرلیا۔ سلطنت دہلی کے انتزاع کے بعد شمالی ہند میں شاہان اودھ کا دور دورہ ہوا۔ انکے تعمیری کارنامے کیا ہیں ؟ آصف الدولہ کے امام باڑے کا لداؤ تو قابل تعریف ہے مگر اس کے علاوہ شاہان اودھ کی کسی عمارت میں کوئی خاص تعمیری خوبی نہیں کیونکہ انہوں نے اسلامی روایات پس پشت رکھکر ایک دوغلا یورپی طرز تعمیر اختیار کیا۔ حالانکہ اگر ان میں ذوق سلیم ہوتا تو ممکن تھا کہ تاج محل بنانے والوں کی اولاد سے وہ کام لے سکتے جن میں فن تعمیر کی روایات موجود ہوں گی۔

علوم دینی میرے موضوع سے خارج ہیں مگر اس عام تبصرہ میں ان کا ذکر ناگزیر ہے۔ مدارس دینی کی موجودہ حالت سے آپ واقف ہیں۔ جس طریقہ تعلیم کے وہ پابند ہیں، صدہا سال قبل اختیار کیا گیا تھا اور ممکن ہے کہ اس وقت مفید ہو۔ انکے دروازے جدید اثرات کے لئے بند ہیں۔ حالانکہ

دینی امور کے متعلق علمائے حال کو قوم کی رہنمائی کرنی ہے کچھ ادر ہی ہیں اور پرانی کتابوں کے پڑھنے اور پڑھانے سے حل نہیں ہو سکتے۔ ہمارے جمود کی حالت یہ ہے کہ مدارس دینی کی اصلاح کی طرف بہت کم توجہ ہے علمائے دین اگر زمانہ کی نبض سے واقف ہوں تو اپنا اثر قوم پر ڈال کر اس کے حق میں آیۂ رحمت ہو سکتے ہیں۔ ایک دو مدارس دینی بعض اصلاح پسند علما کی تحریک سے بڑی مشکلوں سے قائم ہوئے۔ مگر روشن خیال بانی کے انتقال کے بعد پھر اپنی روش پر آگئے، اور انکے تعلیم یافتہ اشخاص میں اور قدیم مدرسہ کے علما میں کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں علوم جدیدہ سے نابلد ہیں۔ یورپ میں ارکان کلیسہ کا جو اثر اور وقار ہے محض انکے علم و فضل کی وجہ سے ہے ورنہ ارتیاب اور لاادریت نے اس کا خاتمہ کر دیا ہوتا۔ انگلستان میں علوم دینی کی پہلی ڈگری بی۔ ڈی ہے مگر آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ آکسفورڈ، کیمبرج اور اسکاٹ لینڈ کی جامعات میں یہ ڈگری ایم۔ اے پاس کرنے یعنی علوم دنیوی میں فضیلت حاصل کرنے کے دو سال بعد ملتی ہے۔ اسی پایہ کے علمائے دین اس زمانہ میں اپنا اور اپنے مذہب کا اثر قائم رکھ سکتے ہیں۔ کلیسہ کاتھلکی (Catholic Church) کو اصلاح مذہبی اور نشاۃ جدیدہ کے پر آشوب زمانہ میں احتجاجیت (Protestantism) کے سیلاب سے بچانے میں سب سے زیادہ حصہ (Society of Jesus) نے لیا ہے۔ اس جماعت کے ارکان کا تبحر علمی مشہور ہے اور اعلیٰ تعلیم کی اشاعت انہوں نے دنیا کے ہر گوشہ میں کی ہے چنانچہ ہندوستان میں بھی انکے متعدد بڑے بڑے کالج موجود ہیں۔

اب صرف تین امور کا ذکر کرنا باقی ہے جس سے میرے خیال میں آپ حضرات اندازہ فرما سکینگے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کس قدر پست ہے۔ اعلیٰ تعلیم میں پس ماندہ ہونیکی وجہ سے (۱) اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں ہمارا وہ حصہ نہیں ہے جو آبادی اور تاریخی اہمیت کے لحاظ سے ہمیں ملنا چاہیئے۔ (۲) مجالس وضع قوانین میں ہمارے نمائندے ایسے نہیں ہیں جن سے ہمیں خاطر خواہ نفع پہنچے (۳) ہمارے اردو اخباروں کی حالت نہایت ابتر ہے اور انگریزی اخبار کافی نہیں ہیں۔

اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا کافی تعداد میں ہونا صرف اس لئے ضروری نہیں ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک خاص تعداد کے لئے معزز ذریعہ معاش نکل آتے، گو اس تنگی معاش کے زمانہ میں یہ بھی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اگر اعلیٰ حکام کے زمرہ میں انکی تعداد کم ہوئی تو ملک میں ان کا کوئی اثر نہ رہیگا اور جب اعلیٰ حکام کے طبقوں میں انکا کوئی یگانہ نہ ہوگا تو جس کا جی چاہے ان پر دن دہاڑے ظلم کرے گا۔ نیابتی طریقہ حکومت کی جڑ ابھی اس ملک میں مضبوط نہیں ہوئی ہے۔ اور عرصہ دراز تک حقیقی حکومت، جماعت عاملہ کے ہاتوں میں رہے گی اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اس جماعت میں داخل ہونے کے لئے جو ذرائع ہیں ان سے پورا نفع اٹھائیں۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی حالت اس امر کی متقضی ہے کہ گورنمنٹ کی موجودہ پالیسی کے مدنظر مسلمان آئی سی ایس کے مقابلہ کے امتحانوں میں جو ہندوستان اور لندن میں ہوتے ہیں کافی تعداد میں شریک ہوں اور کامیابی حاصل کریں۔ لی کمیشن کی تجاویز کے مکمل نفاذ پر ۴۰ فیصدی ہندوستان کے امتحان کے ذریعہ سول سروس میں لئے جائیں گے۔ ۴۰ فیصدی لندن کے امتحان کے ذریعہ سے اور ۲۰ فیصدی اشخاص کو پراونشیل سروس سے ترقی دیجائیگی۔ انگلستان میں جو امتحان داخلہ ہوتا ہے اسکا دروازہ ہندوستانیوں کے لئے بند نہیں ہے اور ہندو جو وہاں تعلیم پاتے ہیں اس رعایت سے پورا نفع اُٹھاتے ہیں۔ اس وقت آئی سی ایس کے افسروں کی مجموعی تعداد ۱۱۳۰ ہے جس میں ۲۰۵ مسلمان، ۱۶۵ ہندو اور دیگر غیر مسلم ہندی اور باقی انگریز ہیں۔ مگر یہ تناسب باقی نہ رہے گا اور گورنمنٹ کی حالیہ پالیسی کے لحاظ سے وہ زمانہ دور نہیں کہ ہندوستانیوں کی تعداد نصف سے زیادہ ہوجائیگی، سول لسٹوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۱ء کے آغاز سے ۱۹۳۰ء کے آخر تک جو نئے افسر سول سروس میں داخل ہوئے ہیں ان میں سے ۷۰ انگریز ۱۶ مسلمان اور ۸۸ ہندو ہیں۔ ہندوؤں کی تعداد میں چند عیسائی اور پارسی بھی شامل ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ چند ہی سال میں آئی سی ایس میں ہندوؤں کی تعداد بہت خاصی ہوجائے گی۔ انگلستان کے داخلہ کے امتحان میں مسلمان بہت کم کامیاب ہوئے ہیں اور زیادہ تر ہندوستان

کے امتحان کے نتائج پر کچھ رعایت سے لئے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے حال ہی میں سید رضا علی صاحب کی تحریک پر مسلمانوں کے ساتھ خاص رعایت کا وعدہ کیا ہے مگر رعایتوں پر انحصار رکھنا دانشمندی سے بعید ہے۔ آئی سی ایس میں مسلمانوں کی تعداد اس وقت صرف ۲۵ ہے، اگر وہ اپنا وقار قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہئے۔ یہی تعلیمی پستی دوسرے سررشتوں میں بھی ہماری کمی تعداد کا باعث ہے۔ مثلاً انڈین فنانس ڈیپارٹمنٹ کے ۱۵۰ عہدیداروں میں صرف ۹ مسلمان ہیں۔ اس سررشتہ میں داخلہ امتحان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ہندو اس سررشتہ میں کثرت سے ہیں۔ اور کئی ہندو اس وقت اکونٹنٹ جنرل ہیں۔ سررشتہ زراعت میں ۱۶۵ انگریز ۳۶ ہندو اور صرف ۵ مسلمان ہیں۔ سررشتہ جنگلات میں ۱۸۹ انگریز ۶۰ ہندو اور مسلمان ہیں۔ انڈین ایجوکیشنل سروس میں ۲۱۸ انگریز ۱۱۸ ہندو اور ۱۰ مسلمان ہیں۔ سررشتہ طبابت میں سول سرجن اور انکے ماتحت عہدہ داروں میں ۲۷۹ انگریز، ۱۰۶ ہندو اور صرف ۹ مسلمان ہیں۔ سررشتہ تعمیرات کی اعلیٰ خدمات پر مسلمان خال خال ہیں۔ واضح رہے کہ گورنمنٹ کی جدید پالیسی کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی تعداد ہر سررشتہ میں بڑھتی جاتی ہے۔ مگر اس سے صرف ہندو نفع اٹھا رہے ہیں مسلمانوں کو گورنمنٹ کی فیاضی سے کوئی نفع نہیں۔ اکثر سررشتوں میں اعلیٰ ملازمتوں کے لئے ایم۔ اے اور ایم ایس سی کی شرط عائد کی جا رہی ہے اس لئے جب تک کہ مسلمان اعلیٰ تعلیم کی طرف کما حقہ توجہ نہ کریں گے انکے داخلہ کی امید نہیں ہو سکتی۔

مجالس وضع قوانین میں انتخاب جداگانہ کی بدولت مسلمان نمائندوں کی تعداد آبادی کے لحاظ سے کافی ہے اور اگر مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم اسی قدر عام اور ہر دل عزیز ہوتی جیسے کہ ہندوؤں میں ہے، تو ہم امید کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کے مفاد اور حقوق کی پوری نگہداشت ہوگی۔ مگر ان مجالس کی رودادوں کے دیکھنے سے سخت مایوسی ہوتی ہے۔ ہمارے بہترین افراد سرکاری ملازمت کی وجہ سے مجالس مذکورہ میں شریک نہیں ہو سکتے اور پھر انکی تعداد بھی کم ہے۔ اسلئے ہمارے نمائندے اکثر جاہل یا نیم تعلیمیافتہ ہوتے ہیں جن کا مایہ ناز صرف یہ ہے کہ انکے نام کیساتھ

ایم ایل سی یا ایم ایل اے کا دم چھلا لگ جاتا ہے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں کو دیکھئے کہ ان کے کیسے قابل افراد کونسلوں میں ہیں اور ہر مسئلہ پر کس قدر باخبری، لیاقت اور بے باکی کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔ ہمارے نمائندے اپنی کم مائگی کی وجہ سے "تا مرد سخن نگفتہ باشد، عیب و ہنرش نہفتہ باشد" کے اصول پر کاربند رہتے ہیں۔ غالباً ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو انگریزی مطلق نہیں جانتے اور رائے دینے کے وقت یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ کس طرف رائے (ووٹ) دیں۔ مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی اپنے نمائندوں کی نااہلی سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ ظاہر ہے۔

اب اپنے اخبارات کو لیجئے۔ اُردو کے روزانہ اخبارات میں جنگ طرابلس کے زمانہ سے بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے اور انکی تعداد بہت خاصی ہے۔ غالباً ہندوستان کی کسی زبان میں اتنے روزانہ اخبار نہ ہونگے۔ کیونکہ اس کے ہر گوشہ میں اُردو اخبار موجود ہیں۔ مگر انکی حالت کیا ہے؟ کس حد تک قوم کو دنیا اور خصوصاً ہندوستان کے معاملات سے واقف رکھتے ہیں؟ کس حد تک اپنے ناظرین کو ہر مسئلۂ زیر بحث کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں؟ کس حد تک انکی رہنمائی اور انکے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں؟ آپ کا کونسا اخبار ہے جو (Reuter) اور (Associated Press) کے تار روز پورے چھاپتا ہے؟ جو اعلیٰ حکام کی تقریروں، اہم قومی مجالس اور مجالس وضع قوانین کے مباحث کے ترجمے برابر شائع کرتا ہے؟ جو مفید اور ذی اثر انگریزی اخبارات اور رسالوں کے مضامین کے ترجمے کرکے اپنے ناظرین کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ شاید ہی ایک دو ایسے اخبار نکلیں گے جن میں یہ خصوصیات موجود ہوں۔ ورنہ ایک دو اشتعال انگیز مضامین کے علاوہ جنکا ماحصل کچھ نہیں، اخباروں میں کچھ نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے اہم سے اہم واقعات اس لایق خیال نہیں کئے جاتے کہ ایڈیٹر صاحبان ان پر خامہ فرسائی فرمائیں۔ کرنسی کمیشن کی رپورٹ حال میں ہی شائع ہوئی ہے۔ کتنے اُردو اخباروں نے اسکا خلاصہ شائع کیا ہے اور اس پر

معقول بحث کی ہے۔ اسی سے آپ انکی حالت کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔ اردو اخباروں کی پست حالت کی وجہ یہی ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ کے ہاتھوں میں نہیں ہے اور انکے ایڈیٹر یم تعلیم یافتہ اشخاص ہیں جو نہ تو اہم معاملات سمجھ سکتے ہیں نہ ان پر اسے زنی کرسکتے ہیں۔

اب رہے ہمارے انگریزی اخبارات انکا بھی زیادہ اثر نہیں مسلمانوں کا صرف ایک روزانہ اخبار پنجاب سے نکلتا ہے مگر اسکا ٹائپ اور کاغذ ملاحظہ فرمائیے۔ چند ہفتہ وار اخبار ہیں جو کسی شمار میں نہیں۔ بنگال میں ابھی حال میں ایک اسلامی اخبار انگریزی میں شائع ہوا ہے جو ہفتہ میں تین بار چھپ رہا ہے اور ممکن ہے کہ روزانہ ہو جائے۔ صوبجات متحدہ کے چند سربرآوردہ مسلمان ڈھائی لاکھ کا سرمایہ ایک انگریزی روزانہ اخبار نکالنے کے لئے جمع کر رہے ہیں خدا انہیں کامیاب کرے۔ ہندوؤں کے ہر صوبہ میں متعدد انگریزی روزانہ اخبارات ہیں جن کا اثر اور اشاعت روز افزوں ہے۔ ان میں سے اکثر کا دعوے قومی ہونیکا ہے مگر یہ دعوئے محض ظاہری ہے اور ان میں سے ہر ایک صرف ہندو قوم کے مفاد کا خیال رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے اخباروں کا کوئی اثر نہیں۔ اس لئے جو کچھ ہندو اخبارات لکھتے ہیں وہی ہندوستان کی متحد آواز خیال کیجاتی ہے۔ ہندو مسلمانوں کی موجودہ نزاع کے متعلق جو مضامین ہندو اخباروں اور رسالوں میں چھپ رہے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سراسر قصور مسلمانوں کا ہے اور ہندوؤں کی طرف سے کسی قسم کا اشتعال نہیں ہوتا۔ کلکتہ کا ماڈرن ریویو ایک علمی رسالہ ہے جس کے ایڈیٹر سے یہ امید ہوسکتی ہے کہ اگر غیر جانبدار نہ ہو تو کم از کم سب و شتم سے احتراز کریگا۔ مگر یہ مدعی اتحاد بھی مسلمانوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ "یہ بدمعاش ہماری عورتوں کی بے حرمتی کرتے ہیں اور انہیں بھگا لیجاتے ہیں۔" انہیں حضرت کو مجلس اقوام (League of Nations) نے اپنی کارروائی کا مطالعہ کرنے کے لئے جنیوا (Geneva) بلایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات مسلمانوں کے بارے میں یورپ میں کس قسم کے خیالات کا اظہار کرینگے۔ یورپ کا پریس انکی

تحریروں سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا عکس آزاد اسلامی ممالک پر پڑتا ہے اور وہاں کے مدبروں کو خیال ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جو کچھ فتنہ و فساد ہے سب مسلمانوں کی بدولت ہے۔ اگر کسی بات کا تکرار کے ساتھ بار بار اعادہ کیا جائے، وہ خواہ کیسی ہی لغو اور غلط کیوں نہ ہو سامعین رفتہ رفتہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں اور اسے صحیح سمجھنے لگتے ہیں۔ اسکے ثبوت کے لئے میں دو مثالیں پیش کرتا ہوں انتخاب جداگانہ کا حق مسلمانوں کو رفع شر کے لئے دیا گیا تھا اور گورنمنٹ کا مقصد یہ تھا کہ دونوں قوموں میں جو شکر رنجی رہا کرتی ہے۔ دور ہو جائے۔ مگر ہندو پریس اور ہندو سیاسی لیڈروں کو سخت ناگوار تھا کہ مسلمان ہند کے سیاسیات میں قرار واقعی حصہ لیں۔ لکھنو کے میثاق (۱۹۱۶ء) کو انہوں نے بادل ناخواستہ قبول تو کر لیا کیونکہ اصلاحات کے اجرا کا دار و مدار اسی پر تھا مگر اس اصول کے ہمیشہ درپے رہے اور انکی متواتر تحریروں تقریروں اور شورش کا اثر یہ ہوا کہ خود گورنمنٹ اس طریقہ کو نامستحسن خیال کرنے لگی اور ذمہ وار حکام اب یہ کہتے ہیں کہ یہ طریقہ صرف ضرورت کے لئے جاری کیا گیا تھا ورنہ اصولاً درست نہیں اور اس کو آئندہ وسعت نہ دیجائیگی یعنی ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں میں مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کا حق نہ دیا جائیگا۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہوا کا رُخ کیا ہے اور ہمارے انگریزی اخباروں کے نہ ہونے کا کیا اثر ہوگا۔ دوسری مثال جو میں عرض کروں گا وہ یہ ہے کہ آج کل جو مناقشات ہندو مسلمانوں میں ہو رہے ہیں، ہندو پریس انکا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیتا ہے اور ہندو اخبارات میں اس رائے کے بار بار ظاہر کرنے سے انگریزوں کو بھی یہی خیال ہوتا جاتا ہے چنانچہ کلکتہ کے ہنگامہ کے متعلق حال میں پائنیر (Pioneer) کے کلکتہ کے نامہ نگار نے لکھا تھا کہ "کلکتہ ہندوؤں کا شہر ہے۔ اس میں مسلمانوں کی بدمستیاں بالکل بے محل ہیں کیونکہ یہاں تجارت، عدالت صحافت سب ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہیں" کلکتہ میں انگریزوں کے دو موثر اخبار (Englishman) اور (Statesman) ہیں۔ انکا رجحان بھی مسلمانوں کے خلاف ہے اور کوئی تعجب نہیں کیونکہ ہندوؤں کو انگریزوں کے اخبارات میں بھی دخل ہوتا جاتا ہے اور انکے رپورٹر زیادہ تر ہندو ہوتے ہیں ہندوستان میں خبروں کی صرف دو ایجنسیاں (Associated Press) اور

(Free Press of India) میں اور دونوں ہندوؤں کی ہیں۔

اعلیٰ تعلیم میں پستی کی وجہ سے علوم و فنون کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کو واضح طور پر بیان کرنے کی میں نے اپنی بساط اور محدود معلومات کے لحاظ سے کوشش کی ہے۔ اس سے جو نقصانات ہمیں اب تک پہونچے ہیں اور آئندہ پہنچنے والے ہیں ان کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی غیر ملکی بصر ہندوستان کی موجودہ حالت پر نظر ڈالے تو وہ یہی بیان کریگا کہ ہندوستان کی نشأۃ جدیدہ اور علمی زندگی میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں کیونکہ نہ تو اعلیٰ تعلیم میں انہوں نے کوئی نمایاں ترقی کی ہے۔ نہ تصنیف و تالیف میں اپنے کمال کا اظہار کیا ہے، نہ فنون لطیفہ سے انہیں لگاؤ ہے۔ نہ ان میں کوئی رابندرناتھ ٹیگور ہے، نہ جگدیش چندر بوس، نہ پرفلا چندر رائے۔ جس قوم کی تعداد سات کروڑ ہو اس کا یہ حالت میں ہونا ایک عبرت کا مقام ہے خصوصاً جب اس کے اسلاف علم و ہنر کے سرپرست اور قدردان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مخالفوں کو ہم پر خندہ زنی کا موقعہ ملتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ نعوذ باللہ اگر حضرت پیغمبر اسلام دنیا میں پھر تشریف لائیں تو اپنی امت کی حالت زار دیکھکر آنحضرت کو شرمساری ہوگی۔ کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ دنیا آئے دن ایک انقلاب سے دوسرے انقلاب کی طرف گامزن ہے مگر مسلمان ہیں کہ "زمین جنبد، زماں جنبد، قطب از جا نمی جنبد" ؎

آں کہ دام ہوس سوختن ہا می داشت
کاش مے آید و از دور تماشا مے کرد

اب صرف دو امور کے متعلق کچھ عرض کرنا باقی ہے یعنی اعلیٰ تعلیم میں ہماری پسماندگی کے اسباب کیا ہیں اور اسکا علاج کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ان دونوں امور کے متعلق باوجود غور و خوض میں کوئی خاص بات عرض نہیں کر سکتا۔ جن اصحاب نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے انکا خیال ہے کہ موج ترقی میں ہمارے افلاس کا بیشتر حصہ ہے۔ مگر اس سے میری تشفی نہیں ہوتی کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ہندو طالب علم باوجود مالی اور تمدنی موانع کے اعلےٰ تعلیم کے حصول میں کوشاں ہیں اور انکی کوششیں بارآور ہوتی ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ جو ہندو اعلیٰ تعلیم کی منازل طے کرتے ہیں وہ

دولتمند طبقوں کے افراد نہیں ہوتے بلکہ طبقہ متوسط کے ادنیٰ گروہوں کے ہوتے ہیں جن کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں۔ دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کیطرف مسلمانوں نے بہت دیر میں توجہ کی۔ مگر انگریزی اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ ہندوستان میں قریب ایک سو سال یعنی یونیورسٹیوں کے قیام کے بہت قبل سے جاری ہے۔ سید احمد خاں علیہ الرحمتہ کی تحریک کی پنجاہ سالہ جوبلی بھی ہو چکی ہے یہ عرصہ اس قدر طویل ہے کہ اگر عدم ترقی کے کوئی گہرے اسباب نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ مسلمان برادران ہند و ان کے دوش بدوش ہو گئے تھے۔ ایک صاحب کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کو بی اے پاس کرنے کے بعد اچھی نوکریاں مل جاتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنی تعلیم جاری رکھنا عبث خیال کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندو اپنی تعلیم جاری رکھتے ہیں اور ایم۔ اے پاس کرنیکے بعد ان میں علم کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور پھر وہ مدت العمر علمی مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ میں اس رائے سے بھی اتفاق نہیں کرسکتا کیونکہ نوکریوں کی تعداد بہت کم ہے اور مسلمان امیدواروں کی تعداد نسبتاً ہندوؤں سے کچھ کم نہیں۔ سب دربدر آوارہ پھرتے ہیں۔ بلکہ بے وسیلگی کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت بدتر ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ من حیث القوم مسلمانوں میں علم کا شوق بہت کم ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم میں ہندوستان کی دوسری قوموں سے وہ بہت پیچھے ہیں اس بدشوقی کے اسباب وہی ہیں جو مسلمانوں کے عام انحطاط اور زوال کے ہیں جن پر بحث کرنا اس وقت بے سود ہے۔

اب رہا علاج۔ اخباروں میں آپنے دواؤں کے اشتہار دیکھے ہونگے۔ مردوا مجرب، سریع الاثر اور تیر بہدف ہوتی ہے۔ میں جو علاج تجویز کروں گا، اسی قسم کا ہوگا، مگر آپ کے اخلاق کریمانہ سے امید ہے کہ آپ نہ صرف اسے سننا گوارا کرینگے بلکہ اس پر غور بھی فرمائیں گے۔ ہمارا مرض مزمن ہو گیا ہے، اس لئے دو قسم کے علاج کی ضرورت ہے۔ پہلا علاج اساسی ہوگا یعنی ہمارے جسم میں جو کثافتیں اور خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں بالکلیہ دور ہوں اور دوسرا

وقتی اور مقامی ہونا چاہیئے مرض کے خاص حالات کے لحاظ سے۔ ہمارا اصل مرض یہ ہے کہ ہم اسلام سے کوسوں دور پڑ گئے ہیں اور ہماری علمی اور دماغی تنزل اور اخلاقی اور روحانی کمزوریوں اور دیگر گوناگوں تمدنی امراض کا یہی علاج ہے کہ ہم اسلام کا دامن کرم پھر پکڑیں۔ دنیا جب مذہبی مناقشوں اور فلسفیوں کی بکواس سے تنگ آگئی تھی تو اسلام ہی نے اسی صراط مستقیم کی ہدایت کی اور بتایا کہ انسان کی حقیقی وقعت کیا ہے اور اسے کس طرح زندگی بسر کرنی چاہئے کہ دنیا میں سرخروئی اور اس کے بعد حیات ابدی حاصل ہو۔ اسلام نہ تو فلسفہ ہے اور نہ دوسری مذہبوں کی طرح عقائد کا محض مجموعہ ہے، بلکہ فی الحقیقت ایک طریق زندگی ہے جسے وہ صراط مستقیم کے نام سے تعبیر کرتا ہے، جس میں دوامی اور لاتمناہی حرکت کا تخیل مضمر ہے۔ مسلمان کی زندگی کا مدعا یہی ہونا چاہیئے کہ وہ اسی بے پایاں شاہراہ ترقی پر چلے اور سر مو ادھر یا ادھر نہ جھکے، نہ پیچھے ہٹے، اور نہ ایک جگہ پر کھڑا ہو ورنہ جمود اور سیدھی راہ سے ہٹنے کی پاداش میں اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو از منہ ماضیہ کی رجعت پسند قوموں کا ہوا یعنی جن پر غضب الٰہی نازل ہوا۔ اسلام نے ہمیں ترقی کی راہ دکھائی اور اگر ہم اس راہ پر چلتے تو ہماری یہ حالت زار نہ ہوتی مگر ابھی وقت نہیں گیا ہے اور ہماری حالت ایسی نہیں ہے کہ بالکل لا علاج ہو خصوصاً جب خدائے تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ میری رحمت سے مایوس نہ ہو۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اسلام کی روشنی میں دیکھیں کہ ہمارے موجودہ تمدنی نقائص کیا ہیں اور ہم اس کے اعلیٰ معیار سے کس حد تک گر گئے ہیں اور ان نقائص کے رفع کرنے کے لئے اسلام کیا ہدایت کرتا ہے۔ یہ نقائص بہت سے ایسے ہیں جنہیں ہم بدقسمتی سے اپنے مذہب یا تمدن کا جزو خیال کرتے ہیں، حالانکہ ان دونوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں بلکہ ہمارے غیر اسلامی ماحول سے پیدا ہوتے ہیں۔ روحانی تعلیم سے قطع نظر جس پر بحث کرنا علمائے دین کا منصب ہے، اسلام حریت، اخوت اور مساوات کے ساتھ غیرت، حمیت اور شجاعت کی تعلیم دیتا ہے۔ ہماری قوم میں اس وقت ایک قسم کی لامرکزیت ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم اخوت اور مساوات کے اصول سے نابلد ہو گئے ہیں۔ ہم میں خودداری

بھی باقی نہیں جو حریت اور غیرت کی محرک ہے۔ اسی لئے ہمیں اپنی ذلت وخواری کی کوئی پروا نہیں۔ بزرگان قوم کو غور کرنا چاہئے کہ خصائل اسلامی کے احیا کے لئے کیا تدبیریں عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ دعا کیجئے کہ خدائے عزوجل اپنے رحم وکرم سے "ہم دیر نشینوں کو مسلمان کردے"۔

اب رہا وقتی اور مقامی علاج۔ اس کے قبل میں عرض کرچکا ہوں کہ سررشتہ تعلیم اب ان صیغوں میں سے ہے جو وزرا اور کونسلوں کے تحت میں آگئے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنے مفاد سے غافل نہ رہنا چاہئے۔ گورنمنٹ کو اب تعلیمی معاملات میں بہت کم دخل ہے اور ہم یہ امید نہیں کرسکتے کہ اسے ہمارے نفع یا نقصان کا زیادہ خیال ہوگا اس لئے ہمیں خود کمر ہمت چست کرنی چاہئے اور اپنے مفاد کی حفاظت کرنی چاہئے۔ سید احمد خاں علیہ الرحمۃ کی مساعی جمیلہ کی بدولت اس وقت دو ادارات ہمارے ہاتھوں میں ہیں جن سے اگر سرگرمی اور استقلال کے ساتھ کام لیا گیا تو ممکن ہے کہ تعلیم کے ہر شعبہ میں ہم ترقی کرسکیں۔ میری مراد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے ہے۔ کانفرنس سے اکثر اصحاب بدظن ہیں اور آپ کو بھی تعجب ہوگا کہ میں نے اسے مسلمانوں کی ترقی کا ایک ذریعہ کیوں قرار دیا ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ کانفرنس کے علاوہ مسلمانوں کا کوئی اور تعلیمی نظام نہیں جس سے اس مقصد کے لئے کام لیا جاسکے۔ اس مجلس نے اگر کچھ نہیں کیا تو کم از کم اپنے جلسوں اور مطبوعات سے مسلمانوں کو اپنی تعلیمی حالت اور ضروریات سے واقف رکھا ہے مگر اس میں کارکردگی کا مادہ نہیں ہے۔ تو یہ قصور ہم مسلمانوں کا ہے کہ ہم نے اس کی کما حقہ تائید اور قدر نہیں کی۔ کانفرنس کے مقاصد پر کوئی اعتراض عاید نہیں ہوسکتا۔ اگر اس کے نظام کی اصلاح ہوسکے اور اس میں اور اس کی صوبوں اور اضلاع کی شاخوں میں نئی روح پھونکی جائے اور انہیں قابل کار بنایا جائے جس کی شدید ضرورت ہے، تو ممکن ہے کہ تعلیم کا مسئلہ حل ہوسکے۔ کانفرنس اس وقت محض ایک جسد بے جان ہے اور اسکا نظام محض کاغذی ہے۔ جن مسلمانوں میں قوم کا درد

ہے انکا فرض ہے کہ اپنی حمایت اور تائید سے کانفرنس کو پھر زندہ کریں۔ اس کے لئے ایثار کی ضرورت ہے۔ مگر دقت یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص دوسرے سے ایثار کی امید کرتا ہے اور خود قوم کے لئے کسی قسم کا نقصان برداشت کرنا گوارا نہیں کرتا۔ یہ بھی ہمارے ضعف ایمان کا نتیجہ ہے۔ ہم اخوت کا سبق بھول گئے ہیں۔

کانفرنس کے احیاء کے لئے چند ایسے اشخاص کی ضرورت ہے جو اعلےٰ تعلیم یافتہ ہوں تعلیمی معاملات سے پوری واقفیت اور اعلیٰ پیمانہ پر تنظیمی قابلیت رکھتے ہوں۔ اس قسم کے اشخاص گورنمنٹ کی سلک ملازمت میں مل سکتے ہیں جنہوں نے انتظامی تجربہ حاصل کیا ہے اور اپنی آئندہ ترقی کی امیدوں سے دست کش ہو کر اپنے باقی ماندہ ایام قوم کی خدمت میں صرف کرنیکے لئے تیار ہوں۔ کانفرنس کی حیثیت دراصل ایک Bureau (دفتر) کی ہونی چاہئے جو ہر صوبہ اور تعلیم کے ہر شعبہ کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچائے اور مسلمان جس شعبہ کی تعلیم میں پیچھے ہوں اسکی اصلاح کے لئے تمام ممکن ذرائع سے کام لے۔ کانفرنس کے مرکزی دفتر کی اصلاح کے بعد، صوبجاتی شاخوں کی اصلاح عمل میں آسکتی ہے اور اگر انکی حقیقی اصلاح ہو جائے اور اسکا نظام درست ہو جائے تو آئندہ تعلیمی ترقی کے متعلق ہمیں پورا اطمینان ہو سکتا ہے کیونکہ تعلیم کا تعلق اب ہندوستان کی مرکزی حکومت سے نہیں ہے بلکہ حکومتہائے صوبجات سے ہے۔ اس کے بعد اضلاع کی شاخیں ہونگی جو ہر ضلع کی تعلیمی حالت کے متعلق مجلس صوبہ کو متوجہ کرتی رہیں۔ مگر اس نظام کی کامیابی کے لئے کام کرنے والوں کی ضرورت ہے اگر ایک سو مسلمان ہندوستان میں ایسے نکل آئیں جو بطور "خدام اسلام" اپنی زندگی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے وقف کر دیں تو کامیابی کی قطعی امید ہو سکتی ہے۔ جہالت کا دور کرنا جہاد اکبر ہے۔ کتنے مسلمان ہیں جو اس کار خیر میں شریک ہوں گے۔ مسٹر گوکھلے کے خدام ہند، اور دکن ایجوکیشن سوسائٹی کی زندہ مثالیں موجود ہیں جو ہمارے لئے چراغ ہدایت بن سکتی ہیں۔ انکے لائق و فایق ارکان مختصر گزاروں پر ملک اور قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ کیا اسلام ایثار

نہیں سکھاتا، یا ہم مسلمان نہیں ہیں؟

مضمون طویل ہوتا جاتا ہے، اس لئے اب میں صرف اس امر پر بحث کروں گا کہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے ذریعہ سے حقیقی اعلیٰ تعلیم میں کس طرح ترقی ہو سکتی ہے اور ذوق علمی اور تحقیقات کا شوق کس طرح بڑھ سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت تک علی گڑھ کا نصب العین نہایت پست ہے یعنی اس کے حامی اسے گریجویٹ بنانے کا ایک کارخانہ خیال کرتے ہیں اور انہیں فکر بس یہی ہے کہ طلبہ کی تعداد بڑھے۔ نئے نئے بورڈنگ ہاؤس اور لیکچر روم نہیں تعلیم کس قسم کی ہوتی ہے اسکا کسی کو خیال نہیں۔ یونیورسٹی کا صرف یہ منشا نہیں ہے کہ طالب علموں کو چند کتابیں پڑھا کر سند دیدے بلکہ اسکا فرض یہ ہے کہ ملک کی تمام علمی اور سائنٹفک تحریکوں میں حصہ لے اور علم کی حدود کو وسعت دینے میں معاون ہو۔ ہندوستان میں اس وقت متعدد علمی تحریکیں ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ علیگڑھ کی دیواروں تک انکی لہریں نہیں پہنچتیں علیگڈھ میں ایم اے کے طالب علموں کی تعداد کافی ہے یعنی صرف ایک سال میں ۶۰ مسلمانوں نے ایم۔اے کی ڈگری لی ہے جو ایک حد تک قابل اطمینان ہے۔ مگر ریسرچ کے لئے جہانتک کہ مجھے علم ہے کوئی انتظام نہیں ہوا ہے اور اساتذہ نے بھی اس میں پیش قدمی نہیں کی ہے۔ کسی یونیورسٹی کی وقعت اب شاندار عمارتوں طلبہ کی تعداد اساتذہ کی یورپین ڈگریوں پر نہیں ہے بلکہ اساتذہ اور منتہی طلبہ کی علمی تحقیقات اور انکے مطبوعات پر ہے۔ فرض کیجیے کہ علیگڑھ کا کوئی طالب علم جرمنی کی کسی یونیورسٹی میں بغرض تعلیم جائے اور وہاں کوئی پروفیسر اس سے پوچھے کہ تمہاری یونیورسٹی میں کیا علمی کام ہو رہا ہے تو شرمندہ ہو کر سر جھکا لینے کے سوا کوئی جواب نہ دے سکیگا۔ علمی ماحول پیدا کرنے کے لئے ایسے اساتذہ کی ضرورت نہیں جنکا مایۂ ناز یورپ کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری ہو بلکہ ایسے اساتذہ کی جن کا علمی پایہ بلند ہو اور جنہوں نے خود کوئی علمی کام کیا ہو اور ریسرچ کرنے والے طلبہ کی ہدایت کر سکتے ہوں۔

صوبجات متحدہ میں یہ شکایت عام ہے کہ اس صوبہ کی یونیورسٹیاں باہمی رقابت سے اپنی ڈگریاں سستی کر رہی ہیں۔ دوسری یونیورسٹیوں پر اس شکایت کا اثر ہو رہا ہے اور وہ اپنے اسٹاف میں

قابل اور فاضل لوگوں کو جگہ دے رہی ہیں مگر علیگڑھ کو غالبًا مالی مشکلات کے سبب سے اسکا اب تک موقعہ نہیں ملا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قحط الرجال کی وجہ سے فاضل مسلمان پروفیسر نہ مل سکتے ہوں اور یہ یونیورسٹی کم تر درجہ کے مسلمان پروفیسروں کو رکھنے پر مجبور ہو مگر۔ اصول اچھا نہیں اور آئندہ چلکر مضرت کا باعث ہوگا۔ متاع نیک از ہر دکان کہ باشد۔ جس مضمون کے لئے جو بہترین پروفیسر ہو اسی کا تقرر کیا جائے۔ البتہ یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ تدریس میں طلبہ کے ساتھ بخل نہ کرے گا۔

علی گڑھ کے کتب خانہ اور معملوں (Laboratories) کی حالت بھی روپیہ کی کمی کی وجہ سے اچھی نہیں اور جدید کتابوں اور سائنس کے آلات پر کافی روپیہ خرچ نہیں ہوتا عملی سائنس کی تعلیم کے لئے روپیہ جمع کرنیکی فکر ہو رہی ہے۔ خدا کامیابی عطا کرے مختلف شعبہ جات ملازمت کے مسابقتی (Competitive) امتحانوں کے لئے طلبہ کو تیار کرنے کا بھی کافی انتظام ہونا چاہیئے۔ ریسرچ کے لئے ہونہار طلبہ کو ترغیبی وظائف دینا ضروری ہے اور امید ہے کہ یونیورسٹی اسکا ضرور انتظام کرے گی۔

علیگڈھ کے ساتھ ساتھ میرا فرض ہے کہ میں جامعہ عثمانیہ کا بھی ذکر خیر کروں جس سے میں نے بحث اسوقت تک اس لئے نہیں کی تھی کہ میرے مضمون کا زیادہ تر تعلق برٹش انڈیا کے حالات سے ہے۔ جامعہ عثمانیہ اہل دکن کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جس کے لئے وہ اپنے شاہ معارف نواز دامت سلطنتہ کا جس قدر شکر کریں کم ہے مگر حضرت سریر آرائے دکن کا خوان کرم صرف اہل دکن کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ برٹش انڈیا کے مسلمان بھی زلہ ربا ہو سکتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی ابھی ابتدائی حالت ہے مگر زبان اردو میں اس نے علمی کتب کا سرمایہ جمع کر دیا ہے اور جمع کر رہی ہے اور اس زبان کے ذریعہ سے ہر فن اور علم کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے در اصل یہ ایک دور جدید کا آغاز ہے اور نشاۃ جدید کا پیش خیمہ ہے۔ اس کی مطبوعات سے اردو داں ہندوستانیوں کے خیالات میں ایک انقلاب ہو رہا ہے جو انکی دماغی اور تمدنی ترقی کا باعث ہوگا۔ جامعہ عثمانیہ

کی تعلیم اسکی چار دیواری تک محدود نہیں ہے بلکہ اپنے مطبوعات کے ذریعہ سے اُردو بولنے والوں میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کر رہی ہے۔ ہندوستان میں غالباً یہ پہلی University Extension Movement) ہے اور بہ لحاظ وسعت اثر بہی کارگر ہو سکتی ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ جامعہ کا ابھی یہ ابتدائی زمانہ ہے اور اس کے اساتذہ ابھی تک تراجم اور درسی تعلیم میں منہمک ہیں۔ مگر یہ حالت ہمیشہ قائم نہ رہیگی جب اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص کی تعداد ملک میں زیادہ ہو جائیگی، علمی تحقیقات کیلئے خود بخود مطالبہ ہوگا۔ جامعہ کے ایم۔ اے شعبہ تاریخ میں طلبہ کے لئے ایک مقالہ کا پیش کرنا لازم کر دیا گیا ہے جو ذاتی تحقیقات پر مبنی ہو۔ اس سے خاطر خواہ نتائج پیدا ہونگے۔ حیدر آباد اسلامی تاریخ اور علوم دینی اور عقلی کی تحقیق کا مرکز تمام ہندوستان کے لئے بن سکتا ہے جس کیلئے یہاں مواقع بہت اچھے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے اور کتبخانہ آصفیہ میں کتابوں کا معقول ذخیرہ ہے جن سے کم از کم تاریخی تحقیقات کا کام شروع ہو سکتا ہے قلمی کتابیں باوجود یورپ کی دست برد کے اب بھی بہت موجود ہیں۔ جامعہ انکی تلاش کا کام اپنے ذمہ لے سکتی ہے اگر جامعہ عثمانیہ میں علوم اسلامی اور سائنس کی تحقیقات کا سلسلہ ہمارے سرکار فیض آثار کی فیاضی سے جاری ہو جائے تو ممالک محروسہ کے باہر کے طلبہ کو بھی ان سہولتوں سے مستفید ہونیکا موقع ملیگا اور علم سے بدشوقی کا جو دھبہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ پر ہے، ممکن ہے کہ مٹ جائے جامعہ عثمانیہ میں بھی چند ایسے جلیل القدر اساتذہ کے تقرر کی ضرورت ہے جنہیں علمی دنیا میں رسوخ حاصل ہو اور جو ہمارے طلبہ کو ریسرچ کے طریقوں سے آشنا کر سکیں اور ان میں ذوق علمی پیدا کر سکیں۔ ان پروفیسروں کی تنخواہوں اور ریسرچ کرنے والے طلبہ کے لئے ترغیبی وظائف کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوگی مگر سرکار ابد قرار کے چشم کرم سے قوی امید ہے کہ جامعہ کی یہ شدید ضرورت پوری کر دی جائے گی۔

اس قدر سمع خراشی کے بعد مجھے اب صرف یہ عرض کرنا ہے کہ تعلیم کی طرف ہماری بے توجہی کا بڑا سبب یہ ہے کہ گذشتہ پندرہ سالوں میں ہم ایسے مباحث میں پڑ گئے جن سے ہمیں اپنے

مادی مفاد کے لحاظ سے بالکل دور رہنا چاہئے تھا۔ اس زمانہ میں ہماری قوم پر ایک عجیب ہیجان کا عالم طاری تھا جس نے ہمیں اپنے نفع نقصان کی طرف سے بالکل اندھا کر دیا۔ ہم نے اپنی قوت اپنی سرگرمی اور اپنا روپیہ ایسے مقاصد پر صرف کر دیا جس سے ہمیں سر مو نفع نہیں ہوا بلکہ ہمیں سنبھلنے کیلئے ایک عرصہ دراز لگے گا۔ درسگاہوں کو جو مالی نقصان اس زمانہ میں پہنچا، اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ مگر مضے ما مضے، آئندہ ترقی کے لئے ہمیں امن و امان سکون قلب اور دماغی یکسوئی کی ضرورت ہے۔ ہماری ترقی میں اگر کوئی شے حائل ہے تو ہم خود ہیں۔ ہم میں احساس تناسب نہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ تمام جزوی امور کی طرف سے قطع نظر کر کے اعلیٰ تعلیم کی اشاعت پر اپنا زور قوت اور روپیہ صرف کریں۔ ہم اکثر بیرونی ممالک کو اپنی گاڑھی کمائی کا روپیہ بھیجتے ہیں حالانکہ خیرات ذوی القربے یعنی اپنے ہم وطنوں سے شروع ہونی چاہئے۔ دوسرے اسلامی ممالک بھی اسی اصول پر کاربند ہیں۔ ہندوستان میں قحط پڑے۔ طوفان آئے۔ طاعون نے زغے کئے۔ مگر کسی دوسرے ملک کے مسلمان بھائیوں نے ہماری دست گیری نہیں کی۔ مگر افسوس ہے کہ ہم اس کا مطلق خیال نہیں کرتے اور اپنا روپیہ دوسروں کے لئے صرف کرتے ہیں حالانکہ ہمارے مدرسوں اور کالجوں کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے۔ اگر کوئی صاحب کھڑے ہوں اور فرمائیں کہ وسط افریقہ کے مسلمانوں کو گرمی کی شدت سے روزہ رکھنے میں تکلیف ہوتی ہے اور تحریک کریں کہ وہاں کی جھیلوں اور ندیوں سے برقی قوت لیکر پنکھوں اور برف کا انتظام کیا جائے، تو بہت سے سادہ لوح ہندوستانی مسلمان چندہ دینے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے، حالانکہ خود انکے ملک میں لاکھوں مسلمانوں کو افطار کے لئے سوکھی روٹی بھی نہیں ملتی۔ ہمارا فرض اس وقت یہ ہے کہ اپنی دقتوں پر غور کریں اور اپنی ترقی کے لئے نئی راہیں نکالیں۔

ہندوستان میں جب مغربی اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کے منصوبے ہو رہے تھے اور یونیورسٹیوں کی داغ بیل پڑ رہی تھی، مدارس یونیورسٹی کے بانیوں نے ۱۸۴۱ء میں لارڈ الفنسٹن

(Lord Elphinstone) گورنر صوبہ مدراس کی خدمت میں ایک محضر پیش کیا تھا جس کے جواب میں لارڈ مذکور نے جن خیالات ذیل ظاہر کئے تھے وہ اسوقت بالکل ہمارے حسب حال ہیں اور انہیں پر میں یہ مضمون ختم کرتا ہوں :-

" پارلیامنٹ ہدایت کر سکتی ہے کہ ہر سال تعلیمی اغراض کے لیے ایک رقم معین کر دی جائے، صوبجات کی حکومتیں اسکول اور کالج قایم کر سکتی ہیں اور نوجوانوں کو ان درسگاہوں میں داخل ہونیکی ترغیب تا حد امکان دے سکتی ہیں، لیکن اگر اس ملک کے باشندوں میں حقیقی تعلیم کی اہمیت کا احساس نہیں ہے اور حقیقی تعلیم سے میری مراد ابتدائی تعلیم سے نہیں ہے بلکہ اس دماغی تربیت اور تہذیب سے ہے جو کمالات علمی کا زینہ ہے، تو اعلےٰ تعلیم کیلئے سہولتیں بہم پہنچانا بالکل بے سود ہے، سیاسی اقتدار میں اہل ہند کی شرکت کی تائید کرنا محض تضیع اوقات ہے "

واقعات مابعد سے ظاہر ہے کہ اس قسم کی مخلصانہ نصائح نے ہندوؤں کے لئے تو تازیانہ کا کام کیا مگر ہم مسلمان تھے کہ :-

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

باغ و بہار

جب تک اُردو زبان دنیا کے پردہ پر موجود ہے میر امن اور ان کی باغ و بہار کا نام باقی رہیگا۔ یوں تو اس کتاب سے پیشتر اور اس کے ساتھ متعدد کتابیں اُردو نثر کی لکھی گئیں لیکن جو قبولیت اسے حاصل ہوئی وہ کسی قدیم اُردو کتاب کو نصیب نہیں ہوئی۔ مولف نے خاتمہ پر لکھا ہے۔

"جب یہ کتاب فضل الہی سے اختتام کو پہنچی جی میں آیا کہ اسکا نام بھی ایسا رکھوں کہ اس میں تاریخ نکلے جب حساب کیا تو بارہ سو پندرہ ہجری کے آخر سال میں لکھنا شروع کیا تھا باعث عدم فرصتی کے بارہ سو سترہ کے سن میں ابتدا انجام ہوئی۔ اس فکر میں تھا کہ دل نے کہا باغ و بہار اچھا نام ہے کہ سم نام و تاریخ اسمیں نکلتی ہے۔ تب میں نے یہی نام رکھا جو کوئی اس کو پڑھیگا گویا باغ کی سیر کرے گا۔ بلکہ باغ کو آفت خزاں کی بھی ہے اور اس کو نہیں، یہ ہمیشہ سرسبز رہے گا۔"

سطور بالا میں مولف نے کچھ تعلی کی نہیں کی ہے بلکہ اس کی خود اعتمادی ہے پورے سوا سو برس اس چمن کو کھلے ہوئے ہو گئے۔ لیکن اس کے پھولوں کی رنگ و بو میں کوئی فرق نہیں آیا اس عرصہ میں متعدد ایڈیشن ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو چکے ہیں مگر یہ باوجود کہن ابتک دلدادگان اردو کو مثنو الا بنا دیتی ہے۔

اُردو زبان کی سرپرستی اور نشو و نما کے باب میں جب کسی انگریز کا نام آتا ہے ہمارے ملک کے بعض حضرات ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔ لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ چشمہ جس سے یہ باغ و بہار سیراب ہوا، ڈاکٹر جان گلگرسٹ کی ذات تھی۔ ڈاکٹر موصوف نے کتاب اُردو کے ان اوراق کو، جو گردش زمانہ کی آندھیوں سے اُڑ اُڑا کر تتر بتر ہو گئے تھے اکٹھا کیا اور اس خوبی کے ساتھ ان کی شیرازہ بندی کی کہ فورٹ ولیم قلعہ معلی پر چشمک زنی کرنے لگا۔ انتخاب کے وقت ان کی نظر ہمیشہ ان باکمالوں پر پڑی جو حقیقت میں اس کام کے اہل تھے پھر کتابیں بھی وہ پاکیزہ اور نادرہ روزگار انتخاب کیں جو واقعی ترجمہ یا تالیف کے لائق تھیں۔ اُردو کی تاریخ میں وہ زمانہ

بھی عجیب تھا کہ ایک طرف تو ہمارے نغز گو شعرا کے افکار یا ڈبرے بندی سے ردیفوں کی تکمیل ہو رہی تھی اور دوسری طرف باغ و بہار، شکنتلا، پریم ساگر، راج نیتی، سنگاسن بتیسی، گلشن ہند، طوطا کہانی، آرائش محفل وغیرہ کتابیں معرض وجود میں آ رہی تھیں۔ ہماری شاعری کی عمر ہماری نثر سے تقریباً دگنی ہے لیکن افتاد کو کوئی کیا کرے۔ ریختہ کے توام نے فارسی کی آگ سے ایسا تاؤ کھایا کہ باوجود کئی چھینٹوں کے جم کر لاٹھ بن گیا۔ مشاعروں میں رات بھر شمع گردش کرتی تھی مگر دن نکلے وہیں ہوتی تھی۔ برخلاف اس کے نثر کا وہ چھوٹا سا چشمہ جو جان گلکرسٹ اور اسکے جانشینوں کی سوتوں سے جاری ہوا تھا بہت جلد ایک زبردست دریا بن گیا۔

افسوس ہے کہ میر امن کے تفصیلی حالات و سوانح کہیں نہیں ملتے۔ اس بارہ میں زیادہ سے زیادہ مواد خود انکی باغ و بہار میں موجود ہے۔ انکے بزرگ ہمایوں کے عہد سے بادشاہ کے زمانہ میں پشت بہ پشت معزز خدمات انجام دیتے رہے اور وقتاً فوقتاً جاگیر و منصب سے سرفراز ہوئے لیکن سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ درانی کے حملہ میں انکا گھر بار بھی تاراج ہو گیا۔ غرض بے سروسامانی کے عالم میں عیال و اطفال سمیت عظیم آباد پہونچے، کچھ عرصہ وہاں رہے لیکن جب روزگار نے موافقت نہ کی تو تن بہ تقدیر کرکر کلکتہ پہنچے، وہاں نواب دلاور جنگ نے اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم کی اتالیقی کے لیے مقرر کیا۔ تقریباً دو سال نواب صاحب کے ہاں رہے لیکن ان سے نباہ نہ ہوا اور آخر کار منشی میر بہادر علی کے وسیلہ سے جان گلکرسٹ تک رسائی ہوئی۔ صاحب موصوف نے ان کی بڑی قدر کی اور اخیر تک اطمینان کی زندگی بسر کرتے رہے۔

باغ و بہار ۱۸۰۱ء میں تالیف ہوئی۔ یہ زمانہ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ کہلاتا ہے دلی اور لکھنؤ میں گھر گھر شاعری کا چرچا تھا لیکن ارباب علم عام اس سے کہ شاعر ہوں یا حکیم مولوی ہوں یا واعظ معلم ہوں یا طبیب، ادیب، منشی، خوشنویس غرض کوئی ہوں گفتگو سب اردو میں کرتے تھے۔ مگر لکھنے کے وقت ان کے قلم سے فارسی ہی نکلتی تھی اور اگر کوئی ہمت کر کے اردو نثر لکھتا بھی تو وہی عربی فارسی آمیز جملے (ہمارے بعض انشاپرداز اس وضعداری کو اب تک

نباہ رہے ہیں لفظی اعتبار سے نثر تمامتر مرجز یا مسجع اور معنی کے لحاظ سے دقیق ہوتی تھی۔ معمولی سی بات کو ایچ پیچ کے ساتھ بیان کرنا انشاپردازی کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ مرزا علی لطف اپنے تذکرہ کے شروع میں لکھتے ہیں:۔

" غرض مدعائے دلی اس صاحب عالی[1] تدبیر کا یہ معلوم ہوا کہ ان فارسی کتابوں کے نثر کرنے سے مراد یہی ہے کہ صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں، ہم انکی تربیت کے لئے یہ خون جگر کھاتے ہیں تاکہ انکے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے اور ان کی طبیعت اس سے بخوبی مزہ اٹھاوے "

اس پر مولانا شبلی نے نوٹ[2] لکھا ہے کہ وہ اس فقرے سے اندازہ کرو کہ اس وقت کے اہل قلم سادہ اردو لکھنے کو کس قدر خلاف شان سمجھتے تھے مصنف صاحبان انگریز پر احسان رکھتا ہے کہ ان کی خاطر اس نے یہ ذلت گوارا کی "، یہ کتاب بھی (گلشن ہند) باغ و بہار کے ساتھ اسی فضا میں لکھی گئی لیکن انداز بیان پرانا ہے وہی لفظی گورکھ دھندے وہی ایچ پیچ!

باغ و بہار حضرت امیر خسرو کی چار درویش سے ماخوذ ہے اس کتاب کا ترجمہ میر صاحب سے پیشتر ایک شخص تحسین نامی نے کیا تھا اور اس کا نام نوطرز مرصع رکھا میر امن نے ترجمہ کے وقت نوطرز مرصع کو پیش نظر رکھا ہے۔ اسی زمانہ میں محمد عوض زریں نے بھی قصہ چار درویش کو اپنے آقا راجہ رام دین کی فرمائش سے اردو میں ترتیب دیا اور نام بھی نوطرز مرصع رکھا۔ یہ نوطرز مرصع تحسین کی نوطرز کا خلاصہ ہے۔ عبارت سادہ اور سلیس ہے لیکن قافیہ کا سررشتہ کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ زریں کی نوطرز مرصع اور باغ و بہار کا سن تالیف ایک ہی (۱۸۰۱ء) ہے اور لطف یہ ہے کہ زریں نے تاریخ

[1] گلشن ہند، صفحہ ۳

[2] جان گلکرسٹ

[3] گلشن ہند، صفحہ ۳

بھی اسی مادہ "باغ و بہار" سے نکالی ہے چنانچہ قطعہ تاریخ کا آخری شعر ہے :-

بنا کر یہ گلدستہ روزگار ۔ لکھی اس کی تاریخ باغ و بہار

تقریباً ربع صدی کے بعد (۱۲۴۰ھ میں) باغ و بہار کا جواب لکھنؤ سے فسانۂ عجائب کی شکل میں دیا گیا۔ چنانچہ مصنف نے باعث تحریر اجزائے پریشان ..... (فسانہ عجائب) کے باب میں لکھا ہے :-

"اگرچہ اس ہیچمیرز کو یارا نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے یا اس افسانہ کو بنظر نثاری کسی کو سنائے۔ اگر شاہجہاں آباد کر مسکن اہل زبان کبھی بیت السلطنت ہندوستان تھا وہاں چندے بود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا جیسا میر امن نے چار درویش کے قصہ میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن و حصہ میں یہ زبان آئی ہے۔ دلی کے روڑے ہیں محاورے کے ہاتھ منہ توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر ..... نیاز مند کو اس تحریر سے نمود نظم و نثر وجودت طبع کا خیال نہ تھا۔ شاعری کا احتمال نہ تھا بلکہ نظر ثانی میں جو لفظ دقت طلب غیر مستعمل عربی فارسی کا مشکل تھا، اپنے نزدیک! سے دور کیا اور جو کلمہ سہل ممتنع محاورے کا تھا دہ رہنے دیا،،

سرور نے فسانہ کو مکمل کرنے سے پیشتر اسکا ابتدائی حصہ اپنے احباب کو سنایا تھا جس پر انہوں نے کہا"..... جیسا رطب و یابس کہے گا ہمیں پسند ہے بشرطیکہ جو روزمرہ اور گفتگو ہماری تمہاری ہے یہی ہو ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینی عبارت کے واسطے دقت طلبی اور نکتہ چینی کریں۔ ہم فقرہ کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں "

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی طبعیت کس قدر دقت پسند واقع ہوئی تھی ہر چند احباب نے اس بارہ میں ان کو متنبہ کیا تھا مگر وہ اپنے ماحول اور رنگینی معاشرت سے مجبور تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ صنائع بدائع لفظی کو چھوڑ کر سلاست سادگی اختیار کرتے یا قدما کے قوانین نثر سے منحرف ہو کر جدت طرازی کے مرتکب ہوتے۔ فسانہ عجائب ایک نثر کی کتاب ہے لیکن اس کا ایک تہائی نہیں تو کم از کم ایک چوتھائی حصہ ضرور نظم میں ہے۔ مصنف نے مناسب

مقامات پر اساتذہ کے مشہور اردو فارسی اشعار سے لطف بیان پیدا کیا ہے لیکن اگر یہ اشعار بقدر نمک ہوتے تو مضائقہ نہ تھا، کمال یہ کیا ہے کہ بعض مقامات پر پوری پوری غزل لکھدی ہے۔ میرامن نے اشعار سے بہت کم کام لیا ہے اور فارسی اشعار کی بجائے ہندی کے دو ہے اور کبت لکھے ہیں جو فسانہ عجائب میں مفقود ہیں۔ ہمارا مقصد اس وقت فسانہ عجائب اور باغ و بہار کا موازنہ کرنا نہیں بلکہ باغ و بہار کی خصوصیات بیان کرنا ہے۔ یہاں دونوں کتابوں سے ایک موضوع کی عبارت نقل کرتے ہیں جس سے ناظرین کو کلام کا فرق اور پیرایہ زبان معلوم ہو جائے گا۔

"وہاں کے باغ کا کیا کہنا، اگر ایک تختے کی صفت تحریر کروں ہزار تختہ کاغذ بخط ریحاں نہ لکھ سکوں، دم تسطیر قلم میں برگ نکلتے ہیں، لکھنا بار ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں بالکل پھولتے ہیں، صفحہ قرطاس پر گل پھولتے ہیں، حاسد کو خار ہوتا ہے، بہت آراستہ و پیراستہ، غرض مربع میں چاروں کونوں پر بنگلے، گرد سبزہ نوخاستہ، دروازہ عالیشان نفیس مکان، زیور دیوار خندق پر کیلے، اکیلے نہیں قطار در قطار، تختہ بندی کی بہار، روشوں کی پٹریاں قرینے کی مہندی کی ٹٹیوں میں رنگت مینے کی، گل مہندی سرخ و زرد، و پر افشاں، عباسی کے پھولوں سے قدرت حق نمایاں نرگس دیدہ منتظر کی شکل دکھاتی تھی۔۔۔۔۔ غرض جانعالم کو لیجا شامیانے تلے مسند مغرق پر بٹھایا، شراب ارغوانی کی گلابیاں کشتیوں میں لے کر وہ زن پری پیکر زیب وہ انجمن ہوئی کہ لعل سے رشک و خجالت سے بحر ندامت میں غوطہ زن ہوئی۔۔۔۔۔" (فسانہ عجائب)

ایک روز بہار کے موسم میں کہ مکان بھی دلچسپ تھا، بدلی گھمنڈ رہی تھی، بوندیاں پڑ رہی تھیں، بجلی بھی کوند رہی تھی اور ہوا نرم نرم بہتی تھی غرض عجیب کیفیت اس دم تھی، جونہی رنگ برنگ کے حباب اور گلابیاں طاقوں پر چنی

ہوئی نظر پڑیں، دل للچا یا کر ایک گھونٹ پی لوں جب دو تین پیالیوں کی نوبت پہنچی، وہیں خیال اس باغ نوخرید کا گزرا، کمال شوق ہوا کہ ایک دم اس عالم میں وہاں کی سیر کرنا چاہئے کم بختی جو آوے، اونٹ چڑھے کتا کاٹے اچھی طرح بیٹھے بٹھائے ایک دائی کو ساتھ لے کر سرنگ کی راہ سے اس مکان میں گئی، وہاں سے باغ کی طرف چلی، دیکھا تو ٹھیک اس باغ کی بہار بہشت کی برابری کر رہی ہے، قطرے مینہ کے درختوں کے سبز سبز پتوں پر جو پڑے ہیں گویا زمرد کی ٹہنیوں پر موتی جڑے ہیں اور سرخی پھولوں کی اس ابر میں ایسی بھلی، جیسے شفق پھولی ہے ......" (باغ و بہار)

مرزا صاحب نے احباب کے اصرار و تاکید پر سادہ اور سہل عبارت لکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنے نزدیک مشکل الفاظ کو دور کرکے لکھنؤ کے روزمرہ، اور گفتگو کا نمونہ پیش کیا ہے۔ لیکن اس پر بھی کر وردں بنا دہیں ہم کو تمام کتاب میں کہیں دو جملے بھی ایسے نہیں ملے جو تصنع یا تکلف سے خالی ہوں۔ شاید مرحوم کو یہ معلوم نہ تھا کہ انسان ہر وقت گانا نہیں سن سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ فسانہ عجائب باغ و بہار کی نسبت زیادہ مقبول ہوئی مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں جب کسی قوم کا مذاق ادب بگڑ جاتا ہے تو سنورتے سنورتے ہی سنورتا ہے۔ ہمارے ڈراموں میں آج تک وہی سرور کا رنگ غالب ہے اور عوام اسی قسم کی مقفیٰ گفتگو سے لطف اٹھاتے ہیں۔

باغ و بہار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل دلی اپنی زبان سے کسقدر محبت رکھتے ہیں اور اس کو ترقی و وسعت دینے میں کس درجہ کوشاں تھے۔ دوسری زبان کے الفاظ و محاورات اور ضرب الامثال کے تراجم کی ایک فہرست لکھتے ہیں جن کو میرامن نے اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے:۔

وہ دو دلا ہو گیا	دو دل شدن
اگر اس کی بات کرسی نشین ہو گی	صرف برکرسی نشانیدن

برباد دی۔	بہ باد دادن۔
مہربانی کی راہ سے۔	از رہ کرم۔
بہت باتیں مجھے خوش نہیں آتیں۔	خوش آمدن
لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھے	لیلی را بچشم مجنوں باید دید
یا اتنے گرم یا اتنے ٹھنڈے	یا بایں شوراشوری یا بایں بے نمکی
سر سے پاؤں تک جو گزرا تھا کہہ سنایا	از سرتا پا
سخاوت کا جامہ اس پر قطع کیا ہے۔	جامہ قطع کردن
میں دست بسر ہوا	دست برسر نہادن
ملکہ اس کے سر پر آئی	برسر آمدن
خاک تیرے سر پر۔	خاک برسر تو
مجھے خورد و خام کیا۔	خورد شدن
زمین خدمت کی چومی۔	زمیں بوسیدن
فقیروں کو جہاں شام ہوئی اپنا گھر ہے	درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست

ہندی اسم سے فعل بنانے کا طریقہ آج کل بعض ادبی حلقوں میں مضحکہ خیز سمجھا جاتا ہے میرامن نے نہایت آزادی سے اس پر عمل کیا ہے۔

میں دوڑتا دھوپتا ساتھ ہولیا

تیورا کر گرا

چور کارواں پر گر کر سب کو ننگیا لیں گے

اسی طرح اسم صفت سے حاصل صفت بھی بناتے ہیں:۔

دبلاپے سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے

حکیمی کے فن میں۔

محبوبی

کل کہا میں نے میرے گھر چلیئے	اس میں کچھ کم نہ ہوگی محبوبی

(حیران دہلوی)

وار (لاحقہ) کا استعمال آج کل کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ "ذمہ دار" ہمارے دیکھتے دیکھتے "ذمہ دار" بن گیا۔ باغ و بہار میں یہ لاحقہ جا بجا استعمال کیا گیا ہے مثلاً منت وار، تقصیروار خطاوار، امیدوار وغیرہ

اس کتاب میں بعض ایسے الفاظ و محاورات بھی موجود ہیں جو خلاف قیاس لغوی کی بنا پر متروک ہو چکے ہیں مثلاً قفل کرنا بمعنی مقفل کرنا، غضب ہونا بمعنی غضب ناک ہونا۔ دستگیر کرنا گرفتار کرنا۔

دلی کے متقدمین اس قسم کی جدتیں بے دھڑک کرتے تھے۔

دیکھنے سے مرے کا ہیکو غضب ہوتے ہو۔ کیا غضب ہوگیا گر میں نے بھی دیکھا دیکھا۔

(حسن شاہجہاں آبادی)

حنا کی طرح میں اپنا بہل کیا ہے خوں	بتاں شہید کرو خواہ دستگیر کرو

(یقین)

ہزل ہمارے ادب قدیم کا ایک جزو ہے افسوس کہ اس سے باغ و بہار بھی نہ بچ سکی ایک آدھ مقام پر میر صاحب متانت سے گر گئے ہیں اور مرزا صاحب تو (فسانہ عجائب میں) بعض جگہ پورے پھکڑ بن گئے ہیں تعجب ہے کہ باغ و بہار جو صاحبان انگریز کی سرپرستی میں لکھی گئی کیوں نہ اس عیب سے خالی رہی۔

درحقیقت میر امن کا ایک اعجاز ہے کہ اس نے دور تصنع میں باغ و بہار جیسی پاکیزہ کتاب لکھی، یہ اپنے عہد کی بہترین تصنیف ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر دلی پر تباہی نہ آجاتی تو ہماری نثر ابتک کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہوتی۔ حضرات لکھنؤ نے اردو کو بڑے شوق اور محنت سے سیکھا اور

بلاشبہ وہ بہت جلد اہل دلی کے مدمقابل ہو گئے مگر سب وہب میں اتنا ہی فرق ہے کہ دلی سے باغ وبہار اور لکھنؤ سے فسانۂ عجائب پیدا ہوئی اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے کس کی عمر زیادہ ہوگی۔ ابتداءً دنیائے انشا میں باغ وبہار کا انداز مقبول نہ ہوا برخلاف اس کے فسانہ کے تتبع میں متعدد فسانے اور قصے لکھے گئے جو اب دم توڑ چکے ہیں لیکن میرامن کی کوششیں بیکار نہ گئیں۔ تقریباً نصف صدی کے بعد مرزا غالب کے خطوط سے انکا احیا ہوا اور آخرکار سرسید مرحوم نے اس کو چار چاند لگا دیئے۔

سفر حجاز

(گذشتہ سے پیوستہ)

مکہ مکرمہ - زاد ہا اللہ تشریفاً و تعظیماً - اسوقت اگر حرم تیرہ سو برس پہلے کی کوئی چیز اپنی اصلی حالت پر معلوم کرنا چاہیں تو وہ صرف میدان، پہاڑیاں، خانہ کعبہ اور زمزم ہیں، پہاڑوں میں زیادہ مشہور یہ ہیں اجیاد، صفا، حرا، ثور، ثبیر وغیرہ چھوٹی بڑی پہاڑیاں ہیں، بہت سے نئے نام ہیں مثلاً جبل عمر شہر میں جو پہاڑیاں ہیں عمارتوں کی وجہ سے غائب ہوگئی ہیں، صفا و مروہ پر عمارت اس طرح ہے کہ سعی کا سلسلہ چند سیڑھیوں پر ختم ہو جاتا ہے بیچ میں بازار نہایت تنگ و تاریک ہے، کدا سے آنیوالا بہت دور سے خانہ کعبہ کو دیکھ سکتا تھا، اب دو تین مکان کے فاصلہ سے بھی مشکل دیکھ سکتا ہے، تمام عمارتیں بلند ہیں، خانہ کعبہ بہت پست مقام میں ہوگیا ہے، سوق مدعاۃ جہاں سے لوگ خانہ کعبہ کو دیکھکر دعا کرتے تھے آج اس کے اردگرد اتنی عمارتیں ہیں کہ حرم کے منارے تک وہاں سے نظر نہیں آسکتے۔ شاید کسی بلند مکان کے تیسرے چوتھے درجہ سے کوئی منارہ دکھائی دیتا ہو

مکہ مکرمہ کی عمارتیں بلند خوشنما مگر سڑکیں تنگ و تاریک ہیں، عمارتیں سہ منزلہ چہار منزلہ ہیں، صفائی کا خاص اہتمام ہے، ہر عمارت میں بیٹھک ہوتی ہے، ہر مکان کو فرش فروش گدے تکئے سے آراستہ کرنیکا ہر عام و خاص کو خیال ہے، چونکہ غسلخانے پاخانے وغیرہ مکان میں اس طرح بنائے گئے ہیں کہ زمین میں کنوے کھود کرانکے پانی کو وہیں اتار دیا گیا ہے اس وجہ سے نیچے کا حصہ غالباً زیادہ نمناک اور خراب ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مچھروں کی ایسی کثرت ہے جو پریشان کرتی ہیں ہوا کیلئے کھڑکیاں ہوتی ہیں مگر مکانات کے قرب کی وجہ سے ہوا کی آمد و رفت کا راستہ مسدود ہوگیا ہے۔ جس مکان میں سطح یعنی برآمدہ یا کھلی چھت نہ ہو اسمیں موسم گرما گذارنا ممکن ہے، پہاڑوں پر جو مکانات دیکھے گئے ان میں خوب ہوا تھی۔ مکانات کے مالک ایام حج میں اکثر حصہ کو کرایہ پر دیدیتے ہیں، کسی ایک حصہ میں خود گذر کرتے ہیں، عموماً ہر مکان کا کرایہ ایام حج میں جنکی ابتدا ر

حج بیت اللہ چھ سے شوال، ذوالقعد تک ہوتی تھی، اب صرف محرم کی پانچ یا دس تاریخ تک پورا عمرہ کرلیا جاتا ہے یعنی سال بھر کا کرایہ ان ہی ایام میں لے لیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد بہت کم لوگ کرایہ پر مکان دینے پر راضی ہوتے ہیں ۔ اب حکومت کی طرف سے انتظام کا اعلان ہوا ہے پہلے فی کرایہ معین گیارہ سے آٹھ دس گنی تک کرایہ لیا جاتا تھا ۔ اس میں جتنے آدمی رہیں اسکی کوئی تحدید نہیں ۔

ہر قسم کی اجناس کے بازار الگ الگ ہیں جو موسم حج میں آراستہ و پیراستہ ہوتے ہیں سوق اللیل باب خانہ دریزانوہ کا عمدہ بازار ہے ، مگر تنگ و تاریک و سائبان دار ، مخلوط ناج کی منڈی ، سوق الحراج نیلام کا بازار ، اسی طرح میوہ جات ، سبزی ، اور جانوروں کے الگ الگ بازار ہیں ۔

یہ معلوم ہے کہ خاص مکہ مکرمہ میں کوئی چیز نہیں تیار ہوتی مگر تمام دنیا کی بہتر سے بہتر اشیاء یہاں دستیاب ہوتی ہیں ، ہر قسم کے فواکہ بھی بافراط ملتے ہیں ، حیوانات بہت عمدہ اور قوی دیکھے گئے ، گوشت نہایت عمدہ ملتا ہے ۔

پانی ہر قسم کا شیریں ، شور بکثرت ملتا ہے ، متعدد کنوئے ہیں جنکا پانی ذرا تلخی لئے ہوئے ہے مگر صحت بخش ، نہر زبیدہ کا جال تمام مکہ ، منیٰ ، عرفات میں بچھا ہوا ہے اور اسکا پانی بہت شیریں ہے ، عموماً ہر جگہ آب زمزم اور زبیدہ کا پانی مستعمل ہوتا ہے ۔ کیسی ہی گرمی کیوں نہ ہو شربہ (صراحی) میں پانی رکھا یا حوض (بڑے مٹکے) میں بھروایا اور تھوڑی دیر میں نہایت عمدہ ٹھنڈا ہو گیا ۔ اگر شب کو چھت پر رکھا جائے تو بہت ہی ٹھنڈا ہو جائیگا ۔

خاص مکہ مکرمہ میں شدت گرما میں بھی کھلے مکانوں میں حبس نہیں ہوتا ، مگر گرمی ضرور ہوتی ہے لیکن اگر جنگل میں چلے جاؤ اور کسی خیمہ میں بیٹھو تو وہ تکلیف بھی محسوس نہ ہوگی رات کو عموماً خنکی ہوتی ہے ، منیٰ اور مزدلفہ کی راتیں تو اچھے خاصے گلابی جاڑے کی یاد تازہ کرتی تھی ۔

مکہ مکرمہ کی آب و ہوا معتدل اور صحت بخش ہے۔ وہاں کے عام باشندے مستعد، پھرتیلے، اور چست نظر آتے ہیں، تعلیم عام ہو جانے پر انکی حالت بہت درست ہو جانیکی قوی امید ہے۔

بیت اللہ الحرام، مکہ مکرمہ کے وسط میں متفرق پہاڑیوں کے نشیب میں واقع ہے پہلے اس کے اردگرد قریش کے متفرق خاندانوں کے محلے اور مکانات تھے جس کی بنا پر اب تک دروازوں کے نام چلے آتے ہیں، باب بنی شیبہ، باب بنی سہم، باب ام ہانی وغیرہ، خانہ کعبہ مربع عمارت ہے جو بڑے بڑے مربع پتھروں سے بنائی گئی ہے، اسکی موجودہ عمارت حجاج بن یوسف الثقفی کی بنا کردہ ہے، جو عبد الملک کے حکم سے بنائی گئی وقتاً فوقتاً اس کی مرمت ہوتی رہی، اسکے گرد سنگ مرمر کا فرش ہے جو مطاف کہلاتا ہے، شرقی جانب دروازہ ہے اس کے متصل ایک کنارہ میں حجر اسود لگا ہوا ہے، جہاں سے طواف کی ابتدا کیجاتی ہے، حجر اسود کے متصل ہی مقام کے ختم ہونے پر زمزم ہے اس سے متصل کمانی ہے جسے باب بنی شیبہ کہتے ہیں، اس کمانی کے متصل مقام ابراہیم ہے جہاں طواف کرنیوالا سنت طواف (دو رکعت) ادا کرتا ہے اسی کے متعلق وارد ہے واتخذوا من مقام ابراہیم مصلی۔ پہلے یہ پتھر خانہ کعبہ سے لحق تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کسی سیلاب کیوجہ سے بے جگہ ہو گیا کہتے ہیں انہوں نے اس جگہ رکھوایا، اسپر حضرت ابراہیم عبادت کیا کرتے تھے اور حج کے لئے اذان دی وہ بھی اسی پر تھی بعض نے کہا خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت اس پر کھڑے ہوا کرتے تھے عوام الناس اسے چھوتے اور اس سے تبرک لیا کرتے تھے اور کسی کو موقع ملتا تو اسکا ٹکڑا کاٹ لیتا تھا اس وجہ سے اسے ایک احاطہ میں محفوظ کر دیا گیا۔ اب بھی جہاں کو دیکھا کہ وہ زنجیروں اور کڑوں کو پکڑتے، چھوتے اور ہلاتے تھے جو ایک فضول عمل ہے، اس پر بعض اہل نجد غصہ ہوتے تھے، پہلے ان کڑوں اور زنجیروں میں سیکڑوں ڈورے منت اور نذر کے باندھے جاتے تھے اسلام میں ایسی رسوم کا کہیں پتہ نہیں بلکہ ان سے بت پرستی کی پوری تقلید ظاہر ہوتی ہے اس لئے مسلمانوں کو ایسے محدثات سے اجتناب کرنا چاہیئے، مقام ابراہیم سے متصل منارہ ہے جس پر خطیب جمعہ کے روز خطبہ

شامل ہے خانہ کعبہ کا ایک حصہ جسے حطیم کہتے ہیں ایک دیوار سے گھیر دیا گیا ہے، جاہلیت میں جب خانہ کعبہ کی عمارت منہدم ہو گئی تھی تو قریش نے اُسے از سر نو تعمیر کیا، مگر نفقہ کم ہونے کی وجہ سے اس حصہ کو اندر نہ کر سکے نیز چوکھٹ بہت اونچی رکھی تاکہ جسے چاہیں اندر جانے دیں، جسے چاہیں نہ جانے دیں، بجائے دو دروازوں کے ایک دروازہ رکھا حطیم اور باب کعبہ کے درمیان ایک گڑھا ہے جسے معجنہ کہتے ہیں، اکثر لوگوں کو دیکھا گیا کہ بعد نماز فرض اسمیں نفل پڑھتے تھے مگر اس کے متعلق کوئی صحیح بات نہیں معلوم ہو سکی بعض کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس جگہ گارا بناتے تھے اس لحاظ سے اسکا نام معجنہ رکھا گیا ہے، بعض نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ نماز پڑھی تھی، خانہ کعبہ کے گرد کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں آپنے نماز نہ پڑھی ہو، تاہم دروازہ کے قریب نماز پڑھنا اصح روایات سے ثابت ہے دیگر مواقع کے متعلق جس قدر روایات ہیں انکی تعداد چھ یا سات ہے حطیم کی طرف کی جہت شامی اور اسکے دونوں کنارے شامیین کہلاتے ہیں، حجر اسود اور اس کے مقابل یا پیچھے کا کنارہ رکنین یمانیین یا حجر اسود اور رکن یمانی کہلاتا ہے، طواف کے وقت ابتدا میں حجر اسود کو چومتے یا ہاتھ سے چھو کر ہاتھ کو چومتے ہیں آخر میں رکن یمانی کو چھوتے ہیں، پھر حجر اسود کو ابتدا کے لئے چومتے ہیں اس طرح سات مرتبہ حجر اسود کو چوما جاتا ہے۔ آٹھویں مرتبہ چوم کر مقام ابراہیم پر دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔

خانہ کعبہ کے گرد مطاف ہے پھر اسکے بعد ایک پختہ احاطہ کچھ بلند آتا ہے جس پر حنفی، مالکی حنبلی مصلے ہیں، شافعی مصلی وہی مقام ابراہیم یا خانہ کعبہ کے دروازے کے قریب ہے ان مصلوں کی ابتدا چوتھی یا پانچویں صدی سے ہوئی، جبکہ مسلمانوں پر اختلاف و عصبیت کا غلبہ تھا مگر باقاعدہ عمارتیں ساتویں آٹھویں صدی میں تیار ہوئی تھیں، ہرچند کے علما نے اختلاف کیا اور اسکی حرمت کا فتوی بھی دیا تھا اس لئے کہ ایک تو نماز میں تشویش ہوتی تھی دوسرے لوگ جماعت میں شامل ہونے سے رکتے تھے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ امام صاحب مع چند مصلی بیٹھے

رہتے تھے، ایک جماعت ختم ہونیکے قریب ہوتی کہ دوسری نے دوسری شروع کر دی۔ مگر بعض مصالح کی بنا پر اسے قائم کر دیا گیا جس سے حرم الٰہی میں اختلاف وشقاق کی بنیاد پڑ گئی۔ کسی ایک مذہب کے امام کا نماز پڑھا دینا کافی تھا، ناحق اس طرح شقاق کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ ابن جبیر کے زمانہ میں زیدیہ کا کچھ غلبہ تھا اس لئے پانچواں مصلیٰ بھی تھا۔ گذشتہ سال مغرب اور عشاء کی صرف ایک جماعت ہوتی تھی، فجر میں حنفی امام دوسری جماعت کراتا تھا، ظہر میں شافعی عصر میں مالکی۔ میں نے تو اس طریقہ کو بھی غلط خیال کیا، اور صرف ایک جماعت کیلئے کہا اور اسی کے متعلق گفتگو کی۔ للہ الحمد اب یہ خبر محقق ہو چکی ہے کہ صرف ایک جماعت پنجوقتہ رکھی گئی۔ اور وہ متفرق اہل مذاہب میں تقسیم کی گئی۔ یہ رائے اکثر ارباب سیاست کی ہوگی، مگر اسمیں پھر خامی باقی ہے، صرف ایک مذہب کی جماعت ہونی چاہیئے خواہ حنفی ہو یا حنبلی۔ واللہ الموافق۔

اذان وغیرہ میں جو بدعات مروج تھیں وہ سب ختم ہو گئیں صبح کے وقت دو اذانیں سنت کے مطابق ہوا کرتی ہیں۔

ان مصلوں میں صرف حنفی مصلیٰ ایک تاریخی یادگار کی حیثیت رکھتا ہے، کہتے ہیں دار الندوہ اسی جگہ تھا، جہاں کفار قریش اپنے تمام معاملات، جنگ وصلح طے کیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا معاملہ بھی یہاں طے ہوا تھا۔ اس بلندی کے بعد بجری کا ایک احاطہ ہے، سبحان اللہ! مکہ کی دھوپ سے دن بھر تو وہ آگ ہوتا ہے۔ مگر دھوپ کی تیزی ختم نہیں ہوتی کہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے، اسی پر مغرب کے بعد عموماً لوگ بیٹھتے ہیں کیونکہ سنگین فرش والا حصہ گرم ہوتا ہے۔ بجری کے بعد آخری احاطہ پر سائبان ہے، اور آس کے ساتھ مدارس جو کمروں کی شکل میں عمدہ عمارتیں ہیں، انہیں طلبہ واہل علم کی جائے اقامت بھی تھی، مگر آج یہ موقوفہ مقامات مملوکہ ومغصوبہ بنے ہوئے ہیں۔ بجائے اہل علم کے یہاں امراء واغنیاء مقیم رہتے ہیں اور معقول کرایہ لیا جاتا ہے۔ حرم کے ۲۰-۲۲ چھوٹے بڑے دروازوں میں سے پانچ چھ بڑے ہیں۔ باب السلام، باب الزیادہ، باب ابراہیم وغیرہ، ان میں سے صرف دو یا تین جگہ برائے نام وضو کا کچھ انتظام ہے باقی کچھ نہیں، ایک یا دو جگہ جائے ضرورت کا انتظام

جو ملتی ہیں حوض کا پانی بنا رہا ہے بعض سبیلیں ہیں جنکی قیمت وصول کیجاتی ہے مگر پانی نہیں رکھا جاتا۔ ہزاروں روپیہ حج کے موسم پر خرچ کرتے ہیں مگر کسی بندۂ خدا کے دل میں یہ نہ آیا کہ ایسا انتظام کیا جائے جو ابداً الآباد باقی رہے اور جس سے قیمتی منفعت حاصل ہو حرم میں مطاف پر سب سے پہلے چھت کی ضرورت ہے جو عام دنوں میں غیر ضروری ہے، صرف موسم حج میں یکم ذوالحجہ یا ۲۰ ذیقعدہ سے ۱۵ ذوالحجہ تک دہرے پھریرے خیمے کے رنگ لگایا جائے۔ بجری اور دیگر احاطہ پر صرف ایام حج میں یکم ذوالحجہ سے ۹ تک خیمہ ہو، پھر ۱۳ سے ۱۵ تک رہے ہر دروازہ کے مقابل ایسا راستہ بنایا جائے جس پر سائبان رہے تاکہ آنے جانے والوں کو گرمی کی شدت سے نجات ملے کیونکہ دوپہر کو اگر بھولے بھٹکے کسی نے بغیر جوتہ چلنے کی ہمت کی تو اس کی حالت بہت خراب ہو جاتی ہے، پانی کی متعدد سبیلیں ہونی چاہئیں جو ہر دروازہ پر ملیں حرم میں جابجا ہوں اور قیمت پر پانی پلانیوالوں کو یک قلم موقوف کر دیا جائے۔ جو شرعاً ناجائز ہونیکے علاوہ اسلامی روایت و سخاوت کے خلاف ہے۔ کم از کم دس جگہ یا اس سے بھی کم ہو تو پانچ چھ جگہ ایسے وضو خانے یا حوض بنوائے جائیں جن سے دو سو آدمی ایک وقت بلا تکلف وضو کر سکیں، ہر وضو خانہ کے ساتھ بیت الخلا اور پیشاب خانے بھی بنیں جن کی صفائی کے واسطے آدمی مقرر ہوں۔

اگر عام طور پر عمارت نہ بن سکے تو ایام حج میں ایک ماہ کیلئے ایسا معقول انتظام ازبس ضروری و لابدی ہے، اکثر حجاج کو پریشانی ہوتی ہے، پانی نہیں ملتا، راستہ میں بہت سے قضاء حاجت کر لیتے ہیں جس سے لوگوں کو سخت اذیت پہنچتی ہے، تمام دنیا کی مساجد میں وضو خانے موجود ہیں پینے کا پانی بلا تکلف میسر آتا ہے مگر افسوس کہ خانہ کعبہ میں مسلمانوں کی سخاوت کا دریا خشک ہو گیا کئی روز میں نے لوگوں کو پانی کے واسطے پریشان دیکھا، جو لوگ رات کو سوتے تھے صبح وضو کے واسطے حیران رہتے تھے، پیاسوں کی یہ کیفیت کہ اکثر مجبوری سے نہایت رنجیدہ ہوتے تھے۔ ہندوستان کے حجاج اور رؤسا کبوتروں، اور دیگر حرم کے باشندوں کو زکوٰۃ خیرات دیتے ہیں، حالانکہ اس سے بہتر بہت سے کام ہیں، جانوروں کا تو بعد کو خیال ہو گا، پہلے

آدمیوں کا کام تو پورا کیا جائے، ریاستوں کی طرف سے بھی سبیل کی رقمیں اور تنخواہیں مقرر ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی سبیل معقول صورت میں نہیں دیکھی، نہ کسی جگہ پانی کا کافی انتظام پایا، برائے نام کسی وقت بھروا دیا گیا تاکہ رقم مقرر جائز ہو جائے۔ اکثر حاجی زکوۃ و خیرات کی بہت سی رقمیں بیجا کر وہاں تقسیم کرتے ہیں جو محض بیکار اور فضول ہوگی اس لئے کہ وہ عموماً مستحقین کو نہیں ملتیں نیز جس شخص کے مصارف یومیہ تین چار روپیہ ہوں اُسے پانچ دس روپیے بھی تو کس کام کے شریعت نے زکوۃ و خیرات کے واسطے اس طرح بیجا خرچ کرنیکا کوئی حکم نہیں دیا ہے بلکہ باقاعدہ خاص خاص مقامات پر خرچ کا حکم ہے، اگر یہی رقوم محفوظ شکل میں کسی جگہ جمع کر کے اُن سے اصلاح و تعلیم کا کام لیا جائے تو آب حیات سے کم نہ ہوں مثلاً مسافر خانے حجاج کی آسایش کے اسباب، اور وہاں کی ضرورتیں رفع کرنیکی صورتیں غرض اشد ضرورت ہے کہ اس بیقاعدہ کام کی اصلاح کیجائے۔

طواف کے وقت صرف اواخر ذیقعدہ سے کچھ ہجوم ہوتا ہے جو ذوالحجہ تک رہتا ہے، اس کے ماسوا ہجوم نہیں ہوتا۔ عورتوں کو شرعاً ممانعت ہے کہ وہ ہجوم میں گھسکر طواف کریں یا حجر اسود کے پاس بھیڑ کا مقابلہ کرنیکے واسطے آئیں، مگر مصری عورتوں کو کیا کہئے، کہ مردوں سے زیادہ وہ اس کے واسطے زور کرتی تھیں،

عرب کے قبائل میں سے نجد و یمن کے بدو حجر اسود پر بہت اژدحام کرتے تھے، ذوالحجہ کی ابتدائی تاریخوں سے انکی آمد شروع ہوئی جس کی وجہ سے رات کے علاوہ عام طور پر بھیڑ رہتی اور حجر اسود تک پہنچنا مشکل تھا۔ ابن جُبیر نے بھی اپنی رحلت میں اسکا ذکر کیا ہے، استاذی شیخ محمد طیب کی مرحوم بھی کہا کرتے تھے کہ عسیر و نجد کے بدو جس زمانہ میں حج کیلئے آتے ہیں، انکی جماعت آپس میں گتھی ہوئی اور اس قدر ملی ہوئی ہوتی ہے کہ کسی دوسرے آدمی کا ان میں گھسنا اور پھر ان سے جا نبر ہونا مشکل ہوتا ہے۔ وہ حجر اسود چومے بغیر حج کو پورا نہیں سمجھتے، عورتوں کو ساتھ لاتے ہیں اور انکو پکڑ پکڑ کر بزور وہاں پہنچاتے اور حجی حجی کا شور مچاتے ہیں یہ تمام باتیں آنکھوں سے دیکھیں، بعض عورتوں کے حمل ساقط ہونیکی خبر بھی سنی گئی، حج کے بعد طواف وداع میں حجر اسود کی حالت خراب ہو گئی تھی اس

وجہ سے سرکاری طور پر ممانعت کردی گئی یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک شخص کا سر اس طرح کچل گیا کہ اسکی خاصی حالت ہوگئی تھی تین روز تک بیمار رہا - میں نے بہت سے بدوؤں کو دیکھا کہ عاجزی و زاری کر کے کہتے تھے الوداع الوداع، مگر سنتری کسی کی نہ سنتا تھا، اُس نے مجھسے کہا کہ ہمکو حکم ملا ہے کہ نجدی کو ماریں اور باقیوں کو ویسے منع کریں، اُن نجدیوں کو مار بھی جاتا تھا مگر وہ پرواہ نہ کرتے تھے اور حجر اسود تک کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتے تھے۔ بالآخر بندوق سے ڈرایا گیا تب رکے۔

تمام لوگوں کو بالخصوص مصریوں کو دیکھا کہ نماز کا سلام نہیں پھرا اور وہ حجر اسود پر دوڑ گئے بعضے تو سلام سے پہلے ہی اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کر دیتے ہیں یہ نری جہالت ہے حجر اسود کا بوسہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ اس کے واسطے نفل نماز توڑی جا سکے چہ جائیکہ فرض ایک مرتبہ ہم لوگ عشاء کی نماز میں تھے کہ کسی نجدی بدو نے نماز توڑ کر حجر اسود سے خوب اپنی بھڑاس نکالی۔ سلام کے بعد لوگوں نے اُسے پکڑ لیا اور کہا تو نے ایسی حرکت کیوں کی؟ میں بھی وہاں پہنچا اُسے سمجھایا بولا مجھے اسکا علم نہ تھا، اب آئندہ سے توبہ کرتا ہوں، ایک روز کثرت ہجوم سے وہاں کے سنتری عاجز تھے، میں بھی یہی تماشہ دیکھ رہا تھا لوگ نہایت بے دردی سے پٹتے تھے مگر بغیر بوسہ لئے نہ ہٹتے تھے۔ میں نے ایک بدو کا ہاتھ پکڑ کر اس سے کہا یہ فرض نہیں، مسنون فعل ہے اور بھیڑ کے موقع پر صرف اشارہ کافی ہے، وہ اسے سمجھ گیا اور اپنے ساتھیوں کو اسکی تلقین کر کے اشارہ سے طواف کرتا رہا۔

خانہ کعبہ کے گرد احاطہ میں دو عام کتبخانے ہیں، ایک باب الدریبہ پر حمیدیہ کے نام سے مشہور ہے جسمیں قلمی مطبوعات کا عمدہ ذخیرہ غیر منظم حالت میں پڑا ہے، دوسرا باب ام ہانی کے پاس شروانی کا کتبخانہ اسمیں بعض نادر کتابیں تھیں جو شریف کے زمانہ میں یورپ چلی گئیں۔ الوافی بالوفیات صفدی کا نہایت عمدہ نسخہ مکمل تھا اب چند اجزا ہیں، باب السلام میں کتب فروشوں کی دکانیں ہیں جنمیں ابو بکر خوقیر مشہور دینی علم اور تاجر کتب ہیں۔

مکہ مکرمہ کی تمام آبادی میں عربی خاندان کے لوگ عنقا ہیں، اجانب آکر بس گئے جو مکی کہلاتے

میں بعض ملکی احباب کا بیان تھا کہ صرف ایک دو خاندان کے علاوہ سب دخیل ہیں غرض قریش کا
اصلی موطن آج اُن سے خالی نظر آتا ہے، ہاں جنگل میں کچھ بستیاں ہونگی لیکن مجھے اس مقصد سے سیاحت
کا موقع نہیں مل سکا، نہ ایکی مرتبہ زیادہ تفتیش سے کام لیا گیا. عموماً جادہ کے لوگ آباد میں انہیں حجاز
سے خاص انس بھی معلوم ہوتا ہے میں نے بعض لوگوں سے سنا ہے کہ انکے یہاں حج کے قبل شادی
کی رسم بھی ادا نہیں کرتے. گویا دولھا دلہن کا حاجی ہونا ازبس ضروری امر ہے. یہ لوگ تاجر اور
مالدار ہوتے ہیں، مگر بہت ضعیف اور لاغر، حاجی باقر وغیرہ انکے فضلاء موتمر میں شرکت کے واسطے
آئے تھے اُن سے ملاقات ہوئی، بہت ذی فہم معلوم ہوئے. اُنکے یہاں اصلاح کی سعی بڑی
حدتک کامیاب ہو رہی ہے. مکہ کے متوطنین عموماً مطوفی یا تجارت کرتے ہیں. انکے اخلاق میں
نرمی وضع قطع میں لطافت وصفائی ہے، ظاہراً باحیا ومروت ہیں مگر علم وتدین سے کوئی تعلق
نہیں، گذشتہ ایام میں صرف شریف عون کا زمانہ علماء وفضلاء کا زمانہ مانا جاتا ہے، جبکہ ہر علم وفن
کے لوگ پائے جاتے تھے، شریف کی مجلس انہی سے گرم تھی. اہل مکہ میں سے بجز چند معدودے
نماز روزہ کا پابند کوئی نہیں معلوم ہوتا، حج وطواف محض حاجیوں کی بدولت انکے سر لگ جاتا ہے
ورنہ انکی مثال تو یہی ہے کہ چراغ تلے اندھیرا. اب معلوم ہوا ہے کہ انکا انتظام ہو رہا ہے اور فرائض
اسلام کی طرف متوجہ کئے گئے ہیں، خدا کرے کہ ایسا ہو. یہ لوگ ایام حج میں روپیہ حاصل کر کے
حجاج کی واپسی پر اسے خوب بے تکلفی سے اڑاتے اور طائف وغیرہ پر لطف مقامات کی سیر کرتے ہیں
اگر موقع ملا تو اپنے موکلین کے یہاں بھی پہنچتے ہیں، انکے لباس ووضع قطع اور مصارف سے انسان
سمجھ سکتا ہے کہ انہیں کسقدر سالانہ رقم درکار ہوگی. یہ لوگ اگر تعلیمیافتہ ہوں تو بہت منفعت پہنچا
سکتے ہیں. حاجیوں کی ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ گھر سے نرے کورے نکلتے ہیں نہ حج وغیرہ کے احکام
سے واقف ہوتے ہیں، نہ مخصوص دعاؤں سے، حالانکہ اس کے واسطے صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی تعلیم
کافی ہے، البتہ عمل کرانیکے واسطے ایسا رہبر درکار ہوگا جو مقامات سے واقف اور اعمال سے مطلع
ہو جس طرح مطوف کی وجہ سے راحت پہنچتی ہے اسی طرح یہ شکایت بھی ہے کہ انکی بدولت دماغ مختل

ہوجاتا ہے استقدر شور کرتے اور اس زور سے فضول نیتیں اور بیکار دعائیں رٹاتے ہیں کہ الامان کاش اللہ تعالیٰ ولی الامر کو اسکی طرف متوجہ کرے اور وہ اس لغو طریقہ کو بند کر دیں۔ میں نے اس کے متعلق بھی بعض احباب سے گفتگو کی ہے، اور ہر مطوف کو معقول تعلیم کے بعد سند ملنی چاہئے کہ یہ مطوفی کرا سکتا ہے، نیز مطوف حاجی کو پہلے سب باتیں سہولت میں سمجھادے تب لاوے۔ اگر ہر ایک حاجی مناسک حج کا ایک نسخہ لیکر رہن لے یا خود پڑھے پھر اس کے مطابق عمل کرے تو یہ شور و غوغا بند ہوجاوے

ایک یہ بھی قبیح عمل دیکھا گیا کہ مطوف عورتوں کو طواف کراتے وقت انکا ہاتھ پکڑتا ہے، اسکی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ کسی کپڑے کا پکڑ لینا کافی ہے۔

شریف اور شیبی کا خاندان مکہ کے اصلی باشندوں میں شمار ہوتا ہے مگر افسوس کہ علم تدین اور زہد کا نام نہیں، شیبی صاحب کے مظ لم پر تو العیاذ باللہ اگر خون کے آنسو بہائے جائیں تو کم ہیں، باب کعبہ پر اسکے غلام بیٹھکر عوام کو اس طرح مغلظات سناتے اور ایسے دھکے دیتے اور مارتے ہیں کہ کوئی اعز خلق اللہ اپنے مکان پر کسی اذل خلق اللہ سے بھی ایسا عمل جائز نہ رکھے گا۔ میں نے اس بارہ میں دو شکایتوں کو خاص طور سے محسوس کیا ہے، ایک یہ کہ عورت و مرد کا ایک ساتھ ایسی بھیڑ بھاڑ میں داخلہ، دوسرے دام لیکر یا مفت اس قدر ذلت و اہانت سے پیش آنا بعض اہل نجد نے یہ جواب دیا کہ سلطان نے شیبی کو بلا کر کئی بار سمجھایا اور ایسی حرکات سے منع کیا ہے، آئندہ اس کے متعلق شدت سے کام لیا جائیگا۔ میرے نزدیک یہ ٹھیکیداری کا معاملہ اور اس طرح سے مسلمانوں کی اہانت کرنا موقوف کیا جائے۔ کیا بیت اللہ المعظم میں بندگان خدا کے ساتھ ایسا برتاؤ باعث اذیت وعبرت نہیں؟

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ خانہ کعبہ کا داخلہ حج سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، نہ فرائض حج سے نہ سنن سے، اس لئے بلا وجہ اس پر زور دینا یا اس قدر ذلت اٹھا کر جانا جس میں جان کا بھی بعض وقت خطرہ ہوتا ہے، غیر ضروری ہے۔

مکہ مکرمہ میں پہلے بہت سے مقامات و مقابر بطور زیارت وعبادت مقرر تھے، لوگ وہاں جاتے

اور وہاں کے مجاوروں کی خدمت کرتے، مطوف بھی اس کے عادی تھے، انہیں تو کمانے سے غرض چاہیے کسی کا ایمان رہے یا جائے، ہر روز کسی نہ کسی جگہ حاجیوں کو لیجا کر کچھ رقم وصول کرتے تھے جو کچھ نذرانہ دلوائے اس میں بھی انکا حصہ تھا، اس کے علاوہ حاجیوں سے غلط طریقہ پر کفارہ کے جانور کی رقم لیجاتی ہے، اگرچہ حاجی سے کوئی غلطی نہ ہوئی ہو وہ کفارہ کا جانور ضرور کرے اور بجائے اس کے کہ خود ذبح کرے مطوف کو اسکی رقم ادا کردے، یہ بے اصل بات ہے، اگر کسی پر کفارہ یا فدیہ ہو تو اُسے چاہیئے کہ خود اپنے روبرو اُسے مستحقین تک پہنچائے، یا کسی معتدامانتدار کے ذریعہ سے، مطوف پر اعتماد کرنا ٹھیک نہیں، مقامات متبرکہ شعائر اللہ کے علاوہ جنکی صفت کتاب وسنت میں آئی، جن کا تعلق حج سے مذکور ہوا، تمام مقامات و مآثر مکہ مکرمہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جنکی کوئی تاریخی اصلیت ہے، دوسرے وہ جنکی تاریخی اصلیت نہیں، ویسے تو سارا مکہ ہی مآثر ہے کر کو بھی اس حیثیت سے کیوں مخصوص کریں، دنیا کا کوئی قطعہ زمین مآثر و مناقب سے خالی نہیں ہوسکتا کوئی نہ کوئی اہم واقعہ یا عبد صالح وہاں ضرور گزرا ہوگا، اگر کسی صالح کی یادگار معبد و مسجد کا حکم دیا جائے تو پھر کوئی جگہ مشکل بچ سکتی ہے، دور کیوں جاؤ، ہر چیز اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہونیکے لحاظ سے بالضرور احترام کے قابل ہے۔ اور فضیلت کی جستجو کی کیا حاجت ؟ اس قسم کے مقامات کی تخصیص اگر بندوں کے اختیار میں ہو تو ہر جگہ خانہ کعبہ ہوسکتا ہے اور ہر مسجد مسجد نبوی کا حکم رکھتی ہے، پھر طواف وسعی کے واسطے اتنے دور دراز سفر کی ضرورت باقی نہیں رہتی، نہ مکہ اور دیگر شہروں میں کوئی تفریق وتفضیلت کی گنجائش ہے۔ شرع کی طرف سے مقامات کی تخصیص صاف وصریح حجت ہے کہ اسمیں انسانوں کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ جس جگہ کو چاہیں مخصوص کردیں اور کسی ادنیٰ یا اعلیٰ کی طرف نسبت کرکے اسکو شعائر اللہ کی طرح محل عبادت و نذر و نیاز سمجھیں۔

منجملہ ان مقامات کے جو بے اصل و بے حقیقت ہیں مولد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ایک جگہ مقرر تھی جو اب مسمار کردی گئی ہے۔ بیت خدیجہ جسمیں مولد فاطمہ وحسنین تک کا ذکر بعض لوگوں نے کیا ہے، یہانتک کہ ابن جبیر اندلسی جیسا فاضل بھی اسے بلا کسی قسم کی جرح کے اپنے سفرنامہ میں

لکھ گیا۔ حالانکہ یہ معاملہ معمولی لیاقت کے آدمی پر بھی مخفی نہیں رہ سکتا، علم تاریخ وسیر سے واقف بھلا
اسمیں کچھ بھی شبہ کرسکتا ہے کہ بنی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی مکہ میں نہیں ہوئی تھی، نہ حسنین کی
ولادت مکہ میں ہوئی۔ فتح مکہ سے قبل مسلمانوں کو حق ہی نہ تھا کہ یہاں آکر رہیں، پھر فتح مکہ کے بعد مہاجرین
کو شرعاً ممانعت تھی کہ اپنی ضروری اشغال کے بعد تین روز سے زیادہ رہیں یا ہجرت میں واپس ہوجائیں
جو چیز خالص اللہ عزوجل کے لئے ترک کی گئی ہو اسمیں واپسی کا کوئی موقع نہیں، بلکہ ہجرت کرکے
اس مقام پر مرنا بھی معیوب سمجھا گیا، چہ جائیکہ وہاں واپس آکر آباد ہونا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
ولادت کے وقت عرب میں اس قسم کا کوئی چرچا نہ تھا، نہ وہ اس قسم کے رسوم سے واقف تھے، یہ
رسوم یہود ونصاری سے ماخوذ ہیں جنھیں مسلمانوں نے مرور زمانہ ایران سے حاصل کیا، نہ آپ اور
آپکے بعد خلفاء راشدین وصحابہ وتابعین کے زمانہ تک اس قسم کا کوئی چرچا ہوا نہ تاریخ وسیر سے کوئی
صحیح تعیین ایسے مقام کی ہوسکی، نہ یہ معلوم ہوسکا کہ عبد المطلب کا مکان کس جگہ تھا۔ چہ جائیکہ ایک
مکان منتخب کرلیا جاوے۔ یہ جگہ صدیوں بعد بنائی گئی ایک بات اور بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، عمرۃ القضاء ۷ھ اور فتح مکہ ۸ھ حجۃ الوداع ۱۰ھ میں متعدد مرتبہ
مکہ مکرمہ آئے، مدتوں رہے، مگر نہ کسی مخصوص مقام کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے، نہ غار حراء
یا ثور کی زیارت کی جو خاص آثار ہیں، حراء میں آپ پر سب سے پہلے وحی نازل ہوئی اور غار ثور میں
آپ ہجرت کے وقت تین دن تک رہے تھے۔ اگر اس قسم کے آثار کی شرعاً کوئی ایسی حیثیت ہوتی
جو شعائر اللہ کی ہے تو سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اسکی جستجو کرتے، اور
پابند ہوتے۔ شریعت کی نظر میں صرف تین مقام اس قابل ہیں جن کے واسطے سفر ہوسکتا ہے، مسجد
حرام، مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم، مسجد اقصی، انکے علاوہ دوسرے مقامات تاریخ یا دیگر وجوہ سے
خواہ کتنی ہی عظمت کیوں نہ رکھیں، عبادت وثواب کی خاطر انکا سفر ناجائز ہے۔ لاتشد الرحال الاالی
ثلثۃ مساجد۔ نہ انکی زیارت کے لئے کوئی دن مخصوص کیا جائے جیسے حج کے لئے ایام حج، نہ ایسے آثار
کا تتبع کیا جائے۔

یہاں ایک امر قابل افسوس ہے جس پر افسوس نہیں کیا جاتا، صفا، مروہ پر کسی فرد کی ملکیت نہیں، اسی طرح منیٰ میں لوگوں نے عمارتیں قائم کرلی ہیں، اس سے ایک تو لوگوں کے حقوق غصب نے کئے گئے۔ دوسرے طواف کی تکمیل نہیں ہوسکتی، راستہ الگ تنگ ہوگیا، بازار کی وجہ سے ہر وقت شور وغل رہتا ہے جس سے عبادت میں لطف نہیں آتا، یہ امور اس قابل ہیں کہ انکی طرف توجہ کیجائے۔ اور صفا، مروہ کے اکثر حصہ کو عمارت سے صاف کردیا جائے۔ منیٰ کی عمارتیں بھی مسمار کردیجادیں، یا ایک بڑا حصہ مسمار کردیا جائے کہ راستہ صاف ہو، اور لوگوں کو آمدورفت میں جو دشواری ہوتی ہے نہ ہو، (باقی آئندہ)

کیسنڈیا کا انجام

(۱)

گبریئل ڈی ینوزیو، نامور ایطالوی شاعر اور ناول نگار، بحر ایڈریاٹک کے ایک ساحلی شہر میں ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں وہ ایوان مبعوثین کا رکن منتخب ہوا جہاں اُس نے اپنے کو اجتماعی جمہوریت کے سیاسی مسلک کا حامی بنا کر پیش کیا اُس کی ابتدائی نظمیں ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئیں جنہوں نے اُسکی غیر معمولی ذہانت و تخیل کا سکہ جما دیا، نثر نگار کی حیثیت سے اس کی تحریرات بیحد رنگین، مصورانہ، تر اور مالا مال ہیں، ساتھ ہی اپنی مخصوص طرز نگارش کی بنا پر وہ ایطالوی ادبیات میں "شاہکار" کا درجہ رکھتی ہیں، اور مستند و مسلم الثبوت اساتذہ سخن کی قلمکاریوں کی فہرست میں داخل ہیں چنانچہ ڈی ینوزیو مصنفین اُملی کے "سلسلۃ الذہب" میں منسلک ہے۔ لیکن اُس کے بعد کے افسانے تخیل کا زیادہ عمق رکھتے ہیں، اپنے موضوع کے اعتبار سے غیر خوشگوار ہیں اور سنگین و بیرحم حقایق کے بیان سے لبریز ہیں، یہ رنگ جدید العہد فرانسیسی اور روسی مذاق ادب سے مستعار ہے بعض اوقات اُسکی استعارہ طرازی اور لفظی موسیقی کی افراط اُسکی تحریروں کے لباس کو شاہد معنی سے قریبًا معرّیٰ کر دیتی ہے لیکن طرز تحریر کا وہ بادشاہ ہے۔

میلاد مسیح کی ضیافت کے تین روز بعد جو خاندان لیمانیکا کی روایات میں ایک مہتم بالشان تقریب کا موقع ہوتا تھا، اور جس دن بڑی دریا دلی اور سیر چشمی سے روپیہ خرچ کیا جاتا تھا اور کثیر تعداد مہمانوں کی مدعو کیجاتی تھی، ڈونا کرسٹنا لیمانیکا میز کی نقرئی ظروف اور دیگر سامانوں کو شمار کر رہی تھی اور انکو سلیقہ سے باترتیب رکھ رہی تھی۔ کسی چیز کو دراز میں رکھتی اور کسی کو الماری میں تاکہ آئندہ دعوت کے موقع پر وہ آسانی سے نکالیجا سکیں۔

جیسا کہ معمول تھا اُس کے ساتھ اُسکے کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے میریا بیسیشیا خادمہ بھی تھی اور کینڈوا ار کینڈا بھی جو کپڑے دھونیکا کام کرتی تھی، اور جو عرف عام میں کینڈریا کے نام سے مشہور تھی۔ بڑے بڑے ٹوکرے دسترخوان اور جا نمازوں سے بھرے ہوئے فرش پر ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے، نقرئی طشت اور صحنیاں بازو کی الماری میں بڑے زرق برق انداز میں چمک رہی تھیں۔ یہ بڑے بڑے برتن تھے جنمیں سے بعض دیہاتی صناعوں کی بھدی کاریگری کا نمونہ تھے اور کم و بیش اُس طرز کے تھے جو مذہبی مراسم میں استعمال کئے جاتے ہیں، انکی ساخت و شکل اُسی قسم کی تھی جو ملک کے دولتمند گھرانوں میں پشتہا پشت سے چلے آتے ہیں۔ صابون آلود پانی کی خوشبو سے سارے کمرے کی فضا پُر تھی۔

ٹوکروں میں سے کینڈریا نے کچھ دسترخوان، تولیے، اور دستمال نکالے، مالکہ مکان سے آپ نے کہا کہ دیکھئے انمیں سے ہر چیز پاک و صاف ہے۔ اور کسی نے انکو ہاتھ نہیں لگایا ہے، اس کے بعد اُس نے انہی چیزوں کو پڑھا کر میریا کے ہاتھ میں دیا جس نے انکو دراز دان میں رکھدیا، کرسٹنا نے انکی تہوں میں لونڈر چھڑکا اور انکے نمبر ایک کتاب میں نوٹ کر لئے۔ کینڈریا ایک کشیدہ قامت دبلی پتلی عورت تھی، عمر کوئی پچاس سال کی ہوگی، مگر کسی قدر خمیدہ ہو گئی تھی جو اسکے پیشہ کا نتیجہ تھا جس کی خدمات انجام دیتے وقت وہ اپنی پشت کو اسی انداز میں رکھنے کی عادی تھی، اس کے ہاتھ غیر معمولی طوالت رکھتے تھے، اور سر ایک شکاری پرندے کا سا تھا جو کچھوے کی سی گردن سے جڑا ہوا تھا۔ میریا بیسیشیا آرٹونا کی رہنے والی تھی، وہ قدرے گٹھیلی بدن کی عورت تھی اُسکا چہرہ تر و تازہ تھا اور آنکھیں نہایت درجہ صاف اور چمکدار تھیں۔ اُسکا ایک لطافت آمیز انداز گفتگو تھا اور اُس میں اُس تُنک و اور مخلی بالطبع قسم رنگ کی آمیزش تھی جو ایسے لوگوں کا خاصۂ طبیعت ہو جاتا ہے جنکے ہاتھ قریباً ہر گھڑی کیک اور شربت، حلوے اور مربے میں آلودہ رہتے ہیں۔ اڈا ناکرسٹنا بھی اپنی طفلیت کے اعتبار سے آرٹونی ہی تھی۔ اسکی تعلیم و تربیت بینڈکٹائن مشرب کی ایک خانقاہ میں ہوئی تھی، اُسکا قد و قامت چھوٹا تھا، اور سینہ بہت فیاض دل و جگر کے لوگوں کی طرح چوڑا چکلا

تھا جیسے پر چھوٹی چھوٹی چتیاں تھیں، ناک بڑی اور لمبی تھی، دانت معمولی قسم کے تھے، آنکھیں خوبصورت تھیں اور نیم باز انداز میں نیچی جھکی رہتی تھیں، جنکو دیکھکر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زنانہ لباس میں کوئی پادری صاحب ہیں!

یہ تینوں عورتیں اپنا کام بڑی احتیاط و تندہی سے کر رہی تھیں، تیسرے پہر کا بڑا حصہ اس کام کی نذر ہو گیا جس وقت کینڈیا خالی ٹوکریوں کو لیکر روانہ ہو رہی تھی تو ڈانا کرسٹنا نے جو چاندی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو گننے میں مصروف تھی دیکھا کہ ایک قاشوقہ غایب ہے۔

"میریا! میریا!"، اس نے چلا کر اور پریشان ہو کر کہا، "ذرا انکو دیکھنا تو! ایک قاشوقہ نہیں ملتا! ذرا تم خود تو انکو شمار کرو!"

"لیکن یہ بات کیا ہے؟ سینورا، یہ کیونکر ممکن ہے!"، میریا نے کہا، "لاؤ ذرا میں تو دیکھوں" اور اس نے زور زور سے ان چاندی کے سب چھوٹے چھوٹے عددوں کو ایک ایک کر کے گننا شروع کیا، ڈانا کرسٹنا کھڑی دیکھتی جاتی تھی اور میریا کے صحیح طریقہ شمار پر سر ہلاتی جاتی قاشوقوں کی جھنکار سے ایک گونج پیدا تھی۔

"ہاں بیشک، یہ تو سچ معلوم ہوتا ہے!"، میریا نے آخر کار مایوسانہ لہجہ میں کہا "اچھا تو اب اس کے متعلق کیا کرنا ہے؟!"

میریا بجائے خود ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھی، وہ پندرہ برس سے اس گھرانے میں تھی اور اس نے اپنی امانت و دیانت اور وفاداری و محسن پرستی کے بیشمار ثبوت پیش کئے تھے وہ آرڈونا ڈانا کرسٹنا کی ہمرکابی میں اس کی شادی کے وقت آئی تھی، وہ اسوقت دلہن کی سہیلی تھی اور گویا اس کے جہیز کا جزو لاینفک بنکر آئی تھی! اپنی مالکہ کی شفقت و نوازش اور ناز برداری و دلداری کے طفیل میں اسکو شروع ہی سے گھر میں بڑا دخل و رسوخ حاصل رہا تھا، اس میں مذہبی جذبہ بہت قوی تھا اور مذہبی عقائد و روایات کے سلسلہ میں ہر قسم کی توہم پرستیوں اور ضعیف الاعتقادیوں پر وہ ایمان رکھتی تھی! اپنے وطن کے مقدس ولی اور اسکی ذات و یادگار کے ساتھ اسکو خاص

عقیدت تھی، وہ بڑی طبیعت دار اور شگفتہ مزاج تھی، اُس نے اور اُسکی مالکہ نے ایک قسم کا اتحاد سیاسی سا قائم کر لیا تھا اور پیسکارا اور پیسکارا کی ہر ایک چیز خاص کر ال پیسکارا کی مرجع ارادت ولی کے خلاف ایک صف مخالفین قائم کر لی تھی۔ وہ اپنے وطن کا ذکر کرنے، اُس کی خوبصورتی اور دولتمندی کے پل باندھنے، اُسکی شان و شوکت کے ترانے گانے، سان ٹوماسو کے خزائن و تبرکات کے قصے سنانے، اور وہاں کی مذہبی مراسم و تقریبات کی رونقوں اور ہنگامہ آرائیوں کی داستانیں۔ بیان کرنیکا کوئی موقع جانے نہ دیتی تھی اور ان ساری چیزوں کا وہ سان شیٹیو کی ناداری و بے مائگی سے مقابلہ کرتی تھی، کیونکہ بیچارے اس مقام میں صرف ایک نقرئی صلیب ہی اُسکی کل کائنات تھی!

ڈانا کرسٹنا نے آخر کار کہا،

"ذرا اچھی طرح اندر جا کر تو دیکھو"

میریا چلی تا کہ اپنی تلاش و تفتیش کو اور وسعت دے، اُس نے باورچیخانہ کا ایک ایک طاق اور ایک ایک کونہ چھان مارا۔ لیکن سب بے سود! آخر کار وہ خالی ہاتھ واپس آئی۔

"وہاں تو نہیں ہے، وہاں تو نہیں ہے!"

اب دونوں غور و فکر میں لگی ہوئی ہیں، قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں، اور دونوں اپنے اپنے حافظہ کے سارے دفتر کو کھنگال رہی ہیں۔ انہوں نے اُس برآمدے کو دیکھا جو بڑے ہال کو جاتا تھا، اور پھر دھوبی خانہ کے پشت کے حصہ میں تلاش کی۔ یہ اُنکی تلاشی کی آخری جگہ تھی۔ اب وہ باآواز بلند اس معاملہ کے متعلق بات کر رہی ہیں، اور گرد و پیش کے مکانات کی کھڑکیوں سے عورتیں سر نکال نکال کر دیکھ رہی ہیں!۔

"کیا بات ہے ڈانا کرسٹنا؟ ہمیں بھی تو بتاؤ"

ڈانا کرسٹنا اور میریا نے یہ قصہ بڑی تفصیل اور تشریح سے اور ہاتھوں اور جسم کی بہت سی حرکتوں کے ساتھ بیان کیا۔

"خدایا خیر ہے! خدایا خیر! اب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی چوروں کا گذر ہے؟!"
مختصر اس سرقہ کی خبر سارے پڑوس میں اور پھر سارے شہر پیکارا میں پھیل گئی۔ مرد اور عورتیں اس پر چہ میگوئیاں اور خیال آرائیاں کرنے لگے کہ آخر یہ کس کا کام ہے۔ سینٹ ڈیگا سیلنو کے دور دراز مکانات تک پہنچتے پہنچتے اس خبر میں بہت سے حاشیئے چڑھ گئے۔ اب خالی ایک قاشوقی کا سوال نہ تھا بلکہ خاندانِ لیمانیکا کے سارے نقرئی ظروف اس خطرے کی زد میں تھے!

موسم دلفریب تھا اور برآمدوں والے گلابوں میں عہدِ شگوفہ اور عہدِ گل کا آغاز تھا۔ لنٹ (ایک خوش الحان پرندہ) کا ایک جوڑا پنجرے کے اندر مصروف زمزمہ پردازی تھا۔ عورتیں مکانوں کی کھڑکیوں میں بیٹھے بیٹھے اس منظر بہار کا تماشہ دیکھ رہی تھیں اور موسم کی خوشگواری پر گپ شپ کر رہی تھیں۔

"آخر تو یہ تھا کون؟" ہاتھ ملتے ہوئے ڈاناکرسٹنا نے کہا۔

ڈانا ازابیلا سرٹیل جس کا لقب "بلی" پڑ گیا تھا کیونکہ اس کے بدن میں ایک عجیب لوچ تھا اور اس کی نقل و حرکت بالکل ایک بلی کے بے چاپ پاؤں کی طرح تھی، اس نے کرسٹنا سے پوچھا کہ "تمہارے ساتھ اسوقت تھا کون کون؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کینڈیا کو وہاں جاتے ہوئے دیکھا تھا"

"اچھا؟" ڈانا فلسیا مارگینسیا چلا اٹھی، اس لڑکی کو محبوبی "بینا" کہا کرتی تھی کیونکہ وہ ہر وقت چہکا کرتی تھی، "اچھا؟" دوسرے حاضرین مجلس نے بھی اس استعجاب آمیز سوال کی تکرار کی۔ "اور کرسٹنا تمہارا کبھی اسطرف خیال ہی نہ گیا؟!" "اور تمہاری نگاہ کبھی بھی اس بات پر نہ پڑی؟!" "اور تم کینڈیا کو جانتی نہیں؟!" "ہم کینڈیا کا حال تم کو بتائیں گے!"
"بیشک اُسکا کچا چٹھا ہم سنا سکتے ہیں!" "اجی ہاں اُسکا حال کس سے چھپا ہوا ہے!"
"اس میں شک نہیں کہ وہ کپڑے اچھے دھوتی ہے، اُسکے اس کمال سے کوئی انکار نہیں

کرتا یا شاید چیکا ما ہیں وہ بہترین دہوبن ہے" اور اس میں قطعًا کوئی کلام نہیں لیکن انمیں جو مرض ہے وہ بھی معلوم ہوام ہے کہ وہ بہت ہی "ہاتھ لپک" واقع ہوئی ہے۔ کرسٹنا! کیا تم آجتک اس حقیقت سے بیخبر ہو؟"

"اُس نے ایک مرتبہ مجھے ایک جوڑ اترالی کا دیا ہے اور ایک چھوٹا دستال مجھے وصول کیا"
"اور ایک رات کو پہننے کا گون مجھے عاریتًہ دیا"، "اور تین جوڑ موزے مجھ سے مانگے"، "اور ایک نیا سایہ ایک دفعہ میں نے دیا"، "اور مجھکو اپنی چیز کبھی واپس نصیب نہ ہوئی"، "نہ مجھکو میری" "اور نہ مجھکو میری"

لیکن میں نے اس کو ایک خاص مجبوری سے برخاست نہیں کیا، مشکل یہ تھی کہ دوسری کوئی خادمہ نظر نہ پڑتی تھی سنا سلو لیشرا؟"

"اجی یہ آپ کیا کہتی ہیں؟ خادمہ نے کی بھی خوب کہی!"
"انجلینتو نیا ہی ایک موجود ہے! وہی افریقہ والی!!"
"ہاں گھر وہی مثل ہے کہ ایک کی خالہ ایک!"
"ہم کو چاہیئے کہ اب اس واردات کو پی جائیں"
"لیکن آپ دیکھئے کہ اس مرتبہ یہ ایک چاندی کے قاشوقے کا معاملہ ہے!"
"اجی یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے"
"منہ کالا کرو جی کرسٹنا! جانے دو!"
"ہاں جانے دیجئے، آپکو اختیار ہے!" میر بیٹیا آخر تاب ضبط نہ لا کر بول اُٹھی، میریا اگرچہ بہت خلیق اور متواضع قسم کی لڑکی تھی، لیکن وہ دوسری خادماؤں پر اپنی فوقیت جتانیکا کوئی موقع نہ جانے دیتی تھی "اصل میں تو یہ ہمارے فیصل کرنیکا کام تھا"، اُس نے آخرکار کہا۔

اور پھر چاب بگڑ گھر چلا، ایک زبان سے دوسری زبان تک اور دوسری سے تیسری تک یہانتک کہ سارے گاؤں میں "افسانہ بزم و انجمن" ہو گیا۔

(باقی)

غزل

از مصور جذبات جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش مدظلہ العالی

میں سمجھتا ہوں مگر تم نہ خفا ہو جانا
موت کے ہاتھ میں ہے میری دوا ہو جانا

دل کو تاکید وفا ہے کہ فنا ہو جانا
درد کو حکم قضا ہے کہ دوا ہو جانا

تہنیت موت کو دیتا ہے مرے دل کا مرض
عید ہے ماتم حسرت کا بپا ہو جانا

طشت از بام ہوا راز وفا غم یہ ہے
ورنہ کچھ بات نہ تھی سر کا جدا ہو جانا

دام الفت نے قفس مجھ کو دکھایا آخر
خوف کہتا تھا کہ گلشن سے ہوا ہو جانا

شمع ساں منتظر صبح نہ رہنا اے دل
شب فرقت کو دعا دے کے فنا ہو جانا

جیتے جی قید سے چھٹتے نہیں زلفوں کے اسیر
نام ہے دم کے نکلنے کا رہا ہو جانا

آؤ نظارۂ عبرت کو یہاں کچھ نہ سہی
کیا برا ہوگا مزاروں کا بھلا ہو جانا

فائدہ دیتی ہی کیا چارۂ تدبیرِ منعم
ہاں مگر بوجھ پہ اک بوجھ سوا ہو جانا

کس دوراہے پہ کھڑا ہوں متحیر کی طرح
کہ بقا ہے مجھے ممکن نہ فنا ہو جانا

خاک بھی اس دلِ سوزاں کی ملیگی نہ کہیں
مجھے معلوم ہے شعلے کا ہوا ہو جانا

حیلہ صبر بتاتے ہیں اگر یاد رہے
ہم کو دم توڑتے دیکھو تو خفا ہو جانا

کچھ نہ کچھ ہو ہی گیا عشق میں اے موت مگر
میں نے چاہا تھا کچھ اس سے بھی سوا ہو جانا

آئے ہو گور غریباں پہ تو باتیں نہ کرو
ذرے کچھ کہتے ہیں خاموش ذرا ہو جانا

پھول کو توڑ کے دیکھو اثرِ وصل و فراق
موت ہے چاہنے والوں سے جدا ہو جانا

لطفِ آزادی دلِ اُنکی اسیری میں ہے
اک نئی قید ہے زنداں سے رہا ہو جانا

جیتے جی آئے قیامت تو مزا ہے ثاقبؔ
دیکھ لیں وعدۂ فردا کا وفا ہو جانا

غزل

از نصیر الدین حسین صاحب نصیر بیرسٹر پٹنہ

چو ساقی طرح الفت را برنگ تازہ می ریزد — بجام دل شراب عشق ہر خمیازہ می ریزد
تکلف بر طرف یک سادگی جانِ دو صد گیرد — حسین خون لبے بے سرمہ و بے غازہ می ریزد
فنا آرد بقا شہرت بعزلت می شود پیدا — بسے باید کہ ہر خلوت گزیں آوازہ می ریزد
دگرگوں حالت بیمار می گردد بہر ساعت — چو اوراق پریشاں جانش از شیرازہ می ریزد
نصیر از لطف یزدانی بتربت ہائے عاشق ہا
خوشاں باران رحمت بیں کہ بے اندازہ می ریزد

غزل

از رشید صدیقی صاحب مدیر ادبستان

چشم پر اشک ہے چہ آب بقا مجھے — ہر قطرۂ لہو سے ہے اک آسرا مجھے
چلتا ہوں راہ عشق میں نقش خیال پر — دنیا کے لوگ کہتے ہیں بھٹکا ہوا مجھے
دیتی ہے بندگی کا تقاضہ! دگر نہ ہاں — عیش دوام ہے غم سیل فنا مجھے
بھٹکینگے اب نہ دامن مقصد کو چھوڑ کر — بھولے نہ کاش! آج کا عہد وفا مجھے
کشتی ڈبوئے کاش! جو ساحل قریب ہو — دکھلائے سعی کی نہ خدا انتہا مجھے
جیتا ہوں اپنے مرنے کی توفیق دیکھکر
منظور ہے رشید بس اسکی رضا مجھے

تنقید و تبصرہ

باقیات فانی

اردو شاعری کا ذوق رکھنے والے فانیؔ سے ناواقف نہ ہوں گے اور ان میں اکثر اب سے بہت پہلے انکے کلام کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم بھی کر چکے ہوں گے۔ اس لئے تنقید سے اگر یہ مطلب ہی کہ رائے عامہ پر اثر ڈالا جائے تو تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں اس کے علاوہ کوئی شخص جو کسی ماہوار رسالے کے لئے تنقید لکھ رہا ہو۔ اس بسوط مقدمے سے زیادہ اسکا حق ادا نہیں کر سکتا جو ضخامت میں دیوان سے کچھ ہی کم ہے اور ایک مشہور اہل قلم کی سعی بلیغ کا (بظاہر) نتیجہ ہے۔ فانی کے کلام سے متعلق رشید احمد صاحب صدیقی نے جو کچھ لکھدیا ہے اس سے زیادہ شاید ہی کوئی لکھ سکتا ہو اور جن لوگوں نے فانی کی شاعری سے ناواقفیت یا قوت فیصلہ کی کمی کی وجہ سے ابتک کوئی رائے قائم کی ہو انکے لئے اس مقدمے کا مطالعہ ازبس ضروری ہے (یہ شرط اس لئے لگائی گئی ہے کہ انسان کی ایک مشہور کمزوری یہ بھی ہے کہ ایک رائے پر پہنچنے کے بعد ذرا مشکل سے اس کے بدلنے پر راضی ہوتا ہے خواہ کتنے ہی معقول دلائل اس کے سامنے کیوں نہ پیش کئے جائیں) تنقید کی غرض و غایت اگر کمزور طبیعتوں پر بیجا دباؤ ڈالنا نہیں ہے تو اسکی بہترین صورت غالباً یہی ہوگی کہ کلام کا نمونہ پیش کرنیکے بعد لوگوں کو اپنی اپنی سمجھ کے مطابق کسی خاموش فیصلہ پر پہنچنے کا موقع دیا جائے یہاں کم از کم اسی پر عمل ہوگا۔ ملاحظہ ہو:-

ہر ذرہ نگاہ غلط جلوہ خود فریب — عالم دلیل گمرہی چشم و ہوش تھا

تجلیات وہم ہیں شاہدات آب و گل — کرشمہ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

مرا وجود ہی میری نگاہ خود نشناس — وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو رازداں ہوتا

بہلا نہ دل نہ تیرگی شام غم گئی — یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو — پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

تعمیر آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق — جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

غم کے بھیجے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں — ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

گو ہستی تھی خواب پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی — چونک اٹھتے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی

تجھے خبر ہے تیرے بے نیاہ کی خیر — بہت دنوں سے دل ناتواں نہیں ملتا

میر اتمل انکے ہاتھوں یہ تو باتیں — کچھ انکے منہ کی ہیں کچھ نامہ بر کی

سرکار میں صنع جفا جا بجا ہوں میں — یہ بھی اگر وفا ہے تو اچھا نہ کیجئے

اس موقعہ پر ایک واقعہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ باقیات فانی کے موصول ہونیکے چند روز بعد ہمارے ایک دوست نے جو خیر سے مدرسے میں اردو پڑھاتے ہیں فانی کا یہ شعر تختہ سیاہ پر یوں ارقام فرمایا۔

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم — بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

(میر)

جب ان سے یہ شکایت کی گئی کہ حضرت آپنے احمد کی پگڑی محمود کے سر کیسے باندھ دی تو وہ بہت چیں بجبیں ہوئے اور سخت اصرار سے فرمایا کہ یہ شعر تو میر کا ہے فانی کا کہاں سے آیا۔ مجبوراً انہیں باقیات فانی کی ایک جلد کا معائنہ کرانا پڑا اس کے بعد بھی کچھ شبہ انکا باقی ہی رہا۔ اب اگر کوئی ہمارے ان دوست کی سخن سنجی سے خاص طور پر حسن ظن نہ رکھتا ہو تو ہم یہ نتیجہ نکالنے میں غالباً حق بجانب ہونگے کہ فانی کی شاعری میں بہت حد تک میر کا رنگ پایا جاتا ہے۔

چاہئے تو یہ تھا کہ اسی سلسلہ میں کچھ مقدمے سے متعلق بھی عرض کیا جاتا لیکن اس حصے کی موجودگی میں جو "سرود بستان" کے نام سے موسوم ہے۔ قلم اٹھانا ظلم ہوگا۔ اسکے علاوہ خود رشید صاحب کا نام اور انکا مخصوص انداز تحریر جس سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں کافی ضمانت ہے۔ کاش جناب موصوف وہ دو مصرعے جنکو "بعض ذفکروں نے اڑا لیا ہے" کہیں نقل فرما دیتے کہ ہم بھی ان سے محظوظ ہو سکتے۔

(ع۔ع)

پس پردہ { مجموعہ مضامین جناب آغا حیدر صاحب دہلوی مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس حجم ۱۰۳ صفحہ قیمت ۱۲/ }

آغا حیدر صاحب کے نام سے ادب اردو کے قدردان خوب واقف ہیں آپ کے مضامین جن میں عورتوں کی زبان میں اور انہیں کے نقطہ نظر سے مختلف مسائل زندگی پر بحث کی گئی ہے علیگڈھ میگزین میں ایک خاتون کے نام سے نکلا کرتے تھے۔ جب اعلان کیا گیا کہ ان مضامین کے لکھنے والے مرد ہیں تو لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا (شبہ جناب مصنف کے مرد ہونے میں نہ تھا بلکہ کسی مرد کے مصنف ہونے میں) اُن لوگوں کے لئے جو صنف نازک کی زبان لکھنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے بڑھکر کامیابی ناممکن ہے۔

اب یہ مضامین مولوی عبدالباسط صاحب۔ ایم۔اے (علیگ) نے یکجا کرکے "پس پردہ" کے نام سے شائع کئے ہیں۔ مضامین میں علاوہ زبان اور طرز ادا کی خوبی کے بعض قیمتی خیالات سیاسی اور معاشرتی مسائل کے متعلق موجود ہیں جو کسی طرح محل سرا کی پیداوار نہیں معلوم ہوتے گویا مصنف نے "سر دیگراں" کو "حدیث دلبراں" میں ادا کرکے شاعر کے مشہور قول کے بالکل برعکس عمل کیا ہے۔

ہم مدیر علیگڈھ میگزین کو اس اشاعت پر جو ظاہری اور باطنی خوبیوں سے آراستہ ہے مبارکباد دیتے ہیں اور اس موقعہ پر یہ کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ علیگڈھ میگزین کا جو نیا پرچہ وصول ہوا ہے وہ بھی لکھائی چھپائی اور مضامین کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔ اشاعت بھی باقاعدہ ہونے لگے تو انشاءاللہ یہ رسالہ ادب اردو کی بہت کچھ خدمت کریگا۔ (ع - ح)

شذرات

جامعہ کے وفد بہار کا ذکر ہم پچھلے پرچہ میں کر چکے ہیں۔ وسط فروری میں امیر جامعہ حکیم اجمل خاں صاحب بہار تشریف لے گئے لیکن وقت کی کمی کے سبب سے صرف تین دن قیام کر سکے۔ اس قلیل مدت میں ممدوح نے صوبہ کے اکثر سربرآوردہ لوگوں سے ملاقات کی اور انہیں جامعہ کا پرجوش حامی بنالیا۔ چندہ کرنیکا بالکل وقت نتھا پھر بھی جو چند گھنٹے ملے اُس میں بہار شریف، باڑہ اور مظفرپور سے دس ہزار روپیہ چندہ ہوا۔ پٹنہ میں چندہ کا کام شروع ہی ہوا تھا کہ حکیم صاحب قبلہ کو طبیہ کالج کے جلسہ تقسیم اسناد میں شریک ہونیکے لئے دہلی واپس آنا پڑا۔ اب ممدوح کا قصد ہی کہ بعد رمضان پھر بہار تشریف لے جائیں اور صوبہ کے کل بڑے شہروں اور قصبوں کا دورہ فرمائیں۔ اگر سب مقامات کے مسلمانوں نے اُسی فیاضی اور ہمدردی کا اظہار کیا جو مذکورہ بالا مقامات کے لوگوں نے دکھائی ہے تو انشاء اللہ بہار کے متعلق ہمارا یہ خیال بالکل صحیح ثابت ہوگا کہ یہ صوبہ قومی تعلیم کا سب سے بڑھ کر قدر دان ہے۔

علیاحضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ دام اقبالہا کو جو تعلق مسلمانوں کی تعلیم سے ہی اُس سے ساری قوم واقف ہی۔ پچھلے پچیس برس میں جتنی مفید تحریکیں مسلمانوں میں عورتوں یا مردوں کی تعلیم کی ہوئیں ان میں سے ہر ایک کو سرکار عالیہ کی سرپرستی کا فخر حاصل ہوا۔ پھر بھلا کیونکر ممکن تھا کہ جامعہ ملیہ فیض سلطانی سے محروم رہتی۔ علیاحضرت نے ۱۰ فروری کو بلا کسی کی تحریک کے خود امیر جامعہ حکیم اجمل خانصاحب سے جامعہ کا معائنہ کرنے کی خواہش ظاہر فرمائی اور ۱۲ فروری کو ۱۱ بجے تشریف لائیں۔ حکیم صاحب مدظلہ العالی نے خیر مقدم کے تقریر میں بہت خوبی کے ساتھ جامعہ کے مقاصد بیان فرمائے۔ حضور بیگم صاحبہ نے اُس جواب میں جو تقریر فرمائی وہ اس قدر پر مغز اور پر خلوص تھی کہ سننے والوں کے دل پر نقش ہوگئی۔ علیاحضرت نے جامعہ

کے قیام کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ضروری قرار دیا اور کارکنان جامعہ کو ہدایت فرمائی کہ علاوہ مردوں کی تعلیم کے عورتوں کی طرف بھی توجہ کریں۔ حضور ممدوح نے جامعہ کی امکانی قدر کرنے کا وعدہ فرمایا اور علاوہ بیس ہزار کی گراں قدر رقم کے جسکا کچھ دن پہلے وعدہ فرمایا تھا پانچ ہزار کے مزید چندہ کا اعلان فرمایا۔ علیا حضرت نے دار الاقامہ جامعہ کا بھی معائنہ فرمایا اور لڑکوں کے قیام اور تربیت کے انتظام پر بار بار خوشنودی کا اظہار فرماتی رہیں۔ حضور ممدوح نے اپنے دو قریبی عزیزوں کو جامعہ کے مدرسہ میں داخل کر دیا ہے اور وعدہ فرمایا ہے کہ اپنے خاندان کے اور بچوں کو بھی روانہ فرمائیں گی۔

ہم ماہ دسمبر ۲۶ء کے پرچہ میں ذکر کر چکے ہیں کہ تعلیمی کانفرنس نے اپنے اجلاس منعقدہ دہلی میں ایک جماعت مسلم ماہرین تعلیم کی اس غرض سے مقرر کی تھی کہ کانفرنس کو اہم تعلیمی مسائل پر غور کرنے میں مدد دے۔ اس کمیٹی کا پہلا جلسہ ۱۰ فروری کو علی گڑھ میں منعقد ہوا جسمیں کمیٹی کے اغراض و مقاصد اور طریق عمل کا تعین کیا گیا۔ یہ طے پایا کہ فی الحال یہ کمیٹی تعلیمی مسائل پر مستند اور مفید کتابیں شائع کرے اور ایک سہ ماہی رسالہ تعلیم کے نام سے نکالے۔ ان کاموں کے لئے مصارف کا تخمینہ کیا گیا جو کانفرنس کی مرکزی کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

معزز معاصر معارف نے اس کمیٹی کا ذکر کرتے ہوئے پیشین گوئی کی تھی کہ نہ اسکا کبھی اجلاس ہوگا اور نہ یہ کوئی کام کرے گی۔ یہ پیشین گوئی اس حد تک تو غلط ثابت ہوئی کہ ایک اجلاس کسی نہ کسی طرح ہو گیا۔ البتہ کام کے بارے میں دوسرے باخبر حضرات بھی معارف کے ہم زبان ہیں ان کا خیال ہے کہ نہ کانفرنس کی مرکزی کمیٹی مالی امداد منظور کرے گی اور نہ کوئی کام کیا جا سکے گا۔

ہم اس معاملہ میں کوئی رائے ظاہر کرنا قبل از وقت سمجھتے ہیں البتہ یہ کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ خواہ کمیٹی کوئی کام کر سکے یا نہ کر سکے اسکا مقرر ہونا بہت ضروری تھا۔ کام کرنے کی کوشش کرنا اسمیں ناکامیاب ہونا اپنی یا دوسروں کی نااہلی یا مجبوری کو محسوس کرنا یہ سب چیزیں اپنی مخصوص قدر رکھتی ہیں یقیناً ہمعصر معارف کا یہ خیال صحیح ہے ہر کام کے کرنے کے لئے ایک فرد کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمہ تن اُس میں محو ہو جائے اور وہ فرد اپنی مدد کے لئے خود ایک جماعت پیدا کر لیتا ہے لیکن کام کرنے والوں کی کامیابی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے بلند آہنگ جماعتوں کا جو کوئی کام نہیں کرتیں بھرم کھلجائے۔ آج کل فریب تعلیم کے بڑے بڑے طلسم ٹوٹ رہے ہیں اگر ہمارے ہمعصر معارف کی رائے صحیح ہے تو اس طلسم بےعملی کا دائرہ کچھ اور وسیع ہو جائے گا مگر ہم صدق دل سے دعا کرتے ہیں کہ اسکی ضرورت نہ پیش آئے۔

تعلیمی معاملات میں ہماری انتہائی نادانی اور تقلید پرستی کا تازہ ثبوت اُس تجویز سے ملتا ہے جو ایک "پبلک اسکول" کے قیام کے متعلق حال میں پیش کی گئی ہے تجویز یہ ہے کہ انگلستان کے ہیرو اور رگبی وغیرہ کے مشہور مدرسوں کے نمونہ پر ہندوستان میں ایک مدرسہ قائم کیا جائے جس میں ہندوستانی روایات اور ہندوستانی تمدن کی فضا میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے اور اس بات پر زیادہ زور دیا جائے کہ بچوں میں مردانہ ہمت اخلاقی جرآت ذمہ داری کا احساس اور دوسرے خصائل حمیدہ پیدا کئے جائیں۔ اس مقصد کی خوبی میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا لیکن اب ذرا اُن ذرائع کو بھی دیکھئے جو ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اختیار کئے جائیں گے۔ "ہندوستانی تمدن" اور ہندوستانی روایات" کی فضا پیدا کرنے کی تو یہ تدبیر ہے کہ مدرسہ میں چھوٹے بڑے سب درجوں میں تعلیم انگریزی زبان میں دیجائے گی کیونکہ یہی ہندوستان کی متحدہ زبان

سے اور لڑکوں کی سیرت میں تمام انسانی اور فوق الانسانی خوبیوں کے پیدا کرنے کا انتظام یوں کیا گیا ہے کہ ہر بچہ کے مصارف تعلیم ایک سو پچیس روپے ماہوار ہوں گے تاکہ مدرسہ دولت کے سایہ میں آجائے جو غالباً ان حضرات کے خیال میں تمام اخلاقی صفات پیدا کرنے کی ضامن ہے۔ تجویز میں تو ذکر نہیں لیکن مدرسہ کے انگلستان کے نمونہ پر قائم کئے جانے اور ذریعہ تعلیم انگریزی زبان ہونے سے خیال ہوتا ہے کہ معلم بھی کل یا اکثر انگریز ہوں گے اگر ایسا ہوا پھر تو "ہندوستانی تمدن" اور "ہندوستانی روایات" کے ماتحت تعلیم ہونا اور قومیت کے نقطۂ نظر سے بچوں میں تمام اخلاقی صفات پیدا ہونا بالکل یقینی ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ انگلستان سے ہندوستان تک چند ہفتوں کی راہ ہے اور ہوائی جہازوں کی ڈاک کا انتظام ہو جانے کے بعد چند دنوں کی رہ جائے گی لیکن تمدنی تاثیر و تاثر کے لحاظ سے دیکھئے تو یہی مسافت نصف صدی سے زیادہ میں طے ہوتی ہے جو تحریکیں انگلستان میں وہاں کے حالات کے لحاظ سے آج سے پچاس برس پہلے مقبول تھیں وہ اب ہندوستان میں جدید ترین تحریکوں کی شکل میں پہنچتی ہیں۔ امیروں کے بچوں کو جمع کر کے انہیں بسم اللہ کے گنبد میں پالنا کبھی انگلستان میں قومی تعلیم و تربیت کا مسلمہ نصب العین تھا لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے سوائے چند قدامت پرستوں کے سب اسکے قائل ہیں کہ بچوں کی تعلیم میں گہرائی اور وسعت پیدا کرنے کے لئے اور قومی زندگی میں ادنےٰ طبقوں اور اعلیٰ طبقوں کی مہلک تفریق مٹانے کے لئے غریب اور امیر بچوں کو ساتھ ساتھ تعلیم دینا ضروری ہے مگر ہمارے ہندوستان کے حامیان تعلیم اسی فرسودہ لباس کو پہن کر اتراتے ہیں جسے انگلستان والوں نے اتار کر پھینک دیا ہے۔

(۲۹ء)

ایک زمانہ تھا جبکہ انگریزی پڑھنا کفر سمجھا جاتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کو اس غلطی کا جلد پتا

ہونیکا احساس ہوا۔ اب ایک زمانہ ہے جبکہ لے دے کر انگریزی ہی مسلمانوں کی سرمایہ علم ہے اور وہ اسی پر قانع اور خوش ہیں۔ حالانکہ وہ دن دور نہیں جبکہ ان کو اپنی اس تنگ نظری کا بھی احساس ہوگا اور وہ کہیں گے کہ انکی یہ قناعت پسندی انکے حق میں کسقدر مضر تھی۔ جرمنی کے ایک رسالہ سے جو ابھی حال میں ہمارے پاس آیا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں تیسری چوتھی صدی ہجری کی کچھ کتابیں جو نہایت کمیاب اور بیش قیمت تھیں، نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیجا رہی ہیں۔ ہانس فان میکسو یانا (آسٹریا) کے ایک مشہور فاضل ہیں جو یہ کتابیں لائبزگ کے ایک مشہور مکتبہ شرقیہ (Otto Harrassowitz) سے شائع کر رہے ہیں۔ ان کتابوں میں سب سے پہلی کتاب "کتاب الوزرا والکتاب" کے نام سے موسوم ہے۔ ابو عبداللہ محمد بن عبدوس اس کے مصنف ہیں جنہوں نے ۳۳۱ھ مطابق ۹۴۲ء میں وفات پائی۔ یہ شخص مسعودی (متوفی ۳۴۶ھ) کا ہمعصر تھا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ ویانا کے قومی کتبخانہ میں موجود ہے لیکن بہت ناقص ہے اور صرف مامون کے عہد تک پہنچتا ہے۔ پھر بھی بہ حیثیت مجموعی نسخہ اچھی حالت میں ہے اور لکھا ہوا ۴۰۶ھ مطابق ۱۰۱۵ء کا ہے۔ اسمیں کل ۲۰۴ اوراق ہیں اور ہر ایک ورق میں ۱۵ سطریں ہیں۔ اب تک اس نسخہ سے صرف فان کریمر نے ہارون الرشید کے میزانیہ (بجٹ) کے سلسلہ میں کام لیا ہے۔

اسی کے ساتھ ایک اور کتاب محمد بن موسی الخوارزمی کی "صورۃ الارض" ہے۔ اسکا سن تصنیف ۲۱۰ھ مطابق ۸۲۵ء ہے۔ یہ غالباً جغرافیہ پر سب سے پرانی کتاب ہے۔ اسکی اہمیت کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کے مصنف نے بطلیموس کے جغرافیہ پر بھی کام کیا تھا نیز یہ کتاب متاخرین کی اکثر تصانیف کا ماخذ معلوم ہوتی ہے۔ اس سے ہم اب تک ایک حد تک ناواقف تھے۔ اس کتاب کا صرف ایک نسخہ موجود ہے اور وہ اسٹراسبرگ کے کتبخانہ میں ہے۔ یہ کتاب کل ۴۸ ورقوں کی ہے اور نہایت خوشنما خط نسخ میں لکھی ہوئی ہے اسمیں چار نقشے بھی ہیں۔ تاریخ کتابت رمضان ۴۲۸ھ مطابق ۱۸ر جون تا ۱۷ جولائی ۱۰۳۷ء درج ہے۔ یہ نسخہ نہایت خراب حالت میں ہے، اکثر سطریں پڑھی نہیں جاتیں۔ بعض یونانی نام معرب کر لئے گئے ہیں، سمجھ میں نہیں آتے اور نقل کرنے میں اعداد

کی جو غلطیاں رہ گئی ہیں اس کی وجہ سے اکثر حصے مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ نسخہ کی خرابی کی یہی اصل وجہ تھی جس سے ابتک یہ چھپ نہ سکا۔ صرف ایک بار ایک اطالوی مستشرق نیلینو نے [illegible] میں اس سے مدد لیکر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کے علاوہ اسکا تھوڑا سا حصہ جو افریقہ کے متعلق ہے، اسکو اس سلسلہ کے اڈیٹر نے ۱۹۱۶ء میں شائع کیا تھا۔ ورنہ بہ حیثیت مجموعی یہ نسخہ اب تک غیر طبع شدہ ہے۔

اس کے علاوہ ایک نسخہ "کتاب عجائب الاقالیم" کا ہے جس کے مصنف کا نام سہراب ہے اور جسے غلطی سے بعض مستشرقین نے ابن سیرابیون لکھا ہے۔ یہ کتاب ۲۸۹ھ اور ۳۳۴ھ کے درمیان لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا مصنف ابوزید بلخی کا ہمعصر تھا۔ یہ تصنیف بھی خوارزمی کی تصنیف کی طرح یونانیوں کی تصانیف سے ماخوذ ہے

(ص - ۱)

رسالہ جامعہ

جلد ۸	ماہ رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ مطابق مارچ ۱۹۲۷ء	نمبر ۳

مشرق و مغرب

ہندوستان کو مغرب کی ایک طاقت سے جو غیر فطری سیاسی تعلق ہے اسکا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم دنیا کے دو بڑے حصوں، ایشیا اور یورپ اور اہم تمدنوں یعنی مشرقی اور مغربی تمدن کے باہم تعاون کی طرف مشکل ہی سے کبھی نگاہ ڈال سکتے ہیں۔ ایک طرف اقتدار اور طاقت کا غرور ہے تو دوسری طرف بے بسی کی شبہوں اور وسوسوں سے پر ذہنیت۔ وہ اسے سمجھنا چاہتا نہیں یہ اُسے سمجھ سکتی نہیں۔ طاقت اور بے بسی کی یہ یکجائی مشرقیوں میں کہیں خوف پیدا کرتی ہے کہیں غصہ، کہیں انہیں بیجا خوشامد کا درس دیتی ہے اور کبھی بیجا نفرت کی تعلیم۔ مشرق کڑھتا ہے کہ وہ غلام ہے اور اس کی آزادی کا سلب کرنے والا مغرب۔

لیکن اگر اس غیر فطری اور عارضی تعلق سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر کے مشرق اور مغرب کے اس فرض کی طرف نگاہ ڈالی جائے جو نوع انسان کی ترقی کے لئے شاید انہیں تفویض کیا گیا ہے تو معلوم ہوگا کہ سوال کسی جزو کی غلامی کا نہیں بلکہ کل نوع کی پابندی کا ہے۔ اور اس

سے رہائی اور ان بندھنوں کو کاٹ کر انسانی آزادی کے حصول میں مشرق بھی کوشاں ہے اور مغرب بھی، یہ اپنے طور پر وہ اپنے طریق سے۔ لیکن نہ اسکی راہ منزل مقصود تک پہنچاتی دکھائی دیتی ہے نہ اُس کی۔ ضرورت شاید اس کی ہے کہ یہ تنگ راستے جن پر دونوں الگ الگ چل رہے ہیں آگے جا کر ملیں اور انکے سنگم سے ایک کشادہ شاہراہ پیدا ہو جو نوع انسانی کو اسکی گمشدہ آزادی تک پھر پہنچا دے۔

تمام وجود ارضی کی غایت ہے نشو و نما۔ بے جان پتھر تک نشو و نما کی خواہش سے آزاد نہیں، کلیاں دامن چاک کر کے پھول بننے کے لئے بیتاب رہتی ہیں، حیوانات بھی زندگی بھر اسی راہ پر گامزنی کرتے ہیں۔ اس نشو و نما کی شرط ہے آزادی سے بڑھ سکنے کا امکان لیکن ہماری اس مجبور اور مقدر دنیا میں آزادی آخر ہے کیا؟ آزادی نام ہے خود اپنے اندرونی قوانین اور اپنی ذات کے آئین مضمر کے مطابق منازل وجود طے کر سکنے کا۔ اور غلامی نام ہے اسباب خارجی پر انحصار کا۔ ہر معدنی چیز یہ تو نہیں کر سکتی کہ جس شکل کے قلموں میں چاہے اپنی تشکیل کر لے، ہر کلی کو یہ قدرت تو نہیں کہ جس رنگ کا پھول چاہے بن جائے۔ معدنی مادے کی آزادی یہ ہے کہ وہ قلم بن سکے، کلی کی آزادی یہ کہ اسے پھول بننے کا موقع ملے۔ معدنی مادہ آزاد نہ ہو تو وہ بے شکل رہ جائیگا، کلی کی آزادی سلب کر لو تو وہ مرجھا جائیگی۔ دونوں صورتوں میں گویا اسباب خارجی کا دباؤ آئین ذاتی کی قوت پر غالب آگیا۔

انسان اپنی اس آزادی کو ہاتھ سے دے چکا ہے۔ جنگل کے وحوش، درختوں پر چہچہانے والی چڑیاں، اور سمندر کی من موجی مچھلیاں سب کو اس سے زیادہ پُرمسرت اور خوبصورت زندگی میسر ہے جو ہندوستان کا وہ فاقہ زدہ، نیم برہنہ، بیمار کسان گذارتا ہے جو جیٹھ بیساکھ کی چلچلاتی دھوپ میں اپنا ہل چلانے پر مجبور ہے یا جو یورپ کے اس مزدور کے حصہ میں آئی

ہے جو اپنی ساری عمر ساعت بہ ساعت ایک ہی مشین کی نگرانی میں اس لئے گزار دیتا ہے کہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے قوت لایموت کا انتظام کر سکے۔

ایک زمانہ شاید ایسا بھی تھا کہ انسان بھی خوشی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ بھی ایک پر مسرت جانور کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ آزاد تھا، اور فطرت کے ایک جزو کی طرح اس کے دن بھی خوب کٹتے تھے۔ منطقہ حارہ کی فیاض فطرت اسے کھانے کو بھی کافی دیدیتی اور اسکے بدن کو گرم رکھنے کا انتظام بھی خود ہی کر دیتی تھی۔ یہ اپنی جبلی خواہشوں کو پورا کر سکتا تھا اور جب تک قدرتی یا اتفاقی موت زندگی کا خاتمہ نہ کرتی یہ اس سے جی بھر کر لطف اندوز ہوتا تھا۔

انسان کی یہ آزاد زندگی افسوس کہ ختم ہو گئی۔ اب یہ تہذیب و تمدن کے معراج کمال کو پہنچکر اپنی زندگی کے اس حسن اور اس کی آزادی کو ترستا ہے۔ یہ غیر فطری اور بد نما مکانوں کے جھرمٹ میں ایک غیر فطری اور بدنما زندگی گذارتا ہے۔ قدرت کی تازہ ہوائیں ادھر اُدھر پھرنے والا یہ جانور اب تنگ و تاریک گلیوں کی خاک چھانتا ہے۔ انسان کو اپنی پرمسرت جنتی زندگی سے کبھی کا دیس نکالا مل چکا ہے۔

انسان سے اسکی یہ جنت دو چیزوں نے چھینی، آبادی کی کثرت نے اور آب و ہوا کی خرابی نے۔ کثرت آبادی نے اس کی آزادی مکان تلف کی، یہ ہر جگہ اپنے ہم جنسوں سے ٹکرانے لگا، اغراض کا تصادم قدم قدم پر رونما ہوا، اور انسان کو منظم جماعت یا ریاست کا غلام بننا پڑا۔ ناموافق اور خراب آب و ہوا نے انسان سے آزادی زمان چھینی۔ یعنی اس کی فرصت اور اسکا آرام۔ یہ مجبور ہوا کہ زندگی گذارنے کے لئے اپنی مرضی کے خلاف مشقت کرے اور نادہند فطرت کو اپنی ضروریات فراہم کرنے پر مجبور کرے۔ چنانچہ متمدن انسانوں کا گلا انہی دو گلہ بانوں کا پابند ہے، جماعت کا اور موسم کا۔

انسانی تاریخ اسی جماعت کی زنجیروں کو توڑنے اور ناموافق آب و ہوا والے ممالک

میں جلاوطنی کے خلاف کوششوں کی داستان ہے۔ آزادی و فرصت کے فردوس گمشدہ تک پہنچنے کے لئے انسان نے چار راہیں اختیار کی ہیں۔

(۱) رُخ موڑ کر پھر پیچھے جانے کی راہ یعنی پھر انہیں وسیع میدانوں اور اسی گرم دھوپ کی طرف جانے کی راہ۔ چنانچہ افراد اور اقوام قدیم الایام سے سرد ملکوں سے گرم ملکوں کو زیادہ آبادی کے ملکوں سے کم آبادی والے ملکوں میں ہجرت کرتے گئے ہیں اور تقریباً سب ہجرتیں تمہارے ملک اور بہت سی جنگیں آزادی اور دھوپ کی اس خواہش کا نتیجہ ہیں۔

(۲) اوپر کی طرف جانے کی راہ یعنی قوت واقتدار کا راستہ۔ نیچے والوں کے خلفشار سے نکلکر اوپر والوں کی تنہائی علیحدگی اور فرصت حاصل کرنے کی کوشش۔ جہاں کہیں کثرت آبادی نے اقتدار کو آزادی کی اور موسمی حالات نے قوت کو فرصت کی شرط بنا دیا ہے وہاں ہمیشہ لوگوں نے اس راہ پر چلنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ کیونکہ جس کے پاس طاقت ہو وہ بنی نوع کا خیال کئے بغیر اپنی نشو ونما کی صورت نکال سکتا ہے، جسے اقتدار حاصل ہے وہ دوسروں سے اپنا کام کرا کے اپنے لئے فرصت پیدا کر سکتا ہے۔ ان مواقع پر آدمی کے سامنے بڑا سخت سوال ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے سر پر قدم رکھکر سرفرازی حاصل کرے یا اپنے سر کو دوسروں کے قدموں کا زینہ بننے دے، آقا بنے یا غلام، قزاق ہو یا بھکاری! قوت واقتدار کی یہی آرزو ہمیشہ جنگوں اور انقلابوں کی وجہ رہی ہے۔

(۳) اندر کی طرف کا راستہ یعنی روحانیت واخلاق کی راہ۔ دنیا کے جدال وقتال سے بیزار ہو کر نفس مطمئنہ کی تنہائی میں پناہ لینا خارجی محنت ومشقت کے دام سے چھوٹ کر اندرونی اطمینان کی طرف رجعت، ضبط نفس بلکہ بے نفسی کے ذریعہ انسانی آزادی کی کوشش، حاجتمندی کا علاج بے حاجتی پیدا کر کے، بس اتنی ہی آزادی اور اتنی ہی فرصت کی خواہش جتنی اس خراب آب وہوا اور کثیر آبادی میں ممکن ہے، خارجی پابندی کی تلافی اس اطمینان قلب کے ذریعہ کرنے کی خواہش تاریخ عالم میں اکثر مذہبی تحریکوں کی وجہ ہوئی ہے۔

(۴) آگے کی طرف جانے کا راستہ یعنی صنعت وحرفت کی راہ۔ ذہن انسانی کو قدرت کی قوتوں پر اس درجہ حاوی کر دینے کی آرزو کہ غلامانہ مشقت کا دور ختم ہو، آبادی اگر بڑھے تو پیدائش دولت میں اسی نسبت سے اضافہ ہو جائے اور انسان آزادی اور فرصت کی زندگی گذار سکے۔ قدرت پر فتح پاکر اسکی جابرانہ حکومت کو ختم کرنیکی یہ خواہش تمام علمی اور صنعتی ترقی کی باعث ہے۔

ان راہوں میں پہلی دو تو مسئلہ کا محض جزوی حل ہیں۔ نہ سب ہجرت کر سکتے ہیں نہ سب اوپر پہنچ سکتے ہیں بلکہ اگر ایسا ہو جائے تو نہ ہجرت کا فائدہ حاصل ہو نہ اعلیٰ مدارج پر پہنچنے کا۔ انسان کی نجات کے لئے تیسری اور چوتھی راہ ہی کام آسکتی ہے یعنی روحانیت واخلاق کی راہ اور صنعت وحرفت کی راہ۔ سچ پوچھئے تو یہ دونوں نہیں ہیں۔ روحانیت واخلاق قدرت کی ان قوتوں پر حاوی ہونا چاہتی ہیں جو ہمارے اندر ہیں، صنعت ان پر جو ہمارے چاروں طرف ہیں دونوں ذہن انسانی کی تخلیقی قوت سے قدرت پر فتحیاب ہونا چاہتے ہیں۔ روحانیت واخلاق ایک شجاعانہ نفی کے ذریعہ انسان کو نجات دلانا چاہتے ہیں، یعنی قناعت کے ذریعہ۔ صنعت وحرفت شجاعانہ اثبات یعنی عمل سے یہی کام لینا چاہتے ہیں۔ روحانیت واخلاق ذہن کی خواہش تسلط کو اندر کی طرف رجوع کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ "کائنات مجمل" کو رام کریں صنعت اس خواہش کو باہر کیطرف مائل کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ "کائنات مفصل" پر فتحیاب ہو۔

لیکن نوع انسانی کو نجات دلانے کے لئے تنہا نہ یہ کافی ہے نہ وہ۔ فاقہ کش اور فلاکت زدہ انسان کیا روحانیت واخلاق کو کھائے یا اوڑھے بچھائے! اور قیود اخلاق سے آزاد انسانیت جب اپنے صنعتی اختراعات سے خود اپنا گلا کاٹنے لگے تو کون ہے جو اسے بچائے! روحانیت واخلاق کس کام کے اگر بھوک اور جاڑے کا انتظام نہ ہو اور ساری صنعتی ترقی کو آدمی لیکر کیا کرے جب یہ خود اسکی ہلاکت کا باعث ہونے لگے۔

یہی بات کہ یہ دونوں طریقے تنہا نجات انسانی کے لئے کافی نہیں مشرق ومغرب ایشیا ویورپ کے باہمی تعاون کے مسئلہ کو نسل انسانی کے مستقبل کے لئے اس قدر اہم بنا دیتی ہے۔ کیونکہ مشرق ومغرب انہیں دو راستوں کے نمائندے ہیں۔ ایشیا کی عظمت اس کی روحانیت واخلاق میں ہے یورپ کی عظمت اس کی صنعت میں۔ ایشیا ضبط نفس میں دنیا کا معلم ہے، یورپ قدرت پر اقتدار حاصل کرنے میں۔ ایشیا میں مسئلہ جماعتی کا مرکز کثرت آبادی رہا ہے یورپ میں موسم۔ ایشیا کو شروع سے اس کی ضرورت رہی کہ اپنی کثیر التعداد آبادی میں باہم امن کی زندگی قائم رکھنے کے ذرائع سوچے اور یہ اس نے ضبط نفس اور اخلاق کی تعلیم دیکر کیا۔ یورپ کو اپنے باشندوں کو بھوک اور سردی کی موت سے بچانا تھا اور اس نے یہ شقت واختراع یعنی صنعت وحرفت کے ذریعہ کیا۔

مغربی تمدن پر غور سے نظر کیجائے تو یہی صنعت اس کی خصوصیت امتیازی ہے۔ یہ تمدن ابھی بہت کم سن تمدن ہے۔ قرون وسطےٰ میں تو یورپ ایشیا کا ایک تمدنی صوبہ تھا۔ اس پر ایک ایشیائی مذہب (عیسائیت) کا تسلط تھا۔ اس کی مذہبی عبادات، اسکا متصوفانہ رجحان طبع اس کی شاہی حکومت، یورپ اور شہنشاہوں کی راہبوں اور راہبنوں کی دوئی یہ سب ایشیائی تھیں۔ یہ تو جب عیسائیت کا اقتدار کم ہونا شروع ہوا یعنی جس کمزوری کی ابتدا لُوتھر سے ہوئی اور جسے روشن خیالی کی تحریک نے آگے بڑھایا جب وہ نیٹشے کے Anti-Christ تک پہنچی تو یورپ نے گویا اپنے کو ایشیا سے پورا پورا علیحدہ کیا۔ پچھلے تین سو سال میں یورپی تمدن کے خط وخال میں اس سے کہیں زیادہ تغیر رونما ہوا ہے جتنا کہ اس سے پہلے تین ہزار برس میں۔ اور یہ صنعت ہی تھی جس نے یورپ کو قرون وسطیٰ کے گہری نیند سے بیدار کیا۔ اس نے نئے اسلحہ ایجاد کرکے منصب داری نظام کو زیر کیا اور مطبع کی ایجاد سے پاپائی اثر اور توہمات پر فتح پائی۔ قطب نما اور فن جہاز رانی کے ذریعہ یورپ کو چار دانگ عالم میں پہنچایا اور پھر اپنی بارود

کی مدد سے سب دنیا کو نیچا دکھایا۔ علوم جدیدہ کا ارتقا خود بڑی حد تک اسی صنعت کا مرہون منت ہے۔ دوربین کے بغیر فلکیات اور بلا خوردبین علم الاجرام کہاں ہوتے۔ جدید فنون لطیفہ بھی اس کے فیض سے آزاد نہیں۔ موسیقی، تعمیرات، تصویر سب کو اس کی مدد سے فروغ پہنچا۔ فن جنگ کی نئی صنعتی ترقی کے باعث کایا ہی پلٹ گئی۔ سیاست بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکی اور کہا جا سکتا ہے کہ قومیت، جمہوریت، سامراج، سرمایہ داری اور اشتراک تقریباً بلا واسطہ اسی صنعتی تغیر کے نتائج ہیں۔ اور یہ سب کیا، خود انسان بدل گئے انکی ذہنیت پلٹ گئی جدید مغربی تمدن سے اسکی جدید صنعتی ترقیاں نکال ڈالو تو جو کچھ رہ جائے گا وہ قدیم بابلی تمدن سے کسی طرح بلند پایہ نہ ہوگا۔

لیکن آخر یہ صنعتی تغیر ممکن کیونکر ہوا۔ دنیا کی تاریخ میں دوسرے عہد کیوں یہ نہ کر سکے میرا خیال ہے کہ اگر جہاں تک ذہنی قوت کے صرف کا معاملہ ہے دنیا میں پہلے بھی بہت سے عہد اسکی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی اس کی آرزو ہی نہ کی۔ انکے سامنے یہ کبھی بطور مقصد آیا ہی نہیں۔ وہ تو اگر اتفاق سے ایسی اختراعات کر بھی لیتے تو انہیں یونہی بیکار پڑا رہنے دیتے اور انکی طرف توجہ بھی نہ کرتے بلکہ شاید انہیں نظر حقارت سے دیکھتے۔ چین میں بارود کی ایجاد ہمارے اس خیال کے لئے نہایت روشن مثال ہے۔ سچ یہ ہے کہ صرف وہ عہد جو اپنی تمامتر توجہ خارجی دنیا کی طرف پھیر دے، جو افراد کو جماعتی پابندیوں اور ذمہ داریوں سے بہت کچھ آزاد کر دے، جو بچہ بچہ میں کمانے کا سودا پیدا کر دے، مضبوط اور چالاک کے لئے زندگی کے تمام انعامات مخصوص کر دے اور کمزور اور بیوقوف کے لئے کہیں پناہ نہ دے صرف وہی عہد جس کا مرکزی تصور انفرادیت ہو وہی یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

نشاۃ ثانیہ میں یورپ میں فرد کا انکشاف ہوا۔ اسی نشاۃ ثانیہ اور مذہبی سدھار نے قرون وسطےٰ کی قبر کھود دی اور پھر قانون فطرت کے مسلک نے وہ تخلیقی خیالات مہیا کئے جن سے اس

قبر پر دور جدید کی عمارت کھڑی کی گئی۔ قرون وسطےٰ کے جماعتی بند ایک ایک کرکے کاٹے گئے اور پھر انقلاب فرانس کے سیلاب نے اپنی انفرادیت کی رو میں جو کچھ رہ گیا تھا اسے مٹا دیا۔ انہیں انفرادی تصورات نے اسکے بعد یورپ کی ذہنی و مادی زندگی کی تشکیل کی۔

ذہنی دنیا میں اس انفرادیت کی خصوصیات تھیں ہر اس چیز کی مخالفت جو مابعدالطبیعی معلوم ہوا ور دوسرے اسکی افادیت۔ جب فرد کافی بالذات ہوگیا اور آپ اپنا مختار آپ اپنا ذمہ دار تو اسے یہ امکان حاصل ہوگیا کہ کچھوے کی طرح اپنے ہی خول میں سمٹ رہے اور گونگے کی طرح اپنے گڑ کا مزا آپ ہی لے۔ اس سے جو اندرونی افلاس پیدا ہوا اسکی تلافی کی کوشش کی گئی "خصوصیت" کے نشہ سے اپنے سے رشتہ باندھ کر یہ فرد سب سے علیحدہ ہوگیا۔ اور یہ آئینیس کی طرح کائنات تک سے اپنے رشتہ کو کاٹ کر ہر چیز کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے لگا۔ پر آئینیس جیسی ذہنیت میں پھر مابعدالطبیعی چیزوں کا کیا دخل؟ وہاں تو سچ اور حق بس وہی ہے جو فرد سوچے، جو فرد سمجھے، چنانچہ اس سیلاب انفرادیت میں تمام خارجی اور مستقل قدر اور معیار بہ گئے۔ اخلاق بھی بالائے فرد اصول اور قدر کا نتیجہ نہ رہا بلکہ اعتباری ہوگیا۔ تمدن کے تمام ذہنی و اخلاقی عناصر سطحی ہوگئے۔ کیفیت کی جگہ کمیت نے لے لی۔ صفات کے بجائے مقدار پر توجہ ہونے لگی نیک اور بد کی تمیز متکبر مالدار اور مفلس کی تقسیم ہونے لگی، حسین اور بدنما کی بجائے لوگ قیمتی اور ارزاں کی تفریق پر نظر کرنے لگے۔ یہاں تعدیلی نے کامیابی کا نہایت آسان معیار فراہم کردیا اور دنیا بس "کامیابی" کے جنون میں مبتلا ہوگئی۔ کسی شخص کی لیاقت نیکی، اخلاق کے متعلق کچھ کہنے کے بجائے یہ بات زیادہ ذوقی ہوگئی کہ "یہ کامیاب انسان ہے"

لیکن تاریخ کی ایک زریں میزان ہے۔ اگر کوئی عہد یا کوئی قوم خارجی مادی اشیاء کا بہت زیادہ حصہ اپنے لئے لیتی ہے تو اسے زندگی کے اخلاقی اور ذہنی شعبہ میں اسی

نسبت سے تخفیف کرنی پڑتی ہے۔ مغرب نے اور مغرب کیساتھ ان سب نے جو اسکے پیرو ہیں اپنی قوت کا اتنا حصہ باہر کیطرف صرف کیا ہے ممکن نہیں کہ اندر کی طرف افلاس و ناداری پیدا ہو زندگی کی اس سرپٹ دوڑ میں بے روک ٹوک اور بے حد و غایت مقابلہ نے جہاں ہر شخص نفسی نفسی میں مبتلا ہے جہانتک خارجی اشیاء کا تعلق ہے حیرت انگیز نتائج حاصل کئے ہیں لیکن قدور باطنی کی دنیا میں اسے اس سے کہیں زیادہ قیمتی چیزیں قربان بھی کرنی پڑی ہیں۔ اسکی سطحیت اب چھپائے نہیں چھپتی اور اس کی انفرادیت جنون کے درجہ کو پہنچ گئی ہے۔ صحیح تصور جماعتی کی مدد بغیر اور اخلاقی و روحانی تعلیم کے لوچ سے بے بہرہ یورپ کے پیرا تھیں جیسے سور ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے اپنے لئے آگے جانے کا جو راستہ اختیار کیا تھا وہ آزادی اور فرصت کے فردوس گم شدہ تک پہنچانے کے بجائے ہمیں غلامی اور تنازعات کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ یہ طریق حیات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راہ اجل ثابت ہوگا۔

ہاں مشرق کی راہ پر چلنے والے بھی بظاہر کچھ بہت بہتر حال میں نہیں معلوم ہوتے۔ یہ اندر کی طرف کی راہ بھی چلنے والے کے لئے زیادہ امید افزا نہیں۔ یہ خود ہماری راہ ہے اس لئے اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ چونکہ یہ نکلی ہی اس لئے تھی کہ بہت سے لوگوں میں باہمی پرامن زندگی کو ممکن بنانے اس لئے ظاہر ہے کہ اس نے فرد کو وہ مطلق العنانی نہ دی جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اس نے جزو کے مقابلہ میں کل کو زیادہ اہم سمجھا اور افراد کو جسم جماعت کے اعضاء کی حیثیت دی۔ ہمارے لئے لازم تھا کہ ہم خارجی اور فوق الفرد قدور کو تسلیم کریں اور ہم نے ایسا کیا۔ ہم نے خشک اور بے لوچ عقلیت سے بچنے کے لئے انسانی زندگی کے غیر عقلی عناصر کیطرف بھی توجہ کی۔ یہ سب کچھ کیا اور شاید درست و بجا کیا لیکن خود اپنے نفس اور اپنے ماحول میں امن و اطمینان اور شانتی پیدا کرنے کی آرزو

ہم پر اس درجہ مسلط ہوئی کہ ہم حدود جائز سے بھی آگے بڑھ گئے۔ ہم بے عملی اور مجہولیت کو امن کا مرادف سمجھنے لگے۔ ہم نکلے تھے ایک زندہ دل کے اطمینان و سکون کی تلاش میں اور لگے اس سکون کی پرستش کرنے جو لوح مزار میں ہوتا ہے۔ ہم نے قناعت کو نقدان عمل کا ہم معنی بنالیا اور روح کی گہرائیوں کا قائم مقام ہم نے مادی زندگی کی پستیوں کو جانا۔ ہم سے ذوق عمل جاتا رہا اور ہم یہ نہ سمجھے کہ فعالیت معدوم ہوتی ہے۔ صرف مردہ چیزوں میں ہم بھول گئے کہ ہستم اگر میرو م گر نہ روم نیستم۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کعبۂ مقصود کی راہ بھی انسانیت کو حرماں نصیبی کے ترکستان کو لیجاتی ہے۔

الگ الگ تو ان دونوں راہوں کا جن پر انسانیت اپنی امیدیں باندھ سکتی تھی یہ حال ہے۔ لیکن آج یہ راہیں کہیں کہیں مل رہی ہیں۔ خود ہندوستان میں! - یہ میل ہمارے لئے بہت بڑا خطرہ بھی ہے اور بہت بڑا موقع بھی۔

خطرہ تو اس لئے ہے کہ مجنونانہ عمل کی زندگی زبردست سیلاب کی طرح اپنے سامنے کی ہر چیز کو بہائے لئے جاتی ہے اس کے جنون میں مردانگی ہے اور ہمارے سکون میں نسائیت اور ڈر یہ ہے کہ یہ مردانگی اس نسائیت کو کہ یہ بھی دنیا کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنا وہ، کہیں مٹا نہ دے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر طرف مردانہ اصول نسائی اصول پر غالب آرہا ہے۔ خود عورتوں کی آزادی جس کا ساری دنیا میں غلغلہ ہے یہ کیا ہے؟ مردانہ اصول کی فتح۔ دنیا کے سیاسی اور معاشی معاملات کی باگ آج دونوں صنفوں کے مردوں کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی مردانہ مرد اور مردانہ عورتوں کے ہاتھ میں۔ عورت کی یہ نام نہاد آزادی اس کی فتح نہیں اس کا خاتمہ ہے۔ مشرقیوں کی سیاسی آزادی کا بھی یہی حال ہے۔

یہ آزادی دنیا کے مغربی ہونے کی علامت ہے۔ اس سے اصلی ایشیائی اور مشرقی انسان کو فتح حاصل نہیں ہورہی ہے بلکہ ایشیائیوں میں انکو جو دراصل یورپی

ہیں جیسے پہلے عیسائیت کے روپ میں ایشیائی دماغ یورپ پر حکمراں تھا آج دنیا پر سفید یا رنگین یورپیوں کا تسلط ہے۔ مشرق کی بیداری اپنے اصلی مشرقی بھائی پر پیلے یا کالے مغربی کی فتح کا نام ہے۔ اس کا نتیجہ مشرقی تمدن کی فتح نہیں۔ اس کا خاتمہ ہے۔

یہ وہ مصیبت ہے جس سے سب کو آگاہ رہنا چاہئے جس طرح مشرق کی مجہولیت مغرب کے قوائے عمل کو مفلوج کر سکتی ہے اسی طرح یورپ کی سختی اور شدت عمل ایشیا کے توازن و تناسب روحی کو ملیامیٹ کر سکتی ہے۔ اور دنیا کو ایک کے جانے سے اتنا ہی نقصان ہوگا جتنا دوسرے کے۔ مغرب کے جنون عمل کی اصلاح اگر تجدید مذہبی و اخلاقی سے نہ ہوئی تو وہ ایک جنگ کی مصیبت سے پیچھے بھی نہ پائے گا کہ دوسری میں مبتلا ہو جائے گا (اگر صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ اسی رفتار سے اخلاقی ترقی نہ ہوئی تو یورپ کا زوال نہیں اسکی تباہی یقینی ہے۔ اور ہم مشرقیوں نے اگر اپنے جمود کاہلی، مجہولیت اور بیجا قناعت کا بر وقت علاج نہ کیا تو ہم کسی طرح اپنے کو فاقہ کی موت سے نہ بچا پائینگے اور ہمیں اپنی موت میں وہ کیفیت بھی نصیب نہ ہوگی جو ہاتھ میں تلوار لیکر مرنے والے کی ہوتی ہے۔)

مشرق و مغرب کی یہ یکجائی ہمارے لئے نہایت عظیم الشان موقع اس لئے ہے کہ اگر ہم چاہیں تو یورپ کا ذوق عمل، اسکی سختی، اس کی شجاعت، اسکی اثباتی زندگی سے اپنے لئے سبق لیں لیکن ان چیزوں کو کسی اعلیٰ مقصد حیات کا خادم بنائیں۔ مشرق چاہے تو اپنی انسانیت سے مغرب کی شدت اور درشتی میں نرمی اور لوچ پیدا کر دے اور دونوں کے امتزاج سے وہ تمدن پیدا ہو جو شاید انسانیت کے دکھ کی دوا ثابت ہو۔

ہر شخص جسے انسانیت کے بہتر مستقبل پر ایمان ہے وہ اس امتزاج باہمی

کے امکان پر یقین رکھتا ہوگا۔ کیونکہ مغرب و مشرق دونوں درصل زندگی کی بنیادی قدور کے حامل ہیں۔ مغرب کی عظمت اور اس کے حسن کا مدار ہے اسکی قوت پر، مشرق کی بڑائی اور خوبی ہے اسکا توازن و تناسب۔ مغرب صنعت ہے، مشرق اخلاق۔ وہ جسم ہے یہ روح۔ یہی انکا تضاد ہے اور یہی انکا رشتہ۔ یہی انہیں جدا کرتا ہے اور یہی انکے ملنے کی قوی ضمانت ہے۔

سامراجی مبلغ "مشرق کے مشرق اور مغرب کے مغرب" ہونے پر جتنا چاہیں زور دیں اور انکے کبھی نہ مل سکنے کی جتنی چاہیں پیشگوئیاں کریں۔ لیکن انکی باہمی حاجتمندی انکے اتحاد کی خبر دیتی ہے۔ دماغ اگر شبہ بھی کرے تو دل یہی کہتا ہے کہ جزوی حق کے یہ حامل ضرور کسی اعلیٰ تصور کے ماتحت یکجا ہوں گے جہاں مشرق و مغرب کی تمیز مٹ جائیگی۔ للہ المشرق و المغرب۔

[مندرجہ بالا مضمون کے مطالب کا زیادہ حصہ میں پٹنہ Young Man's Institute کے ایک جلسہ میں بیان کر چکا ہوں۔ اسکے بعض خیالات مشہور آسٹروی فلسفی کاونٹ کوڈن ہوف کلرگی کی تصانیف سے ماخوذ ہیں۔]

(ذاکر)

مقدمہ انتخاب سودا

جناب ابو محمد صاحب ثاقب کانپوری نے دیوان سودا کا انتخاب کیا ہے اور نواب جعفر علیخاں صاحب اثر نے اُس پر مقدمہ تحریر فرمایا ہے یہ انتخاب معہ مقدمہ ان دونوں حضرات کی نوازش سے مکتبہ جامعہ ملیہ کو مل گیا ہے اور انشاء اللہ وسط مئی تک کتاب کی شکل میں شائع ہو جائے گا۔

(مدیر)

تونے سودا وہ زبانِ ریختہ ایجاد کی
پڑھ کے اک عالم اٹھاتا ہے تری اشعار فیض

سودا کی مختصر سوانح عمری (ماخوذ از آب حیات) سودا تخلص۔ مرزا محمد رفیع نام۔ شہر دلی کو انکے کمال سے فخر ہے۔ باپ مرزا محمد شفیع میرزایانِ کابل سے تھے بزرگوں کا پیشہ سپہگری تھا، مرزا محمد شفیع بطریق تجارت وارد ہندوستان ہوئے۔ ہند کی خاک دامنگیر نے ایسے قدم پکڑے کہ یہیں رہے۔

سودا ۱۱۲۵ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ دلی میں پرورش اور تربیت پائی۔ کابلی دروازہ کے علاقہ میں انکا گھر تھا ایک بڑے پھاٹک میں نشست رہا کرتی تھی، دروازہ تباہی دہلی میں تباہ ہوا۔ شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ اکثر اُدھر ٹہلتے جا نکلتے تھے، آزاد ہمرکاب ہوتے تھے مرزا کے وقت کے حالات اور مقامات کا ذکر کرکے قدرت خدا کو یاد کرتے تھے۔

سودا بموجب رسم زمانہ اول سلیمان قلیخاں وداد اور پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ شاہ موصوف نے بھی اپنے دیوان کے دیباچہ میں جو شاگردوں کی فہرست لکھی ہے اسمیں مرزا کا نام اس طرح لکھا ہے جس سے فخر کی خوشبو آتی ہے۔ خوشا نصیب اس اُستاد کے جس کی گود میں ایسا شاگرد دل کر بڑا ہوا، خان آرزو کے شاگرد نہ تھے مگر ان کی صحبت سے فائدے بہت حاصل کئے۔ چنانچہ پہلے فارسی شعر کہا کرتے تھے خان آرزو نے کہا کہ مرزا فارسی اب تمہاری زبان نہیں، اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمہارا کلام اہل زبان کے مقابل میں قابل تعریف

ہو۔ طبع موزوں ہے شعر سے نہایت مناسبت رکھتی ہے تم اُردو کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہوگے مرزا بھی سمجھ گئے اور دیرینہ سالی استاد کی نصیحت پر عمل کیا غرض طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دلی جیسے شہر میں آئی اُستادی نے خاص وعام سے اقرار لیا۔ انکے سامنے ہی انکی غزلیں گھر گھر اور کوچہ و بازار میں خاص وعام کی زبانوں پر جاری تھیں، جب کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے اور فرمائشیں کرنے لگے۔ ایک دن کسی غزل کیلئے تقاضا کیا، انہوں نے عذر بیان کیا حضور نے فرمایا بھئی مرزا کے غزلیں روز کہہ لیتے ہو۔ مرزا نے کہا پیرومرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ حضور نے فرمایا بھئی ہم تو پاخانہ میں بیٹھے بیٹھے تین چار غزلیں کہہ لیتے ہیں، ہاتھ باندھ کر عرض کی حضور ویسی بو بھی آتی ہے۔ یہ کہکر چلے آئے، بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بلا بھیجا اور کہا کہ ہماری غزلیں بناؤ ہم تمہیں ملک الشعرا کر دینگے۔ یہ نہ گئے اور کہا کہ حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے کریگا تو میرا کلام ملک الشعرا کرے گا، پھر ایک بڑا مخمس شہر آشوب لکھا۔ ع کہا میں نے یہ سودا سے کیوں ہے ڈانواں ڈول۔ بے درد ظاہر میں کہتے ہیں کہ بادشاہ اور دربار بادشاہ کی ہجو کی ہے۔ غور سے دیکھو تو ملک کی دلسوزی سے اپنے وطن کا مرثیہ کہا ہے، مرزا دل شکستہ ہو کر گھر میں بیٹھ رہے قدردان موجود تھے کچھ پروا نہ ہوئی، ان لوگوں کی بدولت ایسی فارغ البالی سے گذرتی تھی کہ انکے کلام کا شہرہ جب نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ میں سنا تو کمال اشتیاق سے برادر من مشفق مہربان من لکھکر خط مع خرچ سفر بھیجا اور طلب کیا۔ انہیں دلی چھوڑنا گوارا نہ ہوا جواب میں فقط اس رباعی پر حسن معذرت کو ختم کیا۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک ۔۔۔ آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہوے ۔۔۔ بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

کئی برس کے بعد وہ قدردان مر گئے زمانے بدل گئے۔ سودا بہت گھبرائے، اُس عہد میں ایسے تباہی زدوں کے لئے دو ٹھکانے تھے، لکھنؤ یا حیدرآباد، لکھنؤ قریب تھا اور فیض سخاوت کی گنگا بہ رہی تھی، اس لئے جو دلی سے نکلتا تھا ادھر رُخ کرتا تھا اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ پھر دوسری

صرف خیال نہ کرتا تھا، اس وقت حاکم ملکہ وہاں کے محکوم بھی جو یائے کمال تھے، نقطے کو کتاب کے مولوں خریدتے تھے غرض ساٹھ یا چھیاسٹھ برس کی عمر میں نکلکر چند روز فرخ آباد میں نواب بنگش کے ہاں رہے وہاں سے ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے، نواب شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی وہ بہت اعزاز سے ملے اور انکے آنے پر کمال خورسندی ظاہر کی لیکن یا تو بے تکلفی سے یا طنز سے اتنا کہا کہ مرزا وہ رباعی تمہاری ابتک میرے دل پر نقش ہے اور اسی کو مکرر پڑھا، انہیں اپنے حال پر بڑا رنج ہوا اور پاس وضع داری پھر دربار نہ گئے، یہاں تک کہ شجاع الدولہ مرگئے اور آصف الدولہ مسند نشین ہوئے، لکھنؤ میں مرزا فاخر مکین زبان فارسی کے مشہور شاعر تھے ان سے اور مرزا رفیع سے بگڑی اور جھگڑے نے ایسا طول کھینچا کہ نواب آصف الدولہ کے دربار تک نوبت پہنچی، انجام یہ ہوا کہ علاوہ انعام واکرام کے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ہوگیا اور نواب نہایت شفقت کی نظر فرمانے لگے، اکثر حرم سرا میں خاصے پر بیٹھے ہوتے اور مرزا کی اطلاع ہوتی فوراً باہر نکل آتے تھے، شعر سنکر خوش ہوتے اور انہیں انعام سے خوش کرتے تھے، جبتک مرزا زندہ رہے نواب مغفرت مآب واہل لکھنؤ کی قدر دانی سے ہر طرح فارغ البال رہے۔ سترّ برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں وہیں انتقال کیا اور میر باقر کے امام باڑے میں دفن ہوے شاہ عالم زندہ تھے سنکر بہت روئے اور کہا کہ افسوس ہمارا پہلوان سخن مرگیا۔

شاہ عالم بادشاہ اور نواب شجاع الدولہ کے واقعات سے ظاہر ہے کہ سودا حد درجہ غیور اور وضع کے پابند تھے، عزت کو دولت پر ترجیح دیتے تھے، آصف الدولہ کے دربار میں بھی اپنی خوشی یا خواہش سے نہیں گئے، مرزا فاخر مکین کے شاگردوں نے انہیں سر بازار ذلیل کرنا چاہا تھا اتفاقاً اسی وقت نواب سعادت علیخاں کی سواری گذری اُنہوں نے پوچھا کیا معاملہ ہے۔ حالات دریافت ہونے پر سودا کو اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھاکر نواب آصف الدولہ بہادر کی خدمت میں لے گئے، اس طرح دربار میں آمدورفت شروع ہوئی۔

سودا کے مزاج میں شوخی اور ظرافت بہت تھی ہجو کے شوق کو اسی کا نتیجہ کہنا چاہئے

زود رنج بھی تھے ذرا سی ناراضی میں بے اختیار ہو جاتے تھے اور ہجو کا طومار تیار کر دیتے تھے، یہ بھی سنا گیا ہے کہ ابتدا انکی طرف سے بہت کم ہوتی تھی۔ اور ہجو کے بعد دل میں کدورت نہیں رہتی تھی تاہم وہ ہجو گوئی کے سبب سے بہت بدنام ہیں اور یہ انکی شاعری پر ایک بدنما دھبہ ہی بہتر یہی ہوتا اگر اپنے اس شعر پر عمل کرتے۔

بزنگ کوہ رہ خاموش حرف ناسزا شکر کہ تا بد گو صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی

زبان اردو کی مختصر تاریخ | زبان مثل دیگر موجودات عالم کے اصول ارتقا کی تابع ہے جس طرح اجرام فلکی کے ٹکرانے سے کچھ اجزا علیحدہ ہو کر ایک نیا مرکز قائم ہو جاتا ہے اور ارتقا کے مدارج طے کرتا ہے، اسی طرح دو زبانوں کے اتصال سے اکثر ایک تیسری زبان پیدا ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ ان زبانوں میں مماثلت ہو اور قوت جاذبہ زائل نہ ہو چکی ہو، ہندوستان پر اسلامی حملوں کے ساتھ ساتھ زبان فارسی اور بھاشا میں بھی تصادم ہوا، اسلامی حکومت قائم ہونے پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول شروع ہوا لین دین اور تبادلہ خیالات کے واسطے ایک دوسری زبان کے الفاظ بولے بغیر گذارہ نہ ہو سکا۔ دونوں زبانوں میں موانست پیدا ہوئی یہ اختلاط روزبروز ترقی کرتا رہا حتیٰ کہ ایک نئی زبان پیدا ہو گئی جسکا نام اردو ہوا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اردو لشکری زبان ہے جو عہد شاہجہاں میں ایجاد ہوئی جدید تحقیق سے اس کی تردید ہوتی ہے، صدیوں پیشتر سے یہ زبان گنگا اور جمنا کے دوآبے میں رائج تھی اور برج بھاشا کے نام سے مشہور تھی، دلی کے گرد و نواح کے باشندوں کی یہی زبان تھی، جب دلی دارالسلطنت ہوا اور بازار لشکر قائم ہوا وہاں بیشتر انہیں لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی، لہذا انکی زبان لشکر کی زبان ہو گئی۔ یہ کہنا واقعات کو برعکس بیان کرتا ہے کہ بازار لشکر میں یہ زبان پیدا ہوئی، البتہ فتوحات کے سلسلے میں جس حصہ ہندوستان میں یہ لشکر پہنچا یہ زبان بھی پہنچی اور رواج بھی پایا۔ شاہجہاں سے بہت پہلے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا قدم آتے ہی عربی اور فارسی الفاظ بھاشا میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے جیسا کہ چند کوی کی

رائج رہا۔ تلسی داس کی رامائن اور دیگر تصانیف سے ثابت ہوتا ہے جن میں بکثرت عربی اور فارسی الفاظ موجود ہیں مگر زبان دراصل بھاشا تھی جس نے ان الفاظ کو بھی قبول کر لیا تھا، دونوں زبانیں ایسی شیر و شکر نہیں ہوئی تھیں کہ جسے ایک تیسری زبان کہا جائے جو دونوں سے مشابہ بھی ہو اور مختلف بھی اس زبان کی بنا جسے اول اول ریختہ کہتے تھے اور اب اُردو کہتے ہیں ولی دکنی نے ڈالی، اسکی ابتدا نظم سے ہوئی اور فارسی کی بحریں تشبیہیں، استعارے حتیٰ کہ چند مستثنیات کے علاوہ فارسی کی صرف و نحو کی ترکیبیں اختیار کی گئیں مگر بھاشا کا رنگ اب بھی غالب تھا اور شعر کی بنیاد زیادہ تر ذومعنی الفاظ اور ایہام پر ہوتی تھی جو بھاشا کے دوہوں کی شان ہے بعد کے شاعروں نے ان رنگ آمیزیوں سے اُردو کو پاک کرنے کی بڑی کوشش کی۔

سودا کی تاریخی اہمیت سب سے ممتاز حصہ اس زبان کی صفائی میں مرزا رفیع سودا نے لیا مولانا آزاد تذکرہ آب حیات میں فرماتے ہیں "زیادہ تر سودا نے اور کچھ میر نے اس طریقہ کو بلا کہ استعارہ کو ہندی محاوروں کے ساتھ ملا کر ریختہ متین بنایا،، (صفحہ ۱۹) ایک اور جگہ کہتے ہیں " دلّی میں اول مرزا رفیع سودا پھر شیخ ابراہیم ذوق نے زبان کی پاکیزگی، الفاظ کی شستگی اور ترکیب کی چستی سے کلام میں خوب زور پیدا کیا، میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے زمانہ کی افسردہ دلی دنیا سے بیزاری کے مضامین کو خوب ادا کیا،، (صفحہ ۸۲) سودا نے کثرت سے فارسی تشبیہیں استعارے محاورے اور بندشیں اردو میں داخل کیں اور انہیں اس طرح گھلایا ملایا کہ زبان چٹخارے لیتی ہے، لہذا جو اہمیت تاریخی نظر سے سودا کو حاصل ہے محتاج بیان نہیں جبتک زبان اردو قائم ہے اسکا نام صفحہ ہستی سے مٹ نہیں سکتا، ایسے شخص کا کلام ضرور اس قابل ہے کہ بغور دیکھا جائے۔

اُردو شاعری کی ابتدا تھی ولی جو راستہ بتا گئے تھے اس میں سیکڑوں جھاڑ جھنکار تھے انکی صفائی کا بیڑا انکے بعد کے شاعروں نے اٹھایا جن میں شاہ حاتم سودا کے استاد بھی تھے۔ سودا

کی موجھاری کا یہ حال تھا کہ شاہ حاتم جب اُسکی غزل کو اصلاح دیتے تھے تو اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

از ادب صائب خموشم ورنہ در سر داوری
رتبۂ شاگردی من نیست استاد مرا

اور احباب سے کہتے تھے کہ یہ شعر صائب نے میری استادی اور مرزا رفیع کی شاگردی کے حق میں کہا تھا۔

جس شاعری کی بنیاد وؔلی دکنی نے ڈالی تھی اسپر سوداؔ نے ایک عالیشان عمارت کھڑی کردی اور اُسے طرح طرح کے نقش و نگار سے زینت دی قصیدہ اور ہجو کا اضافہ کیا، موجودہ نقطۂ خیال سے ہجو کے متعلق جو کچھ کہا جائے۔ مگر سوداؔ کے زمانے میں اسکی وبا عام تھی۔ بات اتنی ہو کہ اور لوگ چند اشعار میں اپنے دل کا بخار نکال لیتے تھے، اس زور شور سے ہجو کہنا کہ بقول آزاد ہجو شاعری کے درخت کا ایک موٹا ٹہنا شگفتگی سوداؔ کا حصہ ہے، اس اعتبار سے سودا کو نہ صرف قصیدہ بلکہ ہجو کا اردو میں موجد کہنا چاہئے، ہجووں سے سودا کی قوت بیان زبان اور وسعت معلومات کا بھی اندازہ ہوتا ہے، انکے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے ہر علم اور ہر فن میں دستگاہ تھی، جس علم یا فن کا بیان کیا اسی کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں، جہاں کسی پیشہ ور کا ذکر کیو ہاں اسی کی زبان کو نظم کیا ہے، اس لحاظ سے اس کی ہجو یں بھی قابل قدر ہیں اس کے قصائد کے متعلق مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

"اول قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلٰی درجہ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا انکا پہلا فخر ہے، وہ اس میدان میں فارسی کے شہسواروں کے ساتھ عنان درعنان ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں انکے کلام کا زور شور انوری اور خاقانی کو دباتا ہے۔ اور نزاکت مضمون میں عرفی ظہوری کو شرماتا ہے"

آب حیات صفحہ ۱۵۲

دیوان ریختہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"(وقت کی زبان سے قطع نظر کرکے) باعتبار جوہر کلام سرتاپا مرصع ہے بہت سی غزلیں دلچسپ اور دل پسند بحروں میں ہیں کہ اس وقت تک اردو میں نہیں آئی تھیں زمینیں سنگلاخ ہیں اور ردیف قافیے بہت مشکل مگر جس پہلو سے انہیں جما دیا ہے ایسے جمے ہیں کہ دوسرے پہلو سے کوئی بٹھائے تو معلوم ہو"

سوداؔ کے متعلق اہل سخن کی رائے

مصنف آب حیات :۔

کل اہل سخن کا اتفاق ہے کہ مرزا اس فن میں استاد مسلم الثبوت تھے وہ ایسی طبیعت لیکر آئے تھے جو شعر اور فن انشا ہی کے لئے پیدا ہوئی تھی میر صاحب نے بھی انہیں پورا شاعر مانا ہے انکا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا، اس پر سب رنگوں میں ہمرنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور کہیں رکے نہیں چند صفتیں خاص ہیں جن سے کلام انکا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے، اوّل یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طپنچہ کی جا ہیں چڑھی ہوئی ہیں اور یہ خاص انکا حصہ ہے، چنانچہ جب انکے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں شعر مزہ ہی نہیں دیتا، خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں، مگر اس باریک نقاشی پر انکی فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے تشبیہ اور استعارے انکے یہاں ہیں مگر اسی قدر جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ، رنگینی کے پردے میں مطلب اصلی کو گم نہیں ہونے دیتے۔ انکی طبیعت ایک ڈھنگ کی پابند نہ تھی، نئے نئے خیال اور چٹخے قافیے جس پہلو سے جمتے دیکھتے جما دیتے تھے اور وہی انکا پہلو ہوتا تھا، انکے

معصرانہ خود اقرار کرتے تھے کہ جو باتیں ہم کاوش سے پیدا کرتے ہیں وہ اُس شخص کو پیش پا افتادہ ہیں۔

جن اشخاص نے زبان اُردو کو پاک صاف کیا ہے مرزا کا ان میں پہلا نمبر ہے۔ انہوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا ہے جیسے علم کیمیا کا ماہر ایک مادہ کو دوسرے مادہ میں جذب کر دیتا ہے کہ کسی تیزاب سے اسکا جوڑ کھل نہیں سکتا۔ انہیں کا زور طبع تھا جس کی نزاکت سے دو زبانیں ترکیب پاکر تیسری زبان پیدا ہوگئی اور اُسے ایسی قبولیت عام حاصل ہوئی کہ آئندہ کے لئے وہی ہندوستان کی زبان ٹھری جس نے حکام کے درباروں اور علوم کے خزانوں پر قبضہ کیا۔ اسی کی بدولت ہماری زبان فصاحت اور انشا پردازی کا نمونہ لیکر شائستہ زبانوں کے دربار میں عزت کی کرسی پاگئی۔ اہل ہند کو ہمیشہ انکی عظمت کے سامنے ادب اور ممنونی کا سر جھکانا چاہیئے۔''

مرزا محمد قتیل چار شربت میں فرماتے ہیں:۔

''مرزا محمد رفیع سوداؔ در ریختہ پایۂ ملاظہوری دارد'' مگر مولانا آزاد کہتے ہیں کہ ''سوداؔ کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے کہ محاورہ کا حاکم اور قصیدہ و ہجو کا بادشاہ ہے'' مولوی عبدالغفور صاحب شہباز مؤلف زندگانی بے نظیر نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شمس العلما مولوی امداد امام صاحب نے سوداؔ کو اُردو کا شکسپیر مانا ہے۔ مولوی صاحب سے ایک انگریز نے جسے اُردو فارسی کا شوق تھا دریافت کیا کہ اُردو میں کوئی شاعر شکسپیر کا ہم پلہ ہے۔ مولوی صاحب نے تھوڑے غور کے بعد جواب دیا کہ اُردو میں ڈرامے کا رواج نہیں تھا اس سبب سے واقع میں تو کوئی بھی شکسپیر کا مقابل نہیں کہا جا سکتا لیکن باعتبار قوت ہم سوداؔ میں شکسپیر کا سا مادہ پاتے ہیں اور اسکی دلیل یہ ہے کہ بعض نظموں میں اسکی اعلیٰ درجہ کی زباندانی کی مثالیں موجود ہیں چنانچہ فیضو چیک باز کی ہجو میں میر شکاروں کی اصطلاحیں اور رفوگری خانے کی تفصیلات اس کثرت سے ہیں کہ اسکی وسیع النظری اور کامل معلومات لسانی

پہ دلیل کافی ہوسکتی ہیں۔

اسی طرح جہاں جہاں جس علم و فن کا ذکر کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسے سب میں دست رس ہے یہی کمال سودا کو مثل شکسپیر کے دوسرے شاعروں سے ممتاز بناتا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں جو مضمون ہندوستانی لٹریچر پر ہے اسمیں خان آرزو کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ وہ میر تقی میر کے استاد تھے جو (یعنی میر تقی) بعد سودا کے بہترین شاعر شمالی ہندوستان کے مانے جاتے ہیں۔ شاہ حاتم کے ضمن میں تحریر ہے کہ انکا ایک شاگرد سودا تھا جو بہترین شاعر شمالی ہندوستان کا ہوا، اسی سلسلے میں لکھا ہے کہ اسمیں جائے سخن نہیں کہ سودا اور میر اردو کے بہترین شاعر تھے، میر کو غزل اور مثنوی میں سودا پر افضلیت ہے اور سودا کو قصائد و ہجو میں میر پر فوقیت۔ اس کے بعد سر سید مرحوم کی رائے کو نقل کیا ہے کہ میر کی زبان اتنی صاف اور جو الفاظ وہ استعمال کرتے ہیں اتنے مناسب اور برمحل ہوتے ہیں کہ اسوقت تک لوگ انکی تعریف میں رطب اللسان ہیں، اگرچہ سودا کی زبان بھی نہایت شستہ ہے اور تشبیہ و استعارے میں وہ میر سے سبقت لیگئے تاہم انکا طرز ادا اتنا دلکش نہیں۔

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

"زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت آثا مرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی بوے (میر) نرسیدہ اما حق آنست کہ ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگرست، مرزا دریائیست بیکران و میر نہریست عظیم الشان در معلومات قواعد میر را بر مرزا ترجیح است و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری"

خواجہ باسط نے ایک موقعہ پر کہا کہ میر کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام واہ ہے اور مثال میں یہ شعر میر کا پڑھا۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو　　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا۔

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت　　　خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

سودا کے انتقال کے بعد مصحفی نے ایک قصیدہ انکے قصیدہ پر کہا جسمیں در اصل سودا کی مدت کی ہے۔ مگر ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی سودا کی زباندانی کا لوہا مانے ہوئے تھا۔

سچ پوچھو تو اُردو میں فقط صاف زباں ہے، مضموں نہیں کرجاتا زنہار وہ تحریر

سید انشاء اللہ خاں انشاؔ زبان اُردو کے ماہر سمجھے جاتے ہیں وہ دریائے لطافت میں لکھتے ہیں "مرزا رفیع در سخن گفتن وحرف زدن، گو در شعر بضرورت وزن وقافیہ چند لفظ خارج از اُردو نیز آوردہ "

میر اور سودا کی غزل گوئی

میر کی شاعری اور شہرت کا مدار انکی غزلوں پر ہے، سودا کی غزلیں اس پائے کی نہیں سمجھی جاتیں اگرچہ قصیدہ کا بادشاہ مانا جاتا ہے، اسکے متعلق رائے قائم کرنے کے پیشتر دونوں کی سیرت اور افتاد طبیعت پر غور کرنیکی ضرورت ہے کیونکہ دونوں فطری شاعر تھے، اور اپنے جذبات، احساسات ومشاہدات کو موزوں الفاظ میں ادا کردیتے تھے، دونوں کی طبیعت جس طرح موثر ہوئی اور جسطرف انکی شاعری کا رخ پھرا وہی طرز انہوں نے اختیار کیا، میر کی طبیعت خلقی طور پر دردمند واقع ہوئی تھی، اسپر طرہ یہ کہ تمام عمر مصیبت وفلاکت میں بسر ہوئی، مزاج میں غیرت، خودداری اور پاس وضع بیحد تھا، جس نے انہیں گوشہ نشین بنادیا، لوگوں سے ملنا جلنا اپنا کلام سنانا دوسروں کا سننا اور تعریف کرنا معیوب جانتے تھے غرض کہ زمانہ سے وہ نالاں تھے اور زمانہ ان سے نالاں تھا، برخلاف انکے سودا کی طبیعت میں شروع سے شوخی اور ظرافت کا مادہ تھا اور جوش وخروش سے لبریز تھی اور شعر گوئی کا چسکا تھا۔ دونوں کی طبیعت طور طرز معاشرت کا اثر انکے کلام پر ہوا، درد وغم کی زبان ہمیشہ سادہ، وہیں نرم اور رکتی ہوئی ہوتی ہے اور یہی غزل کی زبان ہے جس کے واسطے بحریں بھی خاص خاص ہیں، جوش اور امنگ سے بھری طبیعت الفاظ بھی رنگین بلیغ اور پرشکوہ چاہتی ہے۔ اور یہی قصیدہ کی زبان ہے دونوں سچے شاعر تھے میر غزل میں اور سودا قصیدہ میں کوس لمن الملک بجا گئے، ورد بھرے دل سے قصیدہ کا نکلنا معلوم۔ پرجوش طبیعت کہیں نہیں رکتی سودا نے غزل بھی کہی اور خوب کہی، مگر میر

سے قصیدہ نہ ہوسکا۔ یہ غلط ہے کہ اُنہوں نے عمداً قصیدہ نہیں کہا اور بادشاہ وامراء کی مدح سرائی عیب سمجھتے تھے، انکے کلیات میں قصائد آصف الدولہ اور دیگر اشخاص کے موجود ہیں اسی طرح ہجو بھی کی۔ میر صاحب نے کوشش کی اُنکا اجگر نامہ اسکی مثال ہے۔ مگر دونوں صنفوں میں کامیاب نہیں ہوئے۔ میر کے اشعار میں سادگی اور درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، اپنی جیتی خون بھرے اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں اس طرح کہتے ہیں کہ سننے والوں کے دل بچین ہوجاتے ہیں۔ سودا نے اپنے زورِ طبیعت سے پردرد اشعار بھی کہے لیکن ان میں وہ اثر نہیں، کیونکہ اصلیت نہیں جو میر کے اشعار میں ہے، اس کی شوخ طبیعت جو ہر رنگ میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ دکھاتی تھی "درد و غم کے افسانوں تک محدود نہ رہ سکتی تھی اور نہ رہی، وہ کبھی زمین پر تھی تو کبھی آسمان پر، جدت آفرینی سے ایک نئی دنیا قائم کی اور اسے طرح طرح کے گل بوٹوں اور نقش و نگار سے آراستہ کیا مختلف جذبات اور خیالات سے بسایا اس دنیا میں کہیں تو خوشی کی نوبت بج رہی ہے اور کہیں ماتم کی صف بھی ہوئی ہے، مگر ماتم بھی ہے تو جوش و خروش کے ساتھ نہ کہ گھٹ گھٹ کر خونِ جگر پیا ہے، بخلاف اس کے میر کی دنیا ایک غمکدہ ہے جہاں سوائے اندوہ و الم کے عیش و راحت کو دخل نہیں ہر طرف مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی جہاں پھول بھی ہیں تو کمہلائے ہوئے، جہاں شادمانی کا نشہ بھی ازدیادِ غم اور جراحتِ دل پر نمک پاشی ہے انکے ماتم کدہ میں شامِ غم کے سوا صبحِ عید کی جھلک بھی کسی نے نہیں دیکھی بقول عرفی ؎

منم کہ یافتہ ام ذوقِ صحبتِ غم را
بہ صبحِ عید دہم وعدہ شامِ ماتم را

غرضیکہ میر اور سودا دونوں کا رنگ جدا جدا ہے اور دونوں اپنے اپنے رنگ کے بادشاہ ہیں، میر کا کلام اگر چوٹ کھائے دلوں پر تیر و نشتر کا کام دیتا ہے تو سودا اہلِ سماع و بصیرت کو وجد میں لاتا ہے، اگر نوحہ غم اور افسانہ الم سننا ہو میر کا کلام دیکھئے، عالمِ خیال کی سیر مطلوب ہو یا نغمہ طرب کا اشتیاق ہو تو سودا کی طرف توجہ کیجئے۔ زندگی کے دو پہلو ہیں خوشی اور غم۔

امید اور یاس۔ سودا کی نظر ایک پہلو پر تھی اور میر کی دوسرے پر، ایک ہنستا ہنساتا تھا دوسرا روتا رلاتا تھا۔ ایک Optimist تھا جو ہمیشہ خوش رہتا تھا، دوسرا Pessimist تھا جو ہمیشہ غمگین رہتا تھا، ایک صرف اپنی سرگزشت بیان کرتا تھا، دوسرا اپنے تجربات و مشاہدات معرض تحریر میں لاتا تھا۔

میں نے جو کچھ عرض کیا نسبتاً اور دونوں کے منتخب کلام کے متعلق ورنہ ظاہر ہے میر صاحب کے کلام میں بھی کہیں کہیں خوشی کی جھلک آجاتی ہے۔ کم سے کم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُن کا ہر شعر پر از سوز و گداز ہے، اسی طرح سودا کا ہر ایک شعر خوشی کا گیت نہیں ہے، دردانگیز اشعار بھی موجود ہیں اور خوب ہیں سنیئے ؎

ایک شب آ کوئی دلسوز نہ رویا اس پر
شمع تک گور ہماری سے جلی دور سدا

یہ کون حال ہے احوال دل پہ اے آنکھو
نہ پھوٹ پھوٹ کے اتنا بہو ہوا سو ہوا

غافل ہے اس مریض سے ظالم کہ جس کا یار
آیا کوئی تو پونچھتا اشک اپنے گھر چلا

قاصد اشک آ کے خبر کر گیا
قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

دیکھتا ہوں میں تری بزم میں ہر ایک کا منہ
طلب رحم کی نظروں سے گنہگار کی طرح

آج بیمار کا تیرے ہے ترقی پر ضعف
صبح تھا زرد منہ اُسکا سو ہوا شام سفید

ضعف سے نالہ بھی اب دل سے نہیں آسکتا
درد لاتا ہے بہت خون جگر سے باہر

یوں دیکھتا ہوں اس ستم ایجاد کی طرف
جوں صید وقت ذبح کے صیاد کی طرف

تجھ عشق میں روز خوش نہ دیکھا
دکھ بھرتے ہی بھرتے مر گئے ہم

لخت جگر آنکھوں سے مرے آن نکلتے ہیں
یہ دل سے محبت کے ارمان نکلتے ہیں

دے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

رہا کرتا ہمیں صیاد اب پامال کرنا ہے
پھڑکنا بھی جسے بھولا ہو وہ پرواز کیا سمجھے

کیا نیاز عشق سے غافل ہے ناز حسن آہ
شیریں کیا جانے کہ خوں آلود جوئے شیر ہے

(باقی آئندہ)

نراج

کسی قوم کے افراد میں باہم خیالات کا اختلاف ہونا بہ شرطیکہ وہ خلوص، احساس ذمہ داری اور رواداری کے ساتھ ہو ذہنی ترقی کی علامت ہے۔ ذیل کے مضمون میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ ان سے ہمیں بہت سے اصولی اختلافات ہیں لیکن اس مضمون کا شائع کرنا ہم اہل فکر کی دلچسپی کیلئے ضروری سمجھتے ہیں انشاء اللہ کبھی اس کی تردید بھی علمی نقطۂ نظر سے کی جائے گی (مدیر)

نراج جیسا کہ خود نام سے ظاہر ہوتا ہے، اُس نظام کا نام ہے جس میں زندگی کی ہر شاخ میں انسان خود اپنا حاکم ہو اور اس پر کسی قسم کا زور نہ ڈالا جائے کہ وہ کسی خاص کام کو کرے یا نہ کرے، کوئی خاص خیالات رکھے یا نہ رکھے۔ یہ فلسفہ جو خدائی کا بار انسانیت پر ڈالتا ہے بہت پرانا ہے۔ چین میں اسے ہم بہت زمانہ سے ایک تخیل کی صورت میں پاتے ہیں، ہندی کوتا فارسی شاعری میں اسکے عقیدے کثرت سے ملتے ہیں لیکن اس نے ایک علمی نظریہ کی حیثیت یورپ میں انیسویں صدی میں پائی، اور دو روسی Bakunin اور Kropotkin اس کے بانی پائے جاتے ہیں۔

Bakunin اور Kropotkin نے نراج کو ایک مستقل شکل اور صورت دے کر اُس کی خدمت تو ضرور کی، لیکن انہوں نے اُسے سیاسیات اور معاشیات پر محدود رکھا، نراج ایک مکمل فلسفہ ہے، جس کا تعلق صرف چند علوم یا زندگی کے کچھ حصوں سے نہیں اور اُسے کسی طرح سے محدود کرنا اول تو خود اُس کی صورت بگاڑنا ہے، دوسرے لوگوں کو غلط فہمی ہونے کا بھی ڈر ہے لیکن باکونن اور کروپٹکن کے سیاسی نظریوں میں نراج کے تمام بنیادی اصول موجود ہیں، اور اگرچہ ان سیاسی نظریوں کا صرف سرسری طور پر ذکر آئے گا پھر بھی ہم نراج کے عقیدوں کا بیان ان دونوں کے تخیل سے شروع کر سکتے ہیں۔

"آزادی، اخلاق اور انسان کی انسانیت" باکونن ایک جگہ کہتا ہے "اسی میں ہیں کہ وہ اچھا کام کرتا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ اُسے حکم دیا گیا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اُس کا اپنا تصور ہے، اُس کی خواہش ہے اور اسے اچھے کام سے محبت ہو" اس ایک جملے میں نراج کی تقریباً ساری تعلیم ہے، اور اس کے علاوہ جو کچھ کیا جاتا ہے وہ سب اس کی یا تو شرح ہے یا دلیل، اس خاص مسئلہ پر بحث بعد کو ہوگی، میں چاہتا ہوں کہ پہلے اس سے سیاسی اور معاشی نظریئے جو نکلے ہیں اُنکا مختصر ذکر کردوں۔

یورپ کے نراجی ریاست اور حکومت کے جانی دشمن ہیں وہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ ریاست انسان کی اخلاقی اور سماجی ضروریات پوری کرنے کے لئے تعمیر کی گئی ہے "ریاست" باکونن کہتا ہے "سماج نہیں ہے، وہ سماج کی صرف ایک تاریخی شکل ہے . . . تاریخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست ہر جگہ ظلم، زبردستی لوٹ مار مختصر لڑائی اور فتح، سے اُن خداؤں کی جنہیں لوگوں کی وہم پرستی نے بنایا ہے، شادی کا نتیجہ ہے" یعنی، معمولی الفاظ میں ریاست ہر جگہ سماج کے ایک حصہ کے فائدے کے لئے بنائی گئی ہے اور اپنی بے ایمانی سے حاصل کی ہوئی دولت اور حقوق محفوظ رکھنے کے لئے اس فرقہ نے ریاست کو ایک مذہبی چیز بنادیا ہے اور اپنی خواہشوں کو خدا کے احکام کی صورت دیدی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت سی عام فائدے کی باتوں کی مخالفت خدا کا نام لے کر کی جاتی ہے، مگر اس خاص بحث میں مذہب اور سیاست کے جو تعلقات رہے ہیں اُنکو الگ چھوڑکر بھی ایک نراجی ریاست اور اُن تمام اداروں کی مخالفت کرسکتا ہے جو انسان کو زبردستی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں سے قطع نظر کرکے جنہیں موجودہ نظام سے ظاہر طور پر فائدہ ہو رہا ہے اگر ہم ان دلیلوں کو آزمائیں جو بے غرض لوگ ریاست کی حمایت میں پیش کرتے ہیں تب بھی ریاست اپنے وجود کی ضرورت کافی طور پر ثابت نہیں کرسکتی کیونکہ اگر ہم اسکا اقرار بھی کرلیں کہ ریاست ایک اخلاقی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر بھی حکومت صرف کثرت رائے کے مطابق ہوگی، اور تعداد

میں کم جماعت کے حقوق غائب ہوجائیں گے، اور اگر ہم کو قلیل جماعتوں کی، یا ان لوگوں کی جو ہمارے خیالات سے اختلاف رکھتے ہیں کچھ بھی پرواہ ہے، اور آزادی کے ہم سچے طور پر قائل ہیں یعنی دوسروں کی آزادی ہمیں اتنی ہی عزیز ہو جتنی اپنی آزادی، تو ہم کو نراجی نقطہ نظر سے اتفاق کرنا ہوگا۔

یہ مسئلہ محض علمی یا کتابی نہیں، انگلستان جیسی مہذب ریاست میں پچھلی جنگ کے شروع میں جو لوگ فوج میں داخل ہونا، اور قتل کا جرم اپنے سر پر لینا نہیں چاہتے تھے ان پر بہت سختیاں کی گئیں، اور تقریباً سب کو جیلخانے بھیجا گیا۔ یہ لوگ بہت کم تھے، لیکن اسی وجہ سے یہ مثال اور زیادہ عبرت انگیز ہے، غریبوں اور امیروں، مزدوروں اور سرمایہ داروں کے جھگڑوں میں ریاست نے ہمیشہ امیروں اور سرمایہ داروں کا ساتھ دیا ہے۔ غرضیکہ تاریخ اور واقعات سے اسکا کافی ثبوت مل سکتا ہے کہ ریاست سماج کے ہر طبقے کا برابر خیال نہیں کرتی، اور انصاف اور انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ یا تو ایسی ریاست ہو جس میں حکومت کسی قسم کی زبردستی نہ کرسکے، یا کوئی ریاست نہ ہو۔ اور یہ وہی بات ہے جو نراجی چاہتے ہیں۔

یورپ میں نراجی نظریوں کا تعلق زیادہ تر سیاسیات سے رہا ہے، اور اُنکی نئی دنیا کا معاشی نظام انکے سیاسی نظریوں پر مبنی ہے۔ ریاست کی مخالفت تو وہ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ حکومت ظلم اور بے انصافی بہت کرتی ہے، لیکن اصل خیال اُنکا یہ ہے کہ ریاست اگر غائب بھی ہوجائے تو سارا جہان درہم برہم نہیں ہوجائے گا۔ انہیں انسان کی فطرت پر اور انسانیت پر اتنا بھروسا ہے کہ وہ محض اس خواہش کو کہ ایک خاص نظام ہو ایسی نظام کے قائم رکھنے کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اُنکا معاشی تخیل بھی اسی حسن ظن پر مبنی ہے۔ کروپوٹکن نے نراجی معاشیات کو اول تو اس امید پر منحصر کیا ہے کہ ہر شخص جو کسی چیز سے فائدہ اٹھائے گا اسی کے پیدا کرنے میں بھی مدد کرے گا، دوسرے اس خیال پر کہ جب ریاست نہ ہوگی اور زبردستی نہ کی جائے گی تو لوگ ایک دوسرے کی مدد کرنے پر خوشی سے آمادہ ہوجائیں گے اور سائنس کی

ترقی پیداوار کو اتنا آسان کر دے گی کہ ذرا سی محنت سے سماج اپنی ضروریات پوری کر سکے۔

اب ہم اُس سوال پر پہنچ گئے ہیں جو نراج کی بنیاد ہے۔ انسانیت میں یہ صلاحیت، انسان کی طبیعت میں انصاف اور سچائی کی محبت اور اعتدال اس قدر موجود ہیں یا نہیں کہ وہ بغیر کسی کے کہے اور بغیر کسی سے ڈرے دوسروں کا خیال رکھے؟ نراج کے جو مخالف ہیں انکو یقین ہے کہ بغیر پولیس اور فوج کے لوٹ مار اور قتل و خون کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ نراجی برخلاف اسکے کہتے ہیں کہ ریاست کے ساتھ وہ تمام اندھیر غائب ہو جائیگا جو آج کل ہر شریف انسان کو شرمندہ کرتا ہے۔ دنیا میں بڑی بڑی جنگیں صرف ریاست کی وجہ سے ہوتی ہیں مثلاً پچھلی لڑائی میں مشکل سے ایک یا دو جرمن اور فرانسیسی مل سکتے تھے جنہیں خود بخود ایک دوسرے سے اتنی نفرت ہو کہ وہ قتل پر آمادہ ہو جائیں لیکن جرمن اور فرانسیسی ریاستوں نے مل کر ہزاروں بیگناہ لوگوں کا خون کرایا۔ ریاستیں اپنی رعایا کو ہر دوسری قوموں سے نفرت کرنا سکھاتی ہیں، وہ شریف لوگوں کو دھوکا دیکر اُن سے ایسی حرکتیں کراتی ہیں جو وہ خود کرنے پر کبھی راضی نہ ہوتے، اور اگر ریاست نہ ہو اور ہر شخص اپنی حرکتوں کا ذمہ دار بنا دیا جائے تو اوّل تو اس قدر باقاعدہ جنگ و جدل ہی ناممکن ہو جائے گا، دوسرے لوگوں میں اسکا احساس پیدا ہو جائے گا کہ انکی انسانیت کا تقاضا امن اور شانتی سے زندگی بسر کرنا ہے۔

ریاستیں ثواب کے نام سے جو گناہ کراتی ہیں اُنکا علم ہر شخص کو ہے۔ لیکن اس نتیجہ پر عام طور سے لوگ اسی وقت پہنچ سکیں گے کہ نراج کے سوا اور کوئی نظام ممکن نہیں، جب یہ ثابت ہو جائے گا۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ باکونن اور کروپوٹکن نے نراج کے اس مسئلہ پر کافی توجہ نہیں کی، اور یہی اُنکی تعلیم کی ایک بڑی کمزوری ہے۔ جہاں تک وہ موجودہ نظام پر اعتراض کرتے ہیں انکی دلیلوں سے انکار کرنا ناممکن ہے۔

مگر یہ خامی ان دونوں کے نظریوں کی ہے۔ نراج پر دراصل اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا، اور اگر آپ اجازت دیں تو میں پہلے سیاسیات میں اور پھر زندگی کے اور اہم پہلوؤں میں

میں یہ دکھانے کی کوشش کروں کہ نراج کے سوا اور کوئی ترقی کا طریقہ ہی نہیں، اور انسان کو اچھے کام کی طرف مائل کرنا اسی وقت ممکن ہے جب اُسے برے کام کرنے کی بھی آزادی دیدی جائے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں اپنی ترقی اور بہبودی کا سرچشمہ صرف انسان خود ہو سکتا ہے اور وہ بھی صرف اپنی عقل، اپنے تجربہ اور اپنے دل کے ذریعہ سے۔

انگلستان میں شراب کی دوکانیں صرف مقررہ وقت پر کھل سکتی ہیں، اور اگر کوئی شخص رات کو سڑک پر نشہ میں پایا جائے تو اُسے پولیس والا فوراً کوتوالی پہنچا دیتا ہے۔ فرانس میں شراب کی دوکانوں کے کھلنے اور بند ہونے کے بارے میں کوئی قید نہیں، اور اگر کوئی شخص نشہ میں سڑکوں کی سیر کرے یا کسی نالی کو اپنا بستر سمجھے تو پولیسمین کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ انگلستان میں پولیس ہمیشہ ایسی شراب کی دوکانیں بند کرتی اور انکے مالکوں کو کچہری میں پیش کرتی رہتی ہے جو اوقات کی پابندی نہیں کرتے، اور فرانس میں ایسی دوکانیں خودبخود بند ہو جاتی ہیں۔ انگلستان میں رات کو بہت سے لوگ مست گھومتے ہوئے ملتے ہیں، فرانس میں صرف کبھی کبھی، اور وہ بھی اکثر دوسرے ملکوں کے لوگ ہوتے ہیں، ایک اور مثال لیجئے، روس میں بولشیوک جوا کھیلنا بند کرنا چاہتے تھے، پولیس نے بہت کوشش کی، قانون نے بہت سختی، لیکن اسکا نتیجہ کچھ نہ ہوا، ریاست عاجز آکر خود جواری بن گئی اور بہت سی ایسی عمارتیں بنا دیں جہاں بغیر کسی روک ٹوک کے آکر جوا کھیل سکتے تھے۔ اس حرکت نے جوا تو بند نہیں کیا لیکن جواریوں کی تعداد بہت کم ہو گئی۔

میں ان مثالوں سے یہ نتیجہ نہیں نکالتا ہوں کہ اگر انسان آزاد ہو جائے تو وہ خودبخود اپنی بری عادتیں چھوڑ دیگا لیکن ان مثالوں کو اگر ہم اور چند تحریکوں کے ساتھ دیکھیں جو تاریخ سے ثابت ہوتی ہیں تو ہم کو یہ معلوم ہوگا کہ ہر انسان میں ایک نراجی رگ موجود ہے جو اُسے ہر قسم کی زبردستی اور جبر کی چاہے وہ اخلاقی ہو چاہے سیاسی، مخالفت پر آمادہ کر دیتی ہے۔ اس کی مثالیں بہت سی مل جائیں گی، خاص طور سے مذہبوں کی تاریخ میں اور مذہب میں اگر نئے

نظام کی پرانے سے لڑائی ہوتی ہے، اور اس لحاظ سے نئے مذہب پر ایمان لانا محض نراجی گنا نہیں کہا جا سکتا تو اسکے علاوہ انسان میں اور ایک خاصیت ہے جو اُسے نراجی بناتی ہے، اور یہ عشق ہے۔

آپ کو یورپ کے لوگوں کی اخلاقی آزادی پر حیرت ہوتی ہے، لیکن آپ کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ صدیوں کی لڑائی کا نتیجہ ہے۔ عیسائی مذہب مرد اور عورت کے تعلقات کے معاملہ میں اسی قدر سخت ہے جتنا اور مذہب بلکہ اوروں سے زیادہ، اور آج کل کی آزادی عشق کے سماج کا پھل ہے۔ اس زمانہ کی حالت کو بہت اچھا ثابت کرنا ممکن ہے، لیکن اسی سے ہمیں سبق لینا چاہئے۔ یورپ کی اخلاقی آزادی، اگر آپ اُس کے اوپر جو میل ہے اُسے ہٹا کے دیکھیں، تو جوانی کی بڑھاپے کے خلاف، نئی جوشیلی زندگی کا پرانے قانونوں اور قاعدوں کے خلاف بغاوت کا اعلان ہے۔ یہ بغاوت یورپ میں صدیوں ہوتی رہی ہے، اس زمانہ میں وہ اپنی فتح کی خوشی میں مست ہے جو وعدے اُس نے پہلے کئے تھے، جو امیدیں اُس نے شاعری، گیت اور اپنے اعمال سے دلائی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں لیکن اسکی وجہ ضروری ہے اور اسکا علاج سختی اور زبردستی نہیں۔ عشق کے اس دریا کے پانی کو ہم روک نہیں سکتے۔ لیکن اس سے نہریں کاٹ کر ہم اپنی اخلاقی سرزمین کو زرخیز بنا سکتے ہیں اور ہر طرح سے اسے اپنے لئے مفید۔

میرا مقصد یہ کہنا ہے کہ عشق، اُسے آپ عشق مجازی کہئے یا محض حماقت، انسان کی طبیعت میں موجود ہے، اور اس عشق پر کسی قسم کا راج قائم کرنا اگر امکان کے باہر نہیں تو بہت مشکل ہے۔ یورپ کی اخلاقی زندگی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ قید مقرر کرنا غلط ہے کیونکہ جیسے دریا کا راستہ رُک جائے تو پانی ہر طرف پھیل جاتا ہے اور ایک دریا کی دس ندیاں بن جاتی ہیں اور نقصان بھی دس گونہ ہوتا ہے اسی طرح اگر انسان کی آزادی پر بیجا قید مقرر کی جائیگی تو اُس سے سماج اور انسان دونو بلا میں مبتلا ہو جائیں گے، میں نے جو

مثالیں دی تھیں، اُن میں انسان کی نراجی رگ اسقدر نہیں تڑپتی ہے، مگر عشق ہر انسان کو سراسر نراجی بنا دیتا ہے، اور یہ اگر نراج کی خوبی کی کافی دلیل نہیں تو اس سے کم از کم یہ تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ انسان کی طبیعت میں نراج کی طرف رجحان موجود ہے، اور دیکھنے میں اگر یہ کم معلوم ہوتا ہو، پھر بھی اس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ صدیوں پرانے نظام کو درہم برہم کردے۔

یہ نراجی رجحان صرف شرابیوں، جواریوں اور عاشق مزاجوں میں نہیں یہ ہر انسان میں پایا جاتا ہے جس میں ذرا سی بھی جرأت ہو۔ اور اگر میں کہتا ہوں کہ سوا نراج کے اور کوئی طریقہ انسان کو سیدھے راستے پر لانے اور اُسکی ترقی ممکن بنانے کا نہیں تو میں اپنی رائے کی تائید میں بڑے بڑے نام پیش کرسکتا ہوں۔ لیکن اسی سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ انسان کی فطرت پر جو ایک ساتھ دنیا کی تمام بیماریوں کی جڑ ہے، اور ان تمام بیماریوں کی دوا بھی ہم کچھ غور کریں۔

انسان کی فطرت میں، میرا خیال ہے، اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے دو خاصیتیں ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور انسان کا مزاج اسی کے مطابق طے پاتا ہے کہ ان دونوں خاصیتوں میں سے اُسکی طبیعت میں کون کی غالب ہے۔ ان خاصیتوں میں سے ایک تو حکومت کی ہے جو انسان کو دوسروں پر حکمرانی کرنےکی طرف رغبت دلاتی ہے، دوسری اس کے برعکس محکومیت کی ہے، جو انسان سے دوسروں کی تابعداری اور اُنکے احکام بجالانے پر کفایت کراتی ہے، اور انسان کو خود مختاری کے ناقابل بنا دیتی ہے۔ یہ دونوں خاصیتیں ہر شخص میں موجود ہوتی ہیں۔ ہر شخص ایک حد تک حاکم بننا چاہتا ہے، اور ایک حد تک محکوم ہونے پر راضی بھی ہوتا ہے، تاریخ انسان کی اور قوموں کی بھی، دراصل ان دو خاصیتوں کی لڑائی کی تھا ہے۔ ہر قوم میں ایک فرقہ نے کوشش کی ہے کہ راج اس کے ہاتھ میں رہے، اور اسے مستقل بنانے کے لئے اُس نے چاہا ہے کہ اپنے لوگوں میں حکمرانی کی خاصیت پیدا کرے اور عام قوم کو اُس نے، کہیں مذہب کے نام سے، کہیں اخلاق کے، کہیں عقل کے، خود میں یہی محکومیت کی خاصیت

پیدا کرنیکی تعلیم دے رہے ہیں۔ اسے آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، انگریز پہلے ہمیں وفاداری کے نام سے اطاعت پر مجبور کرتے تھے پھر انہوں نے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی غلامی میں ہم کو زیادہ فائدہ ہے، اب یہ کہتے ہیں کہ جمہوریت اور عام طور سے سیاسی خودمختاری کوئی خاص معنی نہیں رکھتی۔ لیکن اُنکے ہندوستان میں حکومت کرنیکی اصل وجہ یہ ہے کہ خود میں حاکم ہونے کی قابلیت اور اس لئے ضرورت دیکھتے ہیں، اور ہم نے جو صدیوں کی غفلت سے اپنی طبیعت میں مجہولیت پیدا کر لی ہے اس سے وہ بخوبی واقف ہیں، انکا راج ہندوستان میں اسوقت تک رہے گا جب تک ہم اپنی طبیعت میں خودمختاری اور حکومت کا مادہ نہ پیدا کرلیں اور غلامی ہمارے لئے فطرتاً ناممکن اور ناقابل برداشت نہ ہوجائے۔

لیکن ہماری تربیت اس طریقہ سے ہوئی ہے، اور ہم پر اثر آج کل ایسے پڑ رہے ہیں کہ غلامی بہت دنوں تک ہماری قسمت میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے یہ مجہولیت کوئی مستقل چیز نہیں یعنی ہر قوم میں یہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، اور قومی رہنماؤں کا ہمیشہ یہ مقصد رہا ہے، اور انکی خدمت یہی ہوتی ہے کہ اپنی قوم سے اس مجہولیت کو دور کریں اور اسکی جگہ اس کے برعکس جو خاصیت ہے اُسے زندہ اور کارگر بنائیں۔ اس کام میں انہیں سب سے زیادہ دقتیں جو پیش آتی ہیں وہ اُن لوگوں کی مخالفت ہے جو قوم میں حکمراں ہوتے ہیں، وہ چند لوگ جنہیں ساری قوم کی حکومت کرنیکی خواہش ایک مفت کی دولت کے طور پر مل جاتی ہے اور دوسرے اُن لوگوں کی بزدلی جن میں مجہولیت رفتہ رفتہ انکی فطرت پر بالکل غالب آجاتی ہے، جو حکمراں ہوتے ہیں وہ اسکا خوف دلاتے ہیں کہ قوم یا ملک کا سارا نظام غائب ہوجائیگا، زندگی ناممکن ہوجائے گی، لوگ ایک دوسرے کو جانوروں کی طرح چیرنے پھاڑنے لگیں گے، جو لوگ مجہول ہوتے ہیں انکی آنکھیں نئی روشنی سے گھبراتی ہیں، اور انہیں اپنے اوپر کافی اعتماد نہیں ہوتا ہے نراج بھی انہیں کوششوں میں شامل ہے جو روشن خیال لوگوں نے اپنی قوم کو، یا اپنے تمدن کو مجہولیت کی نیند سے جگانے کیلئے کی ہیں۔ اس میں وہی تمام خوبیاں ہیں جو نئے مذہبوں میں ہوا کرتی

ہیں۔ نراج کی تعلیم دنیا کے تمام مذہبوں میں موجود ہے، لیکن اسکی کمزوری یہی ہے کہ اس نے ہمارے زمانہ میں اپنا نیا جنم ایک عظیم شخصیت میں نہیں لیا اور اس کی اشاعت کافی زور شور سے نہیں ہو سکی۔

میں نے مضمون کے شروع میں عرض کیا تھا کہ نراج خدائی کا بار انسانیت پر ڈالتا ہے اور باکونن کا یہ قول بھی: "آزادی، اخلاق اور انسان کی انسانیت اسی میں ہے کہ وہ اچھا کام کرتا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ اُسے حکم دیا گیا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اُسکا اپنا تصور ہے اس کی خواہش ہے، اور اُسے اچھے کام سے محبت ہے"۔ میں نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی تھی کہ انسان میں ایک نراجی رگ موجود ہے، اور اس سے زیادہ کارگر عشق کا مادہ، جو اُسے رسم و رواج، قاعدوں اور قانونوں کا دشمن بنا دیتا ہے۔ یورپ کی زندگی سے میں نے ان دونوں کی مثالیں اور ایک طرح سے ثبوت بھی دیا تھا۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو نراجی آدرش یا نصب العین کو اپنے سامنے رکھکر ہندوستان کی موجودہ حالت پر کچھ اعتراض کروں، اس سے نراجی اصولوں کی ایک شرح بھی ہو جائے گی۔ اور میرا جو نقطہ نظر ہے وہ بھی آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔

ہر نئے اصول کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک دعوے کا، دوسرا انکار کا۔ نراج ایک طرف تو ایک نیا نظام پیش کرتا ہے، دوسری طرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ موجودہ نظام اس کے مہیا ہے اس قابل نہیں معلوم ہوتا کہ وہ قائم رکھا جائے جیسا کہ باکونن کے قول سے ظاہر ہوتا ہے نراج اُسی چیز کا قائل ہے جو آزاد انسان نے اپنے لئے پسند کی ہو، جو نظام ہو اخلاقی یا مذہبی اصول ہوں، اُن کے جائز اور فائدہ مند ہونے کا نراجی کو اُسی وقت یقین ہوتا ہے جب انہیں انسان نے اپنے تجربہ سے صحیح ثابت کیا ہو، اور اسکی خود کی خواہش ہو کہ وہ ان اصولوں کا پابند رہے۔ مثلاً نراج اُس نماز کو نماز نہیں سمجھتا جو عذاب کے ڈر سے پڑھی جائے، اُن لوگوں کو جو سماج یا برادری کے دباؤ سے نماز پڑھتے ہیں۔ وہ بزدل اور جھوٹے سمجھتا ہے اور جو لوگ

دکھاوے کیلئے ، انہیں مکارزاور اسی لئے کہ لوگ بزدلی یا زبردستی کی نماز نہ پڑہیں وہ ہر شخص کو اجازت دینا چاہتا ہے کہ وہ چاہے نماز پڑہے یا نہ پڑہے ۔ اگر نماز سے دراصل اخلاقی اور روحانی فائدہ ہوتا ہے ، تو لوگ خود ہی پڑہیں گے اور اگر نہیں ہوتا تو نماز نہ پڑھنا چاہئے ، اس میں زبردستی کرنا لوگوں سے جھوٹ بلوانا ہے ، اور ایک اچھی چیز سے لوگوں کی طبیعت ہٹانا کیونکہ اس سے کوئی نہیں انکار کرسکتا ہے کہ نماز وہی بہترین ہوتی ہے جو دل کی آرزو پڑہوائے ہم پر آج کل مجبولیت اسقدر غالب ہے اور اخلاقی جرات ایسی ہماری طبیعت سے غائب ہوئی ہے کہ سوا احکام بجالانے کے زندگی کا دوسرا طریقہ ہمارے تصور میں نہیں آتا میں سیاسی معاملات کا بھی یہاں ذکر نہیں کرنا چاہتا ، نہ آج ایسا بلند آدرش ہے کہ اس غلامی کی حالت میں اسکا خیال کرنا فضول ہے ، اس کے علاوہ سیاسی زندگی بذات خود اتنی اہمیت نہیں رکھتی ، وہ صرف ایک آئینہ ہے جس میں اخلاقی اور مذہبی زندگی کی ایک شکل نظر آتی ہے ، اور انہیں دونوں کی طرف میں آپ کو زیادہ توجہ دلانا چاہتا ہوں ۔

زندگی کا اصل مرکز انسان ہے ، ہر رسم ، قاعدے ، قانون کے جانچنے کا طریقہ صرف ایک ہی ، اور وہ یہ کہ اس سے انسان کو وہ فائدہ حاصل ہو جو کسی قاعدے وغیرہ کا مقصد بتایا جاتا ہو ، اور جب رسمیں اور قاعدے اور قانون اپنا مقصد نہ پورا کرسکیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم انکو دور کریں اور بہتر چیزیں دریافت کریں ، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ انسان اپنی زندگی آسان اور اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے قاعدے اور قانون بناتا ہے اور جب یہ مطلب پورا ہوجاتا ہے تو وہ ان بندوں کو توڑ کر باہر نکل آتا ہے ، اور اگر ترقی کرنا اسکا مقصد ہے تو اُسے باہر نکل آنا چاہئے ۔ یعنی جیسے بچہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر چلتا ہے ، کہ اُسے بعد کو کسی سہارے کی ضرورت نہ رہے ، ویسے ہے انسان اپنے لئے قاعدے اور قانون بناتا ہے تاکہ انکی ضرورت نہ رہے ، بچہ باپ کے سپرد کیا گیا تھا کیونکہ زندگی ایسی تھی کہ بچہ اپنی حفاظت نہیں کرسکتا تھا ، لیکن اس زمانہ میں جب موت کے اندیشے کم ہیں یہ حقوق باپ سے سماج کو واپس لے لینے

چاہئیں، کیونکہ باپ کا اثر ہمیشہ لڑکے پر اچھا نہیں ہوتا، خاندان بھی حفاظت کے لئے بنا تھا، اب اس کی ضرورت نہیں، اس لئے خاندان بھی ضروری نہیں، میں یہ جانتا ہوں کہ خاندانی محبت بھی کوئی چیز ہے لیکن خاندان کے ٹوٹ جانے سے اس محبت پر کوئی اثر نہ پڑے گا اور خاندان کی وجہ سے جو ان پر قیدیں مقرر ہو جاتی ہیں وہ نہیں رہیں گی اور وہ اپنی زندگی بہتر طور پر بسر کر سکے گا۔ آج کل ہندوستان میں بہت خاندان ایسے ہیں جہاں محبت کے سوا اور کوئی وجہ رشتہ داروں کو ایک دوسرے کی طرف نہیں ملاتی لیکن ہزاروں ایسے بھی ہیں جن میں ایک ایماندار کی محنت سے کاہل نکمے عزیز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہندوستان میں ایک زمانہ میں ضروری محسوس کیا گیا تھا کہ عورتوں کی حفاظت کیجائے اور لوگوں کو عام طور سے صلاح دی گئی تھی کہ وہ عورتوں کو گھر کے اندر رکھیں عورتیں اب روپیہ پیسہ کی طرح چرائی نہیں جاتیں اور نہ انکے لوٹ لئے جانیکا کوئی خاص خطرہ ہے لیکن پردہ ایک ایسا قانون بن گیا ہے کہ اُسے توڑنا خدا کی وحدت سے انکار کرنے سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔ جہولیت نے ہم میں اپنی عورتوں پر اور اپنے اوپر بھروسہ رکھنے کا اتنا بھی مادہ نہیں چھوڑا کہ عورتوں کو تازی ہوا میسر ہو سکے۔ ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن یہ ہمارے امکان سے باہر ہے کہ اُس خدا پر جس نے ہمیں یہ دین بخشا ہے اعتماد کر سکیں۔ سوا اس کے کہ عورت پردہ میں مکان کے اندر بند رکھی جائے صحیح اخلاق قائم رکھنے کی اور کوئی صورت ہمیں نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر اسلام اتنی اخلاقی طاقت بھی نہیں دے سکتا اور ہم میں مذہب اتنی جرات بھی نہیں پیدا کر سکتا تو آخر مسلمان ہونے سے کیا فائدہ۔

پہلے آپ اس پر غور کیجئے۔ پھر یہ دیکھئے کہ تربیت ہمارے یہاں کس قسم کی ہوتی ہے بچے وہ اچھے سمجھے جاتے ہیں جو کہنا مانیں۔ لڑکے وہ جو کہنا مانیں۔ جوان وہ جو کہنا مانیں مجہولیت کے سوا اور کوئی قابل تعریف خاصیت ہمارے معیار کے مطابق نہیں، وہی مجہولیت جو انسانیت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ ہمارے سماج کے جو قانون ہیں انہوں نے بجائے

اس کے کہ قوم کو سدھاریں، لوگوں کو ہمت دلائیں، اپنی زندگی، اپنے خیالات سے دوسروں کا راستہ روشن کریں، چند اصول بنا لئے ہیں جن کی پابندی وہ بہت سختی سے کراتے ہیں اور جو اُن کے احکام پر نہ چلے اُس پر یا تو کفر کا فتویٰ لگتا ہے یا ناشکری، سنگدلی اور بے مروتی کا، باپ کی اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ اُسکی رائے کے مطابق پیشہ اختیار کرو اور جہاں وہ کہے وہاں شادی کر لو۔ مذہبی رہنما مسلمان اُسے کہتے ہیں جو سچ اور جھوٹ اور صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا اُنکے سپرد کر دے۔ اور مذہبی معاملات میں جہاں تک ممکن ہو سمجھ سے کام نہ لے۔ اسکا نتیجہ ایک طرف یہ ہوا ہے کہ سوا نوکری اور وکالت کے کوئی پیشہ نہیں رہا۔ ہزاروں مسلمان یہی سوچتے رہتے ہیں کہ خدا نے آخر اُنہیں کیوں پیدا کیا، اور ان سے زیادہ ایسے ہیں جو پچھتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی سعادتمندی میں اپنی زندگی خراب کی۔ دوسری طرف کا منظر اور بھی شرمندہ کرتا ہے۔ جہاں ایک زمانہ میں مذہب کے جوش نے عقل اور دماغ کو روشن کیا تھا وہاں آج عقیدوں کے جھگڑے، کفر کے فتوے لوگوں کو دین سے مایوس کر رہے ہیں، جہاں مسلمان کی پہچان ایک حیرت انگیز جرات اور پرنور دل تھا وہاں آج داڑھی اور لال ٹوپی اور ٹخنے سے اونچا پاجامہ ہے۔

ان مسئلوں کو چھوڑیئے، یہ ایک حد تک اب پرانے زمانے کی باتیں ہوتی جا رہی ہیں۔ اب ہمارا فرض یہ ہے کہ آئندہ کی فکر کریں، اپنی طبیعت مضبوط کریں اور ہمت سے کام لیں۔

ہر شخص کے لئے اتنی آزادی ضروری ہے کہ وہ اپنے تجربے سے کام لے سکے، اور اس آزادی کو چھین لینا صرف بے انصافی نہیں بلکہ بزدلی ہے۔ اگر ہم ایک پیشے کو اچھا سمجھتے ہیں تو ہم کو یہ نہ چاہیئے کہ کسی کو اُسکے اختیار کرنے پر مجبور کریں۔ ہمیں اپنی اور دوسروں کی سمجھ پر اتنا اعتماد لازم ہے کہ ہم امتحان کے لئے تیار رہیں۔ پیشہ اچھا ہے تو اُسے خود ہی لوگ اختیار کریں گے اگر اسلام ایک سچا مذہب ہے تو اُسے لوگ خود ہی قبول کریں گے۔ آپ اپنی زندگی کو اُس کی اچھائی کا ثبوت بنائیے۔ زندگی کے عام طور سے، اور سچے دین کے خاص طور پر دو دشمن ہیں

جھوٹ اور یک رنگی . یک رنگی اُس وقت پھیلتی ہے جب عقیدے تنگ اور بے لچک ہو جاتے ہیں، اور ہر ایک کو اسکا موقع نہیں ملتا کہ وہ اپنی طبیعت اور ذاتی روحانی تجربہ کے مطابق اپنے دین کو سمجھے اور اپنے خدا کو پوجے . جھوٹ اُس وقت جب مذہبیت کا معیار اعمال نہیں بلکہ عقیدے دل نہیں بلکہ زبان ہو جاتے ہیں، یعنی لوگوں پر قاعدوں کی پابندی فرض کر دی جاتی ہے ظاہر پر زور دیا جاتا ہے اور باطن کا خیال نہیں کیا جاتا - دل تک پہونچ کسی کی نہیں، مذہب جو زبردستی سے ایک شکل پر قائم رکھا جائے اور جسمیں ذاتی تجربے اور امتحان کو دخل نہ ہو وہ اس عمارت کی طرح ہے جو باہر سے بنتی اور اندر سے گرتی جاتی ہے ۔

نراج کو یہ خاص فخر حاصل ہے کہ اُس نے مذہب کی بنیاد ڈالنے میں مدد کی ہے اور رہے اپنی اصلی حالت پر قائم رکھنے کا واحد ذریعہ رہا ہے، ہر مذہب نے شروع میں ایک نراجی بغاوت کی صورت اختیار کی ہے ، قوم بدھ کا دین ہندو دھرم کے سخت اور مذہبی نقطۂ نظر سے بے معنی اور نقصان دہ قانون اور رسموں کے خلاف ایک بغاوت تھی . حضرت عیسیٰ کو اگر نراجیوں کا بادشاہ کہا جائے تو میرے خیال میں بالکل صحیح ہوگا . بدھ کے مذہب اور عیسائیت کی طرح اسلام بھی ایک پرانے مردہ نظام کے خلاف بغاوت تھی . ان تینوں مثالوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ذاتی روحانی تجربہ، پرانی تعلیم کے بند توڑ کر نکلا ، اور جہاں کھنڈر اور ویرانے تھے وہاں ایک نئی زندگی پھونک دی . بڑے پیغمبروں کو چھوڑیے . چھوٹے پیغمبر بھی ہر مذہب میں پیدا ہوتے ہیں، اور تمام مذاہب کے بانیوں کی طرح نراجی ہوئے ہیں . مولانا روم باغی تھے، نراجی تھے . انہوں نے اپنے زمانہ کے تنگ نظر اور عام طور سے کچے یا ادھ پکے مسلمانوں کے مذہب کو اپنے لئے ناکافی پایا اور بغاوت کا فرض ادا کیا، اس کا نتیجہ نکلے . ہمارے اور اسلام کے لئے کس قدر اچھا ہوا، اسلام کو ایک سچا مسلمان ملا جس نے اسلام سے پورا فائدہ اٹھایا، ہم کو ایک ، یادگار ، ایک بانسری کی حکایتیں ایک دل کا درد۔ ہندوستان میں کبیر صاحب میرے خیال میں سب سے بڑے نراجی گذرے ہیں، انہوں نے بھی مسجد اور مندر سے ملا کر انسان کو اپنے خدا تک پہنچنے کا ایک اور راستہ بتایا، انکے تجربے نے انہیں سمجھایا

تھا، انکا پریم کا پیغام ایک ساتھ نراجی بھی ہے اور ایسا راج بھی جسکا جواب نہیں۔

نراج کا جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، مذہب پر یہ اثر رہا ہے کہ اس نے لوگوں کو محض پابندی اور مجہولیت سے روکا ہے اور ذاتی تجربے کو سچائی اور سچے دین کا معیار مقرر کیا ہے، نراجیوں نے ظاہری باتوں، دکھاوے کے مذہب کی طرح طرح سے مخالفت کی ہے، اور اس کا مذاق بھی اڑایا ہے اس سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ وہ حقیقت میں خود مذہب کے خلاف ہیں یا اپنی طرف سے ایجاد کرنا چاہتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ذاتی روحانی تجربہ مذہب کی اصل کو انکے سامنے ایسا روشن کر دیتا ہے، اور وہ اپنے آنند میں ایسے ڈوبے ہوتے ہیں کہ نقلی مذہب کو نہیں برداشت کر سکتے، اور انکی سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ کیوں بھٹکتے پھرتے ہیں جب اُن میں خود ہی سب کچھ موجود ہے۔

کبیر صاحب ایک موقعہ پر کہتے ہیں۔

کانکر پاتھر جوری کے مسجد لیں چنائے　　　تا چڑھ ملا بانگ دے، کیا بہرا ہوا خدائے

یہاں کبیر صاحب اسلام کی مخالفت نہیں کر رہے ہیں، مؤذن کی اذان اُسی وقت آدمی سن سکتا ہے جب اس نے دل کی اذان سنی ہو جس نے دل کی اذان نہیں سُنی اُس کے لئے مسجد مندر سب بیکار ہیں۔

یہ دکھانے کیلئے کہ اُن میں کسی قسم کا تعصب نہیں، کبیر صاحب ہندو مسلمان دونوں پر ساتھ اعتراض کرتے ہیں۔ جہاں وہ مسلمانوں پر خدا کو بہرا سمجھنے کا الزام لگاتے ہیں وہاں وہ ہندوؤں سے کہتے ہیں۔

پتھر پوجے ہری ملے تو میں پوجوں پہاڑ

اخلاق میں نراج پیدا کرنا یعنی اخلاقی اصول کے لئے بھی ذاتی تجربہ کو شرط بنانا خیالات اور عقیدوں کے نراج سے زیادہ مشکل ہے اور عام طور سے لوگ اس سے ڈرتے بھی زیادہ ہیں۔ لیکن مذہب کا ثبوت صرف اخلاق سے مل سکتا ہے، اور جو ایمان میں صرف ذاتی تجربے کو مانتا ہو

انسے اخلاق میں بھی اسی کی تعلیم دینا چاہئے۔

حضرت عیسیٰ کے پاس ایک مرتبہ لوگ ایک عورت کو لائے، اور کہا کہ زناکاری میں پکڑی گئی، بتائیے اسے کیا سزا دی جائے، حضرت عیسیٰ نے پوچھا، زنا کی کیا سزا مقرر ہے، انہوں نے کہا، پتھروں سے مارنا، حضرت عیسیٰ نے کہا اچھا، تم میں سے جو بیگناہ ہو اُس سے کہو کہ پہلا پتھر پھینکے، لوگ گھبرائے اور شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حضرت عیسیٰ زنا جائز سمجھتے تھے، یہ بھی نہیں کہ وہ ایک عورت کو بچانا چاہتے تھے، اس سے انکا مقصد تھا دوسروں پر نکتہ چینی کو روکنا، جب تک کہ ہم خود اپنے سے وہ عیب دور نہ کرسکیں۔ یا یہ کہئے ہر عیب دور نہ کرسکیں۔ اخلاقیات میں بڑا سوال اسی زبردستی اور اندھیر کو روکنا ہے جو لوگوں کو دوسروں کے عیب پر اعتراض کرنے اور انکو سزا دینے کا حق دیدیتا ہے اگر وہ اپنے گناہ اور اپنے عیب کامیابی سے چھپا سکیں: حضرت عیسیٰ نے سزا کا حق اُسے دے کر جو خود معصوم ہو، ہر شخص سے یہ کہا ہے کہ دوسروں کے عیب کو دیکھکر اُسے اپنے یاد آنا چاہئیں، اور ہر شخص کو اپنی اخلاقی بہتری کا ذمہ دار بنایا۔ اس سے آزادی بھی آزادی بھی قائم رہتی ہے، اور اخلاقی اصولوں میں وہ جان آجاتی ہے جس کے بغیر وہ سوا ایک بےمعنی قید کے کچھ نہیں۔

"اس سے جو بے گناہ ہو کہو کہ پہلا پتھر پھینکے" یہ قول ایک دم میں ہمارے لئے جرم و سزا، گناہ و ثواب، قانون اور قاعدے سب مٹا دیتا ہے، عقل پریشان ہوجاتی ہے صرف ایک دل دھڑکتا رہتا ہے، اور جتنا اس پر غور کرتے ہیں اتنے ہی ہم اس کے اقرار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ایک کامل استاد نے سچا سبق سکھایا۔

آپ خود دیکھئے کہ اسکا کس کس طرح اثر پڑسکتا ہے۔ مذہبوں کا بیر یہ مٹا دے گا، کیونکہ مسلمان کو عیسائی مذہب اور عیسائیوں پر اعتراض کا حق اسی وقت ملیگا جب وہ اس کا دعوےٰ کرسکے کہ وہ کامل مسلمان ہے، اور اُس نے اپنا حق پورا ادا کیا ہے۔ ہر طرف زندگی

کہ ہر پہلو میں لوگوں کی نظریں خود اپنے اوپر پڑنے لگیں گی انکی آنکھوں کے سامنے سے پردہ اُٹھ جائیگا، اور انکے دلوں میں تمناؤں اور آرزوؤں کا ایسا ہجوم ہو جائے گا کہ دوسروں پر پتھر پھینکنے کی اُن میں نہ خواہش رہے گی نہ جرات۔

"اس سے جو بیگناہ ہو کہو کہ پتھر پھینکے"، نراجی کو اپنی اخلاقی تعلیم بیان کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی الفاظ نہیں مل سکتے، اور در اصل نراج کی ساری اخلاقی تعلیم اسی جملہ میں بہترین طور پر بیان کی گئی ہے، اس کے بعد یہ اندیشہ بھی باقی نہیں رہتا کہ نراج بے اعتدالی کی تعلیم دیتا ہے، یا اخلاق کا دشمن ہے، اور یہ بھی صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ نراج وہ راج ہے جو دل کو سب سے زیادہ بھاتا ہے، انسان کو عجز، انکسار اور پریم پر مجبور کرتا ہے، اور بے شک صداقت کی سیدھی سڑک ہے۔

یہ مثالیں میں نے سب تاریخ سے دی ہیں، لیکن آپ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ اپنے سامنے مہاتما گاندھی کی ذات میں ایک عظیم الشان نراجی اور ستیاگرہ آشرم میں نراجی نظام کا ایک بہترین نمونہ دیکھ سکتے۔ مہاتما جی کی تعلیم وہی ہے جو سچے نراج کے عقیدوں کا معیار ہے، انہوں نے اپنے ضمیر کو، مذہب کا ثبوت اپنے ذاتی تجربے کو بنایا ہے۔ اس طرح سے انہوں نے مذہب پر دھبہ نہیں لگایا، نہ ایسی باتوں کو جھوٹ بتایا جو دوسروں کے دلوں کو سچی معلوم ہوتی ہیں، تنگ نظری کا الزام ان پر کوئی سمجھدار آدمی نہیں لگا سکتا۔ آپ کسی مذہب کی تعلیم پر اچھی طرح سے غور کیجئے، کسی مذہب کے اہم عقیدوں کو لیجئے اور مہاتما جی کی زندگی سے ثابت ہو جائے گا کہ وہ اُنکی پیروی کرتے ہیں، عیسائی کو ماننا ہوگا کہ وہ کامل عیسائی ہیں، ہندو کو کہ وہ کامل ہندو، مسلمان کو کہ وہ کامل مسلمان ہیں۔ اور یہ صرف اس وجہ سے کہ ان کا مذہب ذاتی روحانی تجربہ پر مبنی ہے، اور انہوں نے وہ درجہ حاصل کر لیا ہے جس پر پہنچ کر سب مذہب ایک میں مل جاتے ہیں، جیسے دنیا کے تمام دریا سمندر میں۔

ستیاگرہ آشرم میں وہ خاصیتیں پائی جاتی ہیں جو نراج ہر نظام میں پیدا کرنا چاہتا ہے،

آشرم میں صرف وہی لوگ جاتے ہیں جنہوں نے انسان کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ تھر پردرخت نہیں اگتے۔ اور یہ نصب العین ایک خاص طریقہ زندگی کا لازم بنا دیتا ہے، لیکن آشرم میں کسی قسم کی سختی نہیں پائی جاتی کسی قانون یا قاعدے کی پابندی پر لوگ مجبور نہیں کئے جاتے مہاتماجی کا یہ عقیدہ ہے کہ زبردستی ہر حالت میں ناجائز ہے، اور آپکا پورا یقین ہے کہ سچ رہے گا اور جو لوگ اس کی تلاش میں ہیں وہ اسے ڈھونڈلیں گے۔ اگر ہم رہبری کسی طرح سے کر سکتے ہیں تو وہ اپنی زندگی اپنے اعمال سے۔ یہی اصول آشرم کو چلا رہا ہے، یہی وہاں ہر ایک کو اپنے فرض ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور اسی وجہ سے ہم اسے ستیاگرہ آشرم بھی کہتے ہیں۔

میرا مطلب ان تمام مثالوں کے پیش کرنے سے یا نراج پر مضمون لکھنے کا یہ نہیں تھا کہ آپکے عقیدوں کی کمزوری سے آگاہ کروں، یا کسی طرح سے بے دینی پھیلاؤں، اسلام وہی ہے جو وہ تیرہ سو برس پہلے تھا۔ ہم بدل گئے ہیں اور بگڑ گئے ہیں، اسکی وجہ میرے خیال میں یہ رہی ہے کہ ہم نے اسلام کو ہمیشہ دوسروں کے ہاتھوں سے لیا، دوسروں کے کہنے سے مانا ہے، اور اسے کبھی اپنا مذہب بنانے کی کوشش نہیں کی، اسلام کی تعلیم سے ہم اسی وقت فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب وہ ایک طرح سے ہماری دریافت ہو، جب ہم مسلمان اس وجہ سے نہ ہوں کہ ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے، یا ہم سے کہا گیا ہے کہ اسلام دنیا کا بہترین مذہب ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اسلام ہماری وہ روحانی ضروریات پورا کرتا ہے جو اور مذہب نہیں کر سکتا، اور ہمارا دل ہمکو مسلمان ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ جبتک آپ سچے دل سے یہ نہ کہہ سکیں تب تک اس پر افسوس کرتے رہیئے کہ آپ مسلمان نہیں۔

نراج کی یہی تعلیم ہے، ایک عالیشان نراجی کے معصر ہونیکا فخر آپ کو حاصل ہے، نراجی نظام کا نمونہ بھی آپکے سامنے موجود ہے۔ اس سے فائدہ اٹھائیے اور اپنی انسانیت کا حق ادا کیجئے۔

روپیہ کی شرح مبادلہ

دوران جنگ میں شاید ہی کوئی ملک محارب یا غیر محارب، جانبدار یا غیر جانبدار ایسا بچا ہو جہاں غیر معمولی حالات اور اسباب کیوجہ سے انکا نظام تجارت اور نظام زر و مالیات تہ و بالا نہ ہوگیا ہو۔ جرمنی میں مارک کی قیمت اسقدر گھٹ گئی کہ کوڑیوں کے مول بھی کوئی نہ پوچھتا تھا۔ آسٹریا میں یہی حشر کردے کا ہوا، فرانس ابتک اپنے فرنیک کی قیمت مبادلہ کو پرانی شرح پر نہ لا سکا خود انگلستان جس کے اعتبار کا سکہ ساری دنیا پر بیٹھا ہوا ہے، اس اقتصادی زلزلہ سے محفوظ نہ رہ سکا اور اس کے اسٹرلنگ کی قیمت بھی بالآخر گھٹ گئی تھی، پھر غریب ہندوستان جو نہ صرف سیاسی بلکہ اس سے زیادہ معاشی معاملات میں برطانیہ کا ماتحت ہے، براہ راست شریک جنگ نہ ہونے کے باوجود کیونکر اپنے مالیات و نظام زر کو اس عالمگیر دھچکے سے محفوظ رکھتا! غرض دوران جنگ میں جو ابتری ملکی تجارت، مالیات اور نظام زر میں پیدا ہوئی وہ ناقابل بیان ہے، لیکن جنگ ختم ہوتے ہی تمام ملکوں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنے اپنے مالیات کو اور نظام زر کو اور اپنے اعتبار کو دوبارہ قائم کریں اس لئے کہ بغیر اسکے تجارتی ترقی ناممکن ہے اور اگر تجارت نہ ہو تو معاشی اور سیاسی حالت درست نہیں ہو سکتی چنانچہ اسی بنا پر حکومت ہند نے بھی ۱۹۱۹ء میں ایک کمیٹی مقرر کی کہ وہ ہندوستان کے مالیات اور نظام زر اور مبادلہ کی تحقیقات کرکے اس کی اصلاح کے لئے تجاویز پیش کرے اس کمیٹی کا مفصل ذکر بعد میں کیا جائیگا یہاں تمہیداً یہ بتلانا مقصود ہے کہ اس نے جو سفارشات کی تھیں انکو اختیار کرنیکی وجہ سے بجائے کسی فائدے کے حکومت ہند کو تقریباً پچاس کرور روپیہ کا نقصان اٹھانا پڑا، غریب ہندوستان کے خزانہ پر اتنا بڑا جوا کھیلنے کے بعد ہندوستان کی غیر ذمہ دار حکومت کو احساس ہوا غلطی کا اعتراف بھی دبی زبان سے کیا گیا لیکن پھر تحقیق حالات کے لئے چار سال تک نہ کوئی کمیٹی مقرر کی گئی نہ کوئی کمیشن، ہندوستانی قومی نمائندوں نے بارہا ایوان حکومت میں سر مارا، التجائیں کیں، منت اور

سماجت کی لیکن "رموز مملکت" جاننے والوں کی طرف سے ہمیشہ جواب یہی ملا کہ "ابھی مناسب وقت نہیں آیا ہے"

جب منتوں اور سماجتوں سے تھک کر احتجاج اور شورش کی نوبت آئی تو مجبوراً ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء کو ملک معظم کی طرف سے ایک شاہی کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا جو دس ممبروں پر مشتمل تھا، کمیشن کے صدر مسٹر ایڈورڈ ہلٹن ینگ قرار دئے گئے، ممبروں میں سے صرف چار ہندوستانی تھے جنمیں سے صرف دو ممبر غیر سرکاری تھے ایک رکن لیجسلیٹو اسمبلی اور ایک رکن کونسل آف اسٹیٹ، اس قسم کے کمیشن سے ظاہر ہے کہ زیادہ توقعات نہ تھیں، چنانچہ مرکزی مجلس واضعان قانون نے کمیشن کے تقرر کے فوراً بعد اپنی ناراضگی اور کمیشن پر عدم اعتماد کا اظہار ایک تجویز کے ذریعہ باقاعدہ طور پر کر دیا تھا، بہر حال کمیشن نے کئی ماہ تک ہندوستان اور انگلستان میں شہادتیں لیں اور تحقیقات کر کے اپنی سفارشات یکم جولائی ۱۹۲۶ء کو سر پرشوتم داس ٹھاکر داس کے ایک اختلافی نوٹ کے ساتھ شائع کیں، کمیشن کی اہم سفارشات تین ہیں یہ کہ (۱) روپیہ کی شرح مبادلہ ۱۸ پنس ہونا چاہئے (۲) معیار قیمت سونا ہونا چاہئیے (۳) ایک خاص بنک قائم کیا جائے۔

ان سفارشات میں آخر الذکر دو سے قطع نظر کر کے صرف پہلی سفارش کے فوری اثرات ہندوستان کے عام مفاد کے لئے اسقدر مضرت رساں معلوم ہوئے کہ گذشتہ آٹھ مہینہ سے اخبارات، مضامین، تقریروں اور تحریروں غرض ہر طریقہ سے اسکی اہمیت کو ظاہر کرنیکی کوشش کیگئی تاکہ جب یہ مسئلہ مرکزی مجلس مقننہ کے سامنے آخری فیصلہ کیلئے پیش ہو تو ممبران مجلس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھکر اس کے متعلق رائے دیں، چنانچہ ۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو رائل کمیشن کی پہلی سفارش مجلس کے سامنے منظوری کے لئے پیش ہوئی اور کئی دن تک غور و بحث اور جواب و سوال کے بعد جب ۱۲ مارچ ۲۷ء کو رائیں لی گئیں تو ہماری قومی پارلیمنٹ کی اکثریت نے اپنا فیصلہ حکومت کے حق میں دیا کہ "جو رائے سرکار کی وہ ہماری۔

زندہ بادشاہ پایندہ باد دولت! اس مضمون میں ہم رائل کمیشن کی دوسری سفارشات سے فی الحال قطع نظر کر کے صرف روپیہ کی شرح مبادلہ کے متعلق کمیشن نے جو سفارش کی ہے اس کے معاشی اثرات اور نتائج ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن اس مضمون کو قابل فہم بنانے کیلئے ضرورت ہے کہ ہندوستان کے موجودہ نظام زر اور مبادلہ کے متعلق بھی کچھ بیان کر دیا جائے تاکہ جو لوگ مبادیات سے ناواقف ہیں وہ اُن پیچیدگیوں اور الجھنوں سے گھبرا نہ جائیں جو موجودہ نظام زر اور مبادلہ کی خصوصیت ہوگئی ہیں۔

گذشتہ ڈیڑھ دو صدی کے اندر ذرائع آمدورفت اور تجارت کی ترقی اس درجہ ہوگئی کہ اس وقت تمام دنیا ایک بازار یا شہر ہے جس میں یورپ اور امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک دوکانوں یا کوٹھیوں کی حیثیت رکھتے ہیں ہر ملک میں ساہوکاروں کا انتظام ایسا خوب ہوگیا ہے کہ دوکان پر بیٹھے بیٹھے ہر ملک کا تاجر لاکھوں اور کروروں روپیہ کا لین دین بلا دقت و دشواری دوسرے ملک کے تاجر کے ساتھ کر سکتا ہے، مثلاً ہندوستان اور انگلستان کو لیجئے، یہاں کلکتہ بمبئی اور مدراس میں میں کتنے تاجر ہیں جو انگلستان سے مانچسٹر کا کپڑا، ڈاسن کے بوٹ، موزہ، چاقو، آٹا پیسنے کی مشین اور اسی طرح کی سیکڑوں چیزیں ہر مہینہ اور ہر سال منگاتے رہتے ہیں یا انگلستان والے آپ کے ملک سے اسی طرح کروروں روپیہ کا غلہ، روئی، سرسوں اور کھال وغیرہ منگاتے رہتے ہیں۔ اب اگر دونوں ملک کے تجار اپنا اپنا قرضہ اسی طرح ادا کریں جیسے ہم اور آپ ہر روز بازار میں جاکر ایک ہاتھ چیز لیتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے نقد دام پیش کرتے ہیں تو کروروں گنیوں اور اربوں روپیوں کا ہر روز جہازوں میں بھر کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں لیجانا اور وہاں کے سکہ میں تبدیل کرا کے قرضخواہ کا قرض ادا کرنا کتنی دشواری، دقت، پریشانی اور اخراجات کا باعث ہوگا۔ آسان صورت یہ نکالی گئی ہے کہ اگر فرض کیجئے ہندوستان کے دس تاجر دس لاکھ روپیہ انگلستان اپنے

قرضخواہوں کو بھیجنا چاہتے ہیں اور اسی طرح انگلستان کے دس تاجر اسی قدر رقم اپنے قرضخواہو کو بھیجنا چاہتے ہیں تو ایسی حالت میں دونوں ملکوں کے قرضخواہ اپنے ہی اپنے ملک کے قرضداروں سے رقمیں وصول کر لیتے ہیں، اور اگر ایک ملک کے تاجروں کا مجموعی قرض دوسرے ملک کے تاجروں کے مجموعی قرض سے زیادہ ہے تو صرف اس حالت میں بقایا قرضہ سونے یا چاندی کی صورت میں ایک ملک سے دوسرے ملک کو بھیجا جاتا ہے۔

ادائیگی قرض اور اسی قسم کے تمام لین دین بنکوں یا دلالوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں یہ کام حکومت کے ذریعہ سے بھی انجام پاتا ہے۔ ہندوستان کے تاجر اپنا مال انگلستان بھیجتے ہیں وہ اپنے مال کے خریداروں کے نام ہنڈیاں لکھدیتے ہیں اور انگریز جو اپنا مال ہندوستان بھیجتے ہیں وہ اپنے مال کے خریداروں کے نام ہنڈیاں لکھدیتے ہیں۔ چونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں ملکوں میں جو فروشندہ ہیں وہی خریدار بھی ہوں، اس لئے ہندوستان کے خریداروں کی جماعت ہندوستانی فروشندوں کی ہنڈیوں کو خرید کر کے اپنے انگریز قرضخواہوں کو بھیجدیتی ہے اور انگریز خریدار انگریز فروشندوں کی ہنڈیوں کو خرید کر کے اپنے قرضخواہوں کے پاس ہندوستان بھیجدیتے ہیں، اس طرح بآسانی دونوں ملک کے فروشندہ اپنے اپنے ملک کے خریداروں سے ہنڈی کے مطابق رقوم وصول کر لیتے ہیں۔

اگر ۲۲-۱۹۲۱ء سے ۲۷-۱۹۲۶ء تک پانچ سال کے درآمد برآمد کے اعداد و شمار دیکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی درآمد برآمد سے اوسطاً ۷۹ کرور چار لاکھ روپیہ زائد رہتی ہے اب جو مثال پہلے دی گئی ہے اس کے مطابق ۷۹ کرور روپیہ بصورت نقرہ یا طلا ہر سال ہندوستان آنا چاہئے، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، ہندوستان کو ہر سال تقریباً چالیس کرور روپیہ انگلستان کی گذشتہ اور موجودہ خدمات کے صلہ میں بھیجنا پڑتا ہے جنکو مطالبات وطن کہتے ہیں اور اسکے علاوہ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کا آٹھ سو

ارب روپیہ مختلف تجارتوں میں لگا ہے جسکا سود اور منافع بھی چالیس پینتالیس کرور روپیہ سے کم نہیں ہوتا ہے، اس لئے برآمد کی زیادتی سے جو زائد سونا چاندی ہندوستان آتا چاہئے وہ مطالبات وطن، اور انگریزی سرمایہ کے سود اور منافع کی ادائیگی میں سوخت ہوجاتا ہے۔

مطالبات وطن نیز دوسری بقایا رقوم کی ادائیگی کا یہ طریقہ ہے کہ حسب ضرورت وزیر ہند ہر ہفتہ حکومت ہند کے نام ہنڈیاں لکھتے ہیں جنکو "کونسل بل" کہتے ہیں، یہ ہنڈیاں انگلستان کے یا دوسرے ممالک کے قرضدار جنہیں ہندوستان میں ادائیگی کرنی ہے خرید لیتے ہیں اور اپنے قرضخواہوں کے پاس ہندوستان بھیج دیتے ہیں، یہاں کے قرضخواہ "کونسل بل" کو سرکاری خزانوں میں لیجاکر روپیہ وصول کرلیتے ہیں، اگر ہندوستان میں فصل خراب ہوئی اور برآمد درآمد سے کم ہوئی یعنی ہندوستان میں قرضداروں کی تعداد زیادہ ہوئی تو حکومت ہند جوابی کونسل بل وزیر ہند کے نام لکھدیتی ہے اور یہاں کے قرضدار "جوابی کونسل بل" خرید کرکے اپنے قرضخواہوں کے پاس انگلستان بھیجدیتے ہیں جس کی ادائیگی وزیر ہند لندن میں کردیتے ہیں۔

کونسل بل محض مطالبات وطن کی ادائیگی کے لئے جاری کئے جاتے تھے لیکن انیسویں صدی کے آخر میں جب بوجوہ ہندوستان میں آزاد سکہ سازی حکومت نے بند کردی۔ بجائے چاندی کے سونا معیار قیمت مقرر کیا گیا لیکن اسی کے ساتھ ہندوستان کا زر قانونی روپیہ قرار دیا گیا جس کی قدر فلزاتی اس کی قدر قانونی کے مساوی نہ تھی تو مجبوراً معیار قیمت مبادلہ سونا اور زر قانونی کی شرح مبادلہ قائم رکھنے کے لئے حکومت نے "کونسل بل اور جوابی کونسل بل" کا اجرا تجارتی ضروریات کو پیش نظر رکھکر کرنا شروع کیا چونکہ اس مضمون میں اس شرح تبادلہ کے متعلق ہم بحث کرنا چاہتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر زیادہ تفصیل سے گفتگو کیجائے۔

یہ ظاہر ہے کہ زر کی قدر قانونی صرف ملک کے اندر اندر تسلیم کیجاتی ہے، ملک

کے باہر زر قدر فلزاتی کے حساب سے چلتا ہی چنانچہ مختلف ممالک میں جو طلائی سکہ بطور زر رائج ہیں انکے سونے کا حساب کرکے شرح مبادلہ قرار دیجاتی ہے طلائی زر استعمال کرنے والے ملکوں میں تو شرح مبادلہ مستقل طور پر مقرر ہوتی ہے ہونا چاہئیے اس لئے کہ سونے کی قیمت ہر جگہ ساتھ گھٹتی اور بڑھتی ہے، لیکن جن ملکوں میں نقرئی سکہ بطور زر قانونی رائج ہیں انکے اور طلائی سکہ والے ممالک کے درمیان زر قانونی کی مستقل شرح مبادلہ قائم رکھنی دشوار رہی ہے اس لئے کہ چاندی اور سونے کی قیمت کی باہمی نسبت برابر گھٹتی بڑھتی رہی ہے اگر زر قانونی کی شرح مبادلہ مستقل طور پر مقرر نہ ہو تو اس سے تجارت میں بڑی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور تخمینی عنصر بہت زیادہ بڑھجاتا ہے، ہندوستان کا کوئی تاجر نہیں کہہ سکتا ہے کہ جو مال اُس نے ولایت سے منگایا ہے اسکے ہندوستان پہنچتے پہنچتے اس مال کی قیمت دوگنی ہو جائیگی یا نصف رہجائے گی، وسط انیسویں صدی میں شرح مبادلہ دس روپیہ برابر ایک پونڈ کے تھی لیکن چاندی ارزاں ہونیکی وجہ سے انیسویں صدی کے آخر میں شرح مبادلہ انیس روپیہ اور ایک پونڈ ہو گئی۔

بڑے عجیب وغریب اہتمام سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان بیسویں صدی کے شروع سے ۱۹۱۶ء تک ۱۵ روپیہ اور ایک پونڈ کی شرح مبادلہ قائم رکھی گئی۔ اسکے بعد چاندی کی قیمت دوران جنگ میں اتنی زیادہ ہو گئی کہ روپیہ کی قدر فلزاتی اس کی قدر قانونی سے بڑھ گئی تھی، پھر اس شرح کا قائم رکھنا ناممکن تھا اور ۱۹۱۹ء میں شرح مبادلہ ایک پونڈ اور دس روپیہ سے بھی کم ہو گئی۔

جس عجیب وغریب طریقہ سے روپیہ کی شرح مبادلہ ۱۵ روپیہ اور ایک پونڈ قائم رکھی گئی اور اسکے بعد کچھ عرصہ کے لئے ۱۰ روپیہ اور ایک پونڈ کی شرح مقرر ہوئی اور آج بجائے پرانی شرح کو قائم کرنے کے ایک روپیہ اور اٹھارہ پنس یا ۱۳⅓ روپیہ اور ایک پونڈ کی شرح مبادلہ قائم کرنے کا فیصلہ حکومت نے کیا ہے اسکا بھی اگر مختصر تاریخی حال لکھدیا جائے تو اس مسئلہ پر اور روشنی پڑے گی۔

۱۸۹۳ء سے قبل ہندوستان کا نظام زر چاندی کی بنیاد پر قائم تھا۔ آزاد سکہ سازی تھی یعنی ہر شخص ٹکسال میں چاندی لیجا کر ایک مقررہ وزن کے روپیہ تبدیل کرا سکتا تھا، لیکن اسی زمانہ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں چاندی کی کانیں دریافت ہوئیں، چاندی کی پیداوار بڑھ گئی اور بازار میں جتنی مانگ تھی اس سے زیادہ چاندی جب آ گئی تو قدرتاً اس کی قیمت سونے کے داموں میں گھٹ گئی۔ روپیہ کی شرح مبادلہ ۲ شلنگ سے کم ہوتے ہوتے ایک شلنگ تک آ گئی اس تخفیف قیمت سے زیادہ نقصان حکومت ہند کو ہوا، اس لئے کہ حکومت ہند کو مطالبات وطن سونے میں ادا کرنے پڑتے تھے اور چونکہ حکومت مالگذاری نیز دوسرے محصولات نقرئی سکہ میں وصول کرتی تھی اس لئے "مطالبات وطن" کی اسی قدر رقم کی ادائیگی کے لئے جسقدر روپیوں کی ضرورت پہلے ہوتی تھی اسکی دوگنی تعداد اب درکار تھی جس کو حاصل کرنیکی ایک صورت یہ تھی کہ محصولات میں اضافہ کر دیا جاتا لیکن حتی الوسع حکومت اس سے بچنا چاہتی تھی، دوسری صورت یہ تھی کہ روپیہ کی شرح مبادلہ میں کسی طریقہ سے اضافہ کیا جاتا، چنانچہ آخر الذکر طریقہ مناسب معلوم ہوا اور ہرشل کمیٹی ۱۸۹۳ء میں اس مسئلہ پر غور کرنے کیلئے مقرر کی گئی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ روپیہ کی آزاد سکہ سازی بند کر دی جائے۔ جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ روپیہ چونکہ زر قانونی تھا اور اندرونی کاروبار کے لئے اسکی مانگ میں کوئی کمی نہ تھی، بلکہ مانگ بڑھ رہی تھی اس لئے روپیہ کی شرح مبادلہ میں رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا، حتیٰ کہ ۱۸۹۸ء میں شرح مبادلہ ایک شلنگ اور چار پنس ہو گئی اس وقت ضرورت محسوس ہوئی کہ گذشتہ تجربہ کی بنا پر کوئی قطعی فیصلہ اس بارہ میں کیا جائے یا تو دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی سونا معیار مبادلہ مقرر کیا جائے اور ایک طلائی سکہ زر قانونی بنایا جائے۔ تاکہ شرح مبادلہ کی تمام دقتوں اور دشواریوں سے نجات حاصل ہو ورنہ کوئی ایک شرح مبادلہ مستقل طور پر قائم رکھنے کا فیصلہ کر لیا جائے۔ بہرحال ۱۸۹۸ء میں فاولر کمیٹی اس مسئلہ کی تحقیقات کے لئے مقرر ہوئی اور اس نے یہ سفارش کی (۱) چاندی کی آزاد سکہ سازی کی فی الحال اجازت نہ دی جائے (۲) روپیہ کی شرح مبادلہ ۱۵ روپیہ اور ایک پونڈ قائم کی جائے

(۳) برطانوی ساورن ہندوستان میں زر قانونی تسلیم کیا جائے۔ (۴) ہندوستان کی ٹکسال میں سونے کی غیر محدود اور آزاد سکہ سازی کی اجازت دیجائے۔ ان حالات میں حکومت ہند قانوناً مجبور تھی کہ سونے کی عوض روپیہ یا نوٹ ایک پونڈ ۱۵ روپیہ کی شرح سے خود لے اور دوسروں کو عندالضرورت ادا کرے اس لئے ظاہر ہے شرح مبادلہ ایک شلنگ چار پنس سے کسی طرح زیادہ نہیں ہوسکتی تھی لیکن اگر ہندوستان میں فصل کی خرابی کیوجہ سے توازن تجارت ہندوستان کے ناموافق ہو جائے تو پھر اندیشہ تھا کہ شرح مبادلہ ایک شلنگ ۴ پنس سے گھٹ جائیگی چنانچہ فاولر کمیٹی نے تجویز کیا کہ (۵) روپیہ کی سکہ سازی میں جو منافع حکومت کو ہو وہ علیحدہ ایک فنڈ میں بصورت طلا جمع کیا جائے تاکہ ناموافق حالات میں حسب ضرورت مقررہ شرح مبادلہ کو مستقل رکھنے کے لئے اس فنڈ سے مدد لیجائے۔

حکومت ہند نے فاولر کمیٹی کی ان تجاویز میں سے صرف چند پر عمل کیا "گولڈ ریزرو فنڈ" قائم کیا گیا لیکن اس فنڈ کا تمام سرمایہ نقد نہیں رکھا گیا بلکہ برطانوی ضمانتی رقوں میں لگا دیا گیا، روپیہ کی شرح مبادلہ سرکاری طور پر ایک پونڈ اور ۱۵ روپیہ تسلیم کی گئی اور ساورن بھی زر قانونی تسلیم کئے گئے لیکن سونے کی آزاد اور غیر محدود سکہ سازی کے لئے کوئی ٹکسال نہیں قائم کی گئی مطالبات وطن کی ادائیگی کے بعد بھی درآمد سے برآمد کی زیادتی کی وجہ سے کچھ رقم ہندوستان کو کبھی کبھی مل جایا کرتی تھی جس کی ادائیگی کے لئے ساورن ہندوستان آتے لگے تھے، لیکن ۱۹۰۴ء میں وزیر ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ "کونسل بل" نہ صرف بقدر مطالبات وطن جاری کئے جائیں گے بلکہ تجارت کی سہولت کے لئے بھی مقررہ شرح سے کونسل بل جاری ہونگے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں سونا آنا بالکل بند ہو گیا۔ بجائے ساورن بھیجنے کے لوگ کونسل بل خرید کر بھیجدیتے تھے، اس میں زیادہ آسانی تھی ۱۹۰۸ء میں توازن تجارت ہندوستان کے ناموافق تھا نیز امریکہ کی مالیات میں بھی ایک نازک صورت حال پیدا ہو گئی تھی جسکا اثر یہ ہوا کہ چاندی کی قیمت بہت گھٹ گئی۔ اور روپیہ کی شرح مبادلہ بھی گھٹنے لگی، پونڈ کی قیمت بڑھ گئی لیکن

چونکہ ایک شلنگ چار پنس کی شرح قائم رکھنے کی ذمہ داری سرکار نے لی تھی اس لئے "جوابی کونسل بل" جاری کئے گئے، اور کثیر نقصان کے بعد شرح مبادلہ کسی نہ کسی طرح ایک شلنگ چار پنس کے قریب قریب قائم رکھی گئی۔ فاولر کمیٹی کی تجاویز کا منشا ہندوستان میں رفتہ رفتہ سونا بطور معیار قیمت اور سونے کا سکہ بطور زر قانونی کے رائج کرنا تھا لیکن حکومت نے ان تجاویز پر عمل اس طرح کیا کہ سونا ہندوستان کے نظام زر سے بالکل خارج کر دیا۔

یہ صورت حال ۱۹۲۰ء تک قائم رہی۔ ۱۹۲۳ء میں چیمبرلین کمیشن اسی مسئلہ کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا اور اُس نے اپنی رپورٹ بھی پیش کی لیکن جنگ شروع ہو جانیکی وجہ سے اس کی نوبت نہ آئی کہ انکی سفارشات پر عمل کیا جاتا۔ جنگ کے زمانہ میں نظام زر اور مالیات میں جو درہمی برہمی پیدا ہوئی وہ ایک مستقل داستان ہے جس کے لئے اس مضمون میں گنجائش نہیں برطانیہ اور اسکے حلیفوں کی مدد کے لئے حکومت ہند نے جو طریقے مناسب معلوم ہوئے اختیار کئے۔ مجبوریاں تھیں، قوموں کی زندگی اور موت کا سوال، برطانیہ کا سامراج خطرہ میں تھا اس لئے جب "وفادار ہندوستانیوں" نے جان دینے سے دریغ نہ کیا تھا تو پھر مال اس سے کس کو عزیز ہوتا، اسی لئے مالیات ہند اور نظام مبادلہ اور زر میں جو ابتری دوران جنگ میں پیدا ہوئی اسکی بھی کوئی شکایت نہیں۔

دوران جنگ میں ہر قوم اور ملک یہی چاہتا تھا کہ دنیا بھر کا سونا اسی کے خزانہ میں جمع ہو جائے تاکہ جنگ جاری رکھی جاسکے اور بالآخر دشمن کو شکست دی جاسکے اس لئے ہر ملک میں اندرونی کاروبار کے لئے یا تو کاغذ کے نوٹ بے حساب جاری کئے جاتے تھے یا چاندی کے سکے، اس وجہ سے چاندی کی مانگ اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ اسکا اثر اس کی قیمت پر پڑا ۱۹۱۵ء میں ایک اونس چاندی کی قیمت ۲۷½ پنس تھی۔ مئی ۱۹۱۹ء میں ۵۸ پنس ہوگئی اور ۱۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ۷۸ پنس تک پہنچ گئی۔ چاندی کی قیمت میں اضافہ کی وجہ سے روپیہ کی شرح مبادلہ بھی بڑھ گئی حتیٰ کہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں شرح مبادلہ ایک روپیہ ۲ شلنگ چار پنس یا ایک پونڈ اور تقریباً آٹھ روپیہ ہوگئی

تھی۔ اور روپیہ کی قدر طلائی اس کی قدر قانونی سے زیادہ ہوگئی تھی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے روپیہ گلا گلا کر چاندی جمع کرنا شروع کر دی۔ چنانچہ جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۹ء میں حکومت نے بیبنگٹن اسمتھ کمیٹی مقرر کی کہ نظام زر اور مبادلہ کے متعلق از سر نو غور کیا جائے اور گذشتہ تجربات کی روشنی میں مستقبل کے لیے کوئی بہتر نظام تجویز کیا جائے۔

اس کمیٹی نے جو تجاویز پیش کیں انمیں سب سے زیادہ اہم سفارش جسکا اس مضمون سے تعلق ہے یہ تھی کہ روپیہ کی شرح مبادلہ سرکاری طور پر ایک ساورن اور دس روپیہ یا ایک روپیہ اور ۱۱٫۳۰۰۱۶ گرین سونا قرار دیا جائے، اور اسی کو قائم رکھنے کی کوشش کیجائے۔ کمیٹی کی اس تجویز سے عام طور پر اختلاف تھا۔ خود کمیٹی کے ایک رکن مسٹر دادی با دلال نے اپنا ایک اختلافی نوٹ بھی کمیٹی کی رپورٹ کیساتھ شامل کر دیا تھا جسمیں اس تجویز کی پر زور طریقہ پر مخالفت کی تھی مسٹر دادی با دلال کی رائے تھی کہ جنگ کے بعد قدیم شرح مبادلہ ۱۵ روپیہ اور ایک پونڈ کی دوبارہ قائم کیجائے۔

لیکن حکومت نے کمیٹی کی اکثریت کی رائے کو تسلیم کیا۔ کمیٹی کی رپورٹ فروری ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی اور حکومت نے کمیٹی کی مجوزہ شرح مبادلہ کو قائم کرنیکی کوشش شروع کی طلائی سکہ جس کے ساتھ روپیہ کی شرح مبادلہ کمیٹی نے تجویز کی تھی اس زمانہ میں نایاب تھا البتہ پونڈ واسٹرلنگ یعنی نوٹ کے ساتھ مبادلہ ہوسکتا تھا۔ لیکن اسٹرلنگ کی قیمت امریکن طلائی سکہ ڈالر کے حساب سے روز بروز گھٹ رہی تھی جسکا اثر یہ ہوا کہ دو شلنگ آٹھ اور دس پنس فی روپیہ کے حساب سے حکومت کو جوابی کونسل بل فروخت کرنا پڑے۔ انگریز اور ہندوستانی سیٹھوں نے اسی شرح مبادلہ سے فائدہ اٹھایا، یہی نہیں کہ جو سرمایہ گولڈ رزرو فنڈ میں ایک روپیہ اور ایک شلنگ چار پنس کے حساب سے جمع کیا گیا تھا وہ دو شلنگ اور دس پنس فی روپیہ کے حساب سے لٹایا گیا بلکہ مزید نقصان یہ ہوا کہ ہندوستان سے کروڑوں روپیہ کا سرمایہ بیرونی ممالک میں منتقل ہوگیا۔ درآمد کو فروغ ہوا، اور تجارت برآمد کو نقصان پہنچا۔

حکومت کا خزانہ جوابی کونسل بل ادا کرتے کرتے جب بالکل لٹ گیا تو چھ ساڑھے چھ

مہینہ کے تلخ تجربہ کے بعد ۲۸ ستمبر ۱۹۲۰ء کو مجبوراً یہ اعلان کر دیا گیا کہ آئندہ جوابی کونسل بل نہ فروخت کئے جائینگے۔ لیکن سنہ ۱۹۲۰ء کے آخری چھ مہینوں میں درآمد کی زیادتی اور برآمد کی کمی کیوجہ سے توازن تجارت ہندوستان کے ناموافق ہو گیا تھا، اور اب جوابی کونسل بل کی مانگ حقیقتاً پیدا ہو گئی تھی۔ بہرحال حکومت اب معذور تھی کہ سرکاری شرح پر جوابی کونسل بل جاری کرے نیز چاندی کی قیمت بھی گھٹ رہی تھی اس لئے معاشی اسباب سے روپیہ کی شرح تبادلہ رفتہ رفتہ گھٹنے لگی اور سنہ ۱۹۲۲ء میں تو ایک شلنگ ۲ اور ۳ پنس تک ہو گئی تھی لیکن پھر اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء میں ایک شلنگ چار پنس کی قدیم شرح مبادلہ قائم ہو گئی تھی اور اس وقت حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ انتظامی طریقوں سے یہی شرح قائم رکھی جائے، لیکن شنوائی نہ ہوئی اور وہ موقعہ ہاتھ سے جانے دیا گیا، اور جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا کہ حکومت کا منشا ۲ شلنگ کو ترک کر کے زیادہ سے جو شرح مبادلہ ممکن ہو قائم کرنا تھا، چنانچہ رائل کمیشن ایسے ہی وقت مقرر کیا گیا جب مختلف طریقوں سے شرح مبادلہ بڑھانیکی تمام کوششیں ہو چکی تھیں اور ڈیڑھ سال کے تجربہ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ایک شلنگ چھ پنس سے زیادہ شرح مبادلہ قائم کرنیکی نہ کوئی صورت ممکن ہے اور نہ حکومت کے پاس گولڈ رزرو میں اتنا سرمایہ کہ سنہ ۱۹۲۰ء کا تجربہ دہرایا جائے۔

اس تمام گفتگو کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ شرح مبادلہ اگر ایک شلنگ چھ پنس مقرر ہو تو کون ایسے عظیم مالی اور معاشی نقصانات ہونگے جنکی وجہ سے اس مسئلہ کو اتنی زیادہ اہمیت دی گئی کہ بمبئی اور کلکتہ کے ایوان تجارت یا معاشی کانفرنس کے اجلاسوں تک اس مسئلہ پر بحث ختم نہیں ہو گئی بلکہ کانگریس نے بھی ایک شلنگ چار پنس کے حق میں فیصلہ کر کے اس مسئلہ کو قومی مسئلہ بنا دیا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے اور یہاں کی ۷۰ فیصدی آبادی کا پیشہ زراعت ہی ہے چونکہ ایک شلنگ چھ پنس کی شرح مبادلہ سے اس حصہ آبادی کو نقصان ہوگا۔

جس کی غربت اور افلاس ضرب المثل ہوگئی ہے اس لئے خصوصیت کیساتھ ایک شلنگ چھ پنس کی شرح مبادلہ کی مخالفت اس بلند آہنگی سے کیجارہی ہے

ہمارے ملک میں جو غلہ اور روئی ہر فصل میں پیدا ہوتی ہے وہ سب اسی ملک میں ہنیں صرف ہوجاتی بلکہ بہت سا حصہ بیرونی ممالک میں فروخت کیا جاتا ہے، اب فرض کیجئے کہ غلہ کی ایک مقدار ولایت بھیجی گئی اور وہاں اسکی قیمت ۱۶ پنس قرار پائی۔ ہندوستان میں انگریزی سکے چلتے ہنیں ہیں اس لئے اگر روپیہ میں تبدیل کرائے جائیں تو ایک شلنگ چار پنس کے حساب سے ایک روپیہ ملیگا اور ایک شلنگ چھ پنس کے حساب سے کل چودہ آنے۔ اسلئے غلہ کی ایک مقدار کی قیمت محض شرح مبادلہ کی تبدیلی سے ۱۲½ فیصدی کم ہوجاتی ہے کاشتکار کو تمام مطالبات لگان، مالگذاری، مہاجن کا سود، اور دیگر محاصل و مصارف پیداوار نقدروپیوں میں اداکرنا پڑتے ہیں، اور یہ تمام مقررہ ہیں، اسلئے شرح مبادلہ کی وجہ سے پیداوار کی قیمت میں تخفیف کا نقصان صرف کسان کو بھگتنا پڑتا ہے اور اس کے برخلاف سرکار کی مالگذاری، مہاجن کے سود، اور زمیندار کے لگان کے ہر روپیہ کی قوت خرید میں بقدر ۱۲½ فیصدی اضافہ ہوجاتا ہے۔

اگر اس سادی مثال سے نقصان کی ماہیت واضح ہوگئی ہے تو ذیل کے اعداد پر غور فرماکر اندازہ کیجئے کہ کل نقصان کتنا ہوگا۔

(۱) اس وقت کل مالگذاری اور دوسرے محاصل جو ہر سال کسانوں کو ادا کرنا پڑتے ہیں اسکا تخمینہ ۷۲ کرور روپیہ کیا گیا ہے اس روپیہ کی ادائیگی کیلئے کاشتکاروں کو بحساب ۱۲½ فی صدی ۹ کرور روپیہ فراہم کرنا پڑے گا۔

(۲) ہندوستان کے کسان جس حدتک مقروض ہیں اسکا مفصل ذکر اس مضمون میں ہنیں آسکتا۔ مسٹر ڈارلنگ ایک مشہور مصنف اور سابق رکن سول سروس پنجاب نے اپنی ایک حال ہی کی تصنیف میں برطانوی ہند کے کاشتکاروں کے قرض کا تخمینہ ۶۰۰ کرور روپیہ

کیا ہے اور دیسی ریاستوں کے کاشتکاروں کے قرض کا تخمینہ ۲۰۰ کروڑ روپیہ کیا ہے گویا مجموعی قرضہ آٹھ سو کروڑ روپیہ ہوا جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہتا ہے اور کسان صرف سود بہ شکل ادا کر سکتا ہے۔ سود کی شرح اگر اوسطاً ۱۲ فیصدی مان لی جائے تو ۹۶ کروڑ روپیہ سالانہ محض سود کی مد میں کاشتکاروں کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اصل قرض میں جہاں سو کروڑ روپیہ کا اضافہ ہوگا اسی کے ساتھ بارہ کروڑ سود بھی بڑھ جائیگا۔

اس نقصان عظیم کے عوض میں کہا جاتا ہے کہ چیزوں کی قیمتیں بھی چونکہ بقدر ۱۲½ فیصدی گھٹ جائینگی یعنی ایک گز کپڑا جو پہلے ایک روپیہ کو ملتا تھا اب صرف چودہ آنے میں ملجائے گا وقس علیٰ ہذا اس لئے متذکرہ بالا نقصان کی تلافی ہو جائیگی۔ لیکن اس دلیل میں ایک مغالطہ ہے جسکو واضح کرنا ضروری ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ ایک شخص روئی کی ایک گانٹھ تین سو روپیہ میں فروخت کرتا ہے، یہ رقم اسکی کل آمدنی ہوگی جس میں سے مصارف پیدائش یعنی کھاد، بیج، مزدوروں کی اجرت وغیرہ ادا کرتا ہے، اس کی منہائی کے بعد جو بچتا ہے وہ اس شخص کا حاصل ہوتا ہے، اب فرض کیجئے کہ روئی کی گانٹھ مانچسٹر میں ۲۰ پونڈ کو فروخت ہوئی اور شرح مبادلہ ۱۵ روپیہ اور ایک پونڈ ہے تو کاشتکار کو تین سو روپیہ وصول ہوں گے ہاں میں اگر مصارف پیدائش ڈھائی سو روپیہ نکل گئے تو بقیہ پچاس روپیہ اصل آمدنی ہوگی، اس میں وہ شخص لگان، یا مالگزاری، سود، اور دوسرے مقامی محاصل ادا کریگا، اگر یہ سب مصارف ۳۰ روپیہ فرض کر لئے جائیں تو کل بیس روپیہ اسکو منافع حاصل ہوگا جس کو وہ چاہے کپڑوں پر صرف کرے یا شادی بیاہ اور دیگر مراسم پر۔

شرح مبادلہ کی تبدیلی سے جو فرق پیدا ہوگا وہ ملاحظہ ہو، چونکہ پونڈ کی شرح مبادلہ بجائے پندرہ روپیہ کے اب صرف تقریباً ساڑھے تیرہ روپیہ ہے۔ اس لئے بیس پونڈ جو گانٹھ کی قیمت پہلی مثال میں فرض کی گئی ہے اسکے کل ۲۶۶ روپیہ کاشتکار کو وصول ہوں گے۔ چونکہ مصارف پیدائش میں فوراً کوئی کمی نہیں ہو سکتی اس لئے ڈھائی سو روپیہ منہا کرنیکے بعد کل ۱۶ روپیہ بچتے

ہیں جو لگان اور سود وغیرہ کی مدمیں ادائیگی کے لئے بھی ناکافی ہیں۔ ایسی صورت میں کاشتکار کو قرض لینا پڑیگا تب مقررہ مطالبات ادا ہوسکینگے ورنہ گھر بار اور مویشی سب نیلام پر چڑھ جائینگے۔ جب منافع ہی نہو گا تو کسان اپنے عیش و آرام کے لئے روپیہ کہاں سے لائیگا! آپ کہیں گے کہ کسان اسقدر بیوقوف نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کا یہ نقصان برداشت کرے اور جب جائے تین سو کے اسکو ۲۶۶ روپیہ ملتے ہیں تو وہ اپنی گانٹھ کو بجائے بیس پونڈ کے بائیس یا چوبیس پونڈ سے کم قیمت پر نہیں فروخت کریگا۔ لیکن واقعتاً وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ ہندوستان کا کاشتکار اپنی روئی اسی نرخ سے فروخت کرے گا جس سے امریکہ اور مصر کی روئی بکتی ہے ورنہ مقابلہ میں ہندوستان کے مال کو دوسرے سستے مال کے سامنے میں کون پوچھے گا جب خود ہندوستانی اپنے سودیشی مال کو اس لئے نہیں خریدتے کہ انیس بیس کے فرق سے ولایتی مال انکو سستا پڑتا ہے۔

مثال بالا پر آپنے غور کیا ہے تو اس سے معلوم ہوگا شرح مبادلہ کی تبدیلی سے کاشتکار کی قوت خرید کس قدر کم ہوگئی ہے، اور چونکہ بمبئی، احمد آباد اور دہلی کی ملوں کا تیار کردہ کپڑا تقریبًا سب ہندوستان میں صرف ہوتا ہے اور اسی ۸۰ فیصدی آبادی کے تن بدن کو ڈہانکنے میں صرف ہوتا ہے جسکی قوت خرید اب کم ہوجائیگی اور اسکا اثر ملوں کے کپڑے کی بکری پر پڑیگا اس لئے ہندوستانی سرمایہ داروں کی جماعت بھی ۱۸ انیس کی شرح مبادلہ کی مخالفت کررہی ہے نیز یہ کہ باہر سے جو سامان اور مصنوعات ہندوستان آئینگی انکی قیمت میں چونکہ بقدر ۱۲½ فی صدی تخفیف ہوجائیگی اس لئے ہر شخص بدیسی چیزیں خریدے گا اور ملکی مصنوعات کو خود ہندوستانی بازاروں میں مقابلہ کرنا دشوار ہوجائیگا۔ رہی سہی دو چار صنعتیں جو اب فروغ پزیر ہیں وہ بھی ختم ہوجائیں گی۔

مختصراً یہ معاشی نقصانات ہیں جنکی وجہ سے ایک شلنگ چھ پنس کے مبادلہ کی مخالفت جاری ہے۔ لیکن رائل کمیشن نے جس بنا پر اسکی سفارش کی ہے اور جس کو حکومت نے کمیشن کی رپورٹ سے پہلے ہی طے کرلیا تھا وہ بھی قابل غور ہیں۔

سب سے پہلی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ ایک شلنگ چھ پنس کی شرح خود بخود گذشتہ ڈیڑھ سال سے قائم ہے اور اسی شرح کے مطابق لین دین ہو چکے ہیں اور علاوہ ازیں اسی لحاظ سے قیمتوں میں تعین ہو گیا ہے اس لئے اگر کوئی شرح مقرر ہو سکتی ہے تو وہ ایک شلنگ چھ پنس ہے؟ اسمیں شک نہیں کہ جون ۱۹۲۰ء سے اسوقت تک شرح مبادلہ ۱۸ پنس کے قریب قریب رہی ہے لیکن یہ معاشی اسباب کا نتیجہ تھا. بلکہ حکومت کی دانستہ اور ارادی کوشش کی وجہ سے یہ شرح مبادلہ اتنے عرصہ تک قائم رہی اس مسئلہ کے متعلق اگر وائسرائے اور وزیر ہند کے وہ تمام برقی بیانات (جواب شائع ہو گئے ہیں) نظر انداز کر دئے جائیں جن سے یہ دعوئے پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ ایک شلنگ چھ پنس کی شرح مبادلہ زبردستی مقرر کرائی گئی ہے تب بھی صرف یہ بات کافی ہے کہ حکومت نے گذشتہ چار سال کے اندر زر کے اجرا میں اتنی زیادہ تخفیف کر دی تھی کہ روپیہ کی قیمت میں اضافہ ناگزیر تھا. جب رسد ضرورت سے زیادہ کم ہوتی ہے اور طلب زیادہ ہوتی ہے تو ہمیشہ چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ روپیہ بھی ایک شئے ہے جسکی ٹھیکہ دار حکومت ہے اس لئے اس کے اختیار میں تھا کہ رسد جتنی چاہے بڑھائے گھٹائے. قبل از جنگ اوسطاً ۲۰ کروڑ روپیہ سالانہ خزانہ سے جاری کیا جاتا تھا تب کاروبار آسانی چلتا تھا لیکن گذشتہ چار سال کے اندر کل ۴۲ کروڑ روپیہ جاری کیا گیا اور اوسطاً ۱۱ کروڑ بارہ لاکھ روپیہ سالانہ ہوا، اس تخفیف کی کیا وجہ تھی؟ اسکا تشفی بخش جواب حکومت ہند کے مشیر مال سر بیسل بلیکٹ صاحب اب تک نہ دے سکے. پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شرح کو جو صرف ڈیڑھ سال بمشکل قائم رہی ہے ایک ایسی شرح پر ترجیح دیا جا رہا ہے جو کم و بیش پچیس سال تک مستقل رہی!

دوسری وجہ ایک شلنگ چھ پنس کی موافقت میں یہ بتلائی گئی ہے کہ قیمتوں کا تعین اسی شرح کے لحاظ سے ہو گیا ہے اس لئے اگر اب شرح مبادلہ تبدیل کر دیجائیگی تو اس سے قیمتوں کے ردوبدل، اضافہ اور تخفیف کی ایک گڑبڑ دوبارہ پیدا ہو جائیگی جو تجارت کے لئے مضر ہے حالانکہ جن اعداد و شمار سے یہ دعویٰ تعین قیمت کا ثابت کیا گیا ہے انکی صحت کے متعلق خود

سر بیسل بلیکٹ کو شبہ ہے اور اسکا اظہار کمیشن کے سامنے شہادت دیتے وقت صاحب موصوف نے کیا تھا۔ ان اعداد و شمار کے متعلق اگر گفتگو کیجائے تو یہ مضمون خشک تر ہو جائیگا اسلئے اس کے متعلق صرف اسی قدر عرض کرنا ہے کہ انگلستان میں جہاں نظام تجارت اور نظام زر وغیرہ اس قدر منظم ہیں وہاں بھی شرح مبادلہ کے معمولی فرق کے مطابق قیمتوں کے تعین میں کم از کم دو تین سال لگتے ہیں۔ پھر ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں ریلیں بھی ابھی اتنی زیادہ نہیں ہیں، نہ موٹروں نے ابھی بیل گاڑیوں اور چھکڑوں کی جگہ لی ہے، صرف ڈیڑھ سال کے اندر ۱۲½ فیصدی فرق شرح مبادلہ کے لحاظ سے کیونکر قیمتوں میں اتنی جلدی تعین ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ سرکار کی کسی سحر کاری سے چشم زدن میں یہ ہو گیا ہو۔

موافقت میں تیسری دلیل جس پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ حکومت کو اپنے بیرونی مطالبات کی ادائیگی میں بہت زیادہ بچت ہو جائے گی۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ عام میزانیہ میں	۲ کرور ۱۶ لاکھ کی بچت ہوگی
۲۔ ریلوے بجٹ	ایک کرور ایک لاکھ " "
۳۔ ریلوں کے لئے سامان کی خرید میں	ایک کرور ۶۸ لاکھ " "
۴۔ تار و ڈاکخانہ کیلئے سامان " "	۲½ لاکھ کی " "
۵۔ نئی دلی کی تعمیر کے سلسلہ میں	۶۳ ہزار کی " "
میزان	۵ کرور ۸۸ لاکھ ۱۳ ہزار

سر بیسل کا خیال ہے کہ پانچ چھ کرور کی اس بچت سے یہ ممکن ہو جائیگا کہ مرکزی حکومت کے اخراجات کے لئے صوبوں کی حکومتوں سے مسٹن کمیٹی کا تجویز کردہ خراج نہ وصول کیا جائے یا اس میں تخفیف کر دی جائے تاکہ یہی روپیہ مختلف صوبے قوم کی فلاح و بہبود کیلئے

تعمیری کاموں پر صرف کر سکیں، اس دلیل میں جو وزن ہے وہ ظاہر ہے لیکن اعتراض یہ ہے کہ پانچ کروڑ کی بچت کے لئے اس سے دس گنا اور بارہ گنا نقصان کرنا کونسی عقلمندی ہے حکومتیں یہ قرض لیکر بھی اپنا کام چلا سکتی ہیں اور چلاتی ہیں۔ لیکن اتنے قلیل فائدہ کیلئے (جس کے متعلق یہ بھی یقین نہیں کہ قوم کی فلاح وبہبود کیلئے صرف کیا جائیگا یا قوم کی تباہی اور بربادی کے لئے پولیس اور سراغ رسانی کے محکمہ پر صرف کیا جائیگا) کاشتکاروں کو تباہ کرنا کب جائز ہے۔ اس سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ محاصل وغیرہ میں اضافہ کر دیا جائے اور اس سے جو زائد رقم وصول ہو وہ صوبہ کی حکومتوں کے خراج کی واپسی میں صرف کیجائے۔

موافقت میں آخری وجہ جو اصل ہے لیکن اسکا اظہار نہیں کیا جاتا وہ یہ ہے کہ ہزاروں انگریز جو ہندوستان میں بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم ہیں انہیں اپنی ساری زندگی وحشت کدۂ ہند میں گذارنا نہیں ہے۔ اس لئے جو کچھ پس انداز کرتے ہیں سب روپیہ وہ ماہ بماہ پونڈ میں تبدیل کرا کر انگلستان کے بنکوں میں جمع کرا دیتے ہیں، پہلے ۱۵ روپیہ جمع کرتے تھے تب ایک پونڈ کی رسید ملتی تھی اب صرف ۱۳½ روپیہ دیکر ایک پونڈ کی رسید حاصل کرلینگے علاوہ بریں کروروں روپیہ کا بیرونی سرمایہ جو ہندوستان کے اندر تجارتوں میں ہے اس کا منافع یا سود جب پونڈ میں تبدیل کرایا جائیگا تو ۱۲½ فیصدی بغیر کسی کوشش کے محض مبادلہ کی الٹ پھیر سے ملیگا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے حکمراں ہزار ایماندار ہوں لیکن آخرالذکر دلیل کا تعلق دماغ سے نہیں ہے بلکہ پیٹ سے ہے اور یہی چیز ہے جس کے لئے ہزارہا میل کا سفر طے کرکے صاحب لوگ ہندوستان تشریف لاتے ہیں پھر کیونکر ممکن ہے کہ اپنے ان فائدوں کو بھولکر ان لوگوں کے نقصانات کا اندازہ کریں جن کی صورتیں بھی وہ نہیں دیکھتے۔

مسئلہ کے دونوں رُخ ظاہر کر دئے گئے حتی الوسع اعداد وشمار سے پرہیز کیا گیا اور محض مسئلہ کی نوعیت پیش کی گئی تاکہ جو لوگ معاشیات سے دلچسپی نہیں رکھتے وہ بھی اپنی معیشت کے

ایک مسئلہ کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر سکیں، سرکار دولت مدار کے فیوض و برکات سے یہ ممکن ہے کہ ہندوستان کے کسی ایک طبقہ کو فائدہ ہو لیکن اس وقت ہماری قومی خوشحالی اور قومی فائدہ، صرف ایک چھوٹے سے طبقہ کی امارت اور چند افراد کے فائدہ پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کی بیشتر آبادی جو نہ شہروں میں رہتی ہے، نہ حکومت کے دفتروں میں، نہ بڑے بڑے کالجوں میں اب تک سما سکی ہے نہ اسکولوں میں اسی غریب اور فلاکت زدہ بے زبان اور پریشان حال طبقہ کا فائدہ حقیقی قومی فائدہ ہے اور اس کا نقصان حقیقی قومی نقصان!۔

اسمبلیات

از "حضرت"

ہوتے رہے معرکے کرنسی بل کے　　چھوڑے سب نے چلے پھپھولے دل کے
جب ہو چکی جنگ زرگری میں نے کہا　　سولہ آنے کھری ہیں سر یا سل کے

ہیں کرنسی کی تہ میں کیا کیا بھید　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
جو سمجھتا ہو ووٹ کو ڈالی　　ایسے ممبر کا کیا کرے کوئی

دیکھنا تقریر کی الجھن کہ جو اُس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ کرنسی بل میں ہے
بیٹھے بیٹھے بن گیا معدہ طلسم پیچ و تاب　　رحم کر سرحد کے ممبر پر کہ کس مشکل میں ہے

غزل

از جناب مولانا شرف الدین صاحب مومن استاد جامعہ ملیہ

وہ ایک بار نہیں ہو ہزار بار نہیں
جو آس توڑے وہ تیرا امید وار نہیں

نظر فریب ہے جو حسن پائدار نہیں
رہی بہار بھی دو دن تو پھر بہار نہیں

خجل گناہ پہ جو ہو گناہ گار نہیں
گناہ گار وہی ہے جو شرمسار نہیں

نگاہ شوق کی تمکیں ہیں ہر کلام کسے
وہ بد نصیب تو دل ہی جسے قرار نہیں

بہار تازہ کا مژدہ سنا اسی کو صبا
بہار رفتہ کا اب تک جو سوگوار نہیں

شراب و ساقی و پیمانہ شمع و پروانہ
تمہاری بزم میں سب ہیں خاکسار نہیں

مزاج عشق میں اک چیز ہی تڑپ دل کی
قرار زیست ہی جبتک اسی قرار نہیں

سوائے چشم فسوں ساز ساقی خودکام
تمام بزم میں اب کوئی ہوشیار نہیں

مقام عشق میں اللہ آبرو رکھ لے
مجھے تو اپنی وفا کا بھی اعتبار نہیں

یہ کہہ کے پچھلے کو بیمار غم نے دم توڑا
اب اسکے بعد کبھی شام انتظار نہیں

جنہیں ہو بے ہنری پر بھی آج ناز و غرور
وہ سن رکھیں کہ زمانہ کسی کا یار نہیں

اٹھو ارادۂ دار البقا کرو مومن
ہوائے ملک فنا اب تو سازگار نہیں

کینڈیا کا انجام

(۲)

دوسرے دن صبح جبکہ کینڈیا اور کینڈیا کے ہاتھ ابھی ایک کپڑوں کی ٹب ہی میں پڑے ہوئے تھے کہ گاؤں کا کانسٹبل بیاگیو، جسے لوگ "چھوٹا جمعدار" کہا کرتے تھے، دھوبن کے دروازے پر نمودار ہوا۔

"عالیجناب میئر صاحب نے حکم دیا ہے کہ تم کو اسی دم اُنکے دفتر میں حاضر کیا جائے!" کانسٹبل بولا۔

"کیا کہتے ہو؟" کینڈیا نے خشمناک ہو کر پوچھا۔ وہ بُری طرح چیں بجبیں ہو گئی لیکن کمال بے پروائی سے اپنے کام میں بدستور مشغول رہی!

"ابھی میں تمہیں سے کہتا ہوں، اور یہی کہتا ہوں کہ حضور میئر صاحب نے تمکو فوراً اپنی کچہری میں طلب کیا ہے"! "کیوں مجھ سے اُنکو کیا غرض؟"! کینڈیا نے بہت ترش رو ہو کر سپاہی سے باز پرس کی۔ اس لئے کہ اُسکی سمجھ کام نہ کرتی تھی کہ اس غیر متوقع سمن (طلبی نامہ) کے کیا معنی ہیں۔ وہ اس بات پر ایسی چوکنی ہوئی جیسے کوئی گھوڑا اپنے سایہ سے بھڑکتا ہے!

"میں تم کو یہ نہیں بتا سکتا کہ کاہے کے لئے بلایا ہے، مجھکو اس سے بحث ہی کیا ہونا چاہئے تھی، میرا کام تعمیل حکم ہے اور حکم میرے لئے یہ کافی تھا!" چھوٹے جمعدار نے تیز ہو کر جواب دیا۔

"ہاں تو تم کو کیا حکم دیا گیا؟" کینڈیا ایک ضدن تھی، بھلا وہ کاہے کو چوکتی، وہ برابر یہی سوال و جواب اور رد و قدح کرتی چلی جاتی تھی، اُسکو یقین ہی نہ آتا تھا کہ اُس کی طلبی ایک واقعہ ہے۔ "میئر صاحب مجھکو بلاتے ہیں؟! لیکن کاہے کے لئے؟ میں نے کچھ کیا ہے؟ مجھکو کچھ معلوم تو ہو! میں یوں تو نہیں جاتی! میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟"

آخر چھوٹے جمعدار صاحب کے مزاج کا پارہ چڑھ گیا "اچھا تو تم نہیں جاؤ گی؟ نہیں جاؤ گی اچھا ہم دیکھیں گے"۔ یہ کہکر وہ روانہ ہو گیا۔ وہ بڑبڑاتا جاتا تھا اور اُسکا ہاتھ اُس کے دستانوں

تلوار کے قبضہ پر تھا جو اسکی کمر میں لگی ہوئی تھی!

اس بیچ میں دوسرے لوگوں نے بھی جھکے گھر اسی تنگ گلی میں تھے کانسٹبل اور دہوبن کی اس ردو بدل کو سنا، اور اپنے اپنے دروازوں پر آکر کھڑے ہوگئے، جہاں سے وہ کینڈیا کو بڑی تیزی اور تندی سے ٹب کے اندر کپڑوں کو دھوتے دیکھ رہے تھے، اور چونکہ انکو اس نقرئی بچہ کا سارا حال معلوم تھا اس لئے وہ ایک معنی خیز طریقے سے ہنس رہے تھے، اور آپسمیں ذو معنی اور تلمیح آمیز فقروں کا تبادلہ ہو رہا تھا! کینڈیا اسوقت تو نہ سمجھی، لیکن بعد میں ان اشاروں اور کنایوں نے دہوبن کے دل میں ایک مبہم سا خدشہ پیدا کر دیا اور خدشہ اسوقت اور بھی بڑا دغدغہ بن گیا جبکہ چھوٹا جمعدار ایک افسر کو لئے ہوئے دروازے پر دوبارہ آن دھمکا!

"جلدی قدم بڑہا کے آؤ!" چھوٹے جمعدار نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

کینڈیا نے اپنے ہاتھ صاف کئے، لیکن کوئی جواب نہیں دیا، بعدازاں وہ انکے ساتھ روانہ ہوگئی۔ بازار کے چوک میں لوگوں کی ایک بھیڑ ہوگئی تھی جو اس گرفتاری کا تماشہ دیکھنا چاہتے تھے کینڈیا کی ایک دشمن جسکا نام روز نیپورا تھا اپنی دوکان پر بیٹھی بیٹھی بولی "ڈال دے جیرائی ہوئی ہڈی!" ایک حقارت آمیز قہقہہ کے ساتھ اس نے یہ الفاظ ادا کئے۔

دہوبن عوام کی طرف سے اس تضحیک واذیت پر بغل در آتش ہوگئی، وہ اس تمام ہنگامہ آرائی کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس سخت طعنہ پر اس نے ایسا پیچ وتاب کھایا کہ الفاظ اسکے منہ کے منہ میں رہ گئے، اور وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

میئر کی کچہری کے سامنے بے فکرے شوقینوں کا ایک مجمع اکٹھا ہوگیا، اور جب کینڈیا داخل کی گئی تو وہ بڑے اشتیاق سے اسکو دیکھنے لگے کینڈیا غصہ میں بیتاب ہو رہی تھی، وہ بڑی تندی کے ساتھ سیڑھیوں پر چڑھی اور دَندناتی ہوئی میئر کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور ہانپتی ہوئی آواز میں ایک شوخ چشمی کے ساتھ اس نے میئر کو خطاب کرکے پوچھا، "کیوں صاحب آپنے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

ڈاان بسلار مسٹر، جو بہت متحمل مزاج آدمی تھا وہ ایک لمحہ کے لئے دہوبن کے اس بیباکانہ طرز عطاب سے کسی قدر سراسیمہ سا ہوگیا۔ اُس نے اپنے سرکاری تزک و احتشام کے جلوس کے اُن دو وفادار ملازموں پر ایک نظر ڈالی جو کینیڈیا کو حراست میں لئے ہوئے تھے۔ اسکے بعد اُس نے اپنی اس دانی سے ایک چٹکی تمباکو سونگھکر عورت سے کہا: "بیٹی ذرا غصہ کو تھوکو اور اطمینان سے بیٹھو!"

مگر کینیڈیا خیرہ چشمی کے ساتھ برابر کھڑی رہی۔ اُسکی منقار نما ناک غصہ سے پھڑک رہی تھی اور اُس کے جھریاں پڑے ہوئے رخسار عجیب طریقے سے لرزش میں تھے۔

نہیں جناب آپ مجھے اسی دم بتا دیجئے کہ میں کیوں طلب کی گئی ہوں!" اُس نے پھر پوچھا۔

تم کل ڈاناکرسٹنا لیمابنکا کے ہاں میلے کپڑے لینے گئی تھیں؟" میئر نے آخر سوال کیا۔

"ہاں اچھا! لیکن اس کے معنی؟! آپ کا اس سے مطلب؟! کیا وہاں سے کوئی چیز گم ہوگئی ہے؟ میں نے ایک ایک کپڑا گن کر حوالے کیا ہے، اور ایک چیز بھی کم نہ تھی۔ آپ مجھے بتائیے تو کہ کیا معاملہ ہے؟"

"میری بچی ذرا صبر کرو، ذرا صبر کرو! کہنا یہ ہے کہ جس کمرے میں تم جاکر بیٹھی تھیں اُس میں میرکا چاندی والا—"

میئر کا نا تمام جملہ یہیں تک پہنچا تھا کہ کینیڈیا سارا معاملہ سمجھ گئی: وہ ایک غضب ناک عقاب کی طرح جوش میں آگئی جو اپنے شکار پر جھپٹکر گرنا چاہتا ہو، وہ اپنے ہونٹوں کو طیش میں آکر کاٹنے لگی!"

"ہاں تو وہ نقرئی چمچہ اُس کمرے میں تھا جیسے ڈاناکرسٹنا نے تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ غائب ہے، سمجھیں کینیڈیا؟ ممکن ہے کہ وہ تمہارے کپڑوں میں چلا گیا ہو۔ یعنی غلطی سے!"

کینیڈیا جوش طیش میں اچھل پڑی! واقعہ یہ ہے کہ اُس بیچاری نے کوئی چیز نہیں چرائی

تھی!

"اچھا! یہ چوری مجھ پر لگائی گئی ہے؟ مجھ پر!! مجھ سے کہئے تو یہ آپ سے کہا کس نے؟ مجھکو کس نے دیکھا؟ مجھکو تو آپ پر تعجب آتا ہے، ڈان سلا! کمال کیا آپنے! میں چور؟! ارے میں!! میں؟!

اس کے غیض وغضب کی کوئی انتہا نہ تھی اُس نے اس غیر منصفانہ اور دل آزار الزام کو ایک تیز نشتر کی طرح محسوس کیا اس لئے کہ وہ جانتی تھی کہ لوگ مجھ میں اس قسم کی صلاحیت ضرور سمجھتے ہیں جس کی بنا پر اس حرکت کو مجھ پر محمول کیا جارہا ہے۔

"پھر اگر اُسکو تم نے نہیں لیا تو کس نے لیا؟" ڈان سلا نے اُسکے سلسلہ کلام کو قطع کرکے کہا، اور یہ کہکر وہ بڑے غرور و خوض کی ادا سے اپنی پر تکلف کرسی عدالت میں پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔

"سچ یہ ہے کہ مجھکو آپ جیسے بزرگ پر سخت حیرت آتی ہے!" غضبناک عورت غصہ کے لہجہ میں پھر بولی اور اس نے اپنے لمبے لمبے ہاتھوں کو اس طرح جنبش دی کہ گویا وہ دو لکڑیاں ہوں۔

"اچھا اب آپ جائیں، ہم اسکا تدارک کرلیں گے۔"

کینڈیا بغیر سلام کئے ہوئے پلٹی، اندھا دھند جوش و از خود رفتگی کی حالت میں وہ دروازے سے جا ٹکرائی! وہ غصہ سے سُرخ ہو رہی تھی اور سچ مچ اپنے آپے سے باہر تھی۔

جوں ہی اُس نے سڑک پر قدم رکھا اور تماشائیوں کے ہجوم کو دیکھا تو اس کو معلوم ہوا کہ رائے عامہ کی عدالت کا فیصلہ پہلے ہی سے میرے خلاف صادر ہو چکا ہے! کوئی شخص اُسکی بے قصوری پر یقین کرنے والا نہ تھا۔ بایںہمہ اُس نے بڑی شدت کے ساتھ صدائے احتجاج و انکار بلند کرنا شروع کی۔ لوگوں کا انبوہ منتشر ہوتے وقت ہنستا جاتا تھا، کینڈیا طیش و غصہ میں بھری ہوئی اپنے گھر آئی اور اپنی لاچاری اور بے کسی پر اپنے دروازے پر بیٹھ کر آنسو بہانے لگی۔

ڈان ڈوڈیٹو برینڈیا رنے جسکا دروازہ ملا ہی ہوا تھا ستم ظریفی سے کہا: "ذرا زور سے رو تاکہ سارے راہگیر سن سکیں!"

آخرکار یہ دیکھکر کہ میلے کپڑوں کا ایک انبار پڑا ہوا ہے اور انکو صابن وغیرہ لگانا ہے اس نے اپنے دل کو تسلی دی۔ ہاتھوں کو بھگا گیا اور پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ ہاتھ کام میں مشغول تھے اور اسکا دماغ اپنے مقدمہ میں غلطاں و پیچاں! وہ اپنے جواب دعوے پر غور کر رہی تھی اور صفائی کی پوری تار و پود کو اپنے ذہن میں ترتیب دے رہی تھی۔ اُس کا نسوانی دل و دماغ اپنی ساری جنسی جدت و اختراع سے کام لے رہا تھا۔ طرح طرح کی نکتہ آفرینیوں اور قانون طرازیوں کے لئے وہ اپنے دماغ کا کونہ کونہ چھان رہی تھی، دیہاتی زبان کی فقرہ بازیوں اور لفاظیوں سے وہ ایک ایسی شیرازہ بندی، استدلال قانونی کی تیاری کرنا چاہتی تھی جو بڑے سے بڑے شکی مزاج کو بھی اُسکی بے جرمی کا قائل بنا دے!

اپنا دن کا کام ختم کر کے وہ گھر سے نکلی، اور اُس نے طے کیا کہ پہلے ڈانا کرستناہی کے ہاں جانا چاہیئے۔

مگر کرستنا گھر پر نہ ملی، صرف میریا بسیشیا ہی تھی جس کو کینڈیا کے طوفان تکلم سے اپنی سمع خراشی کرنی پڑی! وہ اُسکی ہر بات پر سر ہلاتی جاتی تھی مگر منہ سے کچھ ہاں یا نا" کہتی تھی! میریا ایک متانت آمیز اور پُر وقار خاموشی کی ادا کو قائم کئے ہوئے تھی۔

یہاں کی ملاقات کے بعد کینڈیا نے اپنی ساری "برت،" (گاہکوں کا حلقہ) کا دورہ لگایا ہر ایک سے باری باری سے وہ اس قصہ کو دہراتی، اور ہر ایک کے سامنے اپنی "مسل صفائی" کھولتی، اور ہر مرتبہ کسی نہ کسی نئی دلیل قانونی کا اضافہ کرتی، اور اپنی عدالتی بحث کو زیادہ ہنگامہ آرا بناتی، اور اگر کسی مخاطب کے چہرے پر شک و بے اعتمادی کے آثار پاتے تو اور بھی پرجوش ہو جاتی اور اپنی وکالت میں اور بھی جان لڑا دیتی! لیکن اُس نے محسوس کیا کہ یہ سب شغف بے سود ثابت ہو رہی ہے، لوگوں کو خوش عقیدہ بنانے کی کوئی صورت ممکن

نہیں ہے۔ ایک کورانہ قسم کی مایوسی اُس پر طاری ہوگئی، اور اس عالم بیچارگی میں اُسکی زبان پر ان کلمات کی تکرار تھی "اب اس کے سوا کیا کیا جاسکتا ہے ؟ اب اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے ؟"

(۳)

اس اثنا میں ڈانا کرسٹنا لیمانیکا نے شنجیا کو بلائے جانیکا حکم دیا۔ یہ انکی قوم میں ایک عورت تھی جو جادو ٹونا کرنے اور عطائی نسخوں اور ٹٹکوں کے استعمال میں بہت دستگاہ رکھتی تھی۔ شنجیا متعدد بار مال مسروقہ کو برآمد کرانے میں کامیاب ہوچکی تھی، لوگ کہتے تھے کہ درپردہ اُسکی ساز باز چوروں سے ہے۔

"تم وہ بچہ معلوم کردو" ڈانا کرسٹنا نے اُس سے کہا، "تم کو پورا انعام ملیگا"۔

"بہت اچھا حضور!" شنجیا نے جواب میں عرض کیا "مجھکو صرف چوبیس گھنٹہ کی مہلت دیجائے"۔

اور چوبیس گھنٹے گذرنے پر وہ اپنا جواب لیکر حاضر ہوگئی۔ اُس نے کہا بچہ صحن مکان کے اندر ایک سوراخ میں ملیگا جو کونے کے پاس ہے!

ڈانا کرسٹنا اور میریا صحن میں اتر گئیں اور انکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ بچہ وہیں رکھا ہوا ہے!۔

تیزی کے ساتھ یہ خبر سارے پیکارا میں گشت لگاگئی۔

اب کنیڈیا مارکنیڈا بڑے فاتحانہ طریقہ سے اپنے مکان سے نکلی، اور ساری گلیوں کا دورہ لگایا۔ جوش مسرت میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُسکا قد کچھ بڑھ گیا ہے! وہ اپنے سر کو سیدھا اٹھائے ہوئے تھی! وہ شاداں و فرحاں مسکراتی جاتی تھی، اور ہر شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دیکھتی تھی گویا کہ وہ زبان حال سے ایک داد طلب انداز میں یہ کہہ رہی ہو کہ "کہو میں نے تم سے یہی نہیں کہا تھا ؟"

دوکانوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اُسکو گذرتا ہوا دیکھتے، اور پہلے کچھ آہستہ آہستہ آپسمیں کہتے اور پھر یکبارگی ایک معنی خیز اور طعنہ آمیز قہقہہ مار اُٹھتے! فلیولاسیلوی نے جو کیفے ڈی اینج (ایک ہوٹل کا نام) میں بیٹھا ہوا برانڈی کا گلاس پی رہا تھا کنیڈیا کو اندر بلایا۔

"ایک جام اور دینا کنیڈیا کے لئے۔ بالکل ایسا ہی جیسا کہ مجھکو دیا تھا"

ہماری شوقین دہوبن جو آب آتشیں کی بہت دلدادہ تھی اس فرمایش کو سنکر ہونٹ چاٹنے لگی!

"تم واقعی اس خراج تحسین کی مستحق ہو، اس میں کوئی شک نہیں!" فلیو نے کہا۔

بے فکروں کا ایک مجمع ہوٹل کے سامنے جمع ہو گیا تھا۔ سب کی آنکھوں سے شوخی اور شرارت ٹپکتی تھی، کنیڈیا نے ادہر جام شراب منہ سے لگایا اور اُدہر فلیولاسیلوی نے حاضرین محفل کو اس طرح خطاب کرنا شروع کیا۔

"کہئے! اب تو آپ مانیں گے کہ یہی ایک مدبرانہ طریق کار تھا جو ہماری کنیڈیا نے اختیار کیا!! کہئے اس کے اعتراف میں آپ کو کچھ تامل ہے؟! واہ میری روباہ سیاست!" اس نے دہوبن کے سوکھے دبلے کاندھے پر تھپکی دے کر کہا۔

سارا مجمع ہنس پڑا! ایک پستہ قامت آدمی جو کچھ پاگل سا تھا اور بولنے میں ہکلایا کرتا تھا اور اپنے غیر معمولی چھوٹے قد کی بنا پر لوگوں میں "تڑامٹر" کر کے مشہور تھا، اُس نے کیا کیا کہ اپنے ایک ہاتھ کی انگلی کا پور۔ دوسرے ہاتھ کی انگلی کے سرے پر رکھا اور ایک عجیب مضحک انداز بنا کر یہ ترانا گانا شروع کر دیا۔

"ک۔ک۔ک۔ کنیڈیا۔۔ شی۔شی۔شی۔ شنجیا!" اور اُس نے اُچھل کود شروع کی، اور اپنی ہکلائی زبان میں اشاروں کنایوں والے فقرے کہنا شروع کئے! یہ سب مرموز باتیں اس طرف اشارہ کرتی تھیں کہ کنیڈیا اور شنجیا کی آپسمیں "ملی بھگت" ہے۔ بونا یہ تماشے کر رہا تھا اور لوگوں کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑ پڑ جاتے تھے!

کچھ دیر تک تو کنیڈیا مبہوت بنی بیٹھی رہی، شراب کا گلاس اُس کے ہاتھ میں تھا اور وہ یہ معما سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر کار یکبارگی اُس کو القا سا ہوا اور اُس نے محسوس کیا کہ ــ "لوگ میری پارسائی کو مشتبہ سمجھتے ہیں! لوگوں کا یہ گمان ہو رہا ہے کہ میں نے چپکے سے چمچہ لاکر اُس جگہ دبا دیا اور اُس کا منہ سے مل ملا کر میں نے اپنے کو مزید رسوائی سے بچا لیا!"

کنیڈیا کو غصہ کے مارے تاب نہ رہی! طیش و غضب میں اُسکی زبان گنگ ہو گئی! ایک دم طوفان جنون بنکر وہ مجمع کے سب سے کمزور آدمی پر جو یہی پستہ قد کوزہ پشت تھا ٹوٹ پڑی، گھونسوں اور مکوں کی ایک بارش اُسپر کر دی اور مارے ناخنوں کے کھروچوں کے اُس بیچارے کا بُرا حال کر دیا! تماشہ پسند مجمع نے مزیدار کشتی دیکھی اور حلقہ باندھکر دونوں کے گرد کھڑے ہو گئے، اُنکی خوب ہنسی دل لگی ہو رہی تھی اور وہ ایک بیدردانہ حظ کوشی کے ساتھ اس منظر سے لطف اٹھا رہے تھے، اُنہوں نے دونوں کی اس دست و گریباں ہونے کو دو جانوروں کی لڑائی سمجھی اور سب اپنی آوازوں اور ہاتھ پاؤں کی حرکتوں سے انکو بڑھاوے دے رہے تھے!

غریب "بڑا مٹر" کنیڈیا کے اس غیر متوقع حملہ سے حواس باختہ ہو گیا۔ اُس نے جان چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی اور مینڈک کی طرح ادھر ادھر کودنے اور پھدکنے لگا، مگر دھوبن کے قاہر ہاتھوں کی گرفت ایسی ویسی نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ اُسکے پنجہ سے چھٹنا تو ناممکن تھا، بس وہ ایک چکر گھنی سی کاٹنے لگا، بونے کی وحشت زدگی کیوجہ سے اس حلقہ نما رقص کی سرعت سیر برابر بڑھتی رہی! آخر کار تھک کر بیچارہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

کچھ لوگ اُس کو اٹھانے کے لئے دوڑے۔ اور کنیڈیا لوگوں کی ہائیں ہائیں کے شور میں بھاگی اور غرب سے اپنے گھر کے دروازے کے اندر داخل ہو گئی سیدھی اپنے بستر پر جا کر گری اور ہانپنے لگی، وہ غصہ کے مارے اب بھی اپنی انگلیاں کاٹ رہی تھی۔

یہ دوسرا نیا الزام سازش اُس کے لئے پہلے الزام سرقہ سے بھی زیادہ تلخ تھا! سب سے زیادہ اُسکو یہ کوفت ہو رہی تھی کہ خود اُسکا ضمیر بھی اُس کو اس قسم کے توڑ جوڑ میں مشاق سمجھتا تھا!

اب وہ اپنی بریت کس طرح کرے؟ کس طرح وہ امر واقعی کو پایہ ثبوت تک پہنچائے؟ وہ سمجھتی تھی کہ یہ ایک بے سود کوشش ہوگی کہ لوگوں کو یہ بتائے کہ میں نے کس طرح سے کرشنا کے مکان میں داخل ہوکر یہ فریب کرسکتی تھی اور یہ جعل بنانے میں میرے لئے وہاں کیسی کیسی مشکلات درپیش تھیں اس لئے کہ یہ بات ظاہر تھی کہ محل کے اندر آزادانہ آمد و رفت ہوسکتی تھی، بڑے پھاٹک میں کبھی قفل نہ پڑتا تھا اور وہ صبح سے شام تک برابر کھلا رہتا تھا اور نوکر چاکر اور دوسرے لوگ مختلف کام کاج کیلئے بے تکلف آتے جاتے رہتے تھے۔ پس لوگوں کی زبان بند کرنا ناممکن، اور یہ کہکر انکو خاموش کرنا ایک بے معنی سی بات تھی کہ "میں کیونکر اندر پہنچ سکتی تھی؟"، کیونکہ اس کارروائی کو کامیابی سے انجام دینے کے وسائل بہت تھے اور سہل الحصول تھے!

کنیڈیا نے نئے استدلال کے سوچنے میں اپنے شہپر تخیل کو حرکت دی، اُس نے تین چار پانچ مختلف دلیلیں اختراع کیں اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ حجرہ کا صحن میں پہنچانا ناممکن تھا۔ الغرض اُس نے مقدمہ کی از سر نو ترتیب میں ایسی موشگافی سے کام لیا کہ باید و شاید۔ اُس کے بعد اُس نے پھر مکانوں اور دکانوں کا دورہ لگانا شروع کیا، اور لوگوں کے شکوک و شبہات کو دور کرنیکی ہر ممکن تدبیر کو آزمایا۔ لوگوں نے اُس کے عذرات کی سماعت کی، اور اُسکی زبردست وکالت سے بہت محظوظ ہوئے سب یہی کہتے تھے کہ "اجی تم بالکل ٹھیک کہتی ہو کنیڈیا، تمہارے دلائل بڑے دنداں شکن ہیں، اور لوگ تو بکتے ہیں!"

لیکن اُنکی اس تائید و ہمنوائی کا ایک خاص لب و لہجہ تھا جس سے کنیڈیا کباب ہوئی جاتی تھی! پس اس طرح اُسکی ساری محنت و مشقت بیکار ثابت ہوئی کیونکہ کوئی شخص اُس پر اعتماد کرنے کیلئے تیار نہ تھا! لیکن دھوبن اپنی دھن کی پکی تھی، اُس نے بار دگر اپنے ذہن کو دعوت فکر دی، صفائی کی تدبیریں سوچنے میں ساری ساری رات وہ دماغ سوزی میں صرف کر دیتی! اس مسلسل دماغی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُسکے قوائے ذہنی جواب دینے لگے وہ کوئی مرتب سلسلہ خیال و استدلال اپنے دماغ میں قائم نہ رکھ سکتی تھی، اور ہر الجھن جیچہ ی

کے خیال میں غلطاں و پیچاں رہتی تھی!

اُس نے اپنا کام کاج بھی ترک کر دیا، اور ایک عُسرت کی زندگی بسر کرنے لگی! جب کبھی وہ گھاٹ پر چلی جاتی جہاں لوہے کے نل کے نیچے ساری دھوبنیں جمع ہوا کرتی تھیں تو عالم بیخودی میں کھڑے کھڑے وہ کپڑوں کی گٹھری ہاتھوں سے چھوڑ دیتی جسکو ندی کی دھار بہا لیجاتی! ہمیشہ بس وہ اُسی بچے کے ایک ہی مضمون پر مسلسل گفتگو کرتی اور اُسکا سلسلہ دراز اتنا غیر متناہی ہوتا کہ لوگ سنتے سنتے بیزار ہو جاتے مگر وہ نہ تھکتی! اُسکی دماغ پاشیوں اور سمع خراشیوں سے پیچھا چھڑانے کیلئے نوجوان دھوبنیں اکثر گانے لگتیں، اور اپنے نغموں کے طعن آمیز لہجوں میں اُسکا مذاق اڑایا کرتیں۔ ایسے وقتوں میں وہ اور بھی شور و غوغا مچاتی، اور ایک فالج زدہ کی طرح اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے بے معنی حرکتیں کرتی!

اب لوگ اس کو کام بھی نہ دیتے تھے۔ اُسکے پرانے گاہکوں میں سے بعض لوگ ترس کھا کر اُسکو کھانا بھیج دیا کرتے تھے۔ ہوتے ہوتے وہ بھیک مانگنے پر لگ گئی۔ وہ بال کھولا جیتھڑے لگائے تباہ حال گلیوں گلیوں پھرتی، اور بچے اُس کے پھٹے کپڑوں کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچتے اور چلا کر کہتے کہ "بچی کنیڈیا! اُس بچے کا قصہ تو کہو ہم نے کبھی نہیں سُنا!"

وہ خود بھی بعض اوقات راستہ چلتے اجنبیوں کو روک کر کھڑا کر لیتی، اور اُن سے بچے کی سرگذشت بیان کرتی اور اپنی صفائی کے دلائل پیش کرتی! نوجوان لڑکے کبھی کبھی اُس کو بلا بھیجتے، اور پیسہ دو پیسہ دے کر اُس سے بار بار اس قصے کو کہلواتے اور مزہ لیتے۔ بیچ بیچ میں چھیڑنے کے لئے جرحی سوالات کر دیتے اور کنیڈیا تلملا جاتی اور بڑے پر زور طریقے سے انکار و تردید کرتی، وہ اُسکے سارے بیان صفائی کو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے اور آخر میں "سب غلط ہے!" کہکر اُسکو قتل کر دیتے! کنیڈیا اپنا سر ہلاتی اور چلی جاتی۔ چند روز بعد وہ ضابطہ فقیروں کی برادری میں داخل ہو گئی، لیکن فقیروں کی ٹولی میں بھی بیٹھکر وہ اُسی بچہ والے موضوع سخن پر گرم گفتگو ہو جاتی، اور ایک غیر مختتم اور لاطائل بحث چھیڑ دیتی، وہ بھٹکتی

نہ ارما تھی! اُسکی یار غار ایک بہری عورت تھی جو لنگڑا کر ایک پاؤں پر چلا کرتی تھی، اور غصہ کی حالت میں اپنی سی بدن کو نوچ نوچ کر اُس نے اپنا جو حال کر لیا تھا اُس کی یہ کیفیت تھی کہ اُس کی ساری جلد داغدار تھی!

[illegible]ء کے موسم سرما میں آخر کار وہ سخت بیمار پڑی، اسوقت بھی اُسکی جگری دوست اُس کی تیمار دار تھی۔ ڈاناکرستنا نے بیمار پرسی کرائی اور اپنے خلوص وہمدردی کے ثبوت میں اُسکو کوئیلوں کی ایک ٹوکری بھیجی۔

کنیڈیا اپنے بستر مرگ پر لیٹی ہوئی تھی لیکن اس وقت بھی وہی چمچہ کا خیال کامش جان تھا! اپنے ہذیان مرض میں بھی وہ چمچہ ہی کا ذکر کر رہی تھی، جوش کلام میں وہ بار بار اپنی کہنی کے سہارے سر کو اٹھا لیتی اور اپنے استدلال کو تقویت دینے کے لئے اپنے دوسرے ہاتھ کو سختی سے جنبش دیتی، اگرچہ بہزار دقت!

اور دم آخر جبکہ اُسکی گھورنے والی آنکھوں کی پتلیاں پھیلنے لگیں، اور آنکھوں کا رنگ گدلا ہو گیا۔ کنیڈیا نے آخری سانس لی، لیکن نزع کے ان آخری لمحوں میں بھی اُسکی زبان چل رہی تھی اور اُسکا مرغ روح یہی کہتے کہتے پرواز کر گیا؛

"بیگم! یہ ہرگز نہیں نہ تھی۔ کیونکہ آپ جانتی ہیں کہ — یہ چمچہ —"

تنقید و تبصرہ

تلقیح فہوم اہل الاثر فی عیون التاریخ والسیر۔ امام ابن جوزی بغدادی متوفی ۵۹۷ھ چھٹی صدی ہجری میں علوم اسلامیہ کے لحاظ سے سب سے بڑے آدمی گذرے ہیں۔ تفسیر، حدیث، تاریخ اور رجال غرض جملہ علوم میں مسلم امام تھے۔ اور روایت حدیث میں نہایت تحقیق بلکہ تشدد سے کام لیتے تھے۔ وعظ و تذکیر میں بھی انکا رتبہ بہت بلند تھا۔ لاکھوں گنہگاروں نے انکی مجلس وعظ میں گناہوں سے توبہ کی اور کم و بیش بیس ہزار یہود و نصارا انکے ہاتھ پر مسلمان ہوئے انکی بڑی چھوٹی تصانیف کی تعداد ساڑھے تین سو کے قریب ہے۔ کم تر فن ایسے ہوں گے جس پر کوئی کتاب نہ لکھی ہو۔

کتاب مذکورہ بالا انکی تصانیف میں ایک خاص رتبہ رکھتی ہے اسکا انداز وہ ہے جو معارف ابن قتیبہ کا ہے۔ اسمیں سیرت بھی ہے اور صحابہ و رواۃ کی تاریخ بھی۔ سیرت کے بعد مشہور بڑے بڑے صحابہ کے حالات لکھے ہیں اور بقیہ کے نام ذکر کر دئے ہیں اس کے بعد انکے ہر قسم کے طبقات کی فہرستیں جمع کی ہیں۔ مثلاً شرکار جنگ بدر کے نام۔ شہدائے احد کی فہرست۔ مہاجرین حبشہ کے نام۔ حبشے میں جو صحابہ پیدا ہوئے تھے انکی فہرست، الغرض اسی قسم کی سینکڑوں طرح کی معلومات سے لبریز ہے۔ اور وہ باتیں اسمیں نہایت آسانی کے ساتھ ملجاتی ہیں جو بہت سی کتابوں کے تتبع اور بہت جستجو کی زحمت کے بعد بھی محقق طور پر نہیں مل سکتی تھیں۔

یہ بیش قیمت کتاب کمیاب بلکہ نایاب تھی۔ اور بڑے بڑے کتب خانے اس سے خالی تھے۔ مولوی محمد یوسف صاحب ٹونکی نے اسکا ایک عمدہ نسخہ ٹونک میں نواب زادہ عبدالرحیم خاں کے کتب خانہ میں پایا جو مصنف کے خاص زمانہ یا اس کے بعد ہی کا لکھا ہوا ہے، انہوں نے اسکی نقل لیکر نہایت محنت اور جانکاہی سے مفید حواشی کے اضافہ کے ساتھ حال میں

دہلی میں چھپوا کر شائع کی ہے۔ تصحیح خود کی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ کس کوشش کے ساتھ کی ہے اور کسقدر زحمت اٹھائی ہے۔ کاغذ بھی اچھا لگایا ہے اور لکھائی چھپائی بھی عمدہ ہے۔ قیمت صہ فی نسخہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مولوی محمد یوسف صاحب ٹونکی۔ گفنشہ گھر۔ مدرسہ حاجی علی جان دہلی۔

مجھے یقین ہے کہ اگر عربی مدارس میں منطق یا فلسفہ کی غیر ضروری کتابوں میں سے کوئی کتاب کم کر کے یہ کتاب نصاب میں رکھدی جاے تو جو طلبہ فاضل ہو کر نکلیں گے وہ علوم سلامیہ اور خود اسلام کا ذوق صحیح لیکر نکلینگے۔ کیا علما کرام اس پر غور کریں گے؟۔

رسالہ مسح جورب۔ جرابوں پر مسح کرنیکے متعلق حدیث میں تصریحات موجود ہیں لیکن فقہاء نے اس معاملہ میں تشدد سے کام لیا۔ اور طرح طرح کی شرطیں لگا کر ایسا مقید کر دیا کہ سوتی جراب پہننے والا غریب مسح کی رعایت سے محروم ہو گیا جسکا نتیجہ یہ ہے کہ بعض سرد ممالک کے مسلمان جاڑوں کے موسم میں جرابوں کے اتارنے اور وضو میں پاؤں دہونے کی زحمت کی وجہ سے نماز ہی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جہازوں پر کام کرنے والے مسلمان بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں کیونکہ سردی کی سختی کو برداشت کر کے اگر وہ پاؤں دہو لیتے ہیں تو اکثر ورم قدم یا تشقف الجلد کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

علامہ جمال الدین قاسمی دمشقی نے جو شام کے ایک مشہور عالم تھے جنہوں نے ابھی چند سال ہوئے انتقال کیا ہے اس مسئلہ پر ایک مفصل رسالہ لکھکر دین کی آسانی کو واضح کیا اور جرابوں کے مسح میں جو حدیثیں وارد ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے۔ نیز صحابۂ کبار میں سے حضرت علی۔ ابن عباس۔ انس بن مالک۔ براء بن عازب اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم کا بھی مسح جرابوں پر ثابت کیا ہے۔

یہ رسالہ دمشق سے ۱۳۳۲ھ میں شائع ہوا تھا۔ اب قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان

منصور پوری مصنف رحمۃ اللعالمین نے اُردو میں اسکا ترجمہ کر دیا ہے جس کو حاجی عبدالغفار صاحب تاجر دہلی نے شائع کرایا ہے۔ قیمت درج نہیں۔ غالباً حاجی صاحب موصوف سے مفت مل سکے۔

کتب تعلیمیہ عربیہ۔ مولوی شتاق احمد صاحب ساکن قصبہ چرتھاول ضلع مظفرنگر مقیم رنگون نے عربی مدارس کے لئے ایک جدید نصاب تعلیم تجویز فرماکر شائع کیا ہے۔ درس نظامیہ سے اس میں بجز صوفیانہ تبلیغی عنصر کے اور کوئی خاص اضافہ نہیں معلوم ہوتا۔ اور میری رائے میں یہ تبلیغی عنصر بھی موجودہ زمانہ میں کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ کیونکہ کتابیں فرسودہ رکھی گئی ہیں۔ مولانائے موصوف نے عربی تعلیم کو آسان کرنیکے لئے اُردو زبان میں حسب ذیل کتابیں بھی تصنیف فرماکر شائع کرائی ہیں جو ابتدائی تعلیم کے لئے مفید معلوم ہوتی ہیں۔

عربی زبان کا قاعدہ ۸ر۔ علم الصرف حصہ اول دوم ۵ر۔ علم الصرف حصہ سوم ۶ر۔ علم النحو ۶ر۔ عوامل النحو ۵ر۔ عربی صفوۃ المصادر مع لغات جدیدہ ۶ر۔ روضۃ الادب فی تسہیل کلام العرب ۸ر

ان رسالوں پر ملنے کے پتے اگرچہ مختلف لکھے ہوئے ہیں لیکن غالباً یہ سب کے سب شفیق احمد صاحب ناظم اشاعت الادب بازار بلیماران دہلی سے مل سکتے ہیں۔

مستقبل۔ یہ ایک ماہانہ رسالہ ہے جو فروری ۱۹۲۷ء سے بالائے قلعہ علیگڈھ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اسکے مدیر حضرت ساغر نظامی سیمابی ہیں جو ادیب اور ناظم و ناشر کی حیثیت سے آگرہ کے رسالہ پیمانہ کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

یہ رسالہ بلحاظ اپنی تقطیع۔ کاغذ۔ لکھائی اور چھپائی کے اچھا ہے اور جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے وہ "ایک ہمہ گیر ادبی رسالہ" ہے جس میں ملی اور اقتصادی مباحث بھی ہیں۔ تصویروں کا بھی انتظام ہے اور زیر تنقید نمبر میں رضا خاں پہلوی کی تصویر دی گئی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ یہ رسالہ ترقی کرے گا۔ حجم تین جز قیمت للعہ سالانہ۔

شذرات

۲۰ مارچ کو جامعہ میں کھیل اور ورزش کا سالانہ مقابلہ اور تقسیم انعامات کا جلسہ تھا۔ شہر کے معزز حضرات اور اسمبلی کے ممبر بھی اس جائز ینگمشن کا تماشا دیکھنے اور طلبہ کی ہمت بڑھانے کیلئے تشریف لائے تھے۔ مہمانوں کی نشست وغیرہ کا انتظام اور کھیلوں کی ترتیب قابل تعریف تھی اور نتیجوں سے ظاہر ہوا کہ ورزش کا معیار خاصا بلند ہو گیا ہے۔ لوگوں کو سب سے زیادہ لطف "بورا ڈھکیل" کے دیکھنے میں آیا جس میں ایک شجاعت مآب عزم و ثبات کے چٹان بنے ہوئے لوگوں کو زمین ناپنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اشادوں کی دوڑ بھی لطف سے خالی نہ تھی۔ بڑے بڑے ثقہ حضرات مثلاً شیخ الجامعہ، استاد فارسی، ناظم دینیات اور جامعہ کے دونوں مدیروں کو دامن گرداننے، سینہ تانے، اُفتاں و خیزاں دوڑتے دیکھ کر بیچارے تماشائی خصوصاً طلبہ ہنسی کے مارے لوٹے جاتے تھے۔ کھیلوں کے ختم ہونے کے بعد مسٹر پٹیل صدر اسمبلی نے انعامات تقسیم کئے مگر افسوس ہے کہ مدیران جامعہ کو کوئی انعام نہیں ملا۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب اپریل کے آخری عشرہ میں بہار کے دورہ کو ختم کرنے کیلئے تشریف لیجائیں گے۔ ممدوح کا باوجود طبیعت کی ناسازی کے شدید گرمی کے زمانہ میں قومی تعلیم خدمت کے لئے نکلنا ہمارے دلی شکریہ کا مستحق ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی میں تقسیم اسناد کا جلسہ ۱۹ر فروری کو منعقد ہوا۔ وائس چانسلر کے خطبہ میں بہت سی اہم تبدیلیوں کا ذکر تھا جو گذشتہ سال عمل میں آئیں مثلاً ثانوی تعلیم کی نگرانی یونیورسٹی سے نکال کر ایک علیحدہ منتظم جماعت کی سپرد کی گئی۔ اسکول کے کل درجوں میں تعلیم اور امتحان کا ذریعہ بجائے انگریزی کے دیسی زبان قرار دی گئی۔ امتحانوں میں معیار کے گرنے کا تدارک

کیا گیا۔طب مغربی کی تعلیم میں بہت توسیع ہوئی۔
وائس چانسلر صاحب نے یونیورسٹی کے چند اساتذوں اور طالبعلموں کی خدمات کا اعتراف کیا جنہوں نے پچھلے سال علمی سائل پر تحقیقات کی ہے ان میں سے ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی ڈاکٹر نرنجن پرشاد چکرورتی اور ڈاکٹر پربھوده چرن بگچی جنہوں نے علم الالسنہ اور آثار قدیمہ پر قابل قدر مقالات لکھے ہیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

وائس چانسلر صاحب کی تقریر کا وہ حصہ خاص طور پر اہم ہے جس میں اُنہوں نے یونیورسٹی کے برکات کا ذکر کیا ہے۔علاوہ خالص علمی فوائد کے ممدوح کے نزدیک یونیورسٹی سے ملک کو سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا ہے کہ مختلف مذاہب مختلف نسلوں مختلف حصوں کے لوگوں کے عمل،خیال اور مذاق میں ایک طرح کا اتحاد اور اشتراک پیدا ہوتا ہے جس پر احساس قومیت کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ہمیں وائس چانسلر صاحب کے اس خیال سے بالکل اتفاق ہے۔ لیکن اُن سے ایک بات پوچھنا ہے کہ انہوں نے جو اپنی تقریر میں حکومت سے اظہار عقیدت اور اُسکی جا و بیجا تعریف کی ہے اس سے کیا چیز پیدا ہوتی ہے اور اس پر کس احساس کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ سرکاری یونیورسٹیوں میں بھی جہاں شاذ و نادر خدا شناس،محب وطن اور جری اساتذہ موجود ہیں طلبہ کے دل میں دینداری اور قومیت کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ان جذبات میں وہ گرمی اور وہ سوز کہاں جسے ہمارا دل ڈھونڈھتا ہے۔

آتش آں نیست کہ بر شعلۂ او خندد شمع
آتش آنست کہ بر خرمن پروانہ زند

گذشتہ ماہ بنگال کی خواتین نے پہلی بار ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کی جس میں علاوہ اور تجاویز کے مندرجہ ذیل مفید تجاویز منظور ہوئیں:۔

(۱) عورتوں کو علمی کی تعلیم دینے کے لئے ایک کالج قائم کیا جائے۔

(۲) عورتوں کی تعلیم ورزش اور حفظان صحت پر زور دیا جائے۔

(۳) ہندوستان کے قدیم فنون لطیفہ اور صنعت وحرفت کی تعلیم عورتوں کے مدارس میں لازمی قرار دیجائے۔

ہم خواتین بنگال کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے خود اپنی تعلیم کی طرف توجہ شروع کی ہے اور دعا کرتے ہیں کہ اُن کی یہ کانفرنس عملی حیثیت سے بھی اتنی ہی کامیاب ہو جتنا اسکا پہلا جلسہ تجاویز اور مباحثہ کے لحاظ سے تھا ہمیں یہ دیکھکر اور بھی خوشی ہوئی کہ اس جلسہ میں چند مسلمان خواتین شریک تھیں ان کی سرگرمی کو ہم بنگال کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے بہت امید افزا سمجھتے ہیں۔

کچھ دن ہوئے صوبہ متحدہ کی حکومت نے اڈیٹر صاحب زمانہ کی تجویز کو عملی جامہ پہنانیکے لئے ہندوستانی اکادمی کا قیام منظور کیا ہے۔ اسکی زیر نگرانی ہندی اور اُردو زبان میں مختلف علوم وفنون پر مفید کتابیں ترجمہ، تالیف اور تصنیف کے ذریعہ مہیا کی جائیں گی اور ان دونوں زبانوں کو ترقی دینے کے لئے ہر طرح کی کوششیں عمل میں لائی جائیں گی۔ غالباً اسکے مقاصد میں یہ بھی داخل ہے کہ ہندی اور اُردو سے سنسکرت اور عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ کو دور کرکے دونوں زبانوں کی اجنبیت کو کم کرنے اور ایک متحدہ "ہندوستانی زبان" بنانیکی کوشش کیجائے۔ اس اکادمی کے صدر اور نائب صدر ایسے حضرات مقرر ہوئے ہیں جو ہندی اور اردو سے یکساں محبت رکھتے ہیں اور جن کے علم وفضل مذاق اور وسعت نظر کا ہر شخص قائل ہے یعنی ڈاکٹر تیج بہادر صاحب سپرو اور ڈاکٹر تاراچند صاحب۔ ممبروں کے تقرر

میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ علاوہ اُن حضرات کے جو اُردو اور ہندی کی خدمت میں سرگرم ہیں صوبہ کی سب یونیورسٹیوں کے افسران اعلیٰ بلا شرط بعض دوسری اسخن فہمی ’’ تبرک کے خیال سے داخل کر لئے جائیں۔

نومبر ۱۹۲۶ء میں جامعہ کے ایک مدیر سے ڈاکٹر تاراچند صاحب نے اس اکادمی کے مقاصد کے بابۃ گفتگو کی تھی اور اتحادِ عمل کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مدیر جامعہ نے اکادمی کی ضرورت اور اُسکے بانیوں کی قابلیت کا اعتراف کرنیکے بعد اس پر تعجب ظاہر کیا تھا کہ اس اکادمی کو صوبہ کی وزارت تعلیم کے ماتحت رکھا گیا۔ طویل بحث کے بعد جس میں ضمناً قومی تعلیم کا مسئلہ بھی گیا تھا۔ آخر میں مدیر جامعہ نے یہ کہا کہ چونکہ اکادمی سرکاری ہے اس لئے جامعہ والوں کا تعلق اس سے غیر سرکاری رہے گا۔

مدیر جامعہ نے جو اعتراض اکادمی اور وزارت تعلیم کے تعلق پر کیا تھا اُسمیں تنگ نظری یا تعصب کو دخل نہیں تھا۔ اعتراض محض اس بنا پر تھا کہ اکادمی کے مقاصد خالص علمی ہیں لیکن وزارت تعلیم اصولاً علم اور تعلیم کو سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہے اور عملاً صوبہ متحدہ کی وزارت کے متعلق تو اس میں بھی شبہ ہے کہ وہ کسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اس لئے اکادمی کا اُس سے تعلق رکھنا علوم و فنون کی ترقی کا باعث نہیں ہو سکتا۔

یورپ کے معدودے چند مہذب ممالک میں سے کسی ملک میں کوئی اکادمی براہ راست حکومت کے ماتحت نہیں ہے۔ سب سے زیادہ اثر حکومت کا علمی اداروں پر فرانس اور جرمنی میں ہے لیکن اُن ممالک میں وزراء دوسری طرح کے لوگ ہوتے ہیں وہاں وزارت تعلیم کیلئے کم سواد لوگوں کا انتخاب کسی طرح ممکن نہیں بلکہ عموماً ایسے لوگ اس عہدے پر سرفراز ہوتے ہیں جن کے علم و فضل کا سکہ تمام ملک پر بیٹھ چکا ہو۔ اس پر بھی اکادمی کے علمی جدوجہد میں ہمیشہ سرکاری

تعلق کے سبب سے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ہندوستان اور اس میں بھی صوبہ متحدہ کی وزارتیں اس "بارِ امانت" کی کہاں تک متحمل ہو سکتی ہیں۔

یورپ میں مستشرقین اور علوم شرقی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات آج کل لیڈن یونیورسٹی کے پروفیسر اسنوک ہرگرونیے کو جو عربی کے مستند عالم اور مسائل حجاز کے بہترین ماہر سمجھے جاتے ہیں ستر برس کی عمر ہونے پر مبارکباد دے رہے ہیں۔ ہم بھی اس مبارکباد میں شامل ہوتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ پروفیسر صاحب کو علم و فضل کے ساتھ انصاف اور ہمدردی کے اوصاف بھی عطا فرمائے۔

---

۲۳ فروری کو لندن یونیورسٹی کے شعبہ علوم مشرقی کی دسویں سالگرہ منائی گئی۔ اس شعبہ کی زیر نگرانی عربی، فارسی، ہندوستانی، چینی، سواحلی اور ۶۱ دیگر زبانوں کی تعلیم دیجاتی ہے۔ اسکی سالانہ آمدنی ۲۴۰۰۰ پاؤنڈ ہے جسکا کچھ حصہ حکومت ہند اور کچھ حکومت برطانیہ دیتی ہے اور باقی مختلف انجمنوں سے ملتا ہے۔ اس سال ایک بڑی لنچ پارٹی دی گئی جس میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ ۱۵۰۰۰۰ کا مستقل سرمایہ جمع کر لیا جائے تاکہ اسکی آمدنی سے کل مصارف پورے ہو سکیں۔ اس موقعہ پر لارڈ برکن ہیڈ نے تقریر فرمائی جس میں آپنے اس بات پر زور دیا کہ سلطنت برطانیہ کے چلانے والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ شرقی زبانیں جانتے ہوں۔ آپنے چین کی مثال دی کہ اگر وہاں کے انگریز چینی زبان کے ماہر ہوتے تو یہ روز سیاہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ سر ٹامس آرنلڈ نے جو علاوہ علمی مشاغل کے ہندوستانی طلبہ کے "سیاسی نگراں" بھی ہیں، وزیر ہند کا شکریہ ادا کیا۔

اس سے ہمارے ناظرین کو اندازہ ہوگا کہ انگریز مدبروں کے نزدیک علمی اداروں کا مقصد کیا ہوتا ہے اور ہندوستانی اکادمی یا کوئی اکادمی ان استادوں یا انکے طوطی صفت شاگردوں کے تعلق سے کن مقاصد کے حصول کا آلہ بن سکتی ہے۔

۶۸۶

رسالہ

جامعہ

جلد ۸ | شوال المکرم ۱۳۴۵ہجری مطابق اپریل ۱۹۲۷ء | نمبر ۴

سہل بن ہارون

سید محمد کرد علی رئیس المجمع العلمی العربی دمشق نے ایک مقالہ اس مشہور مصنف و انشا پرداز کے حالات میں لکھکر اپنے 'مجمع' کے ایک جلسہ میں دسمبر ۱۹۲۶ء میں پڑہا تھا۔ یہ مقالہ المقتطف بابتہ فروری و مارچ ۱۹۲۷ء میں چھپا ہے باوجود اسکے کہ سہل بن ہارون کا نام جاحظ کی کتابوں میں اکثر آتا ہے اور خود اس کی شہرت بحیثیت مصنف اور انشا پرداز کسی سے کم نہیں لیکن اس کے مفصل حالات کیاب بلکہ نایاب ہیں۔ نہ قفطی نے اخبار الحکما' میں نہ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں نہ بیہقی نے حکماء الاسلام' میں نہ سمعانی نے الانساب' میں اور نہ ابن الانباری نے طبقات الادبا' میں اسکا کوئی ذکر کیا ہو ذرا ذرا سے حالات صفدی کی' الوافی بالوفیات' صلاح الدین کتبی کی' فوات الوفیات' اور عیون التاریخ'، ابن نباتہ کی شرح رسالہ ابن زیدون'، ابن بدرون کی شرح قصیدہ ابن عبدون اور ؟ کی' المضاف والمنسوب' میں ملتے ہیں۔ فان کرامر نے بھی سہل

کے کچھ حالات لکھے ہیں اور جو دوسرے تذکرہ نویسوں نے لکھ دیا تھا اسی پر بنیاد رکھی ہے تعجب یہ ہے کہ اس نے اس امر کا بالکل ذکر نہیں کیا کہ سہل بن ہارون خلیفہ ہارون الرشید کے درباریوں میں تھا۔ وہ کہتا ہے کہ سہل اور جاحظ کی ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوئی حالانکہ جاحظ نے اپنی ان کتابوں میں جو اب چھپ چکی ہیں اکثر سہل کی گفتگو نقل کی ہے۔

سہل بن ہارون شہر میسان میں جو واسطا و بصرہ کے درمیان واقع تھا پیدا ہوا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ دستمیسان میں جو اہواز، واسطا و بصرہ کے درمیان ایک قصبہ ہے اسکی پیدائش تقریباً دوسری صدی ہجری کے نصف اول کے اواخر میں ہوئی۔ اسکے نسبت کا پتہ اس سے زیادہ نہیں چلتا کہ وہ سہل بن ہارون بن راہیوں (راہبون) تھا کنیت اس کی ابو عمرو تھی، فارسی الجنس تھا، پیدائش کے لحاظ سے اہوازی یا خوزی تھا اور نشو و نما عراق میں ہوئی تھی پھر پتہ چلتا ہے کہ وہ بصرہ چلا گیا یہ نہیں معلوم کہ کس سن میں، اس زمانہ میں بصرہ تمام ممالک اسلامی میں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تمام دنیا میں مدینۃ العلم کی حیثیت رکھتا تھا یا جیسا کہ اس کے متعلق کہا گیا ہے "قبۃ الاسلام و خزانۃ العرب" تھا۔ وہاں ہر قسم کے علوم انسانی کیا اصول اور کیا فروع سب کی تحصیل ہوتی تھی اور بڑے بڑے نامور اہل علم کا مرکز تھا، ایسے مقام کی علمی مجالس میں سہل بن ہارون پروان چڑھا اور اسکی عقل نے انکے معارف کے نور سے جلا حاصل کی یہاں کے علما سے اس نے درس لیا اور اسمیں کسے شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ علما ہر قسم کے فنون و آداب میں بلند ترین پایہ کے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ بصرہ میں کیا بلکہ تمام عالم اسلامی میں عربی تمدن، ایرانی، رومی اور ہندی تمدن کے اثر سے ایک نئی صورت اختیار کر رہا تھا، اور فلسفے کے مختلف مذاہب اسلامی مجلسوں میں زیر بحث نظر آتے تھے گویا قدیم حکمت کے سمندر کا جزر و مد علماے اسلام کو ساحل پہ کبھی ادہر ڈال دیتا تھا اور کبھی ادہر اور شہر بصرہ کی مثال اس سمندر میں ایک خلیج کی تھی جسکا

پانی کبھی گھٹتا تھا اور کبھی بڑھتا تھا لیکن اسکے علما برابر اس بحر میں غوطہ زن رہتے اور رنگ برنگ کے موتی اور نادر جواہرات نکال لاتے۔ اس زمانہ میں لوگ اپنے اس دین کی طرف جو ابھی ابھی مدون ہوا تھا شدت سے متوجہ تھے اور اقوام ماضیہ کے علوم سے وہ وہ دور کی گوٹیاں لاتے تھے جنکا وہم وگمان بھی مشکل سے ہوسکتا تھا اس فضا میں سہل بن ہارون کی عقل نے نشو ونما پائی اور پھر ایسی سرزمین میں جو عقل کی ترقی کے لئے خاص صلاحیت اپنے اندر رکھتی تھی اور آزادی فکر جہاں کی ہوا میں سرایت کرگئی تھی۔ یہ نہیں معلوم کہ سہل نے روم وفارس شام ومصر کی سیاحت کی تھی یا نہیں لیکن اغلب یہی ہے کہ اس کے سفر کے حدود ایک طرف شہر رقہ سے جو دیار مصر میں ہے اور دوسری طرف رصافہ شام سے جو شام کی سرحد ہی پر واقع تھا متجاوز نہیں ہوے تھے اور زیادہ تر اسکا قیام بصرہ اور بغداد ہی میں رہا۔ بغداد ان دنوں دنیا کا بہترین شہر تھا۔ وہاں کی ہر چیز میں ایک جدت تھی۔ خواہ وہ اس کی عمارتیں اور سڑکیں ہوں یا اس کے بسنے والوں کی عقلیں اور اس کے علما کا عروج وہاں ہر چہار طرف سے لوگ صنعت انسانی کے اعلیٰ نمونے اور عقل انسانی کے بہترین نتائج لیکر آتے تھے اور یہ تو مسلم ہے کہ دارالسلطنت کی مثال ایک بازار کی ہے جہاں ہر وہ چیز جو ملک میں پیدا ہوتی ہے ضرور پہنچتی ہے۔

ہمیں تحقیق کے ساتھ یہ نہیں معلوم کہ سہل کا باپ کہاں پیدا ہوا تھا اسکا مذہب کیا تھا اور نہ یہ کہ سہل کی ماں کہاں کی تھی اور اسکی تربیت کیسی تھی، نہ یہی معلوم کہ اس کے وطن میں اسکے معلم کس قسم کے تھے اور بصرہ میں آکر اس کے مخصوص اساتذہ کون کون تھے۔ اور نہ انکے علاوہ ان دوسرے اسباب کا علم ہے جنکا اخلاق وعادات کی تکمیل اور مہارت اور سلیقے کی تربیت میں بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ کسی کے بچپن میں جس قسم کے اسباب مہیا ہوتے ہیں اسکی طبیعت کی ویسی ہی ساخت ہوجاتی ہے اور زندگی کے آخری ایام میں اس طبیعت کا بدلنا محال نہیں تو از بس مشکل ضرور ہوجاتا ہے۔ بایں ہمہ عقل یہی کہتی ہے کہ قانون وراثت کے مطابق جس طرح اس کی رگوں میں ایرانی خون دوڑتا تھا اسی طرح اس کی فطرت میں بھی ایرانی حکمت، نظام اور

ادب کافی حد تک جاگزیں ہونگے۔ پھر اس پر طرہ عربی ثقافت اس طرح عرب وعجم کے امتزاج سے اس کی دماغی قوتیں جس اعلیٰ معیار پر پہنچی ہونگی اسکا اندازہ کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ بسیرآتما اور اضافہ کیجئے کہ بنی عباس کی سلطنت سلطنتوں کی سرتاج تھی اور بصرہ اپنی صفائی، خوبی، عزت اور قوت کے لحاظ سے شہروں کا سردار، پھر سہل جس زمانے میں پیدا ہوا تھا وہ غالباً دنیا کی تاریخ کے بہترین زمانوں میں ایک تھا۔ پچھم سے پورب تک ایک حکومت تھی اور روئے زمین پر اندلس کے علاوہ جو بنی مروان کے ہاتھ میں تھا اور کوئی دوسری اسلامی سلطنت نہیں تھی نہ داخلی فتنوں کا پتہ تھا نہ خارجی فساد کا۔ لوگ امن وامان سے زندگی بسر کرتے تھے اور بنی ہاشم کی ماتحتی میں جو کچھ پاتے تھے اس پر خوش وخرم تھے۔ علویوں میں سے اکا دکا اگر کوئی اٹھتا بھی تھا تو اسے عباسی فوجیں ایک دم میں مغلوب کر لیتی تھیں۔ غرض سلطنت کے مخالفین کا بالکل زور نہ تھا اور مشرق ومغرب کی تمام سلطنتیں خلیفہ عرب کی رضاجوئی میں سرگرم نظر آتی تھیں۔ ایشیا یا یورپ کے کسی بادشاہ کے سفیر کو اگر بنی عباس کے دربار میں باریابی مل جاتی تو یہ اس کے لئے فخر کا باعث ہوتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ سہل بن ہارون شیعی تھا اور اس زمانہ کے عراقی شیعہ عام طور پر معتزلہ تھے لیکن کوئی واقعہ اسکا ایسا نہیں ملتا جس سے معلوم ہو کہ وہ صحابہ کرام میں سے کسی کو بھی برا بھلا کہتا تھا بلکہ وہ تو زندہ ومردہ دونوں کے ساتھ ایک طرح انصاف کے برتاؤ کیلئے مشہور تھا اور یہی ثابت ہے کہ وہ متکلمین کی ان بحثوں میں ابھار رہا ہو جو اس وقت اپنے شباب پر تھیں خصوصاً بصرہ اور دارالسلام بغداد میں بعض لوگوں نے اس پر یہ تہمت رکھی ہے کہ وہ شعوبی تھا جو عرب کی تحقیر کیا کرتا تھا اور عجم پر عرب کی کسی فضیلت کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اگر یہ تہمت صحیح ہے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی شخص شیعی اور شعوبی دونوں کس طرح ہو سکتا ہے۔

شعوبی اللہ تعالیٰ کے اس قول کیطرف منسوب ہیں "وجعلنا کم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم" مذہب شعوبیہ کی ابتدا خلفائے راشدین کے زمانے کے بعد ہوئی اور

اسی کی وجہ یہ تھی کہ عصبیت رکھنے والے لوگ ایک دوسرے سے بڑی شدت کے ساتھ دست و گریباں ہونے لگے تھے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نسل و جنس پر لوگ فخر کرنے لگے حالانکہ یہی چیز تھی جسکو مٹانے کیلئے اسلام آیا تھا اور اگر امت میں نسل و قوم پر انسان کی فضیلت کا مدار ہوتا تو سلمان فارسی، صہیب رومی، اور بلال حبشی کا رسول اللہ کی نگاہ میں یہ مرتبہ ہرگز نہ ہوتا۔ دین میں تو فضل کی بنیاد تقوی ہے اور بس۔ اس کے علاوہ ابن قتیبہ کا خیال ہے کہ عربوں کے خلاف شعوبیت کا زہر پھیلانے والے اکثر ذلیل اور کمینے لوگ اور نبطی اوباش یا شہر کے آوارہ گرد تھے۔ کوئی شریف باوقعت اور صاحب دیانت عجمی ان میں شامل نہ تھا۔ ایسی حالت میں سہل پر سے شعوبیت کی تہمت بلا خوف تردید دور کی جاسکتی ہے۔ اسکا اعتدال ہرگز اسے اسکی اجازت نہ دیسکتا تھا۔ سہل دنیاوی لحاظ سے ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا یہانتک کہ عباسیوں کے دو سب سے بڑے خلفا یعنی ہارون رشید اور مامون کے مقرب لوگوں میں سے تھا علم و فضل کے لحاظ سے وہ امت عربیہ میں بیان اور حکمت کے اماموں میں سے ایک خیال کیا جاتا ہے اور اپنی فہم و فراست کی وجہ سے 'بزرجمہر اسلام' پکارا جاتا ہے۔

جاحظ نے سہل کی تعریف یوں کی ہے: سہل نرم دل، خوشرو، خوبصورت، خوش کلام اور معتدل القامۃ تھا۔ جانچنے سے پہلے انسان اس کی حکمت کا قائل ہو جاتا تھا گفتگو سے پہلے اسکی تیزی فہم کا اقرار کرلیتا تھا۔ امتحان سے پہلے اس کی عقل کا لوہا مان لیتا تھا اور پوچھ گچھ سے پہلے اسکی شرافت کا دم بھرنے لگتا تھا۔ جاحظ اسکا سرقت کا ملنے جلنے والا تھا۔ حرانی (ابراہیم بن ذکوان، خلیفہ ہادی باللہ کا کاتب اور وزیر) سے کسی نے پوچھا کہ تم سے اور سہل سے بڑی دوستی ہے۔ ذرا اس کے حالات بیان کرو کہ ہم لوگ بھی جانیں۔ تو اس نے جواب دیا وہ گویا مجسم خیر ہے، کثیر العلم ہے، وسیع الحلم ہے۔ گفتگو کے وقت جھوٹ نہیں بولتا۔ دلگی کے وقت غصہ نہیں ہوتا۔ بارش کی طرح ہے کہ جہاں برستی ہے نفع پہنچاتی ہے، پانی کی طرح ہے کہ لوگوں کو صفائی بخشتا ہے اور پیاسوں کی پیاس بجھاتا ہے۔ ہوا کی طرح ہے کہ اس سے لوگوں کی زندگی قائم رہتی

ہے۔ اس آگ کے مانند ہے جس سے سردی میں ٹھٹھرنے والا گرمی حاصل کرتا ہے اور اسکی شمعدان کی طرح ہے جس میں طرح طرح کی روشنیاں جھلکتی ہیں۔ یہ سہل کی دو تصویریں ہیں جو دو بے مثال مصوروں نے بنائی ہیں۔ ایسے مصور جو اس کے ساتھ رہتے تھے اور اسکے اخلاق وعادات سے واقف تھے

لوگ سہل پر بخل کا الزام لگاتے ہیں اور اس کے متعلق لطیفے اور چٹکلے بیان کرتے ہیں جاحظ نے اسکا شمار 'بخیل عقلمندوں' اور 'عالم بخیلوں' میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے علم میں صرف دو آدمیوں نے بخل پر کتاب لکھی ہے ایک سہل بن ہارون اور دوسرے ابو عبد الرحمن الثوری "اور فی الحقیقت بخل ایرانیوں کی طبیعت میں اسی طرح غالب ہو چکی جس طرح سخاوت عربوں میں اس لئے سہل عربوں کی فضول خرچی کے جو مظاہر دیکھا کرتا تھا اسکا اقتضا یہی تھا کہ وہ کفایت شعاری اور جزرسی کے متعلق اپنے غیر معمولی خیالات کا اظہار کر کے اپنی قوم کو اس مرض سے بچاتا اس کے علاوہ جہاں کہیں افراط ہے وہاں تفریط کا ہونا لازمی ہے یہ بھی ممکن ہے کہ اس پر بخل کا اتہام محض زیب داستان کے لئے ہو اور اس سے غرض صرف لطیفوں اور چٹکلوں کا اضافہ ہو جاحظ بیان کرتا ہے کہ ایک آدمی سہل بن ہارون سے ملا اور اس نے یوں کہا: مجھے اتنا دیدے جس سے تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچیگی۔ سہل نے پوچھا: میرے بھائی وہ کیا ہے؟ - اس نے جواب دیا ایک درہم۔ سہل نے کہا: تو نے ایک درہم کی بڑی ناقدری کی وہ دنیا میں خدا کا ایسا فرمان ہے جس کی نافرمانی نہیں ہو سکتی۔ وہ دس کا دسواں حصہ ہے، دس سو کا سو ہزار کا اور ہزار درہم ایک مسلمان کا خون بہا ہے۔ تو نے دیکھا کہ ایک درہم جسے تو نے اتنا ذلیل سمجھا تھا کہاں پہنچا اور کیا بیت المال سوا اسکے کچھ اور ہے کہ ایک درہم دوسرے کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ وہ آدمی بیچارا گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا اور اگر وہ چلا نہ جاتا تو یہ ہرگز چپ نہ ہوتا۔

دعبل خزاعی جو شاعر بھی تھا بیان کرتا ہے: ایک روز ہم لوگ سہل بن ہارون کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں دیر ہو گئی یہاں تک کہ سہل کو بھوک بہت ستانے لگی

تو اس نے دن کا کھانا طلب کیا۔ ایک بڑی طشتری لائی گئی جس میں شوربہ تھا اور ایک سوکھے ہوئے بڈھے مرغ کا گوشت۔ اب اس نے ایک روٹی کا ٹکڑا لیا اور طشتری میں مرغ کا ایک ایک عضو تلاش کرنے لگا۔ سب کچھ تو موجود تھا مگر سر نہ ملتا تھا، تھوڑی دیر تک تو وہ سر جھکائے رہا پھر غلام کو مخاطب کرکے کہنے لگا! سر کہاں ہے؟" اس نے کہا میں نے پھینکدیا" پوچھا کیوں؟ کہا میں نے سوچا کہ آپ اُسے کیا کھائینگے۔ سہل نے کہا " تو نے یہ کیسے سوچا۔ قسم خدا کی میں اسے بھی نہیں پسند کرتا کہ کوئی اسکا پیر پھینکدے چہ جائیکہ سر اور اگر تیرے اس فعل میں بدشگونی کے علاوہ کوئی دوسری خرابی نہ بھی ہوتی جب بھی میں اسے اچھا نہ سمجھتا کیا تو نہیں جانتا تھا کہ سر تمام اعضا کا رئیس ہے، اس سے شگون لیا جاتا ہے۔ اسی میں حواس خمسہ ہوتے ہیں۔ اسی سے مرغ بانگ دیتا ہے اور اگر مرغ کی بانگ نہ ہوتی تو اُسے کون پوچھتا اسی میں اسکی کلغی ہوتی ہے جو متبرک سمجھی جاتی ہے اسی میں اس کی آنکھ جو صفائی میں ضرب المثل ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شراب کیسی جیسے مرغ کی آنکھ۔ اور اسی میں اسکا دماغ ہوتا ہے جو درد گردہ کے لئے بے نظیر دوا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے تو آجتک کوئی ہڈی ایسی نہیں دیکھی جو دانت تلے اس سے زیادہ نرم معلوم ہو۔ اگر تجھے ایسی ہی نوابی سوجھی تھی کہ تو اُسے نہیں کھا سکتا تھا تو ہم تو کھانے کو موجود تھے۔ کیا تجھے خبر نہیں تھی کہ وہ ٹنگڑی اور گردن سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ جا دیکھ کمبخت کہاں پھینکا تو نے" غلام نے جواب دیا کہ قسم خدا کی معلوم نہیں کہاں پھینکا" سہل نے کہا" خدا کی قسم میں جانتا ہوں تو نے جہاں پھینکا ہے۔ واللہ تو نے اسے اپنے پیٹ میں ڈال دیا ہے جا خدا تجھ سے سمجھے۔"

سہل نے جب بخل پر کتاب لکھی تو اسے بدیۃً حسن بن سہل کے پاس بھیجا اور اس سے کچھ انعام کی خواہش ظاہر کی۔ حسن نے جواب میں لکھا: تو نے اس چیز کی تعریف کی جسے خدا نے بُرا ٹھہرایا ہے اور اس چیز کو سراہا ہے جس کی اللہ نے مذمت کی ہے۔ تیرے الفاظ کی خوبی کسی طرح تیرے معانی کی خرابی کا بدل نہیں ہوسکتی۔ ہم نے تیری اس مدح سرائی کا اجر یہی ٹھہرایا ہے

کہ تیری بات قبول کرلیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اب ہم تجھے کچھ دے نہیں سکتے۔ حسن بن سہل مامون کا وزیر تھا اور خود بھی ایرانی النسل تھا لیکن سخاوت میں آپ ہی اپنی مثال تھا۔ انہیں حکایات کے ساتھ ساتھ سہل بن ہارون کیطرف یہ شعر بھی منسوب کیا جاتا ہے اور اسکی نسبت ثابت بھی ہوا۔

وما العیش الا ان تجود بنائل   والالقاء الاخ بالخلق العالی

(زندگی بجز اس کے کچھ نہیں کہ تو جی کھول کر بخشش کرے اور اپنے بھائی سے اچھا برتاؤ کرے)

سمجھ میں نہیں آتا کہ جو آدمی یہ شعر کہے اور اس کے معنی کو سمجھ کر کہے پھر اسکے بخل کی یہ حالت ہو جو بیان کی جاتی ہے۔ اور جو مال کو عزیز رکھتا ہے اور اسے جمع کرتا رہتا ہے اس کی مثال سرد ملک کے رہنے والوں کی سی ہے کہ وہ دو دو اور تین تین سال کے لئے ذخیرہ فراہم کر رکھتے ہیں بخلاف اس کے گرم ملک والے آج کو چھوڑ کر کل کی فکر کبھی نہیں کرتے۔ گولڈ سیہر کا خیال ہے کہ سہل بن ہارون نے بخل کی جو مدح سرائی کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے شعوبیت میں بہت غلو تھا اور چاہتا تھا کہ اس طرح عربوں کی جو سخاوت کو اپنے قومی مفاخر میں سے سمجھتے ہیں بے قدری کرے۔

ظاہر ہے کہ جس آدمی کی بڑائی جاحظ کرے اور جس کی لیاقت اور مہارت کا وہ قائل ہو اور جس کی گفتگو وہ اپنی کتابوں میں نقل کرے اور جسکا ذکر کرتے وقت وہ اظہار پسندیدگی کرے اسکا پایہ علم و ادب کے لحاظ سے بہت بلند ہوگا چنانچہ سہل یکتائے روزگار تھا اور اسکا نام بڑا تھا جس چیز کو ہاتھ میں لیتا تھا اسے آسمان پر پہنچا دیتا تھا۔ اس کے تمام ہم عصر اس کے فضل و کمال کے قائل تھے اور کوئی اسے حسد کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ غرض قابلیت میں سہل بے نظیر تھا اور اپنے فن میں دستگاہ اعلیٰ رکھتا تھا۔ اسکا اندازہ کرنے کیلئے صرف ایک حقیقت کا بیان کافی ہوگا وہ یہ کہ جاحظ جیسا آدمی جو بلاغت میں سہل کے پہلو بہ پہلو چلتا ہے اور علم و عقل میں جس کا نام ضرب المثل ہو رہا ہے خود اپنے متعلق بیان کرتا ہے کہ اکثر ہوا ہے کہ میں نے ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے جس کی عبارت بھی بہت سلجھی ہوئی تھی اور اسے اپنے نام سے

منسوب کیا ہے تو کسی نے بھی اسکی طرف توجہ نہ کی۔ پھر اسی کے بعد ہی ایک دوسرا مضمون لکھا ہے جو مرتبے اور مذاق کے لحاظ سے قطعاً پہلے مضمون سے پست ہے اور اسے عبداللہ بن مقفع یا سہل بن ہارون یا کسی ایسے متقدم کیطرف نسبت دیدی ہے جس کا نام عام طور پر مشہور ہو چکا ہے تو لوگ اسکی طرف بے طرح مائل ہوئے ہیں اور اسے نقل کرنیکے لئے بیتاب نظر آنے لگے ہیں (یعنی سہل کا اپنے زمانہ کے لوگوں پر اتنا سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ جو تصنیف اس سے منسوب ہوتی تھی اسے فوراً قبول عام کی سند مل جاتی تھی) سہل کا انداز بیان حضرت علی بن ابی طالب سے بہت ملتا ہوا ہے بتکلف تحریر میں نام کو نہیں ہوتا لیکن پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ لفظ دل میں گھر کرتا جاتا ہے ۔ یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ سہل بن ہارون، جاحظ اور ابن مقفع ایک ہی کانٹے پر تل سکتے ہیں. کسی نے کہا ہے کہ سہل کاتب سلاطین ہے، اور جاحظ مولف دواوین، اسکا کلام گویا ایک نغمہ ہے جس کی انتہا اس کے ترنم سے معلوم ہو جاتی ہے اور جس کے پڑھنے سے انسان پر ایک قسم کا کیف طاری ہو جاتا ہے اور جی خوش ہو جاتا ہے۔ عبارت کو مسجع کرنیکی کوشش نہیں کرتا یہ دوسری بات ہے کہ کہیں خود بخود ہو جائے بڑے پائے کے انشا پردازوں کی یہی شان ہے۔ بڑے بڑے اور موٹے موٹے الفاظ نہیں لاتا بجز ایسی جگہ کے جہاں موضوع اسکا مقتضی ہو اور شاید ہی سہل کا کوئی قول ایسا ہو جس میں کوئی قابل تعریف نکتہ یا قابل اخذ حکمت موجود نہ ہو گویا سہل کی تحریر میں انسان معنی کو لفظ سے پہلے پڑھ لیتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ کوئی تحریر اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتی جبتک وہ پر از معلومات نہ ہو اور اسکا طرز و انداز یکگونہ معنی خیز نہ ہو سہل کی عبارت ایسی ہی ہوتی ہے اور اسے پڑھ کر انسان کچھ نہ کچھ سیکھتا ضرور ہے۔ دوسروں کی تحریر میں چند اچھے الفاظ ملیں گے اور کہیں کہیں اچھی ترکیبیں لیکن اس کے یہاں ایک ایک لفظ معنی سے لبریز ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوتے ہیں کہ سننے والے پر ایک خاص اثر ڈالتے ہیں۔ اس کے یہاں بلاغت حجت اور دلیل کا کام دیتی ہے بخلاف اوروں کے جہاں اس سے مراد محض الفاظ میں ظاہری

حسن یا توازن اور فقرات میں ایک قسم کا ترنم ہوتا ہے۔

سہل اشعار بھی کہا کرتا تھا اور اس کے اکثر شعر، معلوم ہوتا ہے، کہ دل سے نکلے ہیں۔ اور اجتماعی مفاد کو مدنظر رکھ کر کہے گئے ہیں۔ جاحظ نے اسے ان خطیبوں اور شاعروں میں شمار کیا ہے جنہوں نے شعر او خطب، چھوٹے اور بڑے رسالے، ضخیم کتابیں، اچھی طبعزاد قصے اور پرانی روایتیں گویا انشا کی ہر صنف پر خامہ فرسائی کی ہے اور ایک جگہ اُسے کاتب کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کاتب کا لقب بلحاظ شرف کے عالم سے کہیں بڑا ہوا ہے، ابن ندیم نے سہل کا ذکر بلغار کے زمرے میں کیا ہے اور اسے شعرائے کتاب میں گنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ کم گو شاعر تھا اور در اصل اُن لوگوں میں تھا جنہوں نے فسانے یا داستانیں لکھی ہیں کبھی انسانوں کی زبانی اور کبھی حیوانات وطیور کی زبانی۔ انکے علاوہ اس قسم کے مصنف عبداللہ بن مقفع اور علی بن داؤد (کاتب زبیدہ) سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے اشعار کا تمام مجموعہ پچاس صفحوں سے زیادہ نہیں۔ ہاں نثر کا البتہ اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ مثلاً مجموعہ رسائل، کتاب النمر والثعلب کتاب اباسیوس (اساتوس) فی اتخاذ الاخوان، کتاب اسد بن اسد، کتاب سحرة العقل، کتاب تدبیر الملک والسیاستہ، کتاب الی عیسی ابن ابان فی القضاء، کتاب الفرس، کتاب النزالین، کتاب ندوددود دود، دلدود، کتاب الریاض، کتاب ثعلہ دعفراء، (دوسری روایت میں ہے ثعلۃ وعفرۃ) یہ آخری کتاب کلیلہ ودمنہ کی طرح کی ہے اور ابواب و امثال میں اسی کی پیروی کی گئی ہے۔ مسعودی کا خیال ہے کہ حسن نظم کے لحاظ سے کلیلہ ودمنہ سے یہ بڑھی ہوئی ہے۔ سہل نے اسے مامون کے لئے لکھا تھا۔ اسکی تصانیف میں سے کتاب الھزلیۃ والمخزومی، کتاب الوامق والعذراء، اور بہت سی دوسری کتابیں تھیں جو افسوس ہے کہ زمانے کے ہاتھوں ناپید ہوگئیں اور ہمارے علم میں ان میں سے کوئی اب موجود نہیں ہے۔ ان میں بعض ایسی بھی تھیں جنہیں اس نے پرانی کتابوں کے مقابلے میں لکھا تھا اور جو حکمت فائقہ اور فصاحت و بلاغت سے بھری ہوئی تھیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہئے کہ سہل کی اکثر تصانیف فسانے اور داستانوں کی صورت

میں ہیں اس لئے کہ بہت سی انسانوں کی فطرت ایسی ہوتی ہے۔ کہ جبتک انہیں حیلے سے تعلیم نہ دیجائے وہ کچھ حاصل کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے اور یہ بہت مشکل ہے کہ انہیں اعلیٰ شرافت اور اچھے اخلاق کی تعلیم کسی اور طریقہ سے دیجائے بجز اس کے جس کی طرف انکی طبیعتیں خود بخود مائل ہوتی ہیں۔ اور وہ قالب یہی ہے کہ ظاہر تو اسکا ظرافت و تفریح طبع نظر آئے لیکن باطن تعلیم و ارشاد ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کا یہ رنگ زیادہ دلپسند زیادہ مقبول اور زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ سہل اسی کے ذریعہ سے حکمت بالغہ کی تلقین کرتا ہے بالکل اسی طرح جیسے تمدن جدید کے بڑے بڑے افسانہ نگار کیا کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابن مقفع نے اس قسم کی تصانیف میں زیادہ نام پیدا کیا اور اسکی کتاب کلیلہ و دمنہ جسے اس نے پہلوی سے عربی قالب میں ڈھالا۔ کتاب ثعلۃ وعفرۃ سے یا دوسری کتابوں سے جو سہل نے اس موضوع پر لکھیں زیادہ مشہور ہوئی سہل کی کتابوں کے جو نام سننے میں آتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کسی ایسے موضوع پر قلم نہیں اٹھایا جسے دینی کہا جاسکے بجز ایک کتاب کے جو قضا و قدر پر تھی لیکن اس کی اس تصنیف سے جو تدبیر ممالک اور ریاست پر تھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اس مشکل فن میں علم کے ساتھ عمل کو بھی ملا دیا تھا۔

ہمیں یہ نہ معلوم ہوسکا کہ سہل بصرے سے بغداد کب گیا۔ اس کے حالات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ فضل بن سہل برادر حسن بن سہل (دونوں مامون کے وزیر تھے) کے خاص دوستوں میں تھا۔ اور فضل ہی نے اس کو مامون کے دربار میں پیش کیا تھا لیکن تاریخ اور محاضرات کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ سہل ہارون الرشید کے درباریوں میں سے تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ سہل بیٹھا ہوا مامون کو ہنسا رہا تھا کہ ہارون الرشید وہاں پہنچ گیا اسے دیکھکر سہل یوں کہنے لگا "خدایا اس کی بھلائیاں زیادہ کر اور اس کی برکتیں عام کر یہانتک کہ ہر دن اسکا ماضی سے بڑا ہوا ہو اور مستقبل سے گھٹا ہوا" اس پر رشید نے اس سے یوں سوال کیا "اے سہل کیا تجھے معلوم ہے کہ سب سے اچھے شعر سنانیوالا اور سب سے زیادہ فصیح اور واضح

گفتگو کرنیوالا کون ہے، اس طرح کہ جب وہ کچھ کہنے کا ارادہ کرے تو کوئی چیز اسے عاجز نہ کرسکے۔"
سہل نے کہا "یا امیرالمومنین! میں تو سمجھتا تھا کہ اس بارے میں آپ کسی کو مجھ پر ترجیح نہیں دیتے"۔ رشید نے جواب دیا "وہ اعشی ہمدان ہے جو کہتا ہے:۔

رایتک امس خیر بنی لوئی ... وانت الیوم خیر منک امس
وانت غداً تزید الخیر ضعفاً ... کذاک تزید سادۃ عبد شمس

(کل تجھے میں نے بنی لوئی میں سب سے اچھا پایا اور آج تو کل سے اچھا ہے یہی نہیں بلکہ کل تیری خوبیاں دوچند ہو جائیں گی اسی طرح بنی عبد شمس کے سردار ترقی کرتے ہیں)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سہل، ہارون الرشید کے دربار میں اسوقت سے تھا جب مامون ابھی بالکل کمسن تھا اور یہ بھی کہ سہل روایت شعر کے لئے خاصی شہرت رکھتا تھا۔

اغلب یہ ہے کہ سہل ہارون الرشید کے دربار میں اس کے انتقال تک جو ۱۹۳ھ میں ہوا برابر موجود تھا، اس کے بعد امین کے زمانہ میں اسکا کوئی ذکر نہیں ملتا جس کی وجہ بظاہر یہی ہو سکتی ہے کہ وہ امین اور مامون کے جھگڑے سے الگ اتنے دن اپنے گھر بیٹھا رہا۔ پھر جب خلافت مامون کو مل گئی تو یہ اسی طرح اس کے درباریوں میں شامل ہوگیا جس طرح ہارون کے یہاں تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مامون سہل سے ناراض تھا لیکن بھرے دربار میں ایک دفعہ اس نے ایسی گفتگو کی کہ خلیفہ کا سارا غصہ خوشنودی سے بدل گیا اور اس نے جان لیا کہ سہل کیا بلحاظ عقل و فراست اور کیا بلحاظ ادب و قابلیت ایک قابل قدر انسان ہے اس لیے اس نے بھی اپنے باپ کی طرح سہل کو مقرب بارگاہ بنالیا، سہل مامون کو بچپن سے جانتا تھا اور مامون بھی سہل سے خوب واقف تھا لیکن پھر بھی مامون نے جانچے بغیر اسے اپنے دربار میں جگہ نہیں دی اور جب یہ دیکھ لیا کہ اس کے ارد گرد جتنے علما ہیں سہل ان سب میں ممتاز ہے تب اسے وہ عزت عطا کی جس کا وہ مستحق تھا۔

مامون کو قدما اور فلاسفہ کی تصانیف کا بیحد شوق تھا اور عقل کی بیداری اور نشو و نما کو

وہ اپنے اہم ترین فرائض میں سے سمجھتا تھا۔ اسی غرض سے اس نے ایک کتبخانہ قائم کیا تھا اور اس میں مختلف زبانوں کی علمی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جہاں کہیں سے بھی دستیاب ہو سکا فراہم کیا تھا۔ اس زمانے میں جزیرہ قبرس خلافت پر اکثر حملے کیا کرتا تھا۔ چنانچہ رشید کے عمال نے کئی دفعہ وہاں کے بہت سے لوگوں کو گرفتار بھی کر لیا تھا۔ جب مامون خلیفہ ہوا تو اس نے اہل قبرس کا زور توڑ دیا، اور انکے پاس کتب یونانی کے ذخیرہ کی طلبی کے لئے آدمی بھیجا۔ کہا جاتا ہے کہ قبرس میں اس وقت ایک بہت بڑا کتب خانہ موجود تھا جس کے دیکھنے کی اجازت کسی کو نہیں ملتی تھی۔ اس حکم کے پہنچتے ہی جزیرہ قبرس کے حاکم نے اپنے سرداروں کو اور تمام اہل خرد کو جمع کیا اور ان سے اس معاملے میں مشورہ لیا سب نے اس کے خلاف رائے دی بجز ایک پادری کے جس نے کہا کہ جلد سے جلد اس کتبخانہ کو بھیجدینا چاہئے اس لئے کہ یہ علوم عقلیہ جس وقت ایک دولت شرعیہ میں پہنچینگے فوراً اس میں فساد ڈال دینگے اور اسکے علما میں اختلاف پیدا کر دینگے۔ حاکم نے اس خیال کو پسند کیا اور سب کتابیں بھیجدیں جنہیں پاکر مامون بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد خلیفہ نے میکائیل ثالث والی روم سے اس شرط پر صلح کی کہ اس کے پاس جتنی پرانی کتابیں ہیں وہ مسلمانوں کو دیدیگا۔ ساتھ ہی ساتھ مامون نے اپنے خاص لوگوں میں سے چند مسلمان اور عیسائی علما کو اس غرض سے روانہ کیا کہ ان کتابوں کو نقل کرلائیں جنہیں کسی طرح بھی ملک روم علیحدہ کرنے پر راضی نہ ہو۔ اس طرح مامون کے پاس ان کتابوں کے علاوہ جو مشرق یا مغرب سے آئی تھیں ایک بہت بڑا ذخیرہ ان نسخوں کا بھی تھا جنہیں اس نے نقل کرایا تھا۔ اب اس عظیم الشان کتب خانہ کا مہتمم اس نے سہل بن ہارون کو بنایا اور اسکا نام بیت الحکمۃ رکھا۔ سہل اسکی دیکھ بھال میں مصروف ہوا اور اس طرح اسے اپنے علم کے بڑھانے کا ایک بیش بہا موقع ملا۔ اس نے اپنے ساتھ ایک اور عالم کو جسکا نام سلم تھا شریک کر لیا تھا اور سعید بن ہارون بھی جو سہل کا حقیقی یا چچیرا بھائی تھا اسکا معاون تھا۔

اسمیں کسے شک ہو سکتا ہے کہ بیت الحکمت میں جبکہ وہ نگراں تھا سہل کو بحث و نظر کے وہ مواقع حاصل تھے جو کسی دوسرے کو نہ تھے خصوصاً ایسی حالت میں کہ خود خلیفہ کی طبیعت فلسفہ، علوم و صناعات کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرانیکی طرف اس شدت سے مائل تھی اور اس وقت تک اسے کوئی اور بات اچھی ہی نہیں معلوم ہوتی تھی جبتک کہ مکتبہ عربیہ، علوم دنیاوی کے ہر شعبہ میں بھی اتنا ہی مکمل نہ ہو جائے جتنا علوم دین میں تھا۔ پہلی صدی ہجری میں بنی امیہ کے دو بڑے آدمیوں خالد بن یزید اور عمر بن عبدالعزیز نے ترجمے کے کام کو دمشق میں شروع کیا تھا اور دوسری صدی میں دو عباسی خلفا منصور اور مامون نے بغداد میں اسے تکمیل کو پہنچایا۔

اس وقت یوں کہنا چاہئے کہ سہل بن ہارون کی عقل کے سامنے ایک وسیع جولانگاہ تھی اور اسکے دیکھتے دیکھتے ترقی کا تمام سامان پورا ہو چکا تھا۔ اس کی ہمت نے صرف فارسی سے جو اس کی مادری زبان تھی اخذ کرنے پر بس نہیں کیا بلکہ علوم انسانی کے نت نئے اقسام میں سے جو چیز بھی اسے اچھی معلوم ہوئی اس کے حاصل کرنیکی اس نے کوشش ضرور کی اور اس کا بصرے سے بغداد آنا گویا اس کی تمام تمنائیں اور آرزوئیں بر آئیں۔ دربار خلافت کے بڑے بڑے لوگوں سے جو ہر طبقے اور ہر درجے کے تھے ملکر اسکا کمال اور جوہر نفس اور کھلا اس لئے کہ لوگوں کی صحبت سے انسان وہ کچھ حاصل کر لیتا ہے جو بڑی بڑی کتابوں میں بہ مشکل ملتا ہے۔

صفدی کا بیان ہے کہ سہل بن ہارون مامون کے ذاتی کتبخانہ کا بھی نگراں تھا اور بیت الحکمۃ [1] کا بھی گویا اس کے دو فرائض تھے ایک دوسرے سے بڑھکر۔ اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے اول تو یہ کہ مامون نہ یہ چاہتا تھا کہ اسے صرف اپنے محل میں بند رکھے اور مفاد عام کے کام سے اسے محروم کر دے اور نہ اسی پر راضی تھا کہ صرف عام لوگوں کے فائدے کے لئے اسے چھوڑ دے اور خود مستفید نہ ہو اور دوسری بات یہ کہ اس کے دربار میں سہل کی طرح کوئی دوسرا اس منصب کے لئے موزوں آدمی نہ تھا اس لئے یہ دونوں فرائض اسی کے سپرد کئے گئے

عرب قبل اسلام

یہ مضمون جوزف ہیل کی مشہور کتاب تمدن عرب کے پہلے باب کا ترجمہ ہے۔ سید نذیر نیازی صاحب بی اے معلم جامعہ پوری کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں جو انشاء اللہ بہت جلد مکمل ہو کر اردو اکادمی جامعہ ملیہ کی طرف سے شائع ہو جائے گا۔

تمدن انسانی کی ابتدا بڑی حد تک اس کی ضرورتوں سے ہوتی ہے۔ انسان اپنے ارتقائی نشو و نما کے ہر دور میں اپنی زندگی میں لطف پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسے حصول قوت، مشاہدہ حسن اور جستجوئے حق کی آرزو رہتی ہے۔ انسان کی یہ خواہشیں غیر محدود ہیں اور انہیں کے اتمام و احصا کی کوشش اس کی ترقی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ اسکا اصلی نصب العین افراد کی چند مخصوص ضرورتوں کے اندر پنہاں ہوتا ہے لیکن انکے پورا ہونیکے ساتھ اسکا دائرہ فکر بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ دنیا کا ہر تمدن اسی اصول کا پابند ہے، نئی نئی ضرورتوں سے نئے نئے مقاصد پیدا ہوتے ہیں اور جس قدر کسی قوم میں انکے پورا کرنیکی قوت موجود ہوتی ہے اسی سے اسکی صلاحیت تہذیب کا اندازہ ہوتا ہے۔ گویا تہذیب و تمدن بجائے خود عبارت ہے ان مقاصد کے حصول و اتمام سے۔ اس اعتبار سے کسی قوم کے تمدن کی تاریخ دراصل اسکی روز افزوں ضرورتوں اور بڑھتے ہوئے مقاصد اور انکے حصول و اتمام کی جد وجہد کی تاریخ ہے۔

یہی نقطۂ نگاہ ہے جس کے ماتحت ہم قدیم عربی تمدن اور اسکے مقاصد سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی تہذیب کسی خاص ملک کی پیداوار ہے یا یہ کہ عرب ہی اس کی سب سے بڑے داعی ہیں لیکن اس سے کسی شخص کو انکار نہ ہوگا کہ اسلامی تہذیب کی "وحدت" کا خیال عربوں ہی کے اندر پیدا ہوا جس کا تعلق صرف عرب سے تھا بلکہ اس میں تمام عالم اسلامی پر حاوی ہو سکنے کی صلاحیت موجود تھی۔

لیکن موجودہ عرب کو دیکھتے ہوئے بمشکل تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں تہذیب و تمدن کی اشاعت انکا مقصد رہا ہو جس طرح عرب کے متعلق دنیا کو سب سے کم معلومات حاصل ہیں ایسے ہی اس ملک کے رہنے والے بھی دنیا میں سب سے زیادہ بے تعلق اور الگ تھلگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اندرون عرب کے باشندے جو بہت سے حریف قبائل میں منقسم ہیں۔ خانہ بدوش ہیں اور باہم لوٹ مار میں مشغول رہتے ہیں۔ اسلام کی حقیقی روح کا ان پر بہت کم اثر ہے۔ البتہ ایک خفیف سا سیاسی رشتہ ہے جس نے ان میں ایک قسم کی یگانگت پیدا کر دی ہے ورنہ نہ یہ کوئی نصب العین رکھتے ہیں نہ آرزو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انکی تقدیر میں ہمیشہ ایک ہی زندگی بسر کرنا لکھا ہے۔

حالانکہ یہی لوگ ہیں جن کے آباؤ اجداد ساتویں صدی مسیحی میں دنیائے قدیم پر ایک سیلاب کی طرح چھا گئے اور یہ صرف پہلا موقعہ نہیں تھا کہ انکا ظہور دنیا کی تاریخ میں ہوا۔ موجودہ تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ مشرق ادنیٰ کی قدیم تاریخ میں عربوں کو ایک مخصوص درجہ حاصل ہے۔

اکثر علما کا یہ خیال ہے اور اسکی تائید میں بہت سے شواہد بھی موجود ہیں کہ امم سامیہ کا اصلی مسکن عرب ہی ہے۔ یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ۲۰۰۰ ق۔م میں جو لوگ بابل پر حکمراں تھے۔ عرب سے آئے تھے۔ علاوہ ازیں وہ بے شمار کتبے جو عرب کی چٹانوں پر موجود ہیں اس امر کی کافی دلیل ہیں کہ قرون مسیحی سے قبل یہاں ایک ایسی تہذیب اور باقاعدہ نظام حکومت موجود تھا جو اس زمانہ کے کسی تمدن یا حکومت سے کسی بات میں کم نہ تھا۔

یہ خیالات نہایت ہی تعجب خیز ہیں لیکن عرب کی جغرافی خصوصیات پر نظر ڈالئے تو ساری حیرت کافور ہو جاتی ہے۔ عرب جیسا کہ عام خیال ہے محض دشت و صحرا کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں ایسے قطعات بھی موجود ہیں جو نہایت شاداب ہیں اور جنمیں صدیوں سے کاشت ہو رہی ہے۔ یہی علاقے ہیں جو حضری آبادی کا مسکن ہیں اور جنمیں عرب کے نہایت مرفہ الحال نکالے

اور شہر آباد ہیں لیکن یہ زرخیز علاقے زیادہ تر ساحل کے ساتھ واقع ہیں۔ مثلاً جنوب مغرب میں یمن جو از منہ قدیم میں بھی "عرب آباد" (اس کا نام ہی یہی) موسوم تھا اور جنوب میں حضرموت بخورات کا گھر جنہیں گذشتہ زمانے میں غیر معمولی قدر و قیمت حاصل تھی۔ مشرق میں خلیج فارس کے ساتھ ساتھ وہ شاداب علاقہ چلا گیا ہے جسے آج کل ہم الاحسا کہتے ہیں اور جہاں سوائے چند ایک ٹکڑوں کے کسی زمانہ میں نہایت عمدہ کاشت ہوتی تھی۔ مغربی ساحل اگرچہ ناہموار اور سنگلاخ ہے لیکن اس میں بھی اعلیٰ درجہ کی چراگاہیں موجود ہیں جو اس زمانہ میں آج سے کہیں اچھی حالت میں تھیں۔ ایسے ہی نجد وسطی عرب کی سطح مرتفع جس میں پہاڑوں کے متفرق سلسلے دریاؤں اور چشموں کی طویل وادیاں اور چراگاہیں (جن میں عرب کے بہترین گھوڑے پرورش پاتے ہیں)۔ موجود ہیں اور یمامہ جو جنوب مشرق میں واقع ہے اور عرب میں گیہوں کی مرکزی منڈی ہے۔ ان علاقوں میں چھٹی اور ساتویں صدی مسیحی میں ایسی ہی اچھی زراعت ہوتی تھی جیسی کہ اس وقت یورپ کے اکثر حصوں میں بلکہ بعض مقامات کی حالت ان سے بھی بہتر تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان زرعی قطعوں اور حضری آبادیوں کے ساتھ ساتھ وہ غیر آباد اور بنجر علاقہ بھی موجود ہے جس میں پانی کی عدم موجودگی کی وجہ سے کسی قسم کی زندگی کا نشان نہیں تھا اور جسے ہم "عرب" یعنی ویرانہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ ریگ صحرا جنہیں "نفوذ" کہا جاتا ہے شاداب علاقوں کے درمیان اس طرح سے واقع ہیں کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بالکل منقطع ہو گیا ہے۔ چنانچہ عرب کے سب سے بڑے اور خوفناک صحرا "الربع الخالی" کا محل وقوع ایسا ہے کہ جنوب مشرق اور جنوب مغرب کے ساحلی علاقوں اور وسطی عرب کے درمیان کسی قسم کا سلسلہ آمد و رفت ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنوب مشرق (عمان) اور جنوب (مہرہ) کے باشندے جن پر وسط عرب کا بہت کم اثر پڑا ہے اپنی تہذیب کی نشو و نما کا ایک مخصوص اور مستقل طریقہ رکھتے ہیں۔

ایسے ہی جنوب مغربی عرب اور اس کے دوسرے حصص کے درمیان اگر ہزار ہا سال تک کوئی ربط و تعلق پیدا نہیں ہو سکا تو اس کا سبب بھی یہی صحرا اور تہامہ ہے۔ جلتی ہوئی ریت کی ایک لہر جو سمندر تک چلی گئی ہے ۔ ہے جو اس کے مشرق و مغرب میں واقع ہیں۔ کسی زمانہ میں عربی تمدن کے اس قدیم ترین مرکز کو اس قدر قوت اور اقتدار حاصل تھا کہ ہمیں اسکا مطالعہ ذرا تفصیل سے کرنا ہوگا۔ ان بے شمار کتبوں کی بدولت جو گذشتہ ستر برس میں جنوبی عرب کے کھنڈروں سے دستیاب ہوئے ہیں اور جن کے متعلق دن بدن بہتر سے بہتر تحقیقات ہو رہی ہیں۔ (اگرچہ یہ سلسلہ ابھی مکمل نہیں ہوا) یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ قرون مسیحی سے قبل یہاں دو پادشاہتیں موجود تھیں۔ یہ قدیم خیال کہ یہ دونوں پادشاہتیں آخری یونانی عہد تک پہلو بہ پہلو موجود رہیں غلط ہے اس کے ثبوت میں ایڈورڈ گلازر کی وہ تحقیقات پیش کیجا سکتی ہیں جو اس امر کی کافی دلیل ہیں کہ معین کی پادشاہت سبا کے ہاتھوں برباد ہو کر بالآخر اسی میں جذب ہو گئی۔ اگرچہ ان دونوں پادشاہتوں کے زمانہ حکومت کے متعلق ابھی اختلاف ہے لیکن اگر معین کا عہد ۲۰۰۰ ق۔م۔ قرار دے دیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا اس لئے کہ یہاں سلطنتوں کا تغیر و تبدل ہزارہا سال کے بعد ہوا۔ قدیم سے قدیم اخبار جو ہمیں اس پادشاہت کے متعلق ملی ہیں ظاہر کرتی ہیں کہ گذشتہ زمانہ میں بخورات اور حر معینی علاقے کی اصلی پیداوار کو مصر میں بڑی قدر و قیمت حاصل تھی اور چونکہ بحیرہ احمر کی بدولت یہاں نہایت آسانی سے رسائی ہو سکتی تھی اس لئے زمانۂ قدیم ہی سے یہ علاقہ تجارت کا مرکز تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ کس طرح اسکا حلقۂ اثر بالآخر غلزا تک جو بحیرۂ روم پر واقع ہے وسیع ہو گیا اور کس طرح اس کے راستے کیساتھ ساتھ ساحل سمندر تک تجارتی منازل اور ذخائر کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ ان سب باتوں میں سبا و معین کے درمیان بمشکل فرق کیا جا سکتا ہے بسوائے اسکے کہ اس زمانہ میں جب جنوب مغربی عرب کی تجارتی حالت دن بدن کمزور اور متزلزل ہو رہی تھی سبا کو غیر معمولی اقتدار حاصل ہو گیا لیکن جہاں و

کی ان آمدنیت سے جسے بطالسہ نے بحیرۂ روم میں جاری کیا تھا اہل سبا کو شاں میں بہت کم نقصان پہنچا۔ اس لئے کہ وہ بدستور (جیسا کہ عہد بطالسہ کے ایک کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے) مصر کے تمام بڑے بڑے معبدوں کو بخورات پہنچاتے رہے۔ سبا کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ آگسٹس قیصر روم کے سپہ سالار آلیس گالیس کا مقابلہ انہوں نے نہایت کامیابی اور بہادری سے کیا۔ شروع شروع میں رومی سپہ سالار کو ضرور کچھ کامیابی ہوئی لیکن بالآخر اسے مآرب کی دیواروں کے سامنے سے پسپا ہونا پڑا۔

لیکن رفتہ رفتہ سبا کی عظمت و شوکت میں فرق آ گیا۔ ہمیں اس کے زوال و انحطاط کے صحیح اسباب معلوم نہیں البتہ عربوں کا خیال ہے کہ اس کی وجہ بند مآرب کی تباہی تھی۔ بہرکیف اہل سبا کی بربادی کے بعد عرب کے اس جنوب مغربی گوشہ کا تعلق بیرونی طاقتوں سے جو اسے حریصانہ نگاہوں سے دیکھتی تھیں برابر قائم رہا۔ یہاں اس زمانے کی مہذب ترین سلطنتوں کا ایک دوسرے سے تصادم ہوا، اور ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش رہی کہ اس ملک کو اپنی تہذیب و تمدن کا جولانگاہ بنا سکیں۔

سب سے پہلے یہاں اہل حبش کا — جو چوتھی صدی مسیحی سے عیسائیت قبول کر چکے تھے اور جنکی پشت پر باز نطینی سلطنت موجود تھی — قبضہ ہوا۔ لیکن انکے تسلط کے خلاف جنوبی عرب کے کثیر التعداد یہودی اور مشرک عرب سب متحد ہو گئے۔ چنانچہ ۵۲۰ء میں یہاں ذونواس ایک یہودی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ ٹھیک جس طرح حبش کے عیسائی حکمران بازنطینیوں سے متحد تھے ایسے ہی عرب کی یہودی حکومت نے ایران سے جو اس زمانے کی سب سے بڑی کافر سلطنت تھی سلسلہ اتحاد قائم کر لیا تھا۔ مگر اسکے بعد جو لڑائی ہوئی اسمیں عیسائی کامیاب رہے اور جنوبی عرب از سر نو ایک حبشی صوبہ بن گیا۔ لیکن ایرانیوں نے عرب کے اس زرخیز صوبے کو کبھی فراموش نہیں کیا یہانتک کہ ۵۷۰ء میں انہیں اس پر حملہ کرنیکا موقع مل گیا۔ اہل عرب جن کے جذبات عیسائی حکومت کے خلاف برانگیختہ ہو رہے تھے نہایت آب و تاب سے ایرانیوں

حکمراں یک کا ہو رہے تو ایک دفعہ پھر اہل حبش کو اس ملک سے نکالا گیا۔ اب جنوبی عرب ایک ایرانی عامل کے زیر حکومت تھا جس کی ماتحتی میں ایرانی دستور کے ماتحت وصول کیا جاتی تھی لیکن چونکہ اہل ایران بجائے اس کے کہ یہاں کوئی مستبدانہ طرز حکومت قائم کریں اس ملک کی بدولت سے فائدہ اٹھانے کے زیادہ خواہشمند تھے اس لئے عرب بہت جلد اس انقلاب سے مطمئن ہو گئے۔ بایں ہمہ اس سے ان کا قومی وقار بخاک میں مل گیا۔

یوں جنوبی عرب کے ذریعے سے ایران اور بیزنطینی حکومت جو اس زمانے کی بہت بڑی طاقتیں تھیں عرب میں داخل ہوئیں۔ شمال میں بادیہ شام ان کی راہ میں حائل تھا لیکن جنوب میں کوئی ایسی رکاوٹ موجود نہ تھی مگر باوجود اس کے کہ جنوبی عرب کے باشندوں کو ان سے قریبی تعلق رہا اور ان میں تہذیب و تمدن کے اکتساب کی قابلیت بھی موجود تھی دونوں سلطنتوں کا جنوبی عرب کے تمدن پر مطلق اثر نہ پڑا چنانچہ یہاں ہمیں جس تمدن کا نشان ملتا ہے وہ خالصا اسی ملک کے نشو ونما کا نتیجہ ہے۔

افسوس ہے کہ اس تمدن کے متعلق ہمیں جو حالات ملے ہیں نہایت درجہ غیر مکمل ہیں۔ البتہ ہم اس قدر وثوق سے کہ سکتے ہیں کہ یہاں ایک ایسا تمدن ضرور موجود تھا لیکن اس کے عروج وارتقا اور وسعت کے متعلق ابھی ہمیں مزید تحقیقات کا انتظار کرنا چاہئے۔

بایں ہمہ اس زمانے کے معیار سے دیکھا جائے تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ سب سے پہلے جب عربوں کا ظہور تاریخ میں ہوا ہے تو وہ اس وقت کوئی وحشی یا غیر مہذب قوم نہیں تھے اس زمانے میں یہ لوگ بہت سے قبائل میں منقسم تھے جن میں ہر شخص کو یہ خیال رہتا تھا کہ اس کی ذاتی حفاظت اس کے قبیلے کے ذمے ہے۔ ایسے ہی بہت سے قبائل کے کسی ایک قبیلے کے ساتھ مل جانے سے جسے غیر معمولی قوت حاصل ہو گئی ہو قدیم ترین ریاستی نظام کی بنیاد پڑی اگرچہ اس میں قبائل کی جداگانہ ہستی برابر موجود رہتی تھی۔ ایسے نظام میں بادشاہ کا درجہ سب سے بلند ہوتا تھا لیکن اس شاہانہ اقتدار کے تدریجی نشو ونما کے متعلق ہماری معلومات نہایت ناقص ہیں۔

نہیں ہیں۔ البتہ کسی قدر یقین کے ساتھ ہم یہ ضرور فرض کر سکتے ہیں کہ شروع شروع میں مذہبی پیشوائی اور بادشاہت کے فرائض ایک ہی شخص کی ذات میں جمع ہونگے اور ابتدا میں اس کا لوگوں پر جو بھی اثر ہوگا وہ اس شخص کے ذاتی رعب و داب اور خصوصیات پر مبنی ہوگا۔ یہ سبا کا آخری دور تھا جس میں بادشاہ کے تخیل نے رعایا کے سردار اعظم کی حیثیت میں نشوونما پایا۔ اس زمانے میں جس میں بادشاہوں کا سراغ ملنا شروع ہو جاتا ہے جو زمین کے بڑے بڑے وسیع قطعات کے مالک تھے اور انہیں جاگیروں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ وہ سونے، چاندی اور تانبے کے سکے بھی مضروب کراتے تھے جن کے ایک طرف خود ان کے چہروں کی تصویر اور دوسری جانب مختلف قسم کی علامات (مثلاً الو یا سانڈ کا سر یا کوئی اور چیز) ہوتی تھی۔ لیکن انہیں سکوں کی بدولت جو بہت کافی تعداد میں دستیاب ہو چکے ہیں ہمیں اس تمدن کے نشوونما کے متعلق از سرِ نو اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی حد تک اولاً یونانی اور بعد میں رومی نمونوں پر ڈھالے گئے ہیں۔ دوسری طرف بادشاہوں کی شبیہوں، سکوں کی ندرت اور ان کی حسن صنعت سے جنوبی عرب کی ایک مستقل اور آزادانہ ترقی کا اگرچہ وہ کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو پتہ چلتا ہے۔ پرانی وضع کے سکوں میں بادشاہوں کی جو تصویریں ہیں ان میں ان کے بال لمبے اور بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ گھونگھریالے گیسوؤں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یہاں تک کہ بالآخر انہیں قیاصرۂ روم کے طرز پر بالکل چھوٹا تراش دیا گیا ہے۔ ان چیزوں کے دیکھنے سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ان کا کمال صناعی برابر ترقی کر رہا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ جہاں قدیم ترین سکوں میں ہمیں حقیقۃً حسن تکمیل اور پختگی صنعت کا پتہ چلتا ہے خصوصاً ان کی جزئیات میں۔ آخری سکوں کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ وہاں وہ سکے جن کا تعلق بیچ کے زمانے سے ہے صناعانہ قوت اور مہارت دونوں سے محروم ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کی ساخت ہمیشہ غیر مکمل رہی۔

جس طرح سکوں کی بدولت ہمیں بادشاہت کے منصب کے متعلق بہت کم معلومات حاصل

ہوئی ہیں ایسے ہی ایک دوسرے ذریعے سے مذہب کے بارے میں بھی کچھ نا تمام سے حالات ملے ہیں۔ بلکہ یہ ہے جنوبی عرب میں مذہب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوا ان کے کھنڈروں کے کتبات پر بے شمار دیوتاؤں کے نام کندہ ہیں ۔ ہمیں ان دیوتاؤں کی خارجی شکل یا ان کی ضروری صفات کے متعلق کوئی یقینی علم نہیں سوائے اس کے کہ یہ پتھروں سے تراشے گئے تھے۔ ان کی بے شمار مناجاتوں قسموں اور تشکر آمیز دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی عرب کے رہنے والوں کو نہ حیات بعد الموت پر اعتقاد تھا نہ روحانی برکتوں پر۔ لہذا جب یلینی یہ کہتا ہے کہ جنوبی عرب میں معبدوں کی تعداد کی کوئی انتہا نہ تھی تو اس سے ہمیں انکے مذہبی زہد و اتقا کی بجائے کاہنوں کی طاقت اور ایک خاص قسم کے جمالی رجحانات کا ثبوت ملتا ہے۔

جنوب مغربی عرب میں ہمیں صناعی کے قدیم ترین نمونے ملتے ہیں۔ عمارت سازی کے لئے یہاں آتشیں پتھر ساق اور سنگ مرمر موجود تھا لیکن اس سامان کے علاوہ بدوی قبائل کے پڑوس کی وجہ سے بھی جنکا پیشہ قزاقی اور غارتگری ہے انہیں نہایت مضبوط اور محفوظ مکانات بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ رفتہ رفتہ جنوبی عرب قلعوں اور گڑھیوں کا مرکز بن گیا جن کے کھنڈر آج بھی بکثرت موجود ہیں۔ چنانچہ صنعا کا بیس منزلہ قلعہ، قصر غمدان، آرب کی ہیکل جس کی دیواریں ایک قدرتی بلندی کو بیضوی شکل میں گھیرے تھیں اور جن کی اونچائی ۹½ میٹر تھی اور آرب کا وسیع بند جس کے آثار آج بھی موجود ہیں ان سب سے جنوبی عرب کی اس عظیم الشان ترقی کی شہادت ملتی ہے جو انکو فن تعمیر میں حاصل تھی۔ ان عمارتوں سے وسعت و تناسب دونوں کا اظہار ہوتا ہے لیکن جنوبی عرب کے احساس "صورت" کا پتہ ایک دوسری قسم کی یادگاروں سے چلتا ہے۔ جنوبی عرب کے قدیم ترین کتبوں کا زمانہ دسویں صدی قبل مسیح ہے لیکن انکے حسن تشاکلت اور طرز تحریر کی صفائی سے تعجب ہوتا ہے مزید برآں ان میں سے بعض کتبات ایسے بھی ہیں جنکو طرح طرح کے نقش و نگار سے زینت دی گئی ہے یہی

وجہ ہے کہ عرب جغرافیہ داں ہمدانی نے جنوبی عرب کے قلعوں، ہیکلوں اور عمارتوں کے روکار پر بنائے نقش و نگار کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے ہم صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

ہمدانی لکھتا ہے "تمہیں ان پر ہر قسم کی شکلیں ملینگی۔ درندے .... اڑتے ہوئے عقاب اور گدھ اس حالت میں کہ وہ خرگوشوں پر جھپٹ رہے ہیں ..... ہرنوں کے گلے جو موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ کتے کان لٹکائے ہوئے کچھ کھلے اور کچھ زنجیروں میں بندھے اور ایک آدمی جو ایک نئے گھوڑوں کے درمیان کھڑا ہے۔"

بایں ہمہ جنوبی عرب کے بہترین تعمیری نمونے یمن و حضرموت میں نہیں بلکہ شمالی عرب میں بادیۃ الشام کے کنارے حوران کے سلسلۂ کوہ میں ملینگے جہاں جنوبی عرب کی آبادی کا ایک حصہ بعض معاشی وجوہ کی بنا پر ہجرت کر گیا تھا۔

شمالی عرب میں بھی زمانہ قدیم ہی سے ریاستوں کی بناء کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ہمیں ان میں سے قدیم ترین حکومتوں کے محض نام معلوم ہیں مثلاً معضر، مدین اور عمالقہ۔ باہمی رقابت اور دشمنی کی وجہ سے انکا خاتمہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہی ہو گیا اور انکی بجائے دو اور بادشاہتوں نے بطور تجارتی مراکز کے عروج حاصل کیا۔ ایک نبطی بادشاہت جو ... ہے .. ۱۰۶ء تک اندرون عرب میں اپنی حدود سلطنت وسیع کرتی رہی اور دوسری دولت تدمر جو نبطیوں کے زوال کے بعد قائم ہوئی اور جس کا خاتمہ قیصر اورلین کے ہاتھوں ۲۷۱ء میں ہوا۔

جب کسی حقیقی عربی ریاست مثلاً شاہان یمان کے حالات معلوم ہوتے ہیں یا جب ہم ۳۲۸ء کے ایک کتبے میں امرء القیس کے متعلق یہ لکھا دیکھتے ہیں کہ "اس نے تاج پہنا اور ازد و نزار پر حکومت کی" تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس زمانے میں واقعۃً عرب میں ایک ریاستی نظام قائم ہو چکا تھا بلکہ واقعہ صرف یہ ہے کہ جب اہل عرب کا سابقہ ان تہذیبوں سے پڑا جو شمال مشرق اور شمال مغرب میں موجود تھیں تو انہوں نے ویسے ہی رسومات اور القاب

اختیار کر لئے۔

اب ہم شمالی عرب کی ان دو ریاستوں کا ذکر کرینگے جو آنحضرت کے ظہور سے کچھ ہی پہلے وجود میں آئیں اور جن کے مقابل میں ایرانی اور بازنطینی سلطنتیں موجود تھیں۔

سرزمین عرب کے اس طویل اور تنگ علاقہ میں جو ایران کے متصل واقع ہے حیرہ کی ریاست قائم تھی۔ شاعری اور افسانوں میں اسکا تذکرہ بڑی آب و تاب سے کیا گیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ریاست تہذیب و تمدن کا مرکز تھی لیکن عربی تمدن کا نہیں بلکہ ایک ایسے تمدن کا جو اپنی تمام خصوصیات کے اعتبار سے ایرانی تمدن تھا۔

بازنطینی سلطنت کے متصل غسانی عربوں کی حکومت قائم تھی۔ یہ لوگ مذہبًا عیسائی تھے انکا کوئی مستقل دار السلطنت نہ تھا بلکہ ایک مخصوص عسکر تھا جو ان کی سرگرمیوں کا مرکز تھا رومی ان سرداروں کو فیلارک اور عرب بادشاہ کہتے تھے۔ ان دونوں ریاستوں کا نظام کیسا ہی ناقص کیوں نہ ہو عرب کی تاریخ میں انہیں جو اہمیت حاصل ہے ہم اسے نظر انداز نہیں کرسکتے۔ چونکہ یہ دونوں سرحدی ریاستیں اپنے پڑوسیوں کی وظیفہ خوار تھیں اس لئے انہوں نے رومیوں اور ایرانیوں کی غیر متناہی لڑائیوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور جسطرح یہ لوگ ان دونوں سلطنتوں کے دیار و امصار کی دولت اور شان و شوکت سے واقف ہو چکے تھے ایسے ہی انکی فتح و شکست کے دوران میں انہیں انکی کمزوری کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ دولت و ثروت کا اثر عربوں پر ہمیشہ نہایت گہرا پڑا ہے چنانچہ ان دو نوخیز ریاستوں کا سب سے بڑا کام ان عربی جرگوں کو روکنا تھا جو مال و دولت کی تلاش میں سرحد کیطرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ اس قسم کی کوششیں زمانۂ ماقبل اسلام میں بھی ہو چکی ہیں۔ پانچویں صدی کے آخری نصف میں کندہ نے جو وسط عرب کا ایک طاقتور قبیلہ تھا دوسرے قبائل پر اپنی سیادت قائم کرلی یہاں تک کہ اس کے بادشاہوں کی سرداری نے رفتہ رفتہ ایک نہایت ہی سادہ قسم کی متحدہ حکومت کا نمونہ ہوا ۔ ۴۸۰ء میں یہاں کے ایک بادشاہ حجر نے حیرہ پر ایک ناکام حملہ کیا لیکن حجر کی نسل

ناکامی کی بہت جلد تلافی ہوگئی اس لئے کہ ۵۰۲ء میں حارث نے نہایت کامیابی سے فلسطین پر حملہ کیا جس سے نجات حاصل کرنیکے لئے قیصر روم کو ایک بہت بڑی رقم ادا کرنا پڑی۔
اس کامیابی سے حارث کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا اور اس نے چاہا کہ وہ ایک ہی خرمیں حیرہ کو بھی فتح کرلے لیکن اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ اب اس کی تقدیر بھی پلٹ چکی تھی، اہل کندہ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا یہانتک کہ ۵۲۹ء میں وہ اپنے دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا اور اسکے ساتھ ہی ریاست کندہ کی طاقت و اقتدار کا بھی خاتمہ ہوگیا یہی وجہ ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں وسطی عرب میں کسی سیاسی نظام کی شکل تک موجود نہ تھی اور اسی سے اس بات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اسلام کا ظہور بھی عرب کے اس حصہ میں ہوا جو خارجی تہذیبوں کے اثرات سے یک قلم آزاد تھا۔ چنانچہ اب عام طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ اس تحریک کی وسعت کا اصلی سبب معاش تھا نہ کہ مذہب۔ لیکن اس کی جزئیات کے متعلق ابھی ہم کچھ نہیں کہ سکتے البتہ ایک نظریے کی رو سے جس سے بہت کچھ ذہانت اور فراست ٹپکتی ہے عربی قبائل کی ہجرت کا اصلی سبب عرب کی خشکی اور بے حاصلی ہے۔ بہرکیف وہ اسباب جنہوں نے اسلام کے ساتھ مل کر دنیا کی تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کردیا کچھ بھی کیوں نہ ہوں اب ہم مختصراً اندرون عرب کے حالات بیان کرینگے جو ہماری موجودہ معلومات کے مطابق ہر طرح سے اسلام کے لئے ساعد تھے۔

جس طرح طبیعی حالات کے اعتبار سے عرب کے دو حصے ہیں ایسے ہی وہاں کی آبادی بھی حضری اور بدوی دو طبقوں میں منقسم ہے لیکن ان دونوں میں کوئی بہت زیادہ اختلاف نہیں۔ حضریوں کی بہت سی عادات سے بدویت کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ بدویوں کی تمام ضروری خصوصیات ان میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ موسمی حالات کے اعتبار سے حضری کاشتکار اور شہری بھی ایک مقام سے دوسرے مقام میں چلے جاتے ہیں۔ ایسے ہی بدوی محض جپسی نہیں جنہیں محض آوارگی کا شوق ادہر اُدہر لئے پھرتا ہے۔ وہ اپنے مویشیوں کے لئے ہمیشہ

ایسی زمینوں کا انتخاب کرتے ہیں جو شاداب ہوں اور عمدہ چراگاہوں کا کام دے سکیں اور جہاں کسی وسیع دشت میں انہیں قابل زراعت زمین ملجاتی ہے وہاں یہ خانہ بدوش آبادی بس جاتی ہے ایسے ہی جہاں کہیں قافلوں اور چرواہوں کو کوئی عمدہ چشمہ ملجاتا ہے وہاں رفتہ رفتہ کوئی تجارت گاہ یا قریہ بلکہ بعض دفعہ اچھا خاصہ شہر آباد ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی نظام کے فقدان کے باوجود وسطی عرب میں بڑے بڑے شہر اور قصبے آباد تھے جہاں کے باشندے خانہ بدوش قبائل کی طرح اپنے قبیلہ کے باہمی تعلقات پر جان دیتے اور انکے حقوق کا خیال رکھتے۔

بدوؤں کے قانونی خیالات نہایت سادہ تھے۔ انکے نزدیک سب سے پہلا اور مقدم حق حریت ذات کا تھا اگرچہ ان میں سے ہر شخص کسی نہ کسی کنبے، ہر کنبہ کسی نہ کسی قبیلے اور ہر قبیلہ جنوبی یا شمالی طبقے سے وابستہ تھا۔ زمانہ قدیم ہی سے عربوں کی تمام وہ لڑائیاں جو انکی بقائے ذات کے لئے ضروری تھیں پانی اور چارے پر مرکوز تھیں۔ ان لڑائیوں سے وحدت قومی کا احساس جاتا رہا اور اسکی بجائے ایک ناقابل علاج "مخصوصیت" پیدا ہوگئی جس کے ماتحت ہر قبیلہ اپنے آپ کو کافی بالذات خیال کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اسے تمام دوسرے قبائل پر لوٹ مار کا حق حاصل ہے۔ شاذ ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ قتل کے لئے دیت (۱۰۰ اونٹنیاں) قبول کرتے بالعموم وہ قاتل کے خون کا مطالبہ کرتے اور جب جوش وخروش کی انتہا ہوجاتی تو وہ اس خون کا انتقام قاتل کے پورے قبیلے سے لیتے۔ لیکن اگر ایک طرف جہد للحیات نے انہیں مختلف قبیلوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور انہیں دشمنی اور عداوت پیدا کردی تھی تو دوسری طرف فطرت کی درشتی اور سختی کے خلاف انکی مشترکانہ جنگ نے انہیں ایک دوسرے سے قریب تر کردیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم بدوؤں کو صرف ایک ہی فرض کا احساس تھا جسے وہ انتہائی دیانتداری کے ساتھ پورا کرتے یعنی "مہمان نوازی"۔ شمالی اور جنوبی ریاستوں کی طرح سے جنکا عروج وزوال تجارت کی کامیابی اور ناکامیابی پر منحصر تھا۔ وسطی عرب میں بھی تجارت اور تہذیب وتمدن کو پہلو بہپلو فروغ ہوا۔ عرب عطریات کے بے حد شائق تھے جنکو وہ بہت بڑی تعداد میں۔

خصوصاً غلے، ہندوستان سے حاصل کرتے۔ ایسے ہی بہترین تلواریں بھی عدن کے راستے سے ہندوستان ہی سے آتیں۔ اتھوپیا (حبش) سے براہ سمندر غلام لائے جاتے تھے لیکن ان چیزوں کی درآمد کے علاوہ جو عرب کے ہر حصے میں پہنچتیں اندرون ملک میں مقامی اشیاء کی تجارت بھی عروج پر تھی جنوبی عرب سے اعلی قسم کا چمڑا اور سامان لباس بہم پہنچتا۔ شمالی عرب سے غلہ اور اسلحہ آتے اور حیرہ میں زین سازی کی صنعت ترقی پر تھی لیکن سوال یہ ہے کہ بدوؤں کی باہمی لوٹ مار اور عرب کی جغرافی خصوصیات کے باوجود جہاں زرعی علاقوں کے درمیان صحرا کچھ اس طرح حائل ہیں کہ ان میں کسی قسم کی آمد و رفت کا سلسلہ مشکل ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ناممکن ہے تجارت کیونکر جاری تھی؟ لوٹ مار کے خطرات کے خلاف انہیں زمانہ قدیم ہی سے ایک مقدس معاہدہ قائم تھا جس کی رو سے آٹھ مہینے باہمی جنگ و رقابت اور چار مہینے مکمل امن وامان اور صلح جوئی کے لئے وقف تھے۔ ان چار مہینوں میں سے تین یعنی گیارہواں۔ بارہواں اور پہلا مسلسل تھے۔ لیکن چوتھا سال کے بیچ آتا اور یکایک تمام لڑائی جھگڑے رک جاتے۔ اس زمانہ صلح و امن کے تین مسلسل مہینے مذہب اور چوتھا تجارت کے لئے مخصوص تھا۔ جس طرح عرب کے بدوؤں کو انکی مذہبی اغراض حجاز کی غیر مہماں نواز مگر سہل السفر سرزمین میں کھینچ لاتیں ایسے ہی تجارت کے لیے بھی انکا اجتماع یہیں ہوتا اس لئے کہ حجاز میں جنوب، مشرق، شمال سبھی طرف سے بآسانی رسائی ہو سکتی ہے۔ ہر قبیلے کی حدود میں کوئی نہ کوئی مقدس پتھر، درخت یا چشمہ جس کے ذریعے سے وہ اپنی معمولی مذہبی حیات کو پورا کرتے ضرور موجود رہتا۔ لیکن جہاں تک ہماری یاد کام کرتی ہے حجاز نے ہمیشہ مختلف قبائل کے لئے مقام اجتماع کا کام دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی مقدس چیزوں سے انکا تعلق وہی رہا ہے جو مقامی چیزوں کو قومی چیزوں سے ہوتا ہے۔ اور غالباً اسی لئے اس سیاہ پتھر (حجر اسود) کو جو مکہ کی ایک مکعب صورت عمارت کعبہ میں نصب تھا دن بدن زیادہ شہرت حاصل ہوتی گئی اور اس سے اور مکہ کی دوسری مقدس چیزوں کے ساتھ جو حرام سے وابستہ تھیں انکا حلقہ اثر دن بدن وسیع

ہوگئیا۔ آخر کار اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مراسم حج وعمرہ مکہ کی ادائیگی کو عرب کے ایک بہت بڑے حصے میں فرض سمجھا جاتا تھا۔ وادی عرفات جو مکہ سے کچھ میل شمال مشرق میں واقع ہے مزدلفہ جو عرفات سے دو گھنٹے کا راستہ ہے اور ادر منا میں جو مزدلفہ سے اور آگے دو گھنٹے کا راستہ ہے بعض بتوں کے نام قربانیاں کیجاتی تھیں حتیٰ کہ ان بتوں کی پرستش نے جنہیں مختلف مقامات کے طواف (حج) سے ایک قسم کا تعلق پیدا ہوگیا تھا وسط عرب کی عام عبادت کی صورت اختیار کرلی۔ چنانچہ ایام حرام میں ہزارہا عرب حج اور عمرہ ادا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پیشتر بھی حجاز عربوں کی مذہبی زندگی کا مرکز تھا۔ اور اس عام قاعدے کے ماتحت کہ جہاں کہیں انسانوں کا اجتماع ہوگا تجارت کو بھی فروغ ہوگا حجاز کی تجارت بھی ترقی پر تھی۔ چنانچہ عمرہ وحج کا سب سے زیادہ مسرت بخش پہلو وہ سالانہ بازار تھا جو اس مقدس مقام کے پڑوس میں قائم ہوتا اور جو تجارت کا قدرتی لازمہ ہے۔ یہاں عربوں کی زندگی اور ان کی سرگرمیاں اپنی انتہا کو پہنچ جاتیں۔ قدیم عرب کھجور، شہد، گیہوں اور جو سے ایک قسم کی شراب طیار کیا کرتے تھے لیکن یہودی اور عیسائیوں کی بدولت اس میں شراب انگوری کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس سالانہ بازار میں بھی ہر قسم کی شراب ملتی اور ابنائے بادیہ شراب خانوں میں جمع ہو کر جہاں برابر شیشہ و ساغر کا دور رہتا گانے والی لڑکیوں کی خوش آئند اور دلکش سرود کا لطف اٹھاتے

تاجروں اور پیشہ وروں میں جو اپنی دوکانیں ساتھ لاتے بیطاروں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ لیکن ان مقابلوں میں جنکے ذریعے سے لوگ اپنا نام پیدا کرتے غیر معمولی دلچسپی اور انہماک کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یہاں شعرا اپنا کلام سناتے اور نوخیز طبع آزما اپنے آقاؤں کی داد کے منتظر رہتے۔ مختصر آیہ کہ ہر وہ شخص جو عرب میں شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا اسکے لئے ضروری تھا کہ وہ حجاز کے ان بازاروں عکاظ، ذوالمجاز اور مکہ میں نام پیدا کرے۔ ان بازاروں کے خاتمہ پر عکاظ اور ذوالمجاز بالکل خالی ہوجاتے اور انکی کوئی اہمیت نہ رہتی لیکن مکہ نے رفتہ رفتہ ایک عظیم الشان شہر کی صورت اختیار کرلی اور جنوبی عرب کی ریاست حمیر کے زوال کے بعد عرب کا سب سے بڑا

اور پھر رونق شہر ہو گیا لیکن مکہ کو جو امتیاز و اقتدار حاصل ہوا اس سے اس عبادت گاہ کو کوئی تعلق نہیں جو یہاں موجود تھی اس لئے کہ ہر تجارتی مرکز میں ایک معبد موجود تھا۔ اس لئے کہ یہاں سالانہ بازار لگتا تھا اس لئے کہ دوسرے مقامات پر بھی ایسے بازار لگتے تھے اور اس کے جغرافی محل وقوع کو تو کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں اس لئے کہ مکہ ایک بے آب گیاہ وادی میں آباد ہے۔ بلکہ اسکی اصلی وجہ جیساکہ جولیس ویل ہاؤزین نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے قریش کی ذہنی اور دماغی برتری تھی۔ ممکن ہے اہل مکہ کی ذہنی بیداری پر ان خوشگوار روابط کا اثر پڑا ہو جو ان کے اور شمالی ساميوں بالخصوص یہود کے درمیان قائم تھے یقیناً انکے سلسلۂ تجارت سے جو شام، حیرہ اور جنوبی عرب تک وسیع ہو چکا تھا ان کے اندر نئے نئے محرکات اور امنگیں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے قبل جو لوگ لکھنے پڑھنے پر قدرت رکھتے تھے ان میں مقابلۃً اہل مکہ کا حصہ غالب تھا۔ غالباً ہم ان باتوں کو صحیح تسلیم کرنے سے بلا تامل انکار کر دیتے۔ اگر ہمیں یہ معلوم نہ ہوتا کہ آنحضرت کی پہلی بیوی (جو زمانۂ ماقبل اسلام کی تربیت یافتہ نہیں) کا تجارتی کاروبار تمام عرب میں پھیل چکا تھا۔ باوجود اس کے کہ اہل مکہ کے اندر کسی ذمہ دارانہ نظام کا وجود نہ تھا ان کے جماعتی امور سے بقول ویل ہاؤزین صاف طور پر اجتماعی روح کا اظہار ہوتا ہے جو عرب میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ انکا ہر قبیلہ قطعی طور سے خود مختار تھا۔ باہم شہر کے مفاد کو ہر بات سے ضروری اور مقدم خیال کرتے تھے اور یہیں سے ایک طرح کی حکومت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ گویا ایک حقیقی شہری نظام کا آغاز ہے جو اگرچہ نہایت سادہ اور مختصر تھا لیکن باوجود اس کے عرب میں غیر معمولی طور سے اہم تھا۔

چنانچہ چھٹی اور ساتویں صدی مسیحی کی ابتدا میں ہم حجاز کے مجامع اور مکہ میں آزاد منش عربوں کی حقیقی ضروریات اور ان کی تہذیب کی اہمیت کا صحیح طور سے اندازہ کر سکتے ہیں عربوں میں جس چیز کی کمی تھی وہ وحدت قومی کا خیال تھا۔ ان کو خاندان اور قبیلے کا وجود تو نظر

آتا تھا لیکن ایک قوم ہونے کا احساس نہ تھا۔ اس کے علاوہ ان میں یہ نقص تھا کہ ان میں اطاعت کا مادہ موجود نہ تھا۔ انکے اندر کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ اطاعت ضروری ہے بلکہ بعض قوموں پر ایک طرح کی خوبی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا تھا جس کی وہ عزت و احترام بھی کرتے لیکن نہ کسی سردار کو حکومت کرنے کا حق حاصل تھا اور نہ اُن کی اطاعت کرنا کسی کا فرض تھا۔ یہ عربوں کے دو نمایاں عیب ہیں جن کو مٹانے کی نہ اب تک کوئی کوشش کی گئی تھی نہ اس کا کسی کو خیال آیا تھا۔ ان نقائص کے علاوہ یہ لوگ ابھی تک غیر متمدن حالت میں تھے اگرچہ ایسا نہ تھا کہ ان میں کسی چیز کے قبول کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو۔

مکہ کی عمارات سے جن میں کعبہ اور دارالندوہ شامل ہیں کسی تعمیری خوبی یا تجربے کا اظہار نہیں ہوتا اور جب ہم سے آنحضرت کا کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے اور ایک کبوتر کی تصویر کو مٹا دینے کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے تو اس سے ہم کو جو غلط فہمی ہوتی ہے اس کا یہ سنکر فوراً ازالہ ہو جاتا ہے کہ اس تصویر کو کھجور کی چھال سے بنایا گیا تھا۔ اس زمانے میں عربوں کے جمالی احساس کا اظہار زیادہ تر شاعری اور خطابت سے ہوتا ہے۔ حیرہ کا شاہی دربار ہو یا عکاظ کا میلہ جہاں کہیں لوگوں کا اجتماع اور انعام کا اعلان ہوتا وہاں شعرا جمع ہو جاتے اور اپنے قصائد سناتے۔ فن کے اعتبار سے یہ قصیدے سب ایک سے ہوتے۔ ہر قصیدہ میں محبوب کا سراپا، کسی ناقہ یا گھوڑے کی تصویر، کسی شکار یا سفر کی کیفیت اور اکثر کسی محفل شراب کا حال بیان کیا جاتا تھا اگرچہ ان نظموں میں حقیقی شاعری کا شاذ ہی کوئی نقش ملتا ہے لیکن ان کی زبان کی برجستگی، زور بیان اور فطرت کے صحیح مطالعہ کی داد دینا پڑتی ہے۔ اس کے لئے انکے پاس جو سامان موجود تھا اس سے انہوں نے جس عمدگی سے کام لیا ہے وہ بلاشبہ قابل تعریف ہے۔ ایسے ہی چھٹی صدی مسیحی میں — اسلام سے ایک صدی پیشتر — ان نظموں کے سامعین کی کثرت اور ان کی قدر دانی بھی تعریف و ستائش کی مستحق ہے جس سے ایک ایسی قوت اور

حالت کا اظہار ہوتا ہے جو ان میں پھر کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ شاعری کے اس ہیجان کے ساتھ ہی عربی رسم الخط میں نشو و نما ہوا۔ ان سب باتوں سے ایک قسم کی ذہنی بیداری کا پتہ چلتا ہے جس کے اسباب کا ہمیں پوری طرح سے علم نہیں۔ انہیں باتوں سے ہم عرب اور بالخصوص مکہ میں ان آدمیوں کی موجودگی کو بھی سمجھ سکتے ہیں جو اس وقت کے مذہب سے غیر مطمئن ہو کر یہودیت اور عیسائیت میں ہدایت ڈھونڈتے تھے اور جنہوں نے ایک قسم کا انتخابی مذہب پیدا کر لیا تھا جو نیا بھی تھا اور مزید ترقی کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت کا ظہور ہوا اور لوگوں نے انکا شمار انہیں متلاشیان حق میں کیا تو یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔

اس سلسلہ میں اگر جنوب مشرقی جرمنی کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں اس کی اور وسط عرب کی حالت ایک سی نظر آتی ہے۔ ساتویں صدی کے آخر میں فرانک مبلغین نے عیسائیت کی اشاعت کے لئے اس ملک کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا لیکن اس میں انہیں بہت کم کامیابی ہوئی ان کی اور مکے کی حنیفی جماعت ــــ متلاشیان حق ــــ کی حالت قریباً ایک سی تھی۔ ان کی تعلیمات کا بھی عربوں کی قدامت پسندی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

ٹھیک اس وقت جبکہ جنوبی جرمنی میں عیسائیت کے قدم نہایت مضبوطی سے جم گئے تھے دنیا کی حالت بالکل بدل چکی تھی۔ پیشتر اس کے کہ روپ رٹ کے ہاتھوں عیسائیت کو بویریا میں فروغ ہوتا (۶۹۶) مشرق میں ایرانیوں کی عظیم الشان مجوسی سلطنت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اس زمانے کی سب سے بڑی عیسائی طاقت دولت بازنطینی کے ہاتھوں سے شام اور مصر اس کے بہترین صوبے نکل چکے تھے اور تہذیب و تمدن کے پر رونق مراکز، مدائن، دمشق اور اسکندریہ پر ابنائے بادیہ

کا تصرف و اقتدار قائم تھا جو قطعی طور سے ایک جدید مذہب کے حامل تھے۔ یعنی اسلام۔

غزل

از جناب نصیر الدین حسین صاحب بیرسٹر پٹنہ

تیر نگہ ناز چو ناسور فروشد
باز خم جگر لعل لبت شور فروشد

صد مرتبہ خوشتر بود از بادۂ اطہر
آبے کہ بہ مستان تو انگور فروشد

اے کاش کہ آتش بزند در دل پرنور
کو برق تجلے بہ سر طور فروشد

واللہ غم یار متاعیست گرانقدر
ایں رنج بہ صد عیش نہ رنجور فروشد

اے ماہ رخ از سروی مہر تو بدلہا
ہجر تو بہ شب مشک کے کافور فروشد

کارے چہ وراہست بایں بادہ و ساغر
کو عین بہ چشمان تو مخمور فروشد

اے مطلع انوار بہ یک جلوۂ رویت
دیوانہ نصیر تو دو صد حور فروشد

عورت

فلسفی تجھکو سمجھتے ہیں نمودِ بے بود — علما کہتے ہیں سرمایۂ عشرت تجھکو
اہل تاریخ بتاتے ہیں کہ اقوام غیور — مانتے آئے ہیں اک حسن حمیت تجھکو
بیچ کر جان خریدار ترے ہوتے ہیں — بے بہا جانتے ہیں اہل شجاعت تجھکو
کوئی کہتا ہے علاج مرض تنہائی — کوئی کہتا ہے دلیل رہِ عفت تجھکو
کوئی گل سے، کوئی دیتا ہے کنول سے تشبیہ — کوئی پاتا ہے عجب موہنی مورت تجھکو
حور جنت ہے کسی کے لئے لیکن کوئی — چاہ بابل کی سمجھتا ہے حقیقت تجھکو
کوئی قاتل تجھے کہتا ہے ہتھیارا کوئی — کوئی کہتا ہے بلائے شب فرقت تجھکو
کوئی چنچل، کوئی کہتا ہے غزال وحشی — کوئی بجلی، کوئی کہتا ہے قیامت تجھکو
دم شوخی تری چتوں کو بدلتا پاکر — کوئی کہتا ہے چھلاوا کوئی آفت تجھکو
تیرے جور و ستم و ناز و تلون کے قتیل — کانپ کر کہتے ہیں نیرنگی قسمت تجھکو
کوئی کہتا ہے تجھے سایۂ بید لرزاں — کوئی کہتا ہے مگر سرو نزاکت تجھکو
حسن سیرت پہ نظر جن کی گئی، کہتے ہیں — کبھی عصمت کی کبھی شرم کی مورت تجھکو
وصل اور ہجر کے عالم کا کبھی کر کے خیال — جان کہتا ہے کوئی جان کی زحمت تجھکو
اے دو رنگی زمانہ کی مجسم تصویر — فلسفی کہتے ہیں آئینۂ عبرت تجھکو

دیکھتا ہوں تری صورت کو بچشم حیرت
کچھ بتا تو ہی کہ میں کیا کہوں عورت تجھکو

جرمنی میں رفاہ عام کے کام

جرمنی اور روس ہی ایسے دو ممالک ہیں جہاں رفاہ عام کے کام حکومت کے مقدم فرائض میں داخل ہیں۔ اس کام کو فرض سمجھنے کی وجہ وہ معاشرتی عقائد ہیں جو گو دونوں ممالک میں قطعاً مختلف ہیں مگر انسانی ترقی میں ادنی سے لیکر اعلی سوسائٹی تک انکا حصہ نہایت اہم ہے چونکہ فی الحال جرمنی میں ہماری رسائی زیادہ آسان ہے، اس لئے ہم وہاں کی تنظیم کے طریق کا بسہولت مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ حالانکہ ان تمام طریقوں سے اچھی طرح واقف ہونے کے لئے کم از کم دو سال کی لگاتار اور انتھک محنت درکار ہے، اسوقت ہم اسکے متعلق صرف عام اصول بتائیں گے مگر امید کرتے ہیں کہ پھر بھی اس مضمون کے متعلق زیادہ مستند اور مکمل واقفیت بہم پہنچا سکینگے۔

جرمنی میں دوسرے ممالک کی طرح رفاہ عام کے کام صرف خیراتی یا مذہبی غیر سرکاری انجمنوں کے سپرد نہیں، گو یہاں بھی بہت سی ایسی انجمنیں موجود ہیں اور جب کبھی حکومت انکے کام کو قابل قدر سمجھتی ہے عطیات سے انکی ہمت افزائی کرتی رہتی ہے۔ ۱۹۱۸ء کے انقلاب سے پہلے رفاہ عام کے بیشتر کام یہی غیر سرکاری انجمنیں کیا کرتی تھیں۔ جمہوریت کے قیام سے قبل بلکہ اس سے بھی پہلے پرانے دور میں معاشرتی قوانین کے اعتبار سے جرمنی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا تھا۔ ضعیف العمری کی پنشن یا بیماری اور حادثات سے بیمہ کے جبریہ طریقے یہ دو ایسی مثالیں ہیں جنہیں ہر جگہ لوگ جانتے ہیں۔ اصلاح معاشرت کے کام کرنیوالے ہر جگہ سے جرمنی مطالعہ کے لئے آتے اور اپنے اپنے ممالک کو جاکر حکومتوں کو اس قسم کے قوانین وضع کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔

جمہوریت جرمنی کے قیام کے ساتھ ہی رفاہ عام کے کاموں نے ایک زیادہ وسیع اور منتظم شکل اختیار کرلی۔ رفاہ عام کی ایک وزارت قایم کی گئی جسکا کام رفاہ عام کے تمام کاموں مثلاً حفظان صحت، نگہداشت اطفال، لڑائی کے زخمیوں، اپاہجوں، ضعیفوں، بیماروں اور غرباء

کی خبرگیری غرضیکہ تمام ان کاموں کی نگرانی کرنا تھا جو رفاہ عام کے ماتحت آتے ہیں۔ یہ وزارت اس قسم کے تمام کاموں کی جماعت مقننہ منتظمہ ہے۔ یہ وزارت تعلیم اور وزارت مزدوران کی اتحاد عمل سے کام کرتی ہے۔ انقلاب کے بعد اس نے بہت سے ایسے معاشرتی قوانین مجلس مقننہ میں پیش کر کے منظور کرائے جن کے لئے عرصہ سے احتجاج کیا جا رہا تھا۔ اور ۱۹۲۴ء میں اس نے تمام منتشر قدیم اور جدید معاشرتی قوانین کو جرمن قانون رفاہ عام کے نام سے جمع کیا مجلس مقننہ نے اسکو منظور کرلیا اور آج جرمنی میں تمام رفاہ عام کے کام اسی کے مطابق کئے جاتے ہیں۔ یہ قانون بجد وسیع مشرح اور منظم ہے اور تمام ایسی صورتوں پر حاوی ہے جس میں کوئی مرد عورت یا بچہ کسی وجہ سے اپنی روزی کمانے یا تعلیم پانے سے معذور ہو۔ چونکہ یہ قانون ساری قوم کے لئے ہی اس لئے اسکا نفاذ ملک کے ہر حصہ میں ہے۔ اس نے ہر صوبہ اور ہر ضلع۔ ہر شہر قصبہ اور گانوں پر بچوں کی نگہداشت کے مرکز قایم کرنا لازم کردیا ہے۔ یہ اسی قانون کی برکت تھی کہ کام کرنیوالوں کی ایسی مانگ ہوئی کہ ملک میں عوام الناس کے خدمتگذاروں کی ایک کثیر تعداد پیدا ہوگئی۔ یہی لوگ ایک مخصوص نصاب تعلیم کے ماتحت حکومت کی تیس درسگاہوں میں سے کسی ایک میں تعلیم پاکر ایک مرکزی امتحان میں شرکت کے بعد حکومت کی سرپرستی میں رفاہ عام کے کام کرنیوالے بن جاتے ہیں۔ ہزاروں عورتیں جو نیلی وردی پہنے جرمنی کے ہر حصہ میں نظر آتی ہیں محکمہ رفاہ عام کی ملازم ہیں۔

اس عظیم الشان کام سے زیادہ واقفیت کے لئے برلن کی مثال کا ہم ابھی طرح مطالعہ کریں گے۔ بالکل اسی طرح دوسرے شہر اور قصبے بھی کام کرتے ہیں۔

شہر برلن بیس میونسپل حلقوں میں منقسم ہے اور ہر حلقہ میں بچوں کی نگہداشت اور رفاہ عام کے دفاتر علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ان ہی کے ذریعہ سے حلقہ کے تمام امور کی تفتیش تنظیم اور نگہداشت ہوتی ہے۔ یہی حلقہ وار دفاتر کام کے خاص مرکز ہیں اور ہر حلقہ کے کام کرنیوالے حلقہ کے تمام مکانوں کو جانتے ہیں اور ہر حاجتمند شخص اور ہر اس بچہ سے واقف ہوتے ہیں جس کی پرورش کی ذمہ داری

ریاست پر ہوتی ہے۔

ان تمام حلقوں کے دفاتر پر ایک مرکزی دفتر کی نگرانی ہے جو تمام انتظامی اور مالی معاملات کا ذمہ دار ہے۔ یہ مرکزی دفتر چند کام خود بھی کرتا ہے اور حلقوں کے دفاتر سے اتحاد عمل کرتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ وہ کام جو یہ دفتر خود کرتا ہے۔ اندھوں، گونگوں، بہروں اور بے گھروں وغیرہ کی نگہداشت ہیں۔ یہ مرکزی دفتر حلقوں کے دفاتر کا انتظامی اعتبار سے ایک خاکہ ہوتا ہے۔ حلقوں کے دفاتر میں انتظامی پیچیدگیوں کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ ان کا خاص کام نظم و نسق نہیں بلکہ لوگوں اور گھرانوں سے ذاتی ارتباط اور ان کی امداد ہوتا ہے۔ اگر ہم مرکزی دفتر کا اچھی طرح مطالعہ کرلیں تو رفاہ عام کے انتظام کا نہایت اچھا خاکہ ہمارے پیش نظر ہو جائے گا۔ مرکزی دفتر کے کام کی تقسیم حسب ذیل اصولوں پر کی گئی ہے۔

(۱) رفاہ عام کے کام۔

(۲) بچوں کی نگہداشت۔

(۳) لڑائی کے زخمیوں اور مقتولوں کے پس ماندگان کی خدمت۔

(۴) ضعیف العمری کی پنشن اور دوسری پنشنیں۔

ان میں سے ہر محکمہ کی ایک انتظامی کمیٹی نہایت وسیع پیمانہ پر علیحدہ علیحدہ مرتب ہوتی ہے جس میں میونسپلٹی کے چند ارکان۔ بیسوں حلقوں کے دفاتر میں سے ہر ایک کے چند ممبر سلطنت کی مجلس مقننہ کے ایک یا دو ممبر۔ وہ لوگ جو ذاتی طور پر رفاہ عام سے دلچسپی رکھتے ہیں نیز رفاہ عام کی غیر سرکاری انجمنوں کے نمائندے اور ایک یا دو لڑائی کے زخمی شامل ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا محکمے جو کچھ کام کرتے ہیں اسکی تشریح حسب ذیل ہے:۔

۱۔ رفاہ عام کے عام کام | یہ کام اس قدر وسیع ہے کہ ہم اس کو صرف سطحی طور پر بیان کرسکیں گے تعلیم اور اندھے، بہرے اور گونگوں کی نگہداشت کے علاوہ جو اس محکمہ میں شامل ہے یہ محکمہ

عموماً موجودہ صنعتی نظام کے ستم رسیدہ اشخاص کی مدد اور گذشتہ جنگ عظیم کے انحطاطی اثرات کا مقابلہ کرتا ہے۔ رفاہ عام کے متعلق تمام کاموں کی بھی حسب ذیل تقسیم ہو سکتی ہے :۔

(الف) اندھوں کی خبر گیری۔ اُنکے ابتدائی اور ثانوی مدارس کا انتظام اور تجارتی اور مختلف پیشوں کے اسکولوں کی دیکھ بھال۔

(ب) بہروں اور گونگوں کی خبر گیری۔ اندھوں کے مدرسوں کی طرح انکے اسکولوں کا انتظام اور نگرانی۔

(ج) بے گھروں کی مدد۔

(د) ایسے کارخانوں کا انتظام جہاں رہا شدہ قیدیوں، فقیروں اور آوارہ گردوں کو جبریہ کام سکھایا جائے۔ اور انکی رہائش اور اُنکے طعام کا انتظام۔

(ہ) لنگر خانوں کا انتظام۔

(و) بیماری، حادثات اور سماجی حیثیت کا بیمہ۔

(ز) قلیل پنشن پانے والوں کی خبر گیری۔ اس میں اوسط اور اعلیٰ طبقہ کے ایسے لوگ شامل ہیں جو لڑائی یا مارک کی قیمت گر جانے کے ستم رسیدہ ہیں اور جنکی دست گیری حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے۔

یہ تمام کام نہایت اچھی طرح انجام پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اندھوں، بہروں اور گونگوں کو نہ صرف حکومت کے مدارس میں جدید ترین علمی طریقوں سے تعلیم دیجاتی ہے بلکہ اگر وہ غریب ہوتے ہیں تو حکومت (محکمہ رفاہ عام کے ذریعہ) انکی امداد کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس قسم کی شکایات تو قطعی طور پر سننے میں نہیں آئیں کہ ایسے لوگوں کے ساتھ صرف اسلئے بُرا سلوک کیا جائے کہ وہ اتفاقاً غریب یا اپاہج ہیں۔ اسکولوں کا ساز و سامان اور انکی ضروریات کامل طور پر مہیا کی جاتی ہیں اور اچھے سے اچھے استاد جو مل سکتے ہیں اسکول کے نگراں بنائے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں تمام ممکن کوشش اندھے پن ۔ بہرے پن اور گونگے پن کے روکنے کی کیجاتی ہے ۔ پیدائش کے وقت طبی نگرانی اکثر بچوں کو اندھے ہو جانے سے بچاتی ہے ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۸۰ فیصدی بچوں کا اندھا پن والدین کو مرض آتشک ہونے کے باعث ہوتا ہے ۔ جرمنوں نے اس مسئلہ کو قریب قریب حل کر لیا ہے ۔ اور ہم ہندوستان کے لوگوں کی توجہ خاص طور پر جرمن سائنسدانوں کی اس تحقیقات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ قریب کی شادی مثلاً عمزادوں وغیرہ کے آپس کے رشتے بسا اوقات بچوں کے گونگے پن اور بہرے پن کا باعث ہوتے ہیں ۔

اندھوں ۔ بہروں اور گونگوں کی مدد یا کفالت کیساتھ اسکی کوشش بھی کیجاتی ہے کہ ایسے لوگوں کو جلد سے جلد اپنا بار آپ برداشت کرنے کے قابل بنا دیا جائے اور اسوقت تک جبتک کہ وہ اس قابل نہیں ہوتے حکومت انکی تعلیم ، رہائش اور خورد و نوش کا انتظام کرتی ہے ۔ اصل مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اسکو بھی سوسائٹی میں ایک کام کا آدمی بنا دیا جائے

بے گھروں کی مدد کا مسئلہ جو اوپر بیان کیا جاچکا ہے صاف طور پر موجودہ صنعتی نظام کا نتیجہ ہے ۔ برلن میں ہزاروں آدمی ایسے ہیں جو باوجودیکہ تمام عمر اپنے دست و بازو کو کام میں لاتے رہے مگر پھر بھی آج انہیں رہنے کو گھر میسر نہیں ۔ ایسی صورت حالات سے شک ہوتا ہے کہ ہمارے موجودہ نظام معاشرت میں کوئی بڑی خامی ہے ۔ رفاہ عام کے تمام کاموں کے باوجود اس مسئلہ کا حل ممکن ہی نہیں ۔ یہ کام تو صرف عارضی تسکین مرض کے لئے ہیں مگر پھر بھی اس مسئلہ کو حل کرنیکی جو کچھ کوشش ہو سکتی ہے کیجاتی ہے ۔ بڑی بڑی بارکیں جنمیں پہلے فوجیں رہتی تھیں یا نئی بارکیں جو خاص طور پر اسی مقصد کے لئے تعمیر کیجاتی ہیں بے گھروں کے رہنے سہنے میں استعمال ہوتی ہیں تاکہ انکو اس سے بہتر جگہ مل جائے ۔ ان بارکوں میں قطار در قطار چارپائیاں بچھائی جاتی ہیں اور ہر شخص کو کمبل اور تکیہ محکمہ ہی سے ملتا ہے ۔ یہ بارکیں خاصی گرم ہوتی ہیں اور پاخانوں اور غسلخانوں وغیرہ کا نہایت اچھا انتظام

اصول حفظان صحت کے مطابق ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو جو انہیں رہتے ہیں روزانہ صبح ناشتہ کے لئے روٹی اور کافی ملتی ہے۔

رفاہ عام کے کاموں میں غربا، اور مساکین کو کھانا کھلانے کا کام بہت وسیع اور اہم ہے یہ ایک نہایت مفید کام ہے۔ برلن میں ایک بہت بڑا مرکزی مطبخ ہے جہاں صبح سویرے عورتیں کام شروع کرتی ہیں اور دس بجے تک کھانا تیار کرلیتی ہیں۔ غذا گو نہایت سادہ ہوتی ہے مگر لذیذ اور مقوی ہوتی ہے اور صحت برقرار رکھنے کو کافی ہوتی ہے۔ یہ کھانا شہر کے دوسرے چھوٹے مطبخوں کو جنکی تعداد ۱۴ ہے ایسی گاڑیوں میں جن میں ہوا داخل نہیں ہوسکتی بھر کر بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں سے اُن لوگوں کو جن کے پاس دفتر رفاہ عام کے ٹکٹ ہوتے ہیں بہت کم داموں پر کھانا ملتا ہے یعنی اُن سے صرف کھانے کی لاگت کے مطابق قیمت وصول کیجاتی ہے۔ بہت سے لوگوں کو مفت کھانا ملنے کے کارڈ بھی ملتے ہیں اور اس کھانے کی قیمت دفتر رفاہ عام کو ادا کرنا پڑتی ہے جو شہر برلن کے میزانیہ میں شامل ہوتی ہے۔ اسی اصول پر عورتوں کی انجمنوں نے بھی بہت سے مطبخ قایم کر رکھے ہیں اور اگر خرچ کی کمی پڑتی ہے تو محکمہ اُنکی مدد کرتا ہے۔

اس موقعہ پر بیکاری کے تدارک کے محکمہ کا ہم صرف مجمل حال بیان کریں گے۔ یہ محکمہ ہمیشہ کام نہیں کرتا بلکہ ملک میں جب عام طور پر بیکاری کا شور ہوتا ہے کام کرتا ہے۔ ہر بیکار شخص کو ہفتہ وار اس قدر روپیہ ملتا ہے جو اُس کی کفالت کرسکے۔ بیکاری کی سند کو دکھا کر وہ یا اُسکے خاندان کے لوگ حلقہ کے سرکاری مطبخ سے لاگت کے داموں پر کھانا خرید کر گھر لے جا سکتے ہیں۔

رفاہ عام کے ان عام کاموں کے ماتحت فقیروں کا مسئلہ بھی آجاتا ہے جس کو ہم نے ابھی تک بیان نہیں کیا ہے۔ دراصل جرمنی میں بھیک مانگنا خلاف قانون ہے کیونکہ نادار مرد عورت یا بچہ قانون رفاہ عام کی کسی نہ کسی دفعہ کے ماتحت آجاتا ہے اور مدد کا مستحق ہوجاتا ہے

اس پر بھی فقیر باقی ہیں اور رحم کی وجہ سے انکو گرفتار نہیں کیا جاتا - وہ لوگ جو انہیں کچھ دینا چاہتے ہیں کھانے کے ٹکٹوں کی چھوٹی چھوٹی گڈیاں خرید لیتے ہیں اور بجائے نقدی کے یہی اُن کو دیدیتے ہیں - اس ٹکٹ سے وہ حکومت کے مطبخ سے کھانا لے سکتے ہیں -

بیماری حادثات اور سماجی حیثیت کا بیمہ جس کا اوپر ذکر آچکا ہے بہت وسیع کام ہے یہ جرمنی میں تقریباً پچاس برس سے قائم ہے - ہر مزدور کی کمائی کا دسواں حصہ ہفتہ وار لے لیا جاتا ہے اور اس میں اس کے آقا سے اسکا دوگنا لیکر ملا دیا جاتا ہے - یہ روپیہ بیمہ کے بنکوں میں جمع کر دیا جاتا ہے اور ضرورت کے وقت نکالا جا سکتا ہے - اس کے متعلق بہت مشرح قانون ہے اور حکومت کو اس پر کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا - ہر بیمار کو اس کی اصل مزدوری کا تقریباً ½ بہت باقاعدگی سے ہفتہ وار ملتا ہے - حکومت کے خیراتی ہسپتال اور طبیب ہر حلقہ میں ملازم ہوتے ہیں جنکا کام بیمہ شدہ بیماروں اور مجروحوں کا علاج بلا معاوضہ کرنا ہوتا ہے اور نہ صرف بیمہ شدہ شخص خود مفت علاج کا حقدار ہوتا ہے بلکہ اسکے گھرانے کے تمام ایسے لوگ بھی جنکا وہ کفیل ہوتا ہے بیماری کی حالت میں مفت علاج کے مستحق ہوتے ہیں - اس محکمہ کے ماتحت سینکڑوں اسپتال اور صحت بخش مقامات تمام جرمنی میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں لوگ مفت رکھے جاتے ہیں اور انکا بلا معاوضہ علاج ہوتا ہے - طبی مشورہ - بڑے سے بڑے آپریشن یا طویل آرام کے ذریعہ سے علاج ، غرضکہ اس قسم کی ہر امکانی ضرورت کا یہاں انتظام ہوتا ہے -

اسی محکمہ کے ماتحت اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو محکمہ نگہداشت اطفال کا ہے رفاہ عام کی سب سے نفیس شاخ یعنی ماؤں کی نگہداشت آتی ہے - ہر شادی شدہ یا غیر شادی شدہ عورت جس کے بچہ ہونے کو ہوتا ہے اپنے زمانہ حمل میں یا اسکے بعد جبتک اس کو ضرورت ہو قانوناً کھانے کپڑے وغیرہ کی حقدار ہوتی ہے - ہر مزدور عورت کو بچہ ہونیکے بعد کم از کم چھ ہفتہ آرام کی اجازت ملتی ہے اور اگر اسکے بعد اس کو دوبارہ کام نہ مل سکا تو اس کی اور اس کے بچہ کی جب تک کہ ضرورت ہو محکمہ رفاہ عام دستگیری کرتا ہے - اگر ماں غریب یا غیر شادی شدہ ہو تو بچہ کو

اس کے بچپن کے زمانہ میں باقاعدہ ماہوار پنشن ملتی ہے۔ یہ کام اس صورت میں انجام پاتا ہے کہ جب کسی عورت کے وضع حمل کا وقت قریب ہوتا ہے تو وہ اپنے حلقہ کے دفتر نگہداشت اطفال کے شعبہ مشورہ مادران میں جاتی ہے اور اپنی ضروریات بیان کرتی ہے۔ معائنہ کے بعد اس کو ہفتہ وار مناسب کھانا ملتا رہتا ہے اور اس کے اور اس کے بچہ کے کپڑوں کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ نیز دیگر اخراجات کو کچھ روپیہ بھی مل جاتا ہے۔ زچہ پن کے زمانہ میں اسکو اس کی اصل مزدوری کے بقدر روپیہ ملتا ہے۔ وہ ایک طبیب کی نگرانی میں رہتی ہے اور ایک دائی اس کی خدمت کرتی ہے دودھ وغیرہ کے لئے اس کے علاوہ روپیہ ملتا ہے۔

اس موقعہ پر اکثر معلم اخلاق حضرات غیر شادی شدہ عورتوں کی مدد پر شاید معترض ہوں اور انہیں اس صورت میں بھی سزا کا مستوجب سمجھیں جبکہ انہیں حالتوں میں مردوں سے کوئی بازپرس نہیں کیجاتی۔ جرمن اس اعتبار سے بہت آگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "عورت ماں ہونیوالی ہے اور ہم ہر ماں کی عزت کرتے ہیں۔ ایک نئی ہستی عالم وجود میں آرہی ہے۔ اسکا حق ہے کہ ولادت بخیر و خوبی ہو اور اُسے زندگی میں صحت اور خوشی حاصل کرنیکا موقع دیا جائے اور نہ اسوقت تک جب تک کہ وہ سوسائٹی کا ایک مفید اور پیدا کرنے والا ممبر نہ ہوجائے اس کی تربیت میں کوئی چیز حائل ہونا چاہیئے" جرمن اس چھوٹی سی جان کو پیدا ہونے سے قبل کی حالت میں یا اس کے بعد اس طرح قابل سزا نہیں ٹہراتے گویا کہ وہ اپنی پیدائش کا خود ذمہ دار ہے۔ ماؤں کی حفاظت پر جرمنی میں اس قدر روپیہ سالانہ صرف ہوتا ہے جتنا کہ بعض بڑی بڑی طاقتیں جہازوں کی تعمیر پر کرتی ہیں اور یہ بہت ہے۔

۲۔ بچوں کی نگہداشت ہم اس عظیم الشان کام کی ابتدا حال کے پیدا شدہ، نہیں، بلکہ اس سے بھی پہلے غیر پیدا شدہ بچہ سے کریں گے۔ ہم کو جرمن قانون رفاہ عام میں بچوں کی نگہداشت والی دفعہ کی ابتدائی عبارت ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے جو یہ ہے کہ:-

"ہر بچہ حکومت کی سرپرستی میں ہے اور وہ اپنی جسمانی، روحانی اور معاشرتی نگہداشت

اور تعلیم کا حق رکھتا ہے "

جرمن مجلس مقننہ (Reichtag) کی ایک ممبر (عورت) نے اپنی تقریر میں کہا تھا بچوں اور جوانوں کی نگہداشت ایک ایسا کام ہے جس کا اثر ہماری آئندہ تاریخ پر پڑے گا۔ وہ ہمارا فرض ہے جو ہم کو ادا کرنا چاہئیے۔ جرمنی اور برلن میں ہمارے پاس سونا نہیں اور نہ چاندی ہے، نہ روئی اور اون ہے بلکہ ان بچوں کا بیش بہا خزانہ ہے جو کل جوان ہوں گے۔ ہم بچے رکھتے ہیں اور ہمیں اُن کو تعلیم دینا چاہیئے تاکہ جب ہمارا نصیب جاگے تو یہی بچہ وہ کام کرے جو اب افسوس کہ ہم نہیں کر سکتے۔"

جرمنی میں بچوں کی خبرگیری سے مطلب یہ ہے کہ ہر بچہ رہائش۔ کھانے۔ کپڑے اور تعلیم کا حقدار ہے۔ اگر اسکے والدین اتنے غریب ہیں کہ ان اخراجات کو نہ برداشت کر سکیں تو حکومت کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ یہ چیزیں اس کے لئے مہیا کرے۔ ہر حلقہ کے رفاہ عام کے دفتر میں ایک شاخ بچوں کی نگہداشت کی ہوتی ہے جو حلقے کے کام کرنیوالوں کے ذریعہ لڑکوں اور بچوں کی دیکھ بھال کا تمام کا انجام دیتی ہے۔ یہ شاخ حسب ذیل کام کرتی ہے:-

حکومت کی جانب سے بچوں کے سرپرست مقرر کرنا۔ ایسے لوگوں کی تلاش کرنا جو بچوں کو متبنیٰ کریں۔ یتیم خانوں کا انتظام۔ بچوں کے تربیت گھر (جہاں کام کرنے والی مائیں دن کو اپنے بچوں کو چھوڑ جائیں) اپاہج بچوں کے رہنے کا انتظام اور تربیت کے لئے مکانات اور تعلیم گاہیں۔ کھلے میدان یا جنگل کے مدرسے۔ تعطیلوں کی قیام گاہیں۔ اسپتال وغیرہ (یہ کام اس محکمہ اور محکمۂ حفظان صحت میں مشترک ہیں) بچوں کی تربیت جسمانی اور طبی دیکھ بھال تعلیم پانے والے بچوں کے مفت کھانے کا انتظام۔ نابالغوں کے مقدمات کے لئے عدالتیں۔ سیر و سفر کی مجلسیں۔ کاروباری اور تجارتی اسکولوں کا انتظام۔

ترقی یافتہ ممالک میں ۱۴ برس سے کم عمر کے بچے کوئی پیشہ کسی وقت بھی نہیں اختیار کر سکتے مگر جرمنی میں اس عمر میں بھی یہ قید ہے کہ لڑکے کو کسی کام کی امیدواری سے پیشتر کسی اسکول سے ابتدائی آٹھ سال کی تعلیم ختم کرنیکی سند پیش کرنی چاہئے۔ اس حالت میں بھی کام سیکھنے کے

زمانہ میں لڑکا حکومت کی سرپرستی میں رہتا ہے۔ بچوں کی تربیت اور نگرانی کا تمام کام اس قدر مکمل ہے کہ کسی صورت میں کوئی بچہ بھی اسکے فائدہ سے محروم نہیں رہ سکتا۔

بچوں کے سلسلہ میں سب سے اچھی اور دل پر اثر کرنیوالی شاخ وہ ہے جس میں ایسے پژمردہ اور کمزور بچوں کی دیکھ بھال کیجاتی ہے جنہیں بیماری کا خدشہ ہوتا ہے۔ یہ بچے پہاڑوں یا ساحل بحر کے آرام گھروں یا تعطیلوں کی قیام گاہوں میں بھیج دئے جاتے ہیں (یتیم بچوں زیہ بچے بالل محکمہ نگہداشت اطفال کی نگرانی میں رہتے ہیں) اور غریبوں کے بچوں کے لئے یہ طریقہ ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ غریب والدین یا ایسے والدین جو گو اتنے غریب نہوں مگر پھر بھی اپنے بچوں کو کسی ایسی جگہ بھیجنے کے قابل نہیں محکمہ نگہداشت اطفال میں جاکر اپنا حال بیان کرتے ہیں اور اس صورت میں انکے بچے بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ ایسے بچوں کو جنہیں صرف تبدیل آب و ہوا اور شہر کی پرشور زندگی سے آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ چھ ہفتے کافی ہوتے ہیں۔ ایسے بچے جن پر کسی بیماری مثلاً سل وغیرہ کا اثر ہوتا ہے چھ ماہ۔ ایک سال یا اس سے زیادہ کی مدت کے لئے جو بھی مناسب سمجھی جائے بھیجے جاتے ہیں۔ وہاں سے واپسی پر انکی نگرانی رہتی ہے اور سال بسال شہر سے صحت بخش مقامات کو بھیجے جاتے ہیں۔ وہ بچے جو بیمار ہوتے ہیں دیہات پہاڑوں یا ساحلوں کے اسپتالوں اور صحت افزا مقامات میں شفا پانے تک قیام کرتے ہیں۔ ایسی حالتوں میں تمام وہ بچے جو اس مجبوری سے چھٹی پر ہوتے ہیں رفاہ عام کے نہایت اچھے کام کرنیوالوں کی نگرانی میں ہوتے ہیں جو انکی صحت اور تعلیم کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

چھٹی اور آرام کا یہ طریقہ تمام ثانوی مدارس اور یونیورسٹیوں میں جاری ہے مثال کے طور پر برلن یونیورسٹی کے وہ طلبہ جو تھک جاتے ہیں حکومت کی جانب کے مقرر کردہ طبیب سے اس بات کا سرٹفکیٹ حاصل کرتے ہیں کہ وہ تھک گئے ہیں اور انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انکو ایک ماہ اس سے زیادہ کیلئے کسی صحت بخش مقام کو بھیج دیا جاتا ہے۔ حکومت انکے تمام اخراجات کی کفالت کرتی ہے۔ اور وہ دوبارہ اپنا کام زیادہ بہتر طریقہ سے انجام دینے

کے قابل ہو کر واپس آجاتے ہیں۔

بچوں اور خردسالوں کی بہبودی کے کاموں کی ایک حیرت انگیز شاخ اسکولوں میں صحت کی نگرانی۔ ورزشی رقص اور مختلف سیر و سفر کی انجمنوں میں پائی جاتی ہے۔ آخرالذکر نوجوانوں کی جماعتیں ہیں جن میں کبھی لڑکے لڑکیاں دونوں ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی علیحدہ علیحدہ یہ جماعتیں موسم گرما میں دیہات میں گھومتی ہیں۔ وہ ایک سرگروہ کی رہنمائی میں ہوتی ہیں جو یا تو عموماً استاد ہوتا ہے یا رفاہ عام کا کوئی کام کرنے والا۔ اور یا کبھی کی انجمنوں کا کوئی مرد یا عورت ممبر جسکا کام ہی ان لوگوں کے ساتھ سیر و سفر کرنا ہوتا ہے۔ سیر و سفر کی ان جماعتوں نے پہاڑوں پر اور دریاؤں کے کنارے یا اسی قسم کے پُرفضا مقامات پر اپنے مکانات تعمیر کرلئے ہیں جہاں وہ دوران سفر میں شب کو قیام کرتے ہیں یا آگے چلنے سے پیشتر دو ایک دن رُکتے ہیں۔ عموماً یہ کھانے پکانے کے لائق چھوٹے چھوٹے مکانات ہوتے ہیں جن میں صرف پکانے اور سونے کا ضروری سامان ہوتا ہے۔ یہ لوگ اگر طلوع آفتاب سے قبل نہیں تو اس کے ساتھ ہی اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ وہ اپنا کھانا آپ پکاتے ہیں اور گھر کو اسی قدر صاف اور باترتیب چھوڑ جاتے ہیں جتنا کہ انہوں نے پایا تھا۔ ملازموں کا تو یہاں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کیونکہ جرمن جوان مضبوط اور محنتی ہوتا ہے۔ اُسے اپنا کام اپنے ہاتھ سے اور پھر وہ بھی اچھی طرح سے کرنا سکھلایا جاتا ہے۔

جرمنی کے نوجوانوں کی تحریک نے دنیا کے سارے متمدن ممالک کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی ہے۔ گرمی کے زمانہ میں جہاں کہیں جائیے دس اور اٹھارہ کے درمیان کے وہ لڑکے اور لڑکیاں جنکا رنگ آفتاب کی تمازت سے دمکتا ہے اپنے جھولے اور برساتیاں کندھے پر ڈالے، خوب مضبوط سفری جوتے چڑھائے آپ کو ہر جگہ ملیں گے۔ موسم سرما میں اُنکا حملہ دیہات پر رہتا ہے۔ بچے، عورتیں اور مرد برف پر چلنے کی گاڑیاں۔ جوتے۔ پہیئے اور تختے لئے زمستانی کھیلوں کا لطف اٹھاتے ہیں جیسے انکے جسم ہوتے ہیں ویسے ہی انکے دماغ

اور انکی روحیں ہوتی ہیں۔ وہ مضبوط محنتی اور تندرست ہوتے ہیں اور جوانی کے اُن روگ بھرے اور فاسد شہوانی جذبات سے پاک ہوتے ہیں جو غیر فطری خراب آب و ہوا کے مقامات میں رہنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ نوجوانوں کی اس تحریک کے باعث اب سے بیس برس بعد کا یہ ملک ایک ایسا ملک ہوگا جو آجتک ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا ہے۔ اس ملک نے حیات قومی کا یہ بنیادی اصول سمجھ لیا ہے کہ بچے ہی بڑے ہوکر مرد اور عورت ہوتے ہیں اور ایام طفولیت کے اثرات اور عادات و اطوار اور مشاغل انسان کے اخلاق کے لئے اسکے سانچے کا کام کرتے ہیں۔

۳۔ لڑائی کے زخمیوں اور مقتولین کے پس ماندگان کی خدمت۔ رفاہ عام کے کام کا محکمہ تو ایک بہت بڑا محکمہ ہے مگر ایک مستقل نہیں جیسا کہ بچوں کی نگہداشت کا محکمہ۔ یہ محکمہ حسب ذیل شاخوں پر منقسم ہے۔ لڑائی کے زخمیوں اور ستم رسیدہ اشخاص کے لئے مختلف روزگاروں کی ہدایتیں اور تعلیم۔ بیمار اور کمزور زخمیوں کی خبرگیری۔ مقتولین کے بچوں کی نگہداشت (اس محکمہ کو محکمہ نگہداشت اطفال سے بہت قریبی تعلق رہتا ہے) زخمیوں کی نوآبادیاں قائم کرنا اور انکو کام شروع کرنیکے لئے سرمایہ قرض دینا۔ زخمیوں کی پنشنوں اور مقتولین کے بچوں کی تربیت کا انتظام۔

مندرجہ بالا خاکہ سے کام کی نوعیت معلوم ہوسکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے زخمیوں کو مناسب کاروبار کی تعلیم دیجاتی ہے پھر انکے لئے کسی تجارت میں جگہ تلاش کرکے کام سے لگا دیا جاتا ہے۔ اور وہ زخمی جو کام کے لائق نہیں رہے مستقل طور پر پنشن پاتے ہیں۔ مقتولین کے والدین، بیواؤں اور بچوں کی بھی قدر کیجاتی ہے۔ بڈھے والدین کو پنشن ملتی ہے اور اگر بیوائیں بے روزگار ہوتی ہیں تو انہیں بھی پنشن ملتی ہے اور یتیم بچوں کے لئے دوسرے بچوں کی طرح تعلیم کا بندوبست ہوتا ہے۔ ان بچوں کو اگر اُن کے لئے مستقل طور پر گھر ملنا ممکن ہوتا ہے تو یتیم خانوں میں نہیں رکھا جاتا ہے۔ محکمہ نگہداشت اطفال لڑائی کے زخمیوں کے محکمہ سے بالکل ہم آہنگی سے کام کرتا ہے۔ بچوں کو لوگوں کے گھروں میں رکھنے کا ایک مکمل نظام تمام ملک کے لئے بنایا گیا ہے۔ رفاہ عام کے کام کرنے والے اس قسم کے مکانوں کی تلاش میں رہتے

ہیں۔ اُنکی آب وہوا وغیرہ کو دیکھتے ہیں اور پھر اگر مالی اور اخلاقی حالت سے مطمئن ہوتے ہیں تو بچوں کو وہاں رکھ دیتے ہیں۔ بے بچوں کے ایسے گھر اکثر ملتے ہیں جو ان یتیموں کو خوشی سے لے لیتے ہیں۔ لیکن باضابطہ طور پر بچہ اسوقت تک متبنیٰ نہیں کیا جا سکتا جبتک کہ اُسکا یقین نہو جائے کہ متبنیٰ بنانیوالوں کے اب بچہ نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں یتیم بچہ کے حقوق کی حفاظت رہتی ہے۔ علاوہ بریں بچہ کو کسی گھرانہ کے سپرد کرنیکے بعد بھی محکمہ اسکی نگرانی رکھتا ہے اور اُس کے اخراجات کے لایق اس کے رکھنے والوں کو ہر مہینہ کچھ روپیہ مل جاتا ہے اور اس صورت سے بچہ بھی معاشی تنگی سے بچ جاتا ہے۔ وجہ نہایت معقول ہے کہ ہر بچہ بچپن کی ایسی زندگی کا مستحق ہے جس میں اسپر سخت محنت نہ پڑے اور وہ صحیح نشو و نما اور تعلیم پا سکے۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ مگر اس وقت ہم یہ کہنا مناسب سمجھیں گے کہ اکثر وسیع الخیال لوگوں کی طرح جرمن بھی یتیم خانوں کے مخالف ہیں۔ انکا خیال ہے کہ بچوں کی نشو و نما کا بالکل فطرتی اور صحیح طریقہ گھر کی زندگی ہے۔ خواہ وہ گھر غیروں کا گھر کیوں نہ ہو۔ اسی وجہ سے وہ یتیم خانوں کو وقتی اور عارضی صورت کے لئے استعمال کرتے ہیں یا ایسی جگہوں کی طرح جہاں صرف بیمار یا کمزور دماغ کے بچے رکھے جاتے ہیں اور انکی تیمار داری کیجاتی ہے۔

۴۔ ضعیف العمری کی پنشن اور دوسری پنشنیں۔	جرمنی کی یہ ایک بہت قدیم چیز ہے جس کو دوسرے ممالک اختیار کر رہے ہیں۔ اس محکمہ کے ماتحت حسب ذیل تحریکات آتی ہیں۔

حاجتمند بڈہوں کی پنشنیں۔ اُنکے لئے گھروں کا انتظام اور چھوٹے چھوٹے مکانات کی نو آبادیوں کا قائم کرنا جہاں وہ زیادہ قدرتی اور خوشگوار گرد و نواح میں بسر کر سکیں۔ تمام پنشن پانیوالوں کو قانونی مشورہ اور مدد۔ پنشن کے سلسلہ میں نئی نئی صورتوں کی تلاش اور انپر عمل در آمد۔

اس مضمون کو ہم زیادہ طوالت دینا نہیں چاہتے صرف اس قدر عرض ہے کہ ہر مرد اور عورت ایک ایسی عمر کو پہنچ کر جبکہ وہ کام سے معذور ہو جائے (میرے خیال میں یہ عمر ۶۵ سال ہے

اس سے پہلے بھی اگر کوئی چاہے تو یہ حق طلب کرسکتا ہے) اپنی بقیہ زندگی کے لئے پنشن کا مستحق ہوجاتا ہے۔ یہ پنشن اس قدر ہوتی ہے کہ انسان اس حیثیت سے اپنی زندگی بسر کرسکے جس کی اس کو عادت ہو۔ اس خیال کے پردے میں یہ حقیقت ہو کہ بڈھا اسی طرح اپنے بڑھاپے کا ذمہ دار ہنیں جس طرح وہ اپنی پیدایش کا ذمہ دار نہ تھا۔ اور اگر وہ ساری عمر کام کرنیکے باوجود وہ اکثر لوگوں کی طرح اس قابل نہ ہوا کہ کچھ پس انداز کرسکتا تاکہ اس عمر میں کام آتا تو یقیناً وہ حکومت کی امداد کا مستحق ہو۔ شاید یہ کہا جائے کہ کسی شخص کے تمام عمر کام کرنیکے باوجود اسقدر پس انداز نہ کرسکنا کہ وہ ضعیفی میں محنت بغیر خرچ چلا سکے موجودہ صنعتی نظام کی خامی ہے مگر اعتراض کے باوجود مشکل باقی رہتی ہے اور اسکا حل مندرجہ بالا صورت سے کیا گیا ہے۔ ہر حکومت کے ماتحت بڑھاپے میں زندگی بسر کرنے کے لائق امداد ہر شخص کا اصولی حق ہے اور یہ وہ حق ہے جسے ہر ملک کے ترقی یافتہ لوگ کسی نہ کسی دن تسلیم کرینگے۔

رفاہ عام کی تعلیم کے مدارس | ہم خیال کرسکتے ہیں کہ رفاہ عام کے اس قدر عظیم الشان کام کو چلانے کے لئے ایک بہت بڑی تعداد اس خاص کام کی تعلیم پائے ہوئے لوگوں کی درکار ہوگی اس ضرورت کو پورا کرنیکے لئے ملک کے مختلف حصوں میں کام کرنیوالوں کی تعلیم کے لئے تیس اسکول کھولے گئے ہیں جن میں سے ۲۹ عورتوں کے لئے ہیں اور ایک مردوں کے لئے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ رفاہ عام کے کام کے لئے عورتیں ہی زیادہ مناسب خیال کیجاتی ہیں اور اسی وجہ سے جرمنی میں یہ کام کرنیوالی زیادہ تر عورتیں ہیں۔

ان اسکولوں کی تعلیم دو سال کے کورس پر مشتمل ہے جن میں نظری اور عملی دونوں قسم کی تعلیم شامل ہے۔ داخلے کے لئے حسب ذیل شرائط ہیں۔

درخواست دینے والی بیس سال یا اس سے زیادہ کی ہو۔ ہائی اسکول یا کسی دوسرے ایسے تجارتی یا کاروباری اسکول سے فارغ التحصیل ہوچکی ہو جس کو حکومت مستند سمجھتی ہو۔ اور اگر ایسا نہو تو کم سے کم اس نے کسی رفاہ عام کے اسکول کی نگرانی میں کسی معاشرتی کام کی کسی خاص شاخ

میں تین سال بحیثیت امیدوار کام کیا ہو۔

اسکول کے قیام میں اس کو کسی ایک کام یا اس سے زیادہ کاموں میں خاص مہارت حاصل کرنا ہوتی ہے مثلاً خانگی حادثات، حفظان صحت نگہداشت اطفال۔ رفاہ عام کا صنعتی کام وغیرہ۔ انکے نصاب تعلیم میں اس قسم کے مضامین شامل ہیں جیسے علم الابدان حفظان صحت اور صحت عامہ نفسیات اور تعلیمات اجتماعی۔ نگہداشت اطفال۔ اجتماعیات۔ معاشیات۔ تاریخ قانون رفاہ عام۔ رفاہ عام کے کاموں کی تنظیم اور گھروں وغیرہ کا انتظام۔ موسیقی اور کسرت وغیرہ۔

اسکول کی تعلیم کے اختتام پر رفاہ عام کی کسی شاخ میں دو سال کام کرنا ہوتا ہے اور جب اسکی عمر کا چوبیسواں برس ہوتا ہے اس کو گورنمنٹ کی سند اور نیلی یونیفارم مل جاتی ہے۔ وہ سرکاری ملازم ہوجاتی ہے اور باقاعدہ تنخواہ پر کام کرتی ہے۔

جرمنی کے رفاہ عام کے کاموں کا یہ ایک بہت مختصر خاکہ ہے۔ بیشمار چیزیں ایسی ہیں جنکو نظرانداز کردیا گیا۔ ہندوستان کے ایسے لوگوں کو جنہیں تنظیم اور تعلیم کے کاموں سے دلچسپی ہو کم از کم ایک سال کے لئے جرمنی ضرور آنا چاہئے اور اگر وہ اسکو اچھی طرح جاننا چاہتے ہوں تو انہیں برلن کے کسی رفاہ عام کے اسکول میں دو سال صرف کرنا چاہئے۔ بہت سی ہندوستانی عورتوں کو اس خدمت سے خاص دلچسپی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی دو چار نوجوان عورتوں کو جو اسکول یا کالج کی تعلیم سے فارغ ہوچکی ہوں جرمنی آکر تعلیم حاصل کرنیکے متعلق واقعی غور کرنا چاہئے۔ تاکہ وہ واپس ہوکر جرمن طریقہ کار سے ہندوستان کی ضروریات کو پورا کرسکیں۔ ایسی عورتوں کو صرف جرمنی ہی پر بس نہ کرنا چاہئے بلکہ ایک سال روس میں بھی صرف کرنا چاہئے تاکہ وہاں کے کام بھی اچھی طرح سمجھ سکیں کہ وہاں کے معاشرتی اور معاشی حالات ہندوستان کے حالات سے ملتے جلتے ہیں۔

شاید جرمن طریقہ کار میں بہت سی خامیاں ہوں مگر ان دشواریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جو جرمنی کو ایام جنگ میں اور اسکے بعد پیش آئیں حیرت ہوتی ہے کہ یہ کام اسقدر مکمل ہے کسی نہ کسی صورت سے ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی کفالت یا مدد جرمن حکومت کر رہی ہے۔

ہم کو غور کرنا چاہئے کہ ایام جنگ میں جب اتحادیوں نے جرمنی میں سامان خورونوش آنیکا راستہ بند کر دیا تھا اس ملک کو سخت مصائب اور فاقے جھیلنا پڑے تھے۔ اس کے اثرات اب بھی جرمن لڑکوں کے چھوٹے قدوں سے مشاہدہ کئے جا سکتے ہیں اور سل کی بیماری کی عام مصیبت تو بیان کے قابل نہیں۔ پھر یتیموں اور بیواؤں اور تباہ شدہ روزگاروں نیز اُس مال و دولت اور ساز و سامان اور دوسری بیش قیمت اشیا کا کیا ذکر جو تاوان جنگ کے طور پر جرمنی سے لی گئیں۔ اس پر تاوان جنگ کی رقم کا ناقابل برداشت بار تھا جس سے ہر عورت مرد اور بچہ نالاں تھا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جبکہ جرمنی کی بڑی آبادی چربی اور نمک لگی ہوئی سیاہ روٹی پر بسر کرتی تھی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے موت کا بازار گرم رہا اور پھر وہ سخت زمانہ آیا کہ مارک کی قیمت گر جانے سے قوم ناقابل برداشت اور بے اطمینانی کی مصیبت میں گرفتار رہی۔

جرمنوں کی تنظیمی قابلیت ان سب دقتوں پر غالب آگئی اور یہی قابلیت تھی جس نے آگے بڑھ کر ان مصائب کو دور کر دیا جن سے قوم کی بربادی کا خطرہ تھا۔ اسی قابلیت اور مصیبتیں جھیلنے کی قوت اور مستقل مزاجی نے جرمن قوم کو زندہ رکھا۔ اور ترقی کی اعلیٰ منزل پر پہنچا دیا اور یہی وہ قابلیت ہے جس سے ہندوستان والے جرمنی سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اسکا مطالعہ و مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ ایک قوم نے کس طرح ایک قومی مصیبت کا مقابلہ کیا۔ وہ جرمنوں کا طریقہ کار سیکھ کر اُن پر ہندوستان میں عمل درآمد کر سکتے ہیں انگلستان اور امریکہ کے حالات کا مطالعہ اُنکے لئے اسقدر مفید نہ ہوگا کیونکہ دونوں ممالک دولتمند ہیں۔ اور انکے لئے تمام مالی سہولتیں مہیا ہیں۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ امریکہ میں نابالغوں کے مقدمات کی عدالتیں زیادہ منتظم ہیں اور اُن میں زیادہ صحیح روح کام کر رہی ہے مگر جرمنی اور روس

سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ کم روپیہ اور زیادہ ہمت سے آدمی کیا کیا کچھ کرسکتا ہے۔

آج کے رفاہ عام کے کاموں کے مقابلہ میں حکومت کا کام نہ صرف افراد کی جانب سے قومی اور اجتماعی رویہ بدل دیتا ہے بلکہ اس کی اصل اہمیت نفسیاتی حیثیت سے ظاہر ہوتی ہے نجی خیرات ضرورتمند کو عموماً بھک منگا بنا دیتی ہے۔ حکومت کی امداد اسکو ایک بے نیاز شہری بنا دیتی ہے۔ گو جرمنی میں بھی انفرادی اور نجی خیرات بہت عام ہے اور رفاہ عام کے کام بعض نجی جماعتیں بھی چلا رہی ہیں لیکن اکثر کا یہ خیال ہے کہ جبتک حکومت قائم ہے اسکا فرض ہے کہ اپنے شہریوں کی حفاظت کرے اور کسی کو اسکی ضرورت نہ پڑے کہ وہ ادھر ادھر مانگتا پھرے۔ ہندوستان ہمیشہ غلام نہیں رہے گا۔ اور یہ فرض ہندوستان کی نوجوان عورتوں کا ہے کہ وہ مستقبل کو دیکھیں اور اسکے لئے تیار رہوں۔

اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہی کہ جرمنی میں رفاہ عام کا کام عموماً عورتوں کے سپرد ہے اور اس صنف کی رہنماؤں کا خیال ہے کہ ماتا کے اُس جذبہ کو جو عورت کی فطرت میں ہوتا ہے ایک خوشگوار کارآمد اجتماعی موقعہ کام کا ملتا ہے۔ اس روحانیت کی وسعت کا اُن روشن خیال۔ تندرست اور تعلیم یافتہ عورتوں کی تعداد سے اندازہ ہوسکتا ہے جو اس کام کو کرتی ہیں۔ باوجودیکہ وہ جانتی ہیں کہ وہ تنخواہیں جو انہیں یہاں ملتی ہیں دوسرے پیشوں کی تنخواہوں سے کہیں کم ہیں۔ پھر بھی وہ انکو ترجیح دیتی ہیں کیونکہ یہ ایک ایسا کام ہے جس میں وہ براہ راست انسانوں کی حفاظت، انکی نگہداشت اور انکی ترقی کا باعث ہوسکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کی عورتیں بھی جو مختلف حیثیتوں سے جرمن عورتوں سے مشابہ ہیں اس معاملہ میں ان کی ہم خیال ہوں۔

مندرجہ بالا مضمون مس اگنیس اسمیڈلے نے جو امریکہ کے مشہور جرنلسٹ ہیں اور برلن میں مقیم ہیں خاص جامعہ کے لئے تحریر فرمایا اور حامد علیخاں صاحب بی اے جامعی نے اسکا اردو میں ترجمہ کیا۔

مقدمہ انتخاب سودا

(گذشتہ سے پیوستہ)

اب شاعری کے عام اصول پر بحث کرتے ہوئے ہیں سودا اور میر کی غزلوں کے محاسن و معائب دکھانیکی کوشش کروں گا، مقدمہ کے اس جزد کے واسطے میں نے مولوی شبلی مرحوم کی نادر تصنیف شعرالعجم سے مدد لی ہے، اور اکثر جگہ اسی کی عبارت لفظ بلفظ نقل کر دی ہے۔

"شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخیل، محاکات کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو" یعنی جس چیز (مادی یا غیر مادی مرئی یا غیر مرئی) کا بیان کیا جائے خود وہ شئے مجسم ہو کر سامنے آجائے۔ محاکات کی دو قسمیں ہیں ایک تو محاکات جذبات وکیفیات دوسرے مناظر قدرت محاکات جذبات خصوصاً جذبات درد وغم اور یاس وحسرت میں میر کو یدطولے حاصل تھا، خوشی، امید وغیرہ کے جذبات انکے دل ہی میں نہیں تھے نظم کیا کرتے، سودا کو ہر قسم کے جذبات وکیفیات کی صورت گری میں دستگاہ کامل تھی، محاکات کیلئے ہر قسم کی معلومات اور تجربہ کی ضرورت ہے، میر صاحب کی افسردہ دلی عزلت نشینی اور بد دماغی نے انہیں اپنے خاص جذبات پر غور و فکر کا موقع دیا یہ خیالات بیشتر یاسانہ و دردمندانہ ہوتے تھے اور میر صاحب انہیں کی ادہیڑ بن میں رہتے تھے لہذا ایسے جذبات کی تصویریں بے مثل کھینچتے ہیں لیکن جس شخص کے دروازے کے پاس باغ ہو مگر برسوں گذر جائیں اور اسے خبر بھی نہ ہو وہ بہار و باغ کی تصویر کیا کھینچیگا۔ میر صاحب کے یہاں اس قسم کی تصویریں کم ہیں اور جو ہیں انکے رنگ پھیکے و دھندلے ہیں جس کی وجہ سے پوری تصویر نظر کے سامنے نہیں آتی۔ سودا اس قسم کی محاکات کا بادشاہ تھا، دیکھئے کیسی کیسی رنگین اور دلکش تصویریں کھینچتا ہے؎

ساقی بہاری تو یہ تجھ بن ہی کیوں گوارا ۔۔۔ منت نہیں تو ظالم ترغیب یا اشارا
چمن میں آتے سنکر تجھکو باد سحر یہ گھبرائی ۔۔۔ ساغر جیب تک لاویں ہی لاویں تو رسبو کو جام کیلئے

ابر اس کو بجھاتا ہے وہ بجھتی نہیں سودا   دی لالۂ خود رو نے یہ کہسار کو آتش

کیفیت ہے ساقی جلوہ ہائے برق چشمک زن   خروش ابر سے دمساز کیا آواز قلقل ہے

کسے طاقت ہے شرح شوق اس محفل میں کرنیکی   اٹھا دینے کے ڈر سے سانس واں لیتی ہیں وہ ساغر

شور رنگ ہمنوایوں کا ابلتا ہے یہ دل   رخصت یک نالہ لے صیاد جاتی ہے بہار

ڈرتے ڈرتے ترے کوچے میں جو آجاتا ہوں   صید خائف کی طرح رو بقضا جاتا ہوں

اس سے تو چھپا کہئے جو یہ قلقل ہے شیشے میں   مئے گلرنگ بھی ساقی عجب بلبل ہے غنچے میں

ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجکو نیند   جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے مر کہیں

دیتی ہی نہیں چین بدی اپنے گماں کی   ساتھ اسکے میں ہوتا ہوں کوئی جائی کہیں کو

گلریز محبت ہے دل سوختہ میرا   شب نالے میں کرتا ہوں پپیہے کی سی دم دے

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا   ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

بہار و باغ ہو مینا ہو جام و صہبا ہو   ہوا ہو ابر ہو ساقی ہو اور دنیا ہو

وہم غلط کار نے دل خوش کیا   کس پہ نہ جانے وہ نظر کر گیا

ان اشعار میں کسی نہ کسی واقعہ یا جذبہ کی تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے، ایسے اشعار سودا کے دیوان میں بکثرت موجود ہیں۔ اس اقتباس میں سے بھی ہر ایک کی وضاحت میں طول ہو جائے گا اور چنداں ضرورت نہیں کیونکہ ایک شعر بھی ایسا نہیں جو مبہم ہو مگر بعض کی خوبیاں عرض کرتا ہوں۔

میں ایک معمولی واقعہ کو یعنی صبح کے وقت ہوا چلتی ہے اور کلیاں کھلتی ہیں کس لطیف پیرائے میں دکھایا ہے، باغ میں خبر پہنچی کہ وہ مست ناز آئیگا اور مصروف بادہ نوشی ہوگا نسیم سحر انتظام کرنے ادہر اُدہر دوڑنے لگی، پیالے نہیں ملے تو گھبراہٹ میں اس نے صراحیوں کو توڑ کر جام بنا لیا۔ غنچوں کی تشبیہ سبو سے اور گل کی جام سے ظاہر ہے، پھولوں میں شبنم کے قطرے گویا شراب ہیں خبر رساں کون تھا، مرغان سحر کا زمزمہ، مزید لطف یہ ہے کہ اشارہ نے

ہی اشارے میں معشوق کو آفتاب سے تشبیہ دے گئے۔ آفتاب نکلا اور شبنم غائب ہو گئی گویا معشوق نے شراب نوش کی۔ یہ شعر ایسے محاکات کی مثال ہے جس میں صرف چند اجزا بیان کئے جاتے ہیں باقی تصویر خود قوت تخئیل پیدا کر لیتی ہے نمبر ۱۲ (بہار و باغ الخ) ایسا شعر ہے جس میں تصویر کے تمام اجزا موجود ہیں، اس میں "دنیا ہو" کے ٹکڑے نے شعر کو زمین سے آسمان کو پہنچا دیا دل ہو، شوق ہو، اُمنگیں ہوں، حوصلے ہوں ولولے ہوں ور نہ بہار و باغ، شراب و ساقی بیکار، نمبر ۱۴ (کیفیت ہی ساقی) کا قریب قریب وہی مطلب ہے جو نمبر ۱۲ کا ہے، لیکن اس میں ساقی کی مخمور آنکھوں اور آواز قلقل کی طرف خاص توجہ دلائی ہے ساقی کی مستانہ حرکتیں اور اسکا تبسم بجلی سے چشمک زن ہے آواز قلقل شکر ابر مست ہو گیا۔ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ پہلے بجلی چمکتی ہے اور پھر بادل گرجتا ہے، شعر میں اس ترتیب کا بھی لحاظ رکھا ہے، نمبر ۸ (نے سے تو چھپا الخ) خاص شرابیوں کی زبان میں ہے اور انگریزی تصویر۔ The Drunkard's Address to The Moon (شرابی چاند کو مخاطب کرتا ہے) کا جواب ہے، نمبر ۶ (شور سنگرا الخ) میں "جاتی ہے بہار" کے ٹکڑے پر غور کیجئے معلوم ہوتا ہے کہ بے اختیار منہ سے فریاد نکل گئی۔

محاکات کی جان تخیل ہے کیونکہ مشاہدات میں ترتیب اور توافق پیدا کرنا اُب و رنگ چڑھانا قوت تخیل ہی کا کام ہے۔ ورنہ خالی محاکات نقالی سے کم نہیں، محاکات کے لئے تخیل ضروری ہے، مگر تخیل میں محاکات ضروری نہیں، اشعار مندرجہ بالا صرف محاکات بلکہ تخیل کی بہترین مثال ہیں۔

اب چند ایسے اشعار پیش کرتا ہوں جنمیں تخیل کا عنصر غالب ہے یا محض تخیل ہے۔

دکھلائے لیجا کے تجھے مصر کا بازار   خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

(اس شعر کو غالب نے تیز نشتر کہا ہے ملاحظہ ہو عود ہندی)

دکھاؤنگا تجھے زاہد اس آفت دین کو   خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

موج نسیم آج ہے آلودہ گرد سے
دل خاک ہو گیا ہے کسی بیقرار کا

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا
پانی بھی پھر پئیں تو مزہ ہے شراب کا

چمن میں ابر بہار سے اب شراب ٹپکے تو کیا عجب ہے
ہوا ہے رونا قبول ساقی جنابعالی میں مےکشاں کا

ایک دن مجھ سے سلگ اُٹھتے نہ دیکھا کارواں
لے جرس حاصل کچھ اس فریاد بے تاثیر کا

پرے رہ برق خار آشیاں سے میری کہتا ہوں
اڑے گا دھجیاں ہو کر ترا دامن جو یاں اٹکا

جوں شمع تن ہوا شب ہجراں میں صرف اشک
پھر جسقدر میں چاہوں تھا اتنا نہ رو سکا

اشارے کے بلانے سے ہوا رسوا ہے یہ سودا
قیامت اس پر آئے گی جو تیرے قول پر ٹھہرا

تاثیر عشق نے مزۂ درد کھو دیا
اس نے نداں دیکھ مرا حال رو دیا

دعا ہے کس کی قیامت کو ہو پہنچی ہے مری عمر
ہے روز حشر شب ہجر ایک دم جینا

سخن عشق نہ گوش دل بیتاب میں ڈال
مت یہ آتشکدہ اس قطرۂ سیماب میں ڈال

خانۂ دل کہ ہو خوں ہونے کا آئین جس میں
ہے وہ اک بیت کہ سو معنی ہیں نگیں جس میں

ساقیا بزم نہیں آج خلل سے خالی
جام کچھ اور دیے دیتا ہے تو معمور ہمیں

کرکے توبہ ناصحا سو واصل کل ہوا
آج پھر پی ہے مصلیٰ رکھ گرو دو جام کو

رخصت نہیں ہے اپنے تئیں ورنہ عندلیب
تاثیر صد ترانہ اک آہ سحر میں ہے

ہم ہیں وارستہ محبت کی مددگاری سے
سب سے آزاد ہوئے دل کی گرفتاری سے

اثر نے آہ میں ہرچند نے تاثیر نالے میں
پر اتنا ہے کہ ان دونوں سے میرا دل بہلتا ہے

گل ہے عاشق ترا قسم مت کھا
یوں گریباں کسی کا پھٹتا ہے

مستی سے اس نگاہ کی ہے محتسب خبر
دنیا تمام بزم خرابات ہو گئی

درد میرے استخواں کا کیا ترا دمساز ہے
اسقدر اے نے تری محزوں کیوں آواز ہے

ناتوانی بھی عجب کچھ ہے کہ گلشن میں نسیم
نت لئے پھرتی ہے دوش اوپر برنگ بو مجھے

ہے قسم تجکو فلک دے تو جہاں تک چاہے
جلوۂ حسن اُسے حسرت دیدار مجھے

گل پھینکے ہیں عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی
جو طبیب اپنا تھا دل اسکا کسی پر زار ہے — مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

تخیل کے میر اور سودا دونوں بادشاہ ہیں، مگر ایسے تخیلی اشعار جنمیں جذبات درد و الم کا بیان ہے میر، سودا سے بہتر کہتے ہیں۔ اسی طرح جو رنگینی جدت اور شوخی سودا کے تخیلی اشعار میں ہے میر کے یہاں نسبتاً کم ہے تخیل و محاکات شاعری کی جان و روح ہیں اور تشبیہ و استعارہ اس کے خط و خال۔ جن کے بغیر انشاپردازی کا کمال قائم نہیں رہ سکتا۔ ان سے کلام میں وسعت اور زور پیدا ہوتا ہے۔ جب کسی نہایت نازک اور لطیف چیز یا حالت کا بیان کرنا ہوتا ہے تو الفاظ اور عبارت کام نہیں دیتے اور یہ نظر آتا ہے کہ الفاظ نے انکو چھوا تو صدمہ پہنچ جائے گا۔ ایسے موقعوں پر شاعر کو تشبیہ سے کام لینا پڑتا ہے، اور وہ اسی قسم کی لطیف اور نازک صورت کو ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے اور پیش نظر کر دیتا ہے سنئے ؎

صدا نہ دل سے ہوئی دیکھکر یہ میگوں چشم — تری نگاہ سے ٹوٹا خار کے مانند
ہر خار سے الجھا ہے مرا دامن پرواز — ہوں رشتہ بپا بلبل گلزار محبت
گل کو چمن میں شانہ پہ اتنا نہیں غرور — کرتا ہے تیرے ہاتھ میں جو کچھ کہ جام ناز
آشنا مفت نہیں دل سے خیال رخ یار — اتری ہے لاکھ فسوں سے یہ پری شیشے میں

تشبیہ میں جب تک کوئی ندرت اور خاص خوبی نہ ہو وہ کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتی اس لئے شاعر کا فرض ہے کہ جدید اور نادر تشبیہیں اور استعارے ڈھونڈھ کر نکالے اس کی مثالیں ان اشعار میں موجود ہیں، مگر سودا کی ایک غزل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں، بندش کی چستی تشبیہ کی نزاکت، استعارے کی لطافت قدرتی مناظر کے محاکات نے ملکے ایک عالم پیدا کر دیا ہے جس کی تصویر قلم سے کھینچنا ناممکن ہے، یہ اشعار صرف مرزا کی قادر الکلامی اور زور طبع کا بیّن ثبوت نہیں بلکہ اردو کے لئے مایۂ ناز ہیں اور بلاخوف تردید فارسی غزلوں کے مقابلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

لطف نشاط بادہ و حسن ظہور صبح | ملکر ہوا ہے خلق، جہاں میں سرور صبح
لہرائے ہے نسیم سحر کیا ہی ساقیا | گویا ہے موج بادہ و جام بلور صبح
حلقہ میں اسکی زلف کے عارض پہ کر نظر | جوں شب میں رہ گیا ہو گرہ کھا کے نور صبح
گذرے ہی چشم تر سے مرے یوں وہ سیم تن | جیسے کنار بحر سے ہووے عبور صبح
آویزہ گہر ہے بناگوش یار میں | یا سرنگوں ہے اسکے مقابل غرور صبح

سودا کہوں میں یار سے کیا حسن کے سامنے
اُڑ جائیں ہیں حواس برنگ طیور صبح

ایسی نادر لطیف اور بلند تشبیہیں اور استعارے میر صاحب کے کلام میں نسبتۃً کم ہیں شاعری کے لیے جدت و لطف ادا سب سے مقدم ہے، ایک بات سیدھی طرح سے کہی جائے تو ایک معمولی بات ہے۔ اسی کو اگر جدید انداز اور نئے اسلوب سے ادا کر دیا جائے تو یہ شاعری ہے، جو اشعار لکھے گئے ہیں اس شرط کو یہی پورا کرتے ہیں مگر دل چاہتا ہے کہ کچھ اور اضافہ کر دوں۔

رہتا ہے ان دنوں دہن یار کا خیال | بھاتا ہے ناصحا سخن مختصر مجھے
ہو دست خدائی میں تو یہ کیجے منادی | ظالم ہو جو کوئی وہ طرحدار نہووے
عجب بیداد حسرت پر مری جلاد کرتا ہے | دکھاوے ہے مجھے اسکو جسے آزاد کرتا ہے
خیال اپنے میں گو ہوں ترانہ سنجان مست | کراہنے کو دلوں کے کبھی سنا بھی ہے
بیخوابی سے مرتا ہے شب ہجر میں سودا | اب کہنے کو افسانہ کوئی نوحہ گر آئے
بوئے گل باد صبا کوچہ کو کس کے یارب | دوڑے ہیں دونوں ہم باذہ کے دامن دامن
اس واسطے کہیں یہ وحشی نکل نہ جاویں | آنکھوں کو تیرے مژگاں مُوندے رکھتیاں ہیں
سبق ناز پڑھا کسنے چمن میں جا کر | جنبش لب سے لٹائے ورق گل خوں میں
الٰہی ہے شکست نعم البدل کے تجکو دینے کی | مجھے اسکے عوض تو کچھ نہ دے پر پھیر دے دل کو
بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے | اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

سوداؔ کے یہاں جدت و لطف ادا کیساتھ رنگینی ہے، میر صاحب کے کلام میں سادگی میں جدت اور اسی کے ساتھ درد ہے، جس سے دل پر فوراً اثر ہوتا ہے، دونوں اپنے اپنے طرز میں کامل تھے۔

مسائل حکمت و فلسفہ پر بھی سودا بہت گہری نظر ڈالتا تھا اور ہر چیز کی تہ کو پہنچنے کی کوشش کرتا تھا اور اُسے مختلف علوم پر عبور تھا۔ مثلاً۔

یوں باز اخذ نور سے ہم کو رکھے ہے جسم جیسے خسوف ماہ کے حائل زمین ہے

اس شعر میں حکمت و سائنس کے ایک سے زیادہ مسائل کو نظم کیا ہے، (۱) تعلقات دنیوی تزکیۂ نفس میں حارج ہوتے ہیں اور روح کی کثافت کا باعث ہوتے ہیں (۲) چاند گہن کا باعث آفتاب و ماہتاب کے درمیان کرۂ ارض کا حائل ہونا ہے (۳) چاند میں بالذات روشنی نہیں بلکہ آفتاب سے نور حاصل کرتا ہے، (۴) انسان جب "میں" یا "ہم" کہتا ہے تو گویا روح بولتی ہے اور صرف روح اکتساب انوار کی قابلیت رکھتی ہے جسم بظاہر ایک خارجی شے ہے اور روح و نور کے مابین ایک ایسے ظاہری حجاب کا کام دیتا ہے جس طرح حباب کی ہیئت جسمانی اس قطرے کو جو حباب میں ہے دریا سے جدا کرتی ہے ان سب مسائل کو سودا نے دو مصرعوں میں ضبط کر کے انتہائے قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔

ایک شعر اور درج کرتا ہوں جس میں احساس و ادراک کا نازک فرق دکھایا ہے ؎

نور اخذ ہنر کرنے میں دل کا میں گنوایا جوں آئینہ جوہر نے مجھے عیب لگایا

تحصیل ہنر یا حصول کمال میں دل کا نور ضائع ہو گیا جس طرح آئینہ زیادہ صاف ہو کر اپنے جوہر جس جگہ نمایاں کرتا ہے اتنا حصہ زیادہ روشن نہیں رہتا، بلکہ دھبوں کی طرح بظاہر عیب دیتا ہے، یہی جوہر داغہائے معیوب بھی ہیں اور نشانات کمال بھی۔ کیونکہ جب تک جوہر نمودار نہ ہو جائیں تکمیل جلا اور تنویر صفا نہیں، لیکن جو حصہ جوہروں سے مملو ہو جاتا ہے اتنی جگہ پر صورت بخوبی منعکس نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک ثبوت ہے اس بات کا کہ دل کا نور

ضائع ہوا اور کمال نے مجھ میں عیب پیدا کر دیا، اس بلاغت پر قناعت نہیں ہوئی مزید نزاکت یہ ہے کہ آئینہ مصفا مرئیات سے متعلق ہے لہذا محسوسات ظاہر میں داخل ہے، اور جوہر کی وقعت اسی کے ادراک میں ہے جو خود اس فن کے عرفان میں صاحب جوہر ہے۔ تو اب شعر کا مقصود اصلی یہ ہوا کہ سالک کا تصفیۂ قلب بدرجۂ کمال پہنچکر محسوسات میں ناقص اور مدرکات میں کامل ہوتا ہے، شعر کیا ہے ایک دنیا ہے۔

حکمائے جدید نے آسمان کو حد نظر مانا ہے اور اسکی نیلاہٹ کو ہوا کا رنگ قرار دیا ہے،
سودا کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ایسا خیال موجود تھا ؎

کر خانۂ گردوں پہ نظر چشم فنا سے ۔۔۔ ہے مثل حباب اسکی بھی تعمیر ہوا پر

چند شعر اور جنمیں حکمت یا فلسفہ یا تصوف ہے درج کرتا ہوں۔

پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے ۔۔۔ کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا
ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ ۔۔۔ دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا
دیر و حرم کو دیکھا اللہ رے فضولی ۔۔۔ یہ کیا ضرور تھا جب دل کا مکاں بنایا
آدم کا جسم جبکہ عناصر سے مل بنا ۔۔۔ کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا
گزرا کبھی نہ وہم میں وہ اہل ہوش کے ۔۔۔ دنیا سے لطف زیست جو دیوانہ لے گیا
اسباب جہاں دل نے کئے جب نظر انداز ۔۔۔ پوچھا جو میں کیا دیکھے ہے دیوانے کہا ہیچ
چمن دہر میں توام ہیں سدا شادی و غم ۔۔۔ خندۂ گل نہ رہے گریۂ شبنم سے دور
منعم نہ مر بنائے عمارت کی فکر میں ۔۔۔ یہ سب حویلیاں تھیں جہاں تک ہی اب اجاڑ
بات آوے نہ تو چپ رہ کہ گماں کے نزدیک ۔۔۔ سو طرح کا ہے سخن پردۂ خاموشی میں
ہم دعا تو مانگیں اپنے حق میں پر ساماں کہاں ۔۔۔ لاکھ اہل دل ہمیں کہنے کو آمیں چاہیئے
وہ قدم جسکو رگ گل سے بھی ہوتی تھی خلش ۔۔۔ سجدہ گاہ سنگ ہے یا بوسہ گاہ خار ہے
خوب دیکھا یہ جہاں اہل جہاں بھی دیکھے ۔۔۔ ایک زنداں ہے کہ جسمیں ہیں گنہگار کئی

بھاگ دیوانے سے مت اے غافل　　وہیں لیلی ہے جہاں مجنوں ہے
چاہا کہ جوں حباب میں دیکھوں یہ کائنات　　کھولی جو آنکھ اور ہی عالم کی سیر ہے

لفظ جسم ہے اور معنی اسکی جان، دونوں کا باہمی ارتباط ظاہر ہے۔ پس اگر معنی میں نقص ہو اور لفظ میں ہو تو بھی شعر میں عیب سمجھا جائیگا جس طرح لنگڑے اور لنجے میں جان موجود ہوتی ہے لیکن جسم میں عیب ہوتا ہے، اسی طرح اگر الفاظ اچھے ہوں اور مضمون اچھا نہ ہو تو بھی شعر خراب ہوگا۔ اور مضمون کی خرابی الفاظ کو بے وقعت ولاشے بنا دے گی جس طرح مردہ کا جسم کہ دیکھنے میں سب کچھ سلامت ہے لیکن حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح مضمون گو اچھا ہو لیکن الفاظ اگر بُرے ہوں تب بھی بیکار ہوگا کیوں کہ جان بغیر جسم کے نہیں پائی جاتی اگرچہ الفاظ اور مضمون میں تناسب ضروری ہے لیکن شاعری کا معیار کمال یہی ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں کیا گیا ہے اور بندش کیسی ہے مضمون کیسا ہی بلند اور لطیف ہو لیکن الفاظ میں اگر تناسب، شان و شوکت اور بندش میں پختگی نہ ہو تو سارا اثر جاتا رہے گا۔

الفاظ متعدد قسم کے ہوتے ہیں بعض نازک لطیف، شستہ، صاف، رواں اور شیریں اور بعض پُر شوکت، متین، بلند پہلی قسم کے الفاظ عشق و محبت کے مضامین ادا کرنے کے لئے موزوں ہیں۔

سودا نے بیشتر اس امر کا لحاظ رکھا ہے، لیکن کہیں کہیں زورِ طبع نے غزلوں میں قصیدہ کی شان دکھائی ہے۔ میر صاحب کی غزلیں اس قسم کے شکوہ الفاظ سے مبرا ہیں، سودا کی یہ غزلیں اگرچہ اصول غزلیت کے لحاظ سے قابل بحث ہیں لیکن ہر شعر الگ دیکھا جائے تو چستی بندش اور تناسب الفاظ کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں، مثلاً

پونچھ کر چشم کریں ہم جو فشار دامن　　باج خواہاں ہوں رگِ ابر سے تار دامن
دل ناآشنائے نالہ سے صوت جرس بہتر　　نہ ہو مژگاں جو خوں آلودہ اس سے خار و خس بہتر
آتش جو عشق کی ہے سو نور بصر میں ہے　　شعلہ زبان دراز مری چشم تر میں ہے

ایک امر اور بھی قابل لحاظ ہے، اُردو شاعری فارسی کے قدم بقدم چلی ہے، متاخرین شعرائے فارسی نے غزل میں فلسفہ حکمت سب کچھ شامل کر دیا ہے۔ بلکہ خود عشق کو فلسفہ بنا دیا ہے اور عشقیہ اشعار میں وہ شان پیدا کر دی ہے جس کی نظیر دنیا کی دوسری زبانوں میں مشکل سے ملیگی، شعرائے اُردو اساتذہ فارسی کے متبع ہیں۔ اس لئے فارسی غزل گوئی کے لحاظ سے غزل میں شکوہ الفاظ نہ صرف جائز ہے بلکہ بعض مواقع پر ناگزیر ہے۔ البتہ غزل اور قصیدہ کے شکوہ میں فرق ہے۔ یہی وہ موقع ہے جہاں کامل الفن استاد کا جوہر کمال نظر آتا ہے، ایک دقیقہ سنج اُستاد نہایت پر شکوہ اور شوکت آمیز غزل کہتا ہے، لیکن شانِ غزلیت کا سر رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ دوسرا اس نکتہ سے ناواقف شاعر اسکا تتبع کرتا ہے اور غزل کو قصیدہ کی تشبیب بنا دیتا ہے، شعرائے اُردو میں مرزا غالب کو اس صنف غزل میں خاص دستگاہ حاصل ہے۔ سودا بھی اس میدان کا شہسوار ہے لیکن طبیعت کا زور کبھی کبھی عنان قلم اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور غزل گوئی کے میدان سے نکل کے تشبیب کے میدان میں اپنا کمال دکھانے لگتا ہے، اور یہ سودا کی خصوصیت نہیں پر زور طبع شعرا سے اس قسم کا تسامح ہو جاتا ہے اور اگر اس قسم کی مثالیں بکثرت نہ ہوں تو انکی استادی میں فرق نہیں آتا۔

یہ بحث الفاظ کی انفرادی حیثیت کے متعلق تھی، اس سے زیادہ مقدم الفاظ کا باہمی تعلق اور تناسب ہے، یہ خوبی سودا کے اشعار میں بدرجۂ اتم موجود ہے یہاں تک کہ اس کے شعر میں اگر ایک لفظ کا بھی رد و بدل ہو جائے تو شعر کا لطف جاتا رہتا ہے، الفاظ میں باہمی توافق، تناسب، موزونی اور ہم آوازی نہایت ضروری ہے تاکہ سب الفاظ ملکر ایک ہی جسم کے اعضا بن جائیں اسی کا نام سلاست، صفائی اور روانی ہے اور اسی سے شعر میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے، میر اور سودا کے منتخب کلام میں یہ بات پائی جاتی ہے۔

الفاظ کی ظاہری حیثیت یعنی آواز صورت اور لہجہ کے علاوہ انکی معنوی حالت کا خیال رکھنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے، بہت سے الفاظ بظاہر مترادف ہوتے ہیں لیکن بہ

ایک مفہوم اور معنی میں کوئی ایسی خصوصیت ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی ؎

کمال بندگیٔ عشق ہے خداوندی کہ ایک زن نے مہ مصر سا غلام لیا

اس شعر میں "زن" کا لفظ کس خوبی سے استعمال ہوا ہے۔ اسکے بدلے زلیخا ملکۂ مصر عورت یا اور کوئی لفظ رکھدیجئے ہرگز وہ لطف پیدا نہیں ہوسکتا سودا کے اشعار میں یہ خاص صنعت ہے کہ باوجود تناسب لفظی کے، خیال فوراً معنی کی طرف جاتا ہے۔

کیوں نہ کہتے تھے دلا شیریں لبوں کے منہ نہ لگ ایک دن تجکو یہ شربت زہر قاتل ہوئے گا

پہلے شعر کے معنی اثر کرتے ہیں اسکے بعد تناسب الفاظ کا ادراک ہوتا ہے۔

فصیح اور مانوس الفاظ کا انتخاب شاعر کے لئے نہایت ضروری ہے، فصاحت سے یہ مراد ہے کہ حرفوں میں تنافر نہو، لفظ نادر الاستعمال نہ ہو، قیاس لغوی کے مخالف نہ ہو مگر یہ تعریف منطقی اصول پر ہے، متقدمین کے کلام پر ہمیں اپنے موجودہ معیار سے ادبی رائے قائم کرنا نہ چاہئے، کیونکہ جب سے اب تک زبان میں بہت تغیرات ہوگئے کتنے الفاظ اب متروک ہیں جو پہلے مستعمل تھے، ہاں یہ دیکھنا چاہئے کہ سودا کے معاصرین یا جو کچھ اس کے بعد ہوئے اس کی فصاحت کے قائل ہیں یا نہیں، اس کے متعلق "دریائے لطافت" و دیگر تصنیفات سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے عرض کر چکا ہوں جس شخص کو زبان پر حاکمانہ قدرت ہو اسکی فصاحت میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ "رسالہ عبرۃ الغافلین" سودا کی تحقیق زبان کی عمدہ مثال ہے، اس لطیفہ سے بھی اُسکی زباں دانی ثابت ہوتی ہے۔

"ایک دن سودا کے یہاں میر سوز تشریف لائے، ان دنوں میں شیخ حزیں کی غزل کا چرچا تھا جسکا مطلع یہ ہے۔

میگرفتیم بجاناں سر راہے گاہے او ہم از لطف نہاں داشت نگاہے گاہے

میر سوز نے اپنا مطلع پڑھا ؎

نہیں نکلے ہے مرے دل کی اُبا ہے گاہے اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے

مرزا سنکر بولے کہ میر صاحب بچپن میں ہمارے یہاں پشور کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں یا تو جب یہ لفظ سنا تھا یا آج سنا، میر سوز بیچارے ہنس کر چپ ہو رہے ہے (منقول از آب حیات)

سودا نے میر صاحب کے ایک مرثیہ اور سلام پر بہت سے اعتراض کئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

میر

لامکاں بھی ایک بازی گاہ طفلی ہے ترا — کوئی مکان تم سے نہیں یا آہیں خالی السلام

سودا

عوض "کوئی مکاں" جو لفظ فصیح — بولتے "کوئی جا" تو یہ تھا صحیح

انصاف سے دیکھئے کہ اس ترمیم سے شعر میں کسقدر صفائی سلاست اور مفہومیت بڑھ جاتی ہے۔ لامکاں کے لحاظ سے لفظ "جا" ہی مناسب تھا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سودا کے کلام کا اس کے معاصرین کے کلام سے موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ انکے یہاں آپ کو کتنے الفاظ غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں اور کتنے اس کے یہاں سادگی ادا کے یہ معنی ہیں کہ جو مضمون شعر میں ادا کیا گیا ہے بے تکلف سمجھ میں آجائے، اسکے واسطے یہ باتیں ضروری ہیں۔

(۱) الفاظ اپنی مقررہ جگہ سے زیادہ ہٹنے نہ پائیں۔

(۲) مضمون کے جس قدر اجزا ہیں انکا کوئی جز ورہ نہ جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ بیچ میں خلو رہ گیا۔

(۳) استعارے اور تشبیہیں دور از فہم نہ ہوں۔

(۴) تلمیحات ایسی ہوں جن سے لوگوں کو عموماً واقفیت ہو۔

(۵) روزمرہ اور بول چال کا لحاظ رکھا جائے۔

(۶) شعر میں وزن اور بحر کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ الفاظ کے رد و بدل کی اکثر ضرورت ہوتی ہے سودا کو جس قدر نشست الفاظ کا خیال تھا میر صاحب کو نہیں تھا حسن اتفاق ہے

مجھے دونوں کا ایک ایک شعر ایسا مل گیا ہے کہ جنکے پہلے مصرعے لفظ بلفظ لڑ گئے ہیں۔

سودا

آنکھیں برنگ نقش قدم ہوگئیں سفید　　　اس سے زیادہ خاک کروں انتظار خط

میر

آنکھیں برنگ نقش قدم ہوگئیں سفید　　　نامے کے انتظار میں، قاصد بھلا پھرا

سودا کے شعر کی بندش کسقدر چست ہے، اور ہر لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے، میر کے شعر کا دوسرا مصرعہ بہت الجھا ہوا ہے، ان اشعار سے دونوں کی انداز طبیعت کا بھی حال کھلتا ہے سودا کے دوسرے مصرعے کی بندش اور لفظ خاک سے (علاوہ لطف محاورہ در عایت نقش قدم) یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عاشق ہور انتظار خط میں بیحد مضطرب ہے اور زمین پر ہاتھ دے دے مارتا ہے۔ بعد اسقدر انتظار کے کہ آنکھیں سفید ہوگئیں اس اضطراب کا نتیجہ موت ہے یا دیوانگی۔

میر صاحب کے شعر سے وہی افسردگی جو انکی طبیعت کی افتاد ہے ٹپکتی ہے، جب آنکھیں قاصد کے انتظار میں سفید ہوگئیں ایک مرتبہ آہ سرد بھر کر کہا کہ نامے کے انتظار میں آنکھیں برنگ نقش قدم سفید ہوگئیں مگر قاصد واپس نہ آیا اور خاموش ہوگئے، سودا کے شعر میں جوش و خروش ہے اور میر کے شعر میں حزن و اضمحلال۔

(۴) مطلب کی تکمیل میں سودا، میر سے نسبتہً زیادہ کامیاب تھا مشکل سے اسکا کوئی شعر ملیگا جس میں اپنی طرف سے کسی لفظ کے بڑھانیکی ضرورت ہو، برخلاف اس کے میر صاحب کے بعض اشعار میں خلو پایا جاتا ہے۔

میر

گل میں اسکی سی جو بو آئی تو آیا نہ گیا　　　ہم کو بن دوش ہوا باغ سے لایا نہ گیا

سودا

ناتوانی بھی عجب کچھ ہے کہ گلشن میں صبا　　　نت لئے پھرتی ہے دوش اوپر برنگ بو مجھے

میر صاحب کے شعر میں ناتوانی کا لفظ مکائب ہے اور بغیر اسکے دوش ہوا پر داپن کا مادعا واضح نہیں ہوتا، مگر انداز بیان اور بندش بہتر ہے ، اسی کے مشابہ میر و سودا کے یہ اشعار ہیں -

میر - چمن میں گل نے جو کل دعوی جمال کیا — جمال یار نے منہ اسکا خوب لال کیا

سودا - برابری کا تری گل نے جب خیال کیا — صبا نے مار تھپیڑا منہ اس کا لال کیا

میر - کیا میں بھی پریشانی خاطر سے قریں تھا — آنکھیں تو کہیں تھیں دل غمدیدہ کہیں تھا

سودا - (یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کس وقت ایسی حالت تھی، آیا ہجر میں یا معشوق کے انتظار میں)

(۳) دور از فہم تشبیہیں اور استعارے دونوں استعمال نہیں کرتے ، البتہ سودا کی بعض تشبیہیں اور استعارے اسقدر بلند ہوتے ہیں کہ بغیر تھوڑی کاوش کے سمجھ میں نہیں آتے تشبیہ در تشبیہ استعارہ در استعارہ سے دونوں احتراز کرتے تھے -

(۴) تلمیحات بھی دونوں کے کلام میں عام فہم ہیں -

(۵) روزمرہ اور محاورہ کے بھی دونوں بادشاہ ہیں - مگر سودا نے اپنی قادر الکلامی سے فارسی استعاروں کو ہندی محاورے سے اسطرح شیر و شکر کیا ہے اور زبان میں اسقدر زور پیدا کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی اس لحاظ سے اس کو میر پر فوقیت ہے ، ملاحظہ ہو آب حیات صفحہ ۱۹۰)

شاعری کی بڑی خوبی جدت ادا ہے ، جدت ادا میں بات کو خواہ مخواہ کسی قدر معمولی پیرائے سے بدلکر اور اصلی راستے سے ہٹکر بیان کرنا ہوتا ہے - اس لئے شاعر کو اس موقع پر سخت مشکل کا سامنا ہوتا ہے ، کیونکہ اس صورت میں سادگی ادا کو قائم رکھنا گویا اجتماع بین النقیضین ہوتا ہے لیکن حقیقت میں شاعری کے کمال کا یہی موقع ہے ، اسکی صورت یہ ہے کہ جدت کے سوا سادگی کی اور تمام باتیں موجود ہوں یعنی الفاظ سہل ہوں تشبیہات قریب الفہم ہوں - ترکیب میں پیچیدگی نہ ہو ، روزمرہ اور محاورہ موجود ہو ، ان سب باتوں کیساتھ جدت ادا میں تجاوز نہ کیا جائے - اس صورت میں جدت کیوجہ سے سادگی میں کسی قدر فرق پیدا ہو گا تو اور باتیں اس کی تلافی کر دیں گی -

میں دوبارہ سادگی کے مفہوم کیطرف توجہ دلاتا ہوں محض بیدب سادہ ہے الفاظ کا نام سادگی نہیں ہے، بلکہ یہ کہ شعر بے تکلف سمجھ میں آجائے ایسے اشعار جو تھوڑی کاوش کے بعد سمجھ میں آئیں میر اور سودا دونوں کے یہاں ملینگے، ہر شعر میر اور سودا کا شربت کا گھونٹ نہیں ہے، سادگی اور جدت ادا دونوں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ جو اشعار درج ہوچکے ہیں ان میں یہ صفتیں بھی موجود ہیں۔

اکثر غزلیں سودا اور میر کے دیوانوں میں ہمطرح ہیں۔ انکا مقابلہ کیجئے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ سودا کہیں میر سے پیچھے نہیں رہا، بعض قافیے میر کا حصہ ہوگئے اور بعض سودا کا، میں نے میر کی ایسی غزل کا انتخاب کیا ہے جس کے کئی شعر مشہور ہیں۔

میر۔ عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

سودا تھا جوانی فکر و تردد بعد از پیری پایا چین
رات تو کاٹی دکھ بھرنے میں صبح ہوئی آرام کیا

مضمون دونوں کا متحد اور عبارت کے لحاظ سے میر کا مصرعہ اولی اور سودا کا مصرعہ ثانی فصیح ہے۔

میر۔ حرف نہیں جان بخشی میں اسکی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

سودا۔ کون سا مجھ سے حسن تردد عمل میں آیا تیری حضور
دل کو غارت کرکے میری جان کو کیوں پیغام کیا

میر کا مفہوم یہ ہے کہ موت کی اطلاع تو پہلے ہی کردی تھی اس لئے پیغام مرگ دینا قابل شکایت نہیں رہا البتہ یہ امر قابل شکر و منت ہے کہ عمر بھر زندہ رکھا، اس جان بخشی کا احسان سر آنکھوں پر۔ غالب نے اگر یہ شعر نہیں دیکھا تو خیر ورنہ اسی سے ماخوذ ہے ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

سودا کہتا ہے کہ تیری حضوری یعنی تیرے عرفان میں میری فکر کس حسن کیا تو واقع ہو گئی کہ دل تو غارت کر دیا گیا کیونکہ دل کی قوت اور حیثیت سے یہ معاملہ بالاتر ہو گیا، مگر جان کو طلب فرمایا جو کہ لطافت کی وجہ سے نور سے مناسب و مماثل ہے، میر کا شعر فصیح اور عجیب ہے۔ سودا کا شعر بلیغ اور غریب ہے، اس میں وضاحت اس میں ابہام اس میں ندرت اسمیں جدت وہ سہل ممتنع سے قریب یہ مشکل سے بعید آخری حکم مذاق سے وابستہ ہے۔

میر۔ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہمکو عبث بدنام کیا

سودا۔ اجل نے تیرے عہد میں سے تقدیر کو یہ پیغام کیا
ناز و تغافل دے کر اس کو مجکو کیوں بدنام کیا

(میر تصوف) سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہوئی ہے
کوسوں اُس کے اُڑ گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

(سودا خالص عشقیہ) ادب دیا ہے ہاتھ سے اپنے بھلا کبھی منجھا نہ کا
کیسے ہی ہم مست چلے پر سجدہ ہر اک گام کیا

واقعیت کے علاوہ "ہر ہر گام" سے ہر اک گام فصیح تر ہے۔

میر۔ کاش اب منہ سے برقعہ اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مندے پر اُن نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

سودا۔ خاص کروں میں ہی نظارہ تو تو دید کی لذت ہے
کور بھلی یہ آنکھیں اُس دن جس دن جلوہ عام کیا

دونوں نے قیامت کی طرف اشارہ کیا ہے مگر میر صاحب کا شعر الجھا ہوا ہے اور سودا کا شعر صاف ہے اور رشک نے جو عاشق کی شان ہے خوب لطف دیا۔

بے احتیاطی

پیوتر پیوترووچ استرژن، وہی جن کے نئے جوتے پارسال چوری گئے تھے ایک دعوت سے ٹھیک دو بجے رات کو واپس آئے۔ اس ڈر سے کہ کوئی جاگ نہ جائے انہوں نے دروازے ہی پر اوورکوٹ اتار لیا، اور چپکے چپکے سانس تک روکے ہوئے انگوٹھوں کے بل وہ اپنے سونے کے کمرے میں گئے، وہاں، بغیر لیمپ جلائے پلنگ پر لیٹ گئے۔

استرژن صاحب زندگی اصولوں کے مطابق بسر کرتے تھے، اور ہر طرح سے اعتدال کا خیال رکھتے۔ صورت انکی ماشاء اللہ ایسی تھی کہ اُسے دیکھ کر ہر گناہ گار کو خدا کی بارگاہ سے بخشش کی امید ہو جاتی تھی کتابیں وہ ایسی پڑھتے تھے جن سے اخلاق کو استواری روح کو فرحت حاصل ہو۔ اس روز انکی ایک رشتہ دار کے بچہ پیدا ہوا تھا اور اس کی خوشی میں وہ چار گلاس ووڈکا اور ایک گلاس شراب پی گئے تھے۔ ووڈکا مرچ کی طرح تھی۔ شراب معلوم ہوتا تھا کہ سرکہ اور ریڈی کا تیل ملا کر بنائی گئی ہے۔ یہ چیزیں سمندر کے پانی یا شہرت پسندی کی سی ہیں۔ انکے پینے سے پیاس بڑھتی ہے ..... اور اس وقت جب استرژن صاحب کپڑے اتار کر پلنگ پر لیٹے تو انہیں بے حد پیاس لگی۔

"داشنکا کے یہاں دراز میں سیدھے ہاتھ کی طرف کونے میں ووڈکا رکھی ہے" انہوں نے سوچا۔ "اگر میں چرا کر ایک گلاس پی لوں تو اُسے خبر بھی نہ ہوگی"

کچھ دیر تک ہچکچانے کے بعد، اپنی طبیعت کو مضبوط کر کے، استرژن دراز کی طرف روانہ ہوئے دروازہ آہستہ سے کھولا۔ ٹٹول ٹٹول کر بوتل اور گلاس نکالا، گلاس بھرا، بوتل کو اُسکی جگہ پر رکھا، اس کے بعد اپنے پر تقوے سینہ پر صلیب کا نشان بنایا، اور ووڈکا حلق سے اتار لی اسی وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک گولا سا پھٹا اور کسی نے بہت زور سے استرژن کو دراز کے پاس سے صندوق پر پھینک دیا۔ اُن کی آنکھوں میں چکا چوند تھی، سانس گلے میں اٹک گئی، اور بدن بھر میں کچھ

ایسی کیفیت تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ تیزاب کے دلدل میں دھس گئے ہیں۔ انکو خیال ہوا کہ بجائے ووڈکا کے وہ بارود پھانک گئے ہیں جس نے انکے بدن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور مکان اور آدمی سڑک کو ہوا میں اُڑا دیا، سر، ہاتھ، پیر، سب الگ ہوئے جاتے تھے، اور خدا جانے کس طرف اُڑ جانیکی کوشش کر رہے تھے۔

تین چار منٹ وہ صندوق پر بے حرکت پڑے رہے، اُس کے بعد اُٹھے اور پوچھا، میں کہاں ہوں؟"

ہوش میں آتے ہی جو اُنہوں نے محسوس کیا وہ مٹی کے تیل کی تیز بدبو تھی۔

"ارے اللہ" انہوں نے بدحواس ہو کر کہا، "میں بجائے ووڈکا کے مٹی کا تیل پی گیا ہوں! اے اولیا اللہ مدد کرنا۔"

اس خیال سے کہ وہ زہر پی گئے ہیں بدن کبھی تو سردی سے کانپتا تھا، کبھی پسینہ پسینہ ہو جاتا۔ اسکا ثبوت کہ انہوں نے زہر پیا ہے کئی طرح سے مل رہا تھا۔ علاوہ کمرے میں بدبو پھیلنے کے منہ میں جلن تھی، آنکھوں میں چکاچوند، کانوں میں گھنٹے بجنے کی آواز، معدہ میں ہلچل، گویا کہ ایک گھڑی میں پھٹنے والا ہے۔ اپنی موت قریب سمجھ کر، اور دل سے بیکار امیدوں کو دور کر کے انہوں نے چاہا کہ اپنے عزیزوں سے رخصت ہولیں، اور اِسی ارادے سے وہ واشنکا کے دروازے پر گئے (چونکہ انکی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا اُنہوں نے اپنے گھر کا انتظام اپنی بڈھی بن بیاہی سالی واشنکا کے ہاتھوں میں دیدیا تھا۔) انکے کمرے کے اندر جا کے ——— واشنکا!

انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا

"میری عزیز واشنکا!"

"ہاں کیا ہے؟" ایک زنانی آواز نے جلدی سے کہا "آپ ہیں، پیوتر پیتروچ؟ ابھی سے واپس آگئے؟ ہاں بتلائیے تو۔ لڑکی کا کیا نام رکھا؟ دھرم ماں کون بنی؟"

؎ یعنی اِستریژن

... موم بتیاں فلاں اور وہ بڑم تیار فلاں مقرر ہوئے ... میں، واشنکا، معلوم ہوتا ہے مر رہا ہوں اور لڑکی کا نام لوبیا و ارکھا، اس وجہ سے کہ خاندان کی ایک کرم فرما کا یہی نام ہے ...

میں ... میں واشنکا مٹی کا تیل پی گیا ہوں ... "

"لیجئے! کیا وہاں آپ کو لوگوں نے مٹی کا تیل پلا دیا؟"

"مجھے معافی مانگنا ہے کہ میں بغیر آپ کی اجازت کے ووڈکا پینا چاہتا تھا اور ... اور خدا نے مجھے اسکی سزا دی: میں اندھیرے میں غلطی سے مٹی کا تیل پی گیا ... بتائیے میں کیا کروں؟"

واشنکا یہ سن کر بغیر انکی اجازت کے دراز کھولی گئی، بگڑ گئیں انہوں نے جلدی سے موم بتی جلائی، پلنگ پر سے کود پڑیں انکے چہرہ پر داغ سے تھے، بدن میں صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔ اس وقت وہ ایک لمبی قمیص پہنے تھیں اور بالوں میں چھلے ڈالنے کا سامان انکے سر پر لگا ہوا تھا۔ پلنگ پر سے کود کر وہ ننگے پیر دراز کی طرف چلیں۔

"آپ کو اس کی اجازت کس نے دی تھی؟"۔ انہوں نے دراز کے اندر ایک نظر ڈال کر پوچھا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ووڈکا آپ کے لئے رکھی ہے؟"

"میں ... میں نے تو ووڈکا نہیں مٹی کا تیل پیا ہے۔ استرژن نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"لیکن مٹی کے تیل میں ہاتھ لگانے کی آپ کو کیا ضرورت تھی؟ آپ کو اس سے آخر کیا مطلب؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کے لئے رکھا ہے؟ یا آپ کی رائے میں مٹی کا تیل مفت ملتا ہے؟ فرمائیے! کیا آپ جانتے ہیں کہ مٹی کے تیل کا آج کل کیا بھاؤ ہے؟ بتائیے!"

"عزیز واشنکا" استرژن نے کراہ کر کہا "یہاں تو جان کے لالے پڑے ہیں اور آپ روپیہ پیسے کی باتیں کر رہی ہیں"

"پی کر مست ہوگئے ہیں اور میری دراز میں آ کر گڑبڑ کرتے ہیں" واشنکا نے چلا کر کہا اور غصہ میں آ کر دھڑ سے دروازے بند کر دیئے۔ "ارے بن مانسو! ہو ذلیو! مجھ کمبخت کو دن رات

عذاب میں مبتلا رکھتے ہیں! ظالمو، مردودو، بلا یا نو، خدا کرے اُس جنم میں تمہارا یہی حال ہو جو تم نے میرا یہاں بنا رکھا ہے! میں کل ہی اس مکان سے نکل بھاگوں گی! میں کنواری ہوں، میں تم کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ میرے سامنے سونے کے کپڑوں میں آکر کھڑے ہو، تمہاری بےحیائی بےشرمی ہے، جو تم مجھے ان کپڑوں میں آکر دیکھتے ہو!"

وغیرہ وغیرہ ... استرتزن کو یہ معلوم تھا کہ جب وانشکا خفا ہوں تو ان پر کسی چیز کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ نہ منت کا، نہ قسموں کا، نہ توپ کے گولے کا۔ انہوں نے مایوسی میں سر ہلایا، کمرہ میں واپس جاکر کپڑے پہنے اور ڈاکٹر کی تلاش میں نکلنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ڈاکٹر تو اسی وقت ملتے ہیں جب انکی ضرورت نہ ہو۔ استرتزن نے تین سڑکوں پر چکر لگایا، ایک ڈاکٹر کے یہاں پانچ مرتبہ جاکر کھٹکھٹایا، ایک کے یہاں سات مرتبہ اس کے بعد وہ دوا فروش کے یہاں دوڑ کر گئے کہ شاید وہی کچھ مدد کر سکے۔ دوکان میں بہت دیر انتظار کرنے کے بعد ایک صاحب اندر سے نکلے ان کا قد چھوٹا تھا، بال کالے اور گھونگر والے، آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں اور چہرے سے اتنی سنجیدگی اور لیاقت ٹپکتی تھی کہ دیکھ کر ڈر سا معلوم ہوتا تھا۔

"آپ کو کیا چاہئے؟" انہوں نے ایسے لہجہ میں پوچھا جو صرف ذی علم اور خوش حال یہودی دوا فروشوں میں پایا جاتا ہے۔

"خدا کے واسطے ... مجھ پر مہربانی کیجئے! - استرتزن نے ہانپ کر کہا۔ "مجھے کچھ دیجئے ... میں نے ابھی کچھ دیر ہوئی غلطی سے مٹی کا تیل پی لیا! میں مر رہا ہوں!"

"مہربانی فرما کر گھبرائیے نہیں اور جو سوال میں آپ سے کرنے والا ہوں اسکے جواب دیجئے۔ صرف یہی بات کہ آپ گھبرا کر باتیں کرتے ہیں۔ میرے لئے آپ کی باتیں سمجھنا مشکل بنا دیتی ہے۔ آپ نے مٹی کا تیل نوش فرمالیا ہے؟ جی؟"

"جی، جی، مٹی کا تیل! مجھے مرنے سے بچاؤ!"

دوا فروش بغیر کسی ہمدردی کا اظہار کئے، سنجیدگی کے ساتھ اپنی جگہ سے گئے ...

نے ایک کتاب کھولی اور پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ دوا فروش نے پہلے ایک کنہ ہلایا پھر دوسرا، چہرے پر وہ جھریاں پڑ گئیں جن سے حقارت ظاہر ہوتی ہے، اور کچھ دیر سوچ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں وہ دوائیں گھوٹا کرتے تھے گھڑی میں چار بجے۔ اور جب گھڑی میں چار بج کر دس منٹ آ چکے تھے تب دوا فروش صاحب کمرے سے ایک دوسری کتاب ہاتھ میں لئے پھر باہر آئے اور پھر پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔

"ہوں!" انہوں نے کسیقدر خفا ہو کر کہا "صرف یہی ایک بات کہ آپکی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور آپ کو تکلیف ہو رہی ہے اس کی دلیل ہے کہ آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے نہ کہ دوا فروش کے پاس۔"

"لیکن میں تو تمام ڈاکٹروں کے پاس ہو آیا! وہاں کوئی نہیں سنتا!"

"ہوں! آپ ہم دوا فروشوں کو آدمی تک نہیں سمجھتے۔ رات کے چار بجے بھی سوتے سے آکر جگا دیں گے، جب کتے بلی تک آرام سے سوتے ہیں۔۔۔ آپ ہماری بات سمجھنا ہی نہیں چاہتے، ہم انسان تو ہیں ہی نہیں، ہمارے اعصاب کیا ہیں، رسیاں ہیں!"

سٹرژن نے دوا فروش کا نوحہ سنا، ٹھنڈی سانس بھری اور گھر چلے گئے "اس کے معنی یہ ہیں" انہوں نے اپنے دل میں سوچا، "کہ موت کا حکم ہو گیا ہے" اس وقت انکے منہ میں جلن تھی اور مٹی کے تیل کی بدبو آ رہی تھی۔ معدہ میں چھریاں چل رہی تھیں کانوں میں بوم، بوم، بوم!" کی آواز آ رہی تھی۔ ہر لمحہ انہیں خیال ہوتا تھا کہ خاتمہ قریب ہے اور دل کی حرکت رکنے والی ہے۔

گھر پہنچتے ہی انہوں نے لکھا: "میری آخری خواہش ہے کہ میری موت کا الزام کسی پر نہ لگایا جائے،" اسکے بعد کچھ دعائیں مانگیں اور سر تک چادر لپیٹ کر پڑ رہے۔ سویرے انہیں نیند نہ آئی، وہ موت کا انتظار کرتے رہے اور ہر وقت انکی آنکھوں کے سامنے ایک قبر کی تصویر تھی جس پر تازی گھاس نکل رہی تھی اور چڑیاں چہک رہی تھیں۔۔۔

سویرا ہوا تو وہ اٹھ کر پلنگ پر بیٹھے اور مسکرا کر واشنکا سے کہا ۔

"پیاری بہن، جو باقاعدہ زندگی بسر کرتے ہیں ان پر کسی زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ مجھ ہی کو دیکھئے ۔ نیست و نابود ہونے والا تھا، موت سرہانے پر تھی، تکلیف تھی، اور اب ۔ کچھ نہیں منہ ذرا سا جل گیا، حلق میں خلش ہوئی لیکن خدا کے فضل سے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ۔۔۔ کس وجہ سے؟ صرف اس لئے کہ میں باقاعدہ زندگی بسر کر رہا ہوں"

"نہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ مٹی کا تیل خراب تھا" واشنکا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ۔ "اس کے معنی یہ ہیں کہ دوکاندار نے مجھے اچھا تیل نہیں دیا بلکہ وہ جو دو آنے سیر ملتا ہے میں بھی کیسی کمبخت مصیبت زدہ ہوں ۔۔۔ مردود، ظالم کہیں کے، خدا انہیں دوسرے جنم میں ایسی زندگی دے جیسی میری یہاں ہے، بے ایمان، بدمعاش ۔۔۔"

واشنکا نے جتنی گالیاں اور بد دعائیں یاد تھیں سنا دیں ۔

کیفیات

از جناب متین الحق صاحب صدیقی کیف مرادآبادی

بھول جاؤں نہ کہیں آپ کے میخانے کو
اتنا لبریز نہ کیجے مرے پیمانے کو

تو ہے نزدیک مگر پھر بھی ہے تیری ہی تلاش
اتنا بھی ہوش نہیں ہے ترے دیوانے کو

ہر حقیقت ہے نہاں دل کے نہاں خانے میں
اب نہ میں کعبہ کو جاؤنگا نہ بتخانے کو

جوش وحشت میں سے کئے دیتا ہے محشر برپا
کس نے یہ چھیڑ دیا ہے ترے دیوانے کو

التفات نگہ ناز کہاں — دھوکا تھا
بھول جا بھول جا اس عشق کے افسانے کو

ذرہ کھل جائے تری قوت پنہاں کا راز
امتحاں بھی نہیں منظور ہے دیوانے کو

خاک عالم کا ہر اک ذرہ مجھے دیکھتا ہے
اتنی شہرت بھی نہ دیجے مرے افسانے کو

اب نہ وہ حوصلے ہیں اور نہ وہ جذبۂ شوق
کیا سے کیا کر دیا غم نے ترے دیوانے کو

زندگی کیا تھی؟ ترے حسن کا ادنیٰ سا فریب
میں نے رنگین بنایا ہے اس افسانے کو

خاک کے ذروں سے اٹھتے ہیں ابھی تک شعلے
کس نے پھونکا تھا یہ ہستی کے سیہ خانے کو

دیکھو، دیکھو، ہے تمہیں اپنی نگاہوں کی قسم
یوں نہ پھونکو مری امید کے کاشانے کو

اب میں سمجھا ہوں سبب عشق مجازی کا
آزمانا تھا رہ عشق میں دیوانے کو

اک قیامت تھی مرے درد کی دل ناطلبی
بجلیاں ڈھونڈ رہی ہیں مرے کاشانے کو

تم کو مطلب ہی بھلا کیف سے کیا ہے ناصح
بے سبب چھیڑتے کیوں ہو کسی دیوانے کو

تنقید و تبصرہ

تاریخ احمدی مؤلفہ نواب شیخ احمد حسین خاں بہادر مذاق رئیس پریانواں حجم ۱۰، ۸۸ صفحہ تقطیع —
قیمت چار روپیہ ملنے کا پتہ کتب خانہ خزینۃ المحمود پریانواں ضلع پرتاب گڈھ۔

اودھ کے تعلقہ داروں بلکہ غالباً تمام مسلمان رئیسوں میں صرف معدودے چند لوگ ہیں جو علمی مذاق رکھتے ہیں ان میں نواب احمد حسین خانصاحب اس حیثیت سے خاص امتیاز رکھتے ہیں کہ آپ متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ نواب صاحب کو دیکھ کر گیا بان علم کا "ایمان تازہ" ہوتا ہے اور وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ارباب معنی خواہ وہ تعلقہ دار ہی کیوں نہ ہوں علمی مشاغل کو گھوڑ دوڑ کاؤنسل بازی، حضور رسی وغیرہ سے زیادہ دلکش اور دلفریب پاتے ہیں۔

تاریخ احمدی نواب صاحب کی جدید تصانیف میں سے ہے اس میں عہد رسالت، خلفائے اربعہ کے زمانہ خلافت، اور بنو امیہ و بنو عباس کے دوران حکومت کے تاریخی حالات بہت اختصار اور تحقیق کے ساتھ جمع کر دئے گئے ہیں۔ اس بات کا التزام ہے کہ ہر واقعہ کی تاریخی سند دی جائے یہاں تک کہ جن جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے خود اُنکی توضیح بھی بطور مقدمہ کے شامل ہے۔ تاریخ میں جتنا عنصر محض واقعات کا ہوتا ہے اس کے لحاظ سے یہ کتاب تاریخ اسلام کے مبتدی طالب علموں اور منتہی انگریزی خوانوں کے لئے بہت مفید ہے۔

کتاب کی لکھائی چھپائی اچھی ہے مگر اغلاط کثرت سے ہیں جن کی تصحیح کے لئے ایک صحت نامہ شروع میں دیا ہے۔ کاغذ غالباً اس خیال سے کہ کتاب بہت گراں نہ ہو جائے معمولی لگایا ہے۔

زبان "کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی رسالہ" زیر ادارت عبد الرحمن صاحب خوشتر۔ حجم ۸، ۸۸ صفحہ تقطیع ۲۰×۳۰ چندہ سالانہ للعہ رمقام اشاعت منگرول کاٹھیاواڑ

اُردو کہنے کے لئے ہندوستان کے دس کروڑ آدمیوں کی زبان ہے لیکن سچ پوچھئے تو

قطع نظر جہلا کے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی بہت کم لوگ ہندستان اُردو کو صحت کے ساتھ لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ اسکا سبب یہ ہے کہ اس زبان کی ترقی میں ایسے ایسے دور دراز مقامات شامل ہیں کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے زبان کا حلیہ بالکل بگڑ جاتا ہے بضرورت اسکی ہے کہ ان سب مقامات پر ایسے آئینے موجود ہوں جن میں شاہد اُردو اپنی شکل دیکھ کر آرائش و زیبائش کر سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ کاٹھیاواڑ میں ایک ایسا آئینہ قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی اور عبدالرحمن صاحب خوشتر منگرولی کی کوششوں سے بنایا گیا ہے جو "زبان" کہلاتا ہے۔ ہمارے سامنے دوسری جلد کا پہلا نمبر ہے جو لکھائی چھپائی کاغذ کے لحاظ سے اور بہیئت مجموعی مضامین اور زبان کے لحاظ سے بھی اردو زبان کے اچھے رسالوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔

شذرات

ہم کو یہ خبر سُنکر مسرت ہوئی کہ ریاست بہاول پور میں جو پنجاب کی آخری غربی سرحد ہے اور جس کے بعد سے اُردو کی بجائے سندھی زبان کا عمل دخل شروع ہو جاتا ہے سید مبارک صاحب جیلانی نے ایک کتب خانہ اُردو کا قائم کیا ہے۔

سید صاحب موصوف شرافت خاندانی اور اپنے آبائی منصب پیری وارشاد کے لحاظ سے بہت نامور اور باعزت شخص ہیں۔ لیکن انہوں نے اس کام سے جسے بالعموم لوگوں نے اب ایک نیاؤ پیشہ بنا رکھا ہے دست بردار ہو کر قوم کی علمی خدمت کیلئے کمر باندھی ہے۔ چنانچہ یہ لائبریری عوام میں علمی ذوق اور اُردو زبان سے دلچسپی پیدا کرنے کیلئے قائم کی۔ اور باوجود بے بضاعتی کے خود اپنی گرہ سے دو ہزار روپیہ کے صرفہ سے عمارت تیار کرائی اور اسکے لئے کچھ کتابیں بھی خریدی ہیں اور کسی سے ایک پائی چندہ نہ طلب کیا کیونکہ وہاں ابتک لوگوں میں اُردو کی خدمت کا احساس زیادہ نہیں ہے۔

اس لئے ہم محبین اُردو سے التماس کرتے ہیں کہ وہ اس کار خیر میں سید صاحب کی امداد کریں۔ خاصکر اہل بہاول پور کا فرض ہے کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو اس علمی چمن کی آبیاری میں جو انکے وطن میں لگایا گیا ہے پہلو تہی نہ فرمائیں۔ اور "ست مبارک جیلانی لائبریری" کی مدد کریں۔

ہماری خواہش یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر ہر مقام پر حسب حیثیت اسی طرح ایک ایک اُردو کا کتب خانہ یا دار المطالعہ قائم ہو جائے کیونکہ اس سے عوام کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔

ہم نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر درج کرتے ہیں کہ جناب مسیح الملک حکیم اجمل خانصاحب کی بہو جو عرصہ سے بیمار تھیں ۱۲ اپریل کو اپنے عزیزوں اور بچوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئیں۔ ہم اپنی

اور ناظرین جامعہ کی طرف سے جناب مسیح الملک مدظلہ العالی اور حکیم محمد جمیل خانصاحب سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور تمام عزیزوں کو صبر کی دولت کرامت فرمائے۔

جناب مسیح الملک کی صحت پر اس حادثہ جانکاہ کا بہت اندیشہ ناک اثر پڑا تھا اب خدا کے فضل سے پہلے سے حالت بہتر ہے لیکن ضعف اور اضمحلال حد سے زیادہ ہے۔ ایسی صورت میں ضرورت تھی کہ کامل سکون و اطمینان نصیب ہوتا تاکہ طبیعت کو مرض سے مقابلہ کرنے کا موقعہ ملتا لیکن ممدوح کے ایثار اور فرض شناسی کا یہ عالم ہے کہ اس حالت میں طبی کانفرنس کی شرکت کی غرض سے رامپور تشریف لے گئے ہیں۔ خدا ممدوح کو جلد صحت عطا کرے اور آپ کی ذات کو تا دیر ہماری قوم کے سر پر قائم رکھے۔

آج کل ہندوستان میں مسلمانوں کے قریب قریب کل تعلیمی اور علمی ادارے دو اصناف میں تقسیم ہیں جنہیں کبھی مشرقی اور مغربی کبھی قدیم و جدید اور کبھی دینی و دنیاوی کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ جامعہ ملیہ اصولاً اس تفریق کی سخت مخالف ہے اسکے خیال میں اسلام کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ان بظاہر متضاد عناصر میں صحیح امتزاج پیدا کرے اور زندگی کو تنگ نظری اور تعصب کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کرنیکے بجائے وسعت تخیل اور ہمہ گیری کی سپر سے صحیح و سالم رکھنے کی کوشش کرے۔ جامعہ کی ساری تعلیم اس پر مبنی ہے اور اسکی ساری علمی جد و جہد کا یہی نصب العین ہے۔ چنانچہ جامعہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف یعنی اردو اکادمی نے جو پروگرام اس سال کے آخر تک کم سے کم دس نئی مستند علمی کتابوں کے شائع کرنے کا بنایا ہے اور جو اس نمبر کے ساتھ قارئین کرام کی خدمت میں بھیجا جاتا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ کتابوں کے انتخاب میں یہی اصول مد نظر رکھا گیا ہے۔

ترجمہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ زیادہ ترجمے جرمن زبان سے کئے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں جتنی علمی کام کرنے والی جماعتیں ہیں بدقسمتی سے انکی پہنچ غیر زبانوں میں سے صرف انگریزی تک ہی ہے جو علمی زبانوں کی صف میں جرمن اور فرانسیسی کے بعد جگہ پاتی ہے۔ انڈو ولکاوی کی یہ امتیازی شان ہے کہ وہ جرمن کی بہترین کتابوں کا ترجمہ کرا رہی ہے اور آئندہ سال سے فرانسیسی زبان سے بھی ترجمے کرانا شروع کردے گی۔

قارئین کرام سے توقع ہے کہ وہ ان کتابوں کی اشاعت میں مدد دے کر ہماری ہمت افزائی فرمائیں گے۔

جامعہ جونیر (میٹرکولیشن) کا امتحان ، راپریل سے شروع ہو کر ، ار کو ختم ہو گیا۔ جامعہ سینیر اور ابتدائی کے امتحانات یکم مئی سے اور مدرسہ کے کل امتحانات ، رمئی سے شروع ہو جائینگے ۶ رمئی سے ۳۱ رجولائی تک تعطیل رہے گی اور یکم اگست کو جامعہ پھر کھلے گی۔ بی اے کا امتحان امسال ۲۰ رمئی سے شروع ہوگا۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے نئے نمبر کے دیکھنے سے معلوم ہوا ہے کہ حال میں پروفیسر سلوین لیوی کے پانچ مقالات کا مجموعہ L'Inde et le Monde "ہندوستان اور دنیا" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اسکے ملنے کا پتہ حسب ذیل ہے۔

Champion, Paris.

اسی کے ساتھ پروفیسر صاحب کی زوجہ محترمہ نے ہندوستان کا سفرنامہ Dans l'Inde "ہندوستان میں" کے نام سے شائع کیا ہے جو حضرات فرانسیسی جانتے

ہیں۔ اس کتاب کو ضرور پڑھیں ہمیں خود ان خاتون کی تصانیف کے پڑھنے کا ابتک اتفاق نہیں ہوا ہے لیکن یقینی بات ہے کہ جو مواقع ہندوستان کی ذہنی زندگی کو دیکھنے کے اور یہاں کے اہل علم سے ملنے کے انہیں حاصل ہوئے تھے وہ شاید ہی کسی مغربی خاتون کو حاصل ہوئے ہوں اس لئے ان کا سفرنامہ یقیناً نہایت دلچسپ ہوگا۔

آج کل ہم اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ اخبار میں روز مرہ ہندو مسلمانوں کے باہمی تنازعات کی خبریں یا ایسے مضامین پڑھیں جن سے فرقہ وارانہ منافرت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ ہمارے ملک کے بڑے بڑے رہنما جب کوئی تقریر کرتے ہیں تو اُنکے پہلا فقرہ اور آخری فقرہ یہ ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو آپس میں متحد ہو جانا چاہئے۔ لیکن بقیہ تمام تقریر چند تنگ نظری اور تعصب سے پر ہوتی ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اب مدت کے بعد ایک اچھی خبر سننے میں آئی ہے ایک انجمن The Fellowship کے نام سے مذہبی اور نسلی تنازعات کا مقابلہ کرنے کے لئے قائم ہوئی ہے جس کے مقاصد حسب ذیل ہیں:-

"تمام مذاہب کا جو خاص حصہ عالمگیر انسانیت کے ارتقا میں ہے اُسکا ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کرنا، اس کے سمجھنے کی کوشش کرنا اور اُسکی روحانی قدر و قیمت کو پہچاننا اور اس طرح تمام مذہبوں اور تمدنوں کے احترام کے جذبات دل میں پیدا کرنا مختلف عقائد اور تمدنوں کے لوگوں میں اتحاد عمل اس غرض سے کہ خدا کی محبت اور انسان کی خدمت کے عالمگیر مذہبی نصب العین کو حقیقت کا جامہ پہنایا جائے۔"

اس انجمن کے ممبروں میں ہم مختلف مذہب و ملت کے لوگوں کے نام پاتے ہیں جن میں رابندر ناتھ ٹیگور، جے سی بوس، مولانا ابوالکلام آزاد اور پادری شور کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ علاوہ افتتاحی جلسے کے اس انجمن کا ایک اور جلسہ ہو چکا ہے اور عنقریب اس کے مقاصد

سے حاصل کرنے کے لئے بہترین ذرائع استعمال کئے جائیں گے۔

امریکہ میں ایک شخص نے ہندوستان کی تعلیمی رپورٹ بابتہ ۱۹۲۲-۲۳ء کی بنا پر حساب لگایا ہے کہ ہندوستان میں حکومت اپنے باشندوں کی تعلیم پر پانچ آنے فی کس خرچ کرتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں امریکہ میں صرف عام تعلیم پر پچاس روپیہ فی کس یعنی ہندوستان کے مقابلہ میں ایک سو ساٹھ گنا خرچ ہوتا ہے۔

اس تقابل کا پورا لطف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ پانچ آنے میں تعلیم حاصل کرنے والے ہندوستانی یا کم سے کم مسلمان طالب علم کو کپڑوں اور ظاہری سامان آرائش پر اتنا خرچ کرنا پڑتا ہے جس کا تحمل اُسکا خاندان کسی طرح نہیں ہو سکتا اور اس پر بھی تعلیم ختم کرنیکے بعد اُس کا ثمرہ مدعا یعنی نوکری حاصل ہونا نہایت دشوار ہوتا جاتا ہے۔

اس حساب سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ خدانخواستہ ہماری حکومت کنجوس ہے۔ اُسکی دریادلی کا مرقع اگر دیکھنا ہو تو فوج کا بجٹ دیکھئے۔

کتبہ ایس ایم نصیر

رسالہ جامعہ

نمبر ۵	ماہ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۲۷ء	جلد ۸

نابینائی

اس عالم کون وفساد میں ناتواں اور بے بس انسان کے لئے جو ابتدائیں اور آزمائشیں رکھی گئی ہیں انہیں سے بے بصری بھی ایک سخت مصیبت ہے۔ اللہ محفوظ رکھے۔ اندھا زندہ ہے مگر درگور۔ دنیا میں ہے لیکن دنیا سے دور اور اقربا، و احباب کی دیدار سے مجبور۔ اسی وجہ سے اس مصیبت عظمیٰ میں صبر کرنے پر بعض روایات میں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ قرآن حکیم نے بھی اسکو معذورین میں داخل کیا۔ اور فرمایا لیس علی الاعمیٰ حرج۔ چنانچہ فریضہ جہاد اس سے ساقط ہے اور جمعہ و عیدین وغیرہ کی حاضری اس کے لئے لازم نہیں۔

بعض علماء نے اندھوں کو ناقص الدین قرار دیا ہے کیونکہ طہارت جو اصل الاصول ہے اسکی پوری رعایت کرنے سے وہ قاصر ہیں۔ اسی بناء پر بعضوں کے نزدیک انکی امامت بھی مکروہ ہے۔ ان لوگوں کا استدلال اس آیت سے ہے۔

لایستوی الاعمیٰ والبصیر ولا الظلمات ولا النور	نابینا اور بینا برابر نہیں۔ اور نہ ظلمت اور نور

وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ	اور نہ سایہ اور دھوپ۔

لیکن حقیقت میں اس آیت میں نہ اعمیٰ سے مراد اندھا ہے نہ بصیر سے بینا۔ بلکہ کافر اور مومن ہیں اور یہیں نہیں بلکہ قرآن میں دوسرے مواقع پر بھی انہیں معنوں میں یہ الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ سورہ ہود میں ہے۔

مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ۔	دونوں فریقوں (کافروں اور مومنوں) کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا اور بہرا اور بینا و شنوا۔

سورہ حج میں بھی فرمایا۔

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ	حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں نہیں اندھی ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

اس لئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ایک غیر اختیاری معذوری کی وجہ سے کیوں انسان کا رتبہ رب شکور و غفور کے نزدیک فروتر ہو جائیگا۔

جن لوگوں نے یہ دعوےٰ کیا ہے کہ اندھا نبی نہیں ہو سکتا انکا نقطہ نظر اور ہے یعنی وہ اس معذوری کو نبوت کے فرائض میں حارج سمجھتے ہیں۔ انکے نزدیک جہاں اور بہت سی باتیں ہیں مثلاً بد شکل یا بد خاندان ہونا جن سے ساحت نبوت پاک رہنا چاہئے وہاں نابینائی بھی ہے معہذا سارے اہل علم انکے ہم خیال نہیں ہیں۔ علامہ ابوالعباس احمد بن علی نے اپنی کتاب راس مال الندیم میں لکھا ہے کہ حضرت شعیب اور اسحاق علیہم السلام کی بینائی چلی گئی تھی۔ امام ابن جوزی نے تلقیح میں ان دونوں ناموں کے ساتھ حضرت یعقوبؑ کا نام بھی اضافہ کیا ہے جن کی آنکھوں کے سفید ہو جانے کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔

گو اسکا جواب مخالفین کی طرف سے یہ ہے کہ پہلے دو نبیوں کے متعلق کوئی قطعی شہادت

---

۵۱ یہ نادر و نایاب کتاب جس سے دنیا کے بڑے بڑے شاہی کتب خانے خالی تھے حال میں ہمارے دوست مولوی محمد یوسف صاحب ٹونکی کی کوشش سے دہلی میں طبع ہوئی ہے۔

موجود نہیں ہے اور حضرت یعقوب کی نابینائی عارضی تھی لیکن تاہم انکے بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ نابینائی کو ایک نقص سمجھتے ہیں نہ کہ عیب۔ تعجب ان لوگوں پہ ہے جو اس کو نہ صرف عیب بلکہ عذاب قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے دعوے کی تائید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى | اور جو یہاں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔

لہٰذا جب آخرت میں نابینائی عذاب ہے تو دنیا میں کیوں نہیں۔

مگر حضرت ابن عباس مجاہد اور مقاتل وغیرہ اکثر علمائے تفسیر نے اس کے معنے بیان کئے ہیں کہ اعمیٰ عن الحجت یعنی قیامت کے دن اس کو کوئی جواب نہ سوجھے گا۔ یہ مفہوم دوسری آیت سے جو سورہ طٰہٰ میں ہے زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۔ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى

جو کوئی میرے ذکر (قرآن) سے روگردانی کریگا اس کیلئے معیشت تنگ ہوگی۔ اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا اے میرے رب مجھے اندھا کیوں اٹھایا میں تو بینا تھا۔ وہ جواب دیگا کہ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو نے انکو بھلا دیا اسی طرح آج تو بھلا دیا جائے گا۔

یعنی اسکے اندھا اٹھانے کا مطلب نسیان حجت ہے کہ وہ جواب دے کر اپنی برارت نہیں کر سکیگا اور نجات کی صورت نہیں دیکھ پائیگا جیسا کہ آیت کے آخری حصہ سے تشریح ہوتی ہے۔

اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر یہاں اعمیٰ کا مجازی مفہوم یعنی نسیان دلائل مراد ہے تو اس سے دنیا میں اس کو کیا ضرر تھا جو آخرت میں وہ اس کے لئے تعزیر بن سکے۔

امام رازی نے اسکا جواب یہ دیا ہے کہ چونکہ اسکی روح نے جہالت میں دنیا سے مفارقت کی اس لئے یہی جہالت اس کی روح کے لئے الم کا باعث ہوگی۔

اس جواب سے افسوس ہے کہ امام صاحب کے روحانی معاد کے قائل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

ہمارے نزدیک اسکا سیدھا جواب یہ ہے جو شخص دنیا میں قرآن سے روگردان ہوا وہ قیامت میں اندھوں کی طرح سرگردان پھریگا اور کوئی سبیل نجات کی نہیں دیکھ پائے گا۔

گو یہ آیت عمل بالقرآن کے متعلق ہے لیکن بعض علما نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کوئی شخص حفظ کرنیکے بعد قرآن کو بھلا دے تو وہ قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا۔

حاصل یہ ہو کہ نابینائی اگرچہ ایک دردناک مصیبت ہے لیکن وہ عذاب یا تعزیر کسی طرح نہیں کہی جاسکتی۔ ہزاروں بچے مادر زاد اندھے پیدا ہوتے ہیں آخر یہ کس جرم کی تعزیر ہیں؟

بے بصری سے ہر چند انسان میں بڑا نقص آجاتا ہے اور اسکی زندگی تقریباً بیکار سی ہوجاتی ہے لیکن اس میں کچھ فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ توجہ بٹانے والی چیزوں سے اس کو یکسوئی ہوجاتی ہے۔ اس لئے اسکی بصیرت اور ذہانت بڑھجاتی ہے۔ خاصکر قوت حافظہ۔ چنانچہ خود نابینا بزرگوں کے اقوال اس پر شاہد ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔

اِن یاخذ اللہ من عینیّ نورہما — ففی لسانی و سمعی منہما نور

قلبی ذکیٌ و عقلی غیر ذی دخلٍ — وفی فمی صارم کالسیف ماثور

یعنی اگر اللہ نے میری آنکھوں کا نور لے لیا تو انکے بدلے میں میری طلاقت اور سماعت میں نور آگیا۔ میرا دل ذکی ہے اور عقل بے شائبہ۔ اور منہ میں ایسی زبان ہے جو تیغ کی طرح تیز ہے۔

وقالوا قد عمیت فقلت کلّا — وانی الیوم ابصر من بصیر

سواد العین زار سواد قلبی — لیجتمعا علی فہم الامور

یعنی لوگوں نے کہا کہ تو اندھا ہوگیا میں نے کہا ہرگز نہیں۔ اب تو میں بیناؤں سے بھی بڑھکر بینا ہوں۔ میری آنکھوں کی سیاہی (پتلی) سویدا قلب میں آگئی ہے تاکہ دونوں ملکر باتیں سمجھیں۔

جودت طبع۔ میلان ذہن اور حفظ و یادداشت کے متعلق نابیناؤں کی داستانیں حیرت انگیز ہیں ایک حدیث بھی بیان کیجاتی ہے کہ۔

ما اخذ اللہ کریمتی مومنٍ الا عوضہ خیراً منہما | اللہ جس مومن کی آنکھیں لے لیتا ہے انکا بدلا ان سے بہتر اسکو دیتا ہے

یہی وجہ تھی کہ ہمارے سلف اس جماعت کو حفظ قرآن وحدیث میں لگا دیتے تھے تاکہ انکی زندگی نہ صرف انکے بلکہ ملت کے لئے مفید اور کارآمد ہو جائے۔ چنانچہ علماء اسلام یعنی محدثین ومفسرین فقہاء اور ادباء بالخصوص شعراء میں انکی ایک جماعت کثیر نامور ہوئی جنکی تصانیف ابتک بھی امت کے لئے سرمایۂ ناز ہیں۔

خود عرب کی گرمی اور اسکے صحاری آنکھوں کے حق میں کچھ اچھے واقع نہیں ہوئے ہیں۔ ہمیشہ سے وہاں ایک بڑی تعداد احولوں۔ کانوں اور اندھوں کی رہی ہے۔ لیکن اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ آنکھوں کے لئے مضر دریائے نیل کا پانی ہے ملک مصر میں تقریباً ۲۵ فیصدی آدمی آنکھوں کے بیمار رہتے ہیں وہ بیمار نہیں جس کی بابت شاعر نے کہا ہے ؎

نقب کیا کیا تمہاری چشم عاشق کش نے پائے ہیں ؎ نیلی۔ سرگیں۔ بیمار۔ افسونگر۔ بڑی۔ اچھی

بلکہ واقعی مریض۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کثرت سے اندھے سڑکوں پر گھومتے نظر آتے ہیں۔

ہر چند کہ بغداد کی تباہی کے بعد سے اسلامی علوم اور آداب کا مرکز قاہرہ رہا ہے اور آجتک بھی ہے۔ لیکن وہاں کی حالت خراب ہوتے ہوتے اس درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ ہر ہر محلہ میں ایک ایک قبر پرستش گاہ ہوتی ہے جس کے اردگرد یہ اندھے بیٹھے ہوئے قرآن پڑھتے رہتے ہیں تاکہ زائرین سے کچھ خیرات وصول کریں۔ مُردوں کے ایصال ثواب کی دعوتوں اور گورستانوں میں اکثر یہی جماعت قطار در قطار نظر آتی ہے اور اپنی دینی اور دنیاوی اور جسمانی وروحانی افسوسناک حالت سے ایسا پر الم نظارہ پیش کرتی ہے جس پر انسانیت ماتم کرنے لگتی ہے۔ اور اس کے مقابل میں کافر یورپ جو سلوک اپنے یہاں کے اندھوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی تلاش کرنی پڑتی ہے۔

ہندوستان کے مفلس اور نادار مسلمان اس مصیبت زدہ جماعت کی تکالیف کا احساس بھی نہیں رکھتے[1]۔ اور تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ انہوں نے اپنی دولت اور شوکت کے زمانہ میں

---

[1] چند سال ہوئے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنے والد ماجد کی یادگار میں علیگڈھ میں ندوۃ

بھی اسکی طرف زیادہ توجہ نہ کی اور ایک بیکار جزو سمجھا۔

اس آخری زمانہ میں نواب صدیق حسن خانصاحب نے البتہ جا بجا سے اندھوں کو بھوپال میں جمع کر کے سلف کے دستور کے مطابق قرآن و حدیث یاد کرنے کے کام میں لگایا تھا اور وظائف مقرر کر دئے تھے چنانچہ انکے عہد میں وہاں اس جماعت کی بڑی تعداد تھی۔ بالعموم یہ لوگ قرآن حفظ کر لیتے تھے جس کا اثر یہ ہوا کہ وہاں اندھوں کو عام طور پر "حافظ جی" کہنے لگے۔ بعض بعض بلوغ المرام اور مشکوٰۃ از بر کر لیتے تھے اور اس پر انکو انعامات ملتے تھے۔ چند ایسے بھی تھے جو بخاری بلکہ صحاح ستہ یاد رکھتے تھے۔ انیں سے کچھ لوگ صاحب درس بھی تھے جن کی ذہانت اور حافظہ کے متعلق عجیب و غریب روایتیں وہاں مشہور تھیں۔

اس ذیل میں اسلام کے مشہور نابیناؤں کا ایک اجمالی تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے جو حضرات مکفوف البصر تھے وہ یہ ہیں۔

(۱) حضرت سعد بن وقاصؓ۔ فاتح قادسیہ و مدائن یہ ساتویں مسلمان اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ نیز اُن چھار باب شورٰے میں سے بھی جنکو حضرت عمر اپنے آپ میں سے خلیفہ منتخب کرنے کیلئے نامزد فرما گئے تھے۔

یہ صحابۂ کرام میں خصوصیت کیساتھ مستجاب الدعوات تھے۔ زمانہ فتنہ میں سب سے الگ رہے آخری عمر میں بصارت جاتی رہی۔ حمراء الاسد کے متصل انکی ایک زمین تھی وہیں مکان بنا کر سکونت اختیار کی۔ ۵۵ھ میں انتقال فرمایا نعش کو لوگ مدینہ میں اٹھالائے۔

(۲) حضرت عباس بن عبد المطلب۔ عم رسولؐ بڑھاپے میں نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت عمر نے استسقاء میں جب انکو آگے بڑھایا تھا اس وقت بھی نابینا تھے۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔ عمر ۸۸ سال تھی۔

(۳) عبد اللہ بن عباس حبر اُمت۔ اپنے باپ اور دادا کی طرح بڑھاپے میں آنکھوں سے

کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کھولا ہے۔ غالباً ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ پہلی مثال ہے۔

معذور ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ انکی بہت عزت و توقیر کرتے تھے۔ ایک تو انکے عقل و علم کی وجہ سے۔ دوسرے اس سبب سے کہ انکے باپ ابو سفیان اور انکے باپ حضرت عباس میں باہم بہت محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عبداللہ بن عباس اکثر ان سے ملنے کے لئے دمشق میں جایا کرتے تھے۔ جب یہ نابینا ہو گئے تھے اس زمانہ میں امیر معاویہ نے ایک دن کہا کہ بنی ہاشم کی بصارت پر اکثر آفت آجاتی ہے۔ بولے کہ ہاں۔ اور بنی امیہ کی بصیرت پر۔ طائف میں رہتے تھے۔ وہیں ۶۸ھ میں گذر گئے۔

(۴) عقیل بن ابی طالب حضرت علی کرم اللہ وجہ کے بھائی اور انساب عرب کے بڑے واقف کار تھے۔ حضرت عمر نے فوج کا دفتر جن لوگوں سے مرتب کرایا تھا ان میں یہ بھی تھے جنگ صفین کے بعد اپنے بھائی کا ساتھ چھوڑ کر معاویہ کے پاس چلے گئے۔ اور وہیں رہنے لگے۔ انہوں نے مشہور کرنا شروع کیا کہ دیکھو حضرت علی کے حقیقی بھائی جو انساب عرب کے سب سے بڑے عالم ہیں اگر ہمکو بہتر نہ سمجھتے تو کیوں انکو چھوڑ کر ہمارے پاس آتے۔ عقیل کو جب یہ خبر ملی تو کہا کہ بے شک۔ لیکن صرف دنیاوی لحاظ سے۔

ایک روز امیر معاویہ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ سورۂ تبت میں ابو لہب کا نام جو آیا ہے اسکو تم لوگ جانتے ہو کہ کون تھا؟ شامیوں نے کہا کہ نہیں۔ عقیل کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ انکا چچا تھا۔

حضرت عقیل نے ان لوگوں سے کہا کہ اسی سورۃ میں ابو لہب کی بیوی جس کو حمالۃ الحطب کا خطاب دیا گیا ہے جانتے ہو کہ کون تھی؟ لوگ بولے نہیں۔ کہا کہ وہ معاویہ کی پھوپھی ام جمیل بنت حرب تھی۔ ۵۰ھ کے حدود میں وفات پائی۔

(۵) عبداللہ بن عمر بن خطاب۔ علماء اور اتقیا صحابہ میں سے ہیں۔ باپ کے ساتھ ہجرت کرکے مدینہ آئے تھے۔ جنگ بدر اور احد میں کمسنی کی وجہ سے شرکت کی اجازت نہ پائی اور راستہ سے واپس کر دئے گئے اس کے بعد سے تمام مشاہد میں شریک رہے۔ فتح مصر میں بھی شامل تھے

اور جنگ ایران میں بھی۔

بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے بیعت رضوان میں انہوں نے ہی سبقت کی تھی لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ ابو سنان اسدی تھے۔

زمانہ فتنہ میں بالکل الگ رہے نہ حضرت علی کا ساتھ دیا نہ معاویہ کا۔ کبر سنی میں آنکھوں نے جواب دیدیا تھا۔ ۷۳ھ میں محاصرۂ مکہ کے زمانہ میں حجاج بن یوسف ثقفی کے کسی سپاہی کا نیزہ انکے پاؤں میں لگ گیا۔ اس زخم سے جانبر نہ ہو سکے۔ حجاج بھی عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ اور پوچھا کہ کس نے مارا۔ بولے کہ اس نے جس نے حدود حرم میں لوگوں کو اسلحہ رکھنے کی اجازت دی۔

(۶) ابو سفیان صخر بن حرب۔ امیر معاویہ کے والد۔ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے۔ طائف کے غزوہ میں آنحضرت صلعم کے ہمرکاب تھے اس میں ایک آنکھ تیر سے زخمی ہوئی۔ دوسری معرکہ یرموک میں شہید ہوئی جبکہ یہ اپنے بیٹے یزید کے علم کے نیچے جہاد کر رہے تھے۔ مدینہ میں ۳۲ھ میں وفات پائی۔

(۷) ابو قحافہ۔ حضرت ابو بکر کے والد۔ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ خلیفہ اول کی یہ خصوصیت یہاں ذکر کے قابل ہے کہ انکی چار پشتیں صحابی ہیں۔ وہ خود۔ انکے باپ۔ اور انکے بیٹے عبدالرحمن اور پوتے محمد بن عبدالرحمن۔

اسلام لانیکے وقت ابو قحافہ کی بصارت جا چکی تھی اور تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ تاہم وہ حضرت ابو بکر کے انتقال کے وقت تک زندہ تھے۔ انکے ترکہ میں سے ایک سدس ان کو بھی ملا تھا جس کو انکی اولاد پر پرسترد کر دیا۔ ۱۴ھ میں انتقال کیا۔ عمر ۹۷ سال کی تھی۔

(۸) حسان بن ثابت انصاری خزرجی۔ شاعر دربار نبوی۔ بڑی عمر پائی۔ ساٹھ سال جاہلیت میں گذارے اور اسیقدر اسلام میں۔ ۵۴ھ میں وفات ہوئی۔ یہی انکی خاندانی عمر تھی امام ذہبی نے لکھا ہے کہ انکے باپ، دادا، پردادا ہر ایک نے اسی قدر طویل عمریں پائی تھیں۔

جب بڑھاپے میں بینائی سے معذور ہو گئے تو کبھی کبھی حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اشعار سناتے۔ کسی نے کہا کہ ام المومنین! یہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے آپ پر تہمت تراشی تھی اور جنکی نسبت قرآن میں ہے کہ انکے لئے بڑا عذاب ہے۔ ان کو کیوں یہاں آنیکی اجازت دیتی ہیں!!

حضرت عائشہ نے فرمایا کہ نابینائی سے بڑھکر کون عذاب ہو گا۔

لیکن اصلیت یہ ہے کہ قرآن میں عذاب کی وعید اس کے لئے ہے جو اس تہمت کا بانی تھا (والذی تولّٰی کبرہ منہم لہ عذاب عظیم) اور یہ راس المنافقین عبداللہ بن سلول تھا۔

چنانچہ جو جو اس تہمت میں شریک تھے انکو اللہ تعالےٰ نے توبہ کی توفیق بخشی لیکن نہ بخشی تو ابن سلول کو جو نفاق میں مرا۔ اور ایسا مغضوب و معتوب ہوا کہ اسکی قبر کے پاس کھڑے ہونیکی بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اجازت نہ دی۔

(۹) کعب بن مالک انصاری۔ دربار نبوی کے دوسرے شاعر۔ جنگ احد میں انکو گیارہ زخم آئے تھے۔ اسکے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔ بدر کی شرکت میں اختلاف ہے قرآن کریم میں جن تین شخصوں کا ذکر ہے کہ غزوۂ تبوک میں آنحضرت کے ہمراہ نہ گئے اور لیت ولعل میں رہ گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بوجہ صدق کے ان کی توبہ قبول کر لی۔

سنہ ۵۰ھ میں مدینہ میں انتقال فرمایا۔ اس سے کچھ زمانہ پہلے آنکھیں جاتی رہی تھیں۔

(۱۰) ابن ام مکتوم۔ انکا نام عمرو بن قیس ہے۔ ام المومنین حضرت خدیجہ کے ماموں زاد بھائی ہوتے تھے۔ بصارت سے معذوری کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو مدینہ میں موذن مقرر فرمایا تھا۔ عاقل و مدبر تھے۔ چنانچہ آنحضرت جب کہیں باہر کسی غزوہ وغیرہ کے لئے جاتے تو اکثر انہیں کو اپنا قائم مقام کر جاتے۔

جہاد کے شوق میں جنگ قادسیہ میں جاکر شرکت کی۔ کیونکہ عرب و عجم کا سب سے بڑا مقابلہ یہی تھا

ایکطرف تمام عجمی شاہزادے امراء اور روساء تھے۔ دوسری طرف سے ملک عرب کے سارے بہترین لخت جگر حضرت سعد نے انکو علمبردار مقرر کردیا۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ وہیں شہید ہوگئے لیکن اکثر مورخ لکھتے ہیں کہ مدینہ میں آکر ۵۴ھ میں انتقال فرمایا۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَاءَہُ الْاَعْمٰی الخ انہیں کے متعلق نازل ہوئی۔ شان نزول یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صنادید قریش عتبہ۔ شیبہ۔ ابوجہل۔ امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ وغیرہ کا مجمع تھا۔ اور آپ انکو اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ اسی گفتگو میں تھے کہ ابن ام مکتوم وہاں پہنچ گئے اور کہا کہ یا محمد علمنی ما علمک اللہ

انکی یہ بات اس وقت بے موقع معلوم ہوئی۔ اس لئے آپنے ترش رو ہو کر منہ پھیرلیا۔ اس پر یہ سورہ اتری جس میں پیغمبر پر عتاب کیا گیا۔

مفسرین کا بیان یہی ہے امام رازی نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ ابن ام مکتوم اگرچہ نابینا تھے لیکن باتیں تو سن سکتے تھے۔ آنحضرت کے انداز خطاب سے انکو سمجھنا چاہئے تھا کہ کس توجہ کیساتھ تبلیغ میں مصروف ہیں۔ ایسی حالت میں دخل دینا مناسب نہ تھا علاوہ بریں وہ اسلام لاچکے تھے اور ضروریات دین سے واقف تھے بخلاف اس کے سرداران قریش کافر تھے اس لئے اصولاً انکو مسلمان بنانا زیادہ اہم تھا خاصکر ایسی حالت میں جبکہ انکے اسلام لانے سے تقریباً سارے قریش کے مسلمان ہوجانیکی توقع تھی۔ لہذا ابن ام مکتوم بیچ میں چھیڑ کر بہت بڑے کار خیر اور ادائے فرض نبوت میں خلل اندازی کے مرتکب ہوئے۔ پھر اگر پیغمبر نے انکی اس حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو کیا بیجا کیا۔ اور کیوں مورد عتاب ہوئے۔

اسکا انہوں نے خود ہی جواب بھی دیا ہے جو حسب معمول اسقدر قوی نہیں جس قدر کہ اعتراض۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ واقعہ کی ظاہری شکل کا مقتضا تو یہی تھا لیکن چونکہ آنحضرت کے اس طرز سلوک سے فقراء پر اغنیاء کی ترجیح کا شبہ ہوتا تھا جس سے انکی دلشکنی کا احتمال تھا۔

اس لئے عتاب نازل ہوا۔ کیونکہ نبیوں کا دستور یہی ہے" ولا تطرد الذین یدعون ربهم الآ"
یہ بھی ممکن ہے کہ حضور انور کے قلب میں اس وقت ابن ام مکتوم سے بوجہ بعد قرابت
اور نابینائی کے نفرت اور ان کفار کی طرف بسبب انکی ریاست اور قرابت قریبہ کے
رغبت پیدا ہوگئی ہو اسلئے عتاب ہوا۔ یعنی یہ عتاب تادیب (ترش روئی اور اعراض پر
ابن ام مکتوم کی زجر و توبیخ) پر نہیں بلکہ تادیب کے لئے تھا

(۱۱) ابو اسید ساعدی انصاری۔ بدر و احد ہر غزوہ میں حاضر رہے۔ بدریین میں سے سب سے
آخر میں سنہ۶۰ھ میں انتقال فرمایا عمرہ ۷ سال تھی۔ بڑھاپے میں آنکھوں سے معذور
ہوگئے تھے۔

(۱۲) فویک۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں آنکھیں سفید تھیں اور
مطلق سوجھتا نہ تھا حضور نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ کہا سانپ کے انڈوں پر پاؤں پڑ گیا
تھا غالباً اسی کا اثر ہے۔ آپنے اپنے مبارک لبوں کی تری دونوں آنکھوں میں لگادی
اچھے ہوگئے۔ اسی سال کی عمر تک سوئی میں تاگا ڈال لیتے تھے۔

اسی ذیل میں یہ واقعہ بھی ذکر کے قابل ہے کہ جنگ احد میں حضرت قتادہ بن نعمان کو ایک
ایسا تیر لگا کہ انکی آنکھ نکل پڑی۔ وہ اس کو ہاتھ میں لئے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
کے پاس آئے۔ آپنے دعا کی اور آنکھ اپنے دست مبارک سے انکے حلقہ چشم میں رکھکر
جمادی۔ وہ ایسی درست ہوگئی کہ زندگی بھر بہ نسبت دوسری آنکھ کے زیادہ خوش نظر
اور خوش منظر رہی۔ بلکہ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ انکی نسل میں بھی اسکا اثر باقی رہا

(۱۳) مخرمہ بن نوفل۔ سرداران قریش میں سے تھے۔ فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ اور جنگ حنین
میں رسول اللہ کے ہمرکاب شریک ہوئے حضرت عمر نے دفتر فوج کی ترتیب میں انسے
بھی مدد لی کیونکہ انساب اور قبائل عرب سے خوب واقف تھے۔
حضرت عثمان کے زمانہ میں آنکھوں سے معذور ہوگئے تھے بسنہ۵۴ھ میں مدینہ میں انتقال کیا

(۱۴) برا بن عازب انصاری جنگ بدر میں جا رہے تھے لیکن کمسنی کی وجہ سے راستہ سے واپس کئے گئے ۔ سنہ ھ میں ملک رے انہیں کے ہاتھ سے فتح ہوا جب آنکھیں جاتی رہیں تو کوفہ میں سکونت گزیں ہوگئے وہیں سنہ ھ میں وفات پائی ۔

(۱۵) عبداللہ بن ارقم ۔ فتح مکہ میں اسلام لائے ۔ آنحضرت کے اور انکے بعد شیخین کے کاتب رہے حضرت عمر اور عثمان کے عہد میں ایک مدت تک بیت المال انکے سپرد رہا آخر میں نابینا ہوگئے تھے سنہ ھ کے حدود میں گذر گئے ۔ حضرت عثمان نے ایک بار انکو تیس ہزار درہم انعام عطا کئے لیکن لینے سے انکار کر دیا ۔

(۱۶) عبداللہ بن علقمی خزاعی ۔ بیعت رضوان نیز دیگر غزوات میں بھی شریک رہے ۔ آنحضرت کی وفات کے بعد مدینہ چھوڑ دیا ۔ جب کوفہ آباد ہوا تو وہاں سکونت اختیار کر لی بڑی عمر پائی بڑھاپے میں آنکھیں جاتی رہیں ۔ کوفہ میں سب سے آخری صحابہ یہی رہ گئے تھے سنہ ھ میں انتقال فرمایا ۔

(۱۷) عتبہ بن مسعود ہذلی ۔ دونوں ہجرتوں میں شریک تھے ۔ اور کسی غزوہ سے غیر حاضر نہ ہوئے مدینہ میں انتقال کیا ۔ حضرت عمر نے جنازہ کی نماز پڑھائی گو عمر زیادہ نہ پائی لیکن آنکھوں نے جواب دیدیا تھا ۔

(۱۸) اُمیہ بن الاشکر کنانی زمانہ جاہلیت میں اپنے قبیلہ بنی لیث کے سردار تھے ۔ اسلام لاکر مدینہ میں رہ گئے ۔ آنکھوں سے معذور تھے ۔ انکے ایک ہی بیٹا تھا کلاب ۔ جہاد کے شوق میں اس نے ابو موسیٰ اشعری کی فوج میں اپنا نام لکھا لیا اور عراق کو چلا گیا ۔ ادھر ماں اور خاصکر بڑے نابینا باپ کو فرمانبردار اور خدمتگزار بیٹے کے چلے جانے سے بڑی بے قراری ہوئی ۔ خلیفہ وقت حضرت عمر کے پاس آکر روئے اور درخواست کی کہ کلاب کو واپس بلا دیجئے ۔ چند اشعار بھی انکو سنائے جو اسقدر دردناک تھے کہ حضرت عمر آبدیدہ ہوگئے ۔ آخر میں یہ دھمکی بھی تھی کہ اگر نہ بلایا تو بد دعا کر دوں گا ۔

حضرت عمر نے ابو موسیٰ کو فوراً حکم بھیجا کہ کلاب کو واپس کر دو جب وہ آئے تو پہلے خلیفہ ہی کے پاس حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا کہ تم اپنے باپ کی کیا خدمت کرتے تھے کہ وہ تمہارے لئے اسقدر بیتاب ہیں۔ کہا کہ میں ہی انکے سارے کاموں کا کفیل تھا اور جب وہ پینے کے لئے دودھ مانگتے تھے تو سب سے بہتر اونٹنی کو منتخب کر کے اس کے تھن کو پانی سے دہوتا کہ دودھ ٹھنڈا ہو جائے پھر نکالکر لاتا اور پلاتا تھا۔

حضرت عمر نے امیہ کو بلایا پوچھا کہ کیا حال ہے؟ بولے کہ بس آرزو یہی ہے کہ کلاب کو پاؤں جگر سے لگاؤں اور سونگھوں [1]

حضرت عمر نے کلاب کو اشارہ کیا۔ وہ اسی طریقے سے اونٹنی کا دودھ نکالکر لائے جس طریقہ سے باپ کیلئے نکالا کرتے تھے۔ حضرت عمر نے اسکو امیہ کے ہاتھ میں دیا۔ انہوں نے منہ سے لگایا تو کہا کہ واللہ اس پیالہ سے مجھے کلاب کے ہاتھوں کی مہک آتی ہے۔

فرط رقت سے حضرت عمر اور حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ پھر انہوں نے کلاب کو ملا دیا وہ لپٹ گئے۔ اور بیٹے کو لیکر گھر آئے۔ حضرت عمر نے کلاب سے کہا کہ تم اپنے والدین کی خدمت ہی کو جہاد سمجھو۔ چنانچہ ان دونوں کی زندگی تک وہ کسی جنگ میں شامل نہ ہو سکے۔

صحابہ کرام میں سے صرف انہیں حضرات کے حالات ملے یقیناً اور لوگ بھی ہونگے مگر ہم نے استیعاب کی کوشش بھی نہیں کی۔

زمانہ مابعد میں تاریخ اسلام میں نابیناؤں کی ایک کثیر تعداد ملتی ہے۔ مگر ان میں سے بادشاہوں۔ شاہزادوں۔ امراء اور وزراء کے حالات میں کوئی خاص دلکشی مجھکو نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندھا ہونے یا کر دئے جانیکے بعد اس گروہ کو اپنی گذشتہ عزت و شوکت اور دولت و راحت کا اس قدر رنج و غم رہتا تھا کہ ساری انسانی خوبیاں اور طبعی

---

[1] عرب اپنے بچوں کو سونگھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کو اپنی ریحانہ فرمایا۔

لطافتیں جاتی رہتی تھیں اور خوش مزاجی انکے پاس بھی نہیں پھٹکی تھی۔ اس لئے انکے خشک تذکرہ کو چھوڑ دینا پڑا۔

مفسرین ومحدثین بعلما روفقہا مصنفین و مؤلفین اور ادبار وشعرا کا بھی بڑا گروہ ہے لیکن ان میں سے بھی ہم صرف اُن بعض کے حالات لکھتے ہیں جنکی زندگی میں کوئی تاریخی دلچسپی یا ادبی لطافت ہے۔

(۱) عبدالصمد بن علی۔ انکے باپ۔ دادا۔ پردادا۔ اور سکڑ دادا سب آخر میں نابینا ہو گئے تھے پھر یہ کیسے بچتے۔ اُنکی تاریخ اعجوبۂ روزگار ہے۔ پہلی بات یہ ہی کہ اُنکی ولادت اور انکے بھائی محمد بن علی اولین خلیفہ عباسی سفاح کے باپ کی ولادت میں پورے ۴۴ سال کا فصل ہے یہ سنہ ۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے تھے اور محمد مذکور سنہ ۶۰ھ میں۔ پھر محمد نے سنہ ۱۲۶ھ میں وفات پائی اور عبدالصمد نے سنہ ۱۸۵ھ میں دونوں کی وفات میں ۵۹ سال کا فرق ہے۔ اسقدر بُعدِ زمانی ایک ہی باپ کی دو اولاد میں مشکل سے مل سکتا ہے۔

دوسرا امر یہ ہے یزید بن معاویہ سنہ ۵۰ھ میں امیر الحج تھا اور عبدالصمد سنہ ۱۵۰ھ میں حالانکہ دونوں عبدمناف سے ایک ہی درجہ میں پڑتے ہیں۔ یعنی یزید بن معاویہ بن ابی سفیان بن حرب بن امیہ بن عبدشمس بن عبدمناف۔ اور عبدالصمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف۔

تیسری بات یہ ہی کہ پانچ عباسی خلفا سفاح۔ منصور۔ مہدی۔ ہادی اور ہارون الرشید کے زمانے دیکھے چنانچہ ایکبار ہارون کے دربار میں عجیب اجتماع تھا۔ خلیفہ کا چچا سلیمان موجود تھا۔ اور سلیمان کا چچا عباس اور عباس کے چچا عبدالصمد تھے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ خلاف معمول انکے دودھ ہی کے دانت آخر عمر تک رہے۔ دوسرے دانت نہیں نکلے۔

مہدی اور ہارون کے زمانوں میں دمشق اور مکہ وغیرہ مختلف امارتوں کے عہدوں

پر رہے۔ بنی عباس میں انکا خاص احترام تھا۔ بصرہ میں انتقال کیا۔

(۲) قتادہ بن دعامہ حفظ میں ضرب المثل تھے۔ جو بات سن لی کبھی نہ بھولے۔ روایت حدیث میں کسی شیخ سے کبھی یہ نہ کہا کہ دوبارہ فرمائیے۔ امام احمد بن حنبل نے انکی بہت مدح لکھی ہے۔ اور تفسیر اور اختلاف علما، کا عالم اور فقیہ و حافظ حدیث تسلیم کیا ہے۔ انکے حافظہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ میں نے ایکبار صحیفۂ جابر انکے سامنے پڑھا وہ سارے کا سارا ان کو ازبر ہوگیا۔

یہ ائمہ تابعین مثلاً سعید بن المسیب اور امام شعبی وغیرہ کے شاگرد تھے۔ اور آپ سے کئی ارباب صحاح ستہ نے روایات لی ہیں۔ سنہ۱۱۷ھ میں انتقال فرمایا۔ آنکھیں ایام طفلی ہی میں جا چکی تھیں۔

(۳) محمد بن حازم ابو معاویہ سنہ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ چار سال کی عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے۔ امام اعمش کے پاس بیس سال رہے اور انہیں سے علم حدیث اخذ کیا۔ ہشام بن عروہ سے بھی روایت کرتے ہیں ائمہ حدیث مثلاً امام احمد بن حنبل اور یحیٰی بن معین وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ حافظ حدیث اور ثقہ تھے۔ اور بغداد میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے بسنہ۱۹۴ھ میں وفات پائی۔ ہارون الرشید نے علویہ کی طرف سے اپنی سلطنت کیلیے خطرہ دیکھکر ایک بار حکم دیا کہ جو شخص حضرت علی کی خلافت کو صحیح ثابت کرنیکی کوشش کرے گا میں اسکو قتل کردوں گا۔ ابو معاویہ نے کہا کہ بنی تیم کے حضرت ابوبکر۔ بنی عدی کے حضرت عمر۔ بنی امیہ کے حضرت عثمان۔ پھر اگر حضرت علی خلیفہ نہ تسلیم کیے گئے تو خلافت راشدہ میں بنی ہاشم کا کوئی حصہ نہ ہوا۔ یہ سنکر ہارون سوچنے لگا۔ اس کے بعد کہا ٹھیک ٹھیک ہے اب سے جو کوئی حضرت علی کی خلافت کا منکر ہوگا اس کو قتل کی سزا دیجائیگی۔

(۴) ابو الحسن منصور بن اسماعیل ضریر۔ امام شافعی کے شاگردان خاص میں سے تھے۔ متعدد کتابیں

تصنیف کی ہیں۔ اہل مصر انکا بہت احترام کرتے تھے۔

ایک بار وہاں سخت قحط پڑا۔ فاقہ سے تنگ آکر انہوں نے اپنی چھت پر کھڑے ہو کر پکارا کہ لوگو! میری امداد کرو۔ تھوڑی دیر میں انکے دروازہ پر سیکڑوں اونٹ غلہ سے لدے ہوئے آگئے۔

شعر بھی کہتے تھے۔ نہایت لطیف اور حکیمانہ۔

پہلے فوج میں ملازم تھے۔ جب بصارت سے معذور ہوگئے تو تفقہ اختیار کیا۔ ۲۶۳ھ میں مصر میں گذر گئے۔

(۵) محمد بن ہذیل علاف بصری معتزلی۔ جماعت متکلمین میں ممتاز اور انکے ایک گروہ کا جو اسی کی نسبت سے ہذلی بولے جاتے ہیں امام ہے۔

جہم بن صفوان امام فرقہ جہمیہ جنت اور دوزخ کے فنا ہو جانے کا قائل ہے[۱]۔ علاف اس حد تک تو نہیں پہنچا۔ لیکن انکے ایک ہی حالت پر دوام کا وہ قائل نہیں ہے۔ بلکہ کہتا ہے کہ آخر میں اہل جنت پر ایک سکون امن طاری ہو جائیگا جس میں تمام لذتیں مجتمع ہونگی۔ اسی طرح اہل نار پر بھی ایک خمود ہوگا جس میں ہر قسم کے آلام ہونگے۔ مگر یہ ایسی بات ہے کہ قرآن کہیں اس کی تائید نہیں کرتا بخلاف جہم بن صفوان کے قول کے۔

خلیفہ مامون معتزلی اس کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ ایک دن جب وہ دربار میں آیا تو آپ

---

[۱] بحث بہت لطیف ہے اگرچہ اسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں تاہم ایک مختصر توضیح نامناسب نہ ہوگی۔ قرآن کریم میں جنت اور دوزخ دونوں کے لئے خلود اور ابدیت کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ اسوجہ سے اہل سنت تمام تر انکے خالد و مخلد ہونیکے قائل ہیں لیکن جہم بن صفوان انکے خلود کو اسقدر دوامی نہیں مانتا جسقدر کہ انکے خلق کی سرمدیت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک وقت انکا فنا ہوجانا لازمی ہے یعنی "کل شیء ہالک الا وجہہ" میں شے کے تحت میں وہ جنت و نار کو بھی مندرج سمجھتا ہے۔ سورہ ہود میں جنت و نار کی مدت خلود میں دونوں جگہ "الا ما شاء ربک" کا استثنا ہے جو اس کے قول کا موئد ہے

حاجب سے پوچھا کہ دروازہ پر کون کون لوگ ہیں؟ اس نے کہا علاف معتزلی۔ عبداللہ بن ایاض خارجی اور ہشام بن کلبی رافضی
مسکرا کر بولا تو پھر جہنم کے سارے سرغنے جمع ہیں۔

مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ آخر عمر میں اسکی بصارت اور اس کے ساتھ بصیرت بھی جاتی رہی۔ لوگ کہتے تھے کہ سٹھیا گیا ہے۔ ۲۲۷ھ میں مرگیا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں ایسے لوگ ملتے ہیں جنکی عقلیں کبر سنی میں ماری پڑیں۔ بجز محدثین کی جماعت کے حالانکہ سب سے زیادہ طویل عمریں انہیں لوگوں نے پائیں۔ میرے خیال میں یہ اس تقویٰ اور ورع کا اثر تھا جو حدیث کے علم و عمل سے ان میں پیدا ہو جاتا تھا۔

(۶) عبداللہ بن محمد شافعی۔ سلطان نورالدین زنگی شہید نیز سلطان صلاح الدین ایوبی دونوں کے درباروں میں بڑی عزت رکھتے تھے۔ اور چونکہ یہ دونوں شافعی تھے اس وجہ سے امام مذکور انکے عہد میں صاحب فتویٰ اور قاضی القضاۃ تھے۔ متعدد تصانیف چھوڑی ہیں جو شافعیہ میں مقبول ہیں ۵۸۵ھ میں مرے۔

آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ اسوقت ایک رسالہ اس امر کے اثبات میں لکھا کہ اندھا شخص قاضی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سلطان صلاح الدین نے انہیں کے فتوے کے مطابق ان کو انکے منصب پر بحال رہنے دیا۔ لیکن دوسرے لوگوں نے اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کیا ہے اور عام طور پر اہل علم اسی بات کے قائل ہیں کہ نابینا کو قاضی نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہ فریقین نیز گواہوں کی شناخت میں غلطی کر سکتا ہے۔

(۷) شافع بن علی بن عباس بن اسمٰعیل بن عساکر عسقلانی۔ دیار مصریہ کے میر منشی اور علم و ادب میں صاحب کمال تھے۔ صلاح الدین صفدی نے تاریخ اور علوم عربیہ میں انکی تقریباً ۲۰ تصنیفات نام بنام گنائی ہیں۔ ایک دیوان شعر بھی ہے۔

جنگ حمص میں کان کی جڑ میں ایک تیر لگا تھا۔ اسی سے آنکھیں جاتی رہیں۔ اس کے بعد سے خانہ نشین ہو گئے۔ کتابوں کے بڑے شایق تھے۔ ۱۸ الماریاں ان سے بھری ہوئی رکھتے تھے اور اپنے مصاحبین اور شاگردوں سے پڑھوا کر سنا کرتے تھے جب ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ میں لیتے تو بتا دیتے کہ یہ فلاں کتاب ہے جو فلاں زمانہ میں میں نے فلاں شخص سے اس قیمت پر خریدی تھی۔ ۷۳۰ھ میں انتقال کیا۔

(۸) علی بن احمد آمدی۔ یہ بھی بڑے ادیب۔ فاضل اور کتب کے عاشق تھے۔ اور فن تعبیر خواب کے امام۔ جواہر التبصیر فی علم التعبیر انکی مشہور تصنیف ہے کتابوں کی تجارت کرتے تھے اور اپنے کتب خانہ کے ایک ایک نسخہ سے واقف تھے۔ جب ضرورت پڑتی تو خود نکالکر لاتے اگر کسی کتاب کی متعدد جلدیں ہوتیں اور ایک خاص جلد درکار ہوتی تو اسی پر انکا ہاتھ پڑتا تھا۔

ہلاکو خاں کا پڑپوتا سلطان غازان خاں جو سلمان ہو گیا تھا جب بغداد میں مدرسۂ مستنصریہ کو دیکھنے کے لئے آنے والا تھا تو اس کی خوب آرائش کی گئی تھی۔ علماء اپنے اپنے مسندوں پر بیٹھے تھے۔ اعیان واکابر بغداد بھی سلطان کے استقبال کے لئے بلائے گئے تھے جن میں علی آمدی بھی تھے۔

جب سلطان آیا تو اس کے ساتھ کے مغولی امراء سب ان سے مصافحہ کر کر کے گذرتے گئے لیکن یہ کسی کے لئے تعظیماً کھڑے نہیں ہوئے۔ مگر جس وقت سلطان نے ہاتھ ملایا تو بلا تیائے ہوئے سروقد کھڑے ہو گئے اور ترکی۔ فارسی اور عربی زبانوں میں اس کو دعائیں دیں۔ اسکو انکی فراست اور لیاقت پر تعجب ہوا۔ اور یہ معلوم کر کے اور بھی خوش ہوا کہ یہ رومی زبان بھی بے تکلف بولتے ہیں۔ خلعت اور انعام عطا فرمایا اور تین سو درہم ماہانہ گزارہ کے لئے مقرر کر دیا۔ بغداد کے علماء اور رؤسا نیز خود تین مغول سب ان کی عزت کرتے تھے۔ باوجود فراغت کے بھی یہ دن رات اپنے تجارتی

مشاغل میں مصروف رہتے تھے ۔ ۱۲۰ھ میں فوت ہوئے ۔

(۹) یعقوب بن داؤ خلیفہ مہدی کا مشہور وزیر جو وزارت نہیں بلکہ خلافت کرتا تھا ۔ دشمنوں نے مہدی کے کان میں پھونکدیا کہ یہ علویہ کی طرف میلان رکھتا ہے ۔ اُس نے اس کو ایک حسین و جمیل کنیز عطا کی جسکو نہایت خوش ہو کر یہ اپنے گھر لے آیا ۔ دوسرے دن جب دربار میں گیا تو مہدی نے تنہائی میں لیجا کر کہا کہ میرا ایک ضروری کام ہے وہ کردو ۔ اس نے کہا کہ میں تو حضور کا غلام ہوں جو حکم ہوگا بجالاؤں گا ۔ کہا کہ نہیں میرے سر پر ہاتھ رکھکر قسم کھاؤ ۔ اس نے قسم کھائی ۔ فرمایا کہ فلاں علوی کی طرف سے مجھے خطرہ ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسکا خاتمہ کردو ۔ بولا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے ۔ اپنے گھر آکر رات کو اس علوی کو بلایا اور کہا کہ میں تمکو قتل کروں گا ۔ اس نے جواب دیا کہ میں بے بس ہوں اور آپ صاحب اختیار جو چاہیں کر سکتے ہیں ۔ لیکن یہ سوچ لیجئے کہ رسول اللہ کی اولاد کا خون کر کے قیامت میں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دینگے ۔

یعقوب پر اس بات کا اثر ہوا ۔ اس نے کہا اچھا مناسب یہ ہے کہ تم راتوں رات یہاں سے غائب ہوجاؤ ۔ تاکہ خلیفہ کو میں مطمئن کرسکوں ۔ وہ علوی نکل گیا ۔ ادھر کنیز نے فوراً خلیفہ کو پرچہ بھیجکر اس کیفیت سے آگاہ کیا ۔ اُس نے سوار دوڑائے جو علوی کو گرفتار کر لائے اور محل کے ایک حجرہ میں بند کردیا ۔

صبح کو حسب معمول جب وزیر یعقوب وہاں پہنچا تو خلیفہ نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیا کیا کہا حکم کی تعمیل کردی ۔ بولا کہ میرے سر پر ہاتھ رکھکر قسم کھاؤ ۔ اس نے یہ بھی کیا ۔ مہدی نے اشارہ کیا ۔ خدام نے علوی کو سامنے لاکر کھڑا کردیا ۔ یعقوب مبہوت رہ گیا ۔ مہدی نے کہا کہ اب تمہارا خون میرے لئے حلال ہے ۔ لیکن مجھے قتل کی عادت نہیں ہے اس لئے حکم دیتا ہوں کہ تم تہ خانے میں قید کردئے جاؤ ۔

پندرہ سال تک یعقوب ایک تہ خانے میں بند رہا ۔ اس کے بعد ہارون کے عہد میں اس کے

حکم سے آزاد کیا گیا جب دربار میں سلام کے لئے حاضر ہوا تو ہارون نے کہا کہ میں نے اپنے ایک بچہ کو کل گود میں اٹھا لیا تھا اس وقت مجھکو یاد آگیا کہ بچپن میں تم مجھکو اسی طرح گود میں کھلایا کرتے تھے اس لئے میں نے تم کو رہا کیا اب تمہارا گذارہ مقرر کرتا ہوں جہاں چاہو رہو۔ اس نے مکہ مکرمہ میں اقامت اختیار کی۔ وہیں ۳۰۰ھ میں گزر گیا۔

(۱۰) بشار بن برد۔ مادر زاد اندھا۔ عربی کا نامور شاعر۔ ہزاروں قصیدے لکھے۔ جن میں سے اکثر ہجو میں تھے۔ کہا کرتا تھا کہ پہلے میں نے جریر کی ہجو لکھی تھی مگر اس نے کمسن سمجھکر میری طرف توجہ نہ کی ورنہ فرزدق کی جگہ میں لیتا۔

ایک بار مہدی کی تعریف میں قصیدہ کہا۔ اس نے التفات نہ فرمایا اس پر اسکی ہجو کہی وزیر یعقوب بن داؤد نے خلیفہ کو سنایا۔ وہ سخت برہم ہوا۔ چنانچہ جب بصرہ میں آیا تو بشار کو گرفتار کر کے شراب خواری کے الزام میں اسقدر پٹوایا کہ وہ تلف ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۶۸ھ میں ہوا۔

بشار ایک بار گلی سے نکلکر جب سڑک پر پہنچا تو کسی نے کہا کہ ذرا رک جاؤ بڑا اژدہام ہے لوگ ایک جنازہ بڑی تیزی سے لئے جا رہے ہیں۔ بولا کہ کیا کہیں سے چرا کر بھاگے جاتے ہیں؟

اس کے غلام نے ایک بار حساب پیش کیا جس میں دس درہم آئینہ کی جلا کی اجرت بھی درج تھی۔ کہنے لگا کہ عجیب!! اندھا اور آئینہ کی جلا کی اجرت!! واللہ اگر سورج بھی زنگار ہو جائے اور اسکی صیقل کی اجرت دس درہم مجھ سے مانگی جائے تو میں نہیں دونگا۔

(۱۱) ابن علاف مشہور شاعر۔ خلیفہ معتضد کا ندیم تھا۔ اس نے ایک بلی پالی تھی جو ہمسایوں کے کبوتر کھا جاتی تھی۔ ایک دن کسی نے اسے مار کر پھینکدیا۔ اس کا مرثیہ لکھا اور دلچسپ لکھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بلی کا نہیں بلکہ وزیر ابن فرات کا نوحہ ہے جو خلیفہ مقتدر کے حکم سے قید خانہ میں مارا گیا تھا۔ خوف کی وجہ سے اس نے بلی سے تعریض کی اور نام نہ لے سکا۔

(۱۲) ربیعہ بن ثابت۔ اندہا خوشگو شاعر خلیفہ مہدی کا مداح تھا۔
ایکبار عباس کی مدح میں جو خلیفہ سفاح کا بھائی تھا نہایت بلیغ قصیدہ سنایا اس نے صرف دو دینار انعام دیا۔ ربیعہ نے ناراض ہوکر ہجو کہی۔
عباس خلفاء عباسیہ کا بزرگ تھا اور دربار میں اس کی بڑی عزت تھی۔ غضبناک ہوکر ہارون الرشید کے پاس جو اس وقت خلیفہ تھا پہنچا اور ربیعہ کی شکایت کی۔ اس نے فوراً ربیعہ کو بلوایا اور چاہا کہ قتل کر دے۔ ربیعہ نے کہا کہ پہلے قصیدہ تو دیکھ لیا جائے۔ کہا کہ سناؤ۔ جب سنا تو بہت پسند کیا۔ پھر پوچھا کہ اسکا تم کو کیا صلہ ملا۔ اس نے کہا کہ دو دینار۔ یہ سنکر وہ عباس کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ اس کا نہیں بلکہ یہ آپ کا قصور تھا۔ پھر ربیعہ کو تیس ہزار درہم عطا کئے۔ اور کہا کہ خبردار ابکبھی اپنے اشعار میں انکا ذکر نہ تصریحاً کرنا نہ تعریضاً۔
(۱۳) علامہ ابوالبقاء عکبری۔ بچپن میں چیچک نکلی تھی اسی میں آنکھیں جاتی رہیں۔ حافظہ نہایت قوی تھا۔ تحصیل علوم کرکے مختلف فنون میں امام وقت ہوگئے۔ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ فرائض۔ حساب۔ منطق۔ ادب۔ نحو اور لغت میں متعدد کتابیں املا کرائیں جس فن میں کچھ لکھنا ہوتا تھا۔ پہلے اس فن کی کتابیں پڑھوا کر سنتے پھر لکھتے۔ بیشتر انکی بیوی انکو پڑھکر سناتیں۔
دیوان حماسہ اور مقامات حریری کی بھی شرحیں لکھوائی تھیں۔ مگر حماسہ کی شرح میں تبریزی اور مقامات کی شرح میں سریشی ان سے بڑھ گئے۔ لیکن دیوان متنبی کو جو شرح کی تھی اس میں کوئی ان سے فوقیت نہ پاسکا۔ چنانچہ وہی آجتک متداول اور مقبول ہے۔
سنہ ۶۱۶ھ میں وفات پائی۔
(۱۴) عبدالرحمن سہیلی اندلسی متوفی سنہ ۵۸۱ھ سیرۃ ابن ہشام کی مشہور شرح۔ روض الانف کے مصنف۔ سیرت اور عربیت میں امام وقت تھے۔ تفسیر۔ ادب اور تاریخ میں کئی تصنیفیں چھوڑی ہیں۔

روض الانف میں سو اسو کتابوں سے زیادہ سے مدد لی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بڑی معلومات فراہم کی ہیں۔ ۱۷ سال کی عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔

جب انکے کمال کا شہرہ ہوا تو مراقش میں قضا کے عہدہ پر بلوائے گئے۔ وہاں عزت کے ساتھ زندگی گزاری۔

(۱۵) علوک شاعر متوفی ۲۱۳ھ۔ پیدائشی اندھا اور مبروص تھا۔ امیر ابو دلف کی شان میں ایک قصیدہ کہا جو اپنی خوبی کی وجہ سے بغداد میں بہت مقبول ہوا۔ مامون کا عہد تھا اس کا استبداد یہ گوارا نہ کر سکا کہ اس کے ایک خادم کی ایسی بلند رتبہ مدح کیجائے۔ علوک گرفتار کرایا۔ اور اس الزام پر کہ اس نے اپنے قصیدہ میں بعض ان صفتوں کو جو خالق کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً زمانہ پر اختیار اور حکومت ایک مخلوق کی طرف منسوب کیا ہے۔ حکم دیا کہ زبان گدی سے کھنیچ لی جائے۔ اسی میں مر گیا۔

بعضوں نے کہا ہے کہ اگر یہی قصیدہ اس نے خود مامون کی ستائش میں لکھا ہوتا تو کوئی سزا نہ پاتا بلکہ صلہ ملتا۔

(۱۶) موئل کوفی متوفی ۱۹۰ھ۔ جوانی میں نابینا ہو گیا طبیعت رسا رکھتا تھا۔ شعر گوئی شروع کی۔ ایکبار خلیفہ ابو جعفر منصور کے ولی عہد مہدی کی مدح میں قصیدہ کہکر سنایا۔ اس نے بیس ہزار درہم انعام عطا کیا۔ منصور نے جب سنا تو کہا کہ اس قدر فضول خرچی! فوراً پکڑ کر اس سے وہ رقم واپس لیلی اور کہا کہ اس بھولے لڑکے کو تو نے جا کر دھوکا دیا وہ تیرے دام فریب میں آ گیا۔

لیکن جب وہ قصیدہ سنا تو پسند کیا اور باوجود اپنی جزرسی کے حکم دیا کہ ربع اس کو چار ہزار درہم دیدو۔ بقیہ بیت المال میں جمع کر دو

جب مہدی کا دور خلافت آیا تو موئل نے یہ سارا واقعہ لکھوا کر بھیجا وہ بہت ہنسا اور اسکو رقم واپس دلا دی۔

(۱۷) ابو العیناء مشہور ادیب اور مورخ۔ نہایت ظریف الطبع خلیفہ متوکل کا ندیم تھا۔ اس کے بے شمار لطائف کتب محاضرات میں منقول ہیں لیکن اکثر فحش ہیں اس وجہ سے ترک کرنے پڑے۔ بقیہ میں سے بڑا حصہ اس زمانہ کے امراء اور اعیان کی ذات سے متعلق ہے جنکو ناظرین کو سمجھانے کے لئے اس عہد کے ہنگامی حالات اور امراء کے باہمی تعلقات پر اسقدر حاشیہ لکھنا پڑتا کہ یہ مختصر مضمون انکا متحمل نہ ہو سکتا۔ لہذا صرف چند نوادر پر اکتفا کرنا پڑا۔

ایکبار کسی رئیس نے اس سے وعدہ کیا کہ میں سواری کیلئے ایک خچر تم کو دونگا۔ کئی روز گزر گئے لیکن خچر نہ آیا۔ ایکدن راستہ میں ملاقات ہوگئی۔ اس رئیس نے سلام کیا اور خیریت پوچھی۔ جواب دیا کہ خیریت ہی مگر بغیر خچر کے۔ وہ ہنسا اور گھر پہنچکر فوراً بھیجدیا۔

امیر صاعد اسلام لانیکے بعد وزیر مقرر ہوا۔ ابو العیناء اس سے ملنے گیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی نماز میں مصروف ہی۔ تھوڑی دیر انتظار کیا پھر پوچھا۔ حاجب نے کہا کہ ابھی فارغ نہیں ہوئے۔ کہا ہاں کل جدید لذیذ۔ نیا نیا مسلمان ہوا ہے نماز کی لذت لے رہا ہی۔

ابو محمد ادیب سے چشمک تھی۔ ایک دن اس کے دروازہ پر سے گذرا۔ سرسری طور پر اسکا حال بھی پوچھ لیا۔ لوگوں نے کہا کہ آپکے حسب منشا ہے۔ بولا کہ تو پھر میں رونے اور پیٹنے کی آواز کیوں نہیں سنتا۔

نجاح بن سلمہ وزیر مال کو غبن کے جرم میں خلیفہ نے موسیٰ بن عبدالملک کے حوالہ کیا کہ اس سے رقم مطلوبہ وصول کرے۔ موسیٰ نے اسقدر سخت شکنجہ میں کھینچا کہ نجاح ہلاک ہوگیا۔ ابو العیناء سے کسی نے نجاح کا حال پوچھا تو کہا "فوکزہ موسیٰ فقضیٰ علیہ"۔

دوسرے دن موسیٰ نے اس سے تہدید آمیز لہجہ میں کہا کہ میرے بارے میں اگر کچھ کہو گے تو سیدھا کر دوں گا۔ ابو العیناء نے جواب دیا "اتُرِیدُ اَن تقتلنی کما قتلت نفساً بالامس"

علی بن جہم معتزلی نے ایک دن مجلس بحث و مناظرہ میں اس کو مخنث کہدیا۔ اس نے یہ آیت پڑھی وضرب لنا مثلاً ونسی خلقہ

متوکل کے دربار میں ایکدن امیر سعید بن عبدالملک ابوالعینا۔ کی طرف دیکھکر کسی بات پر مسکرایا۔ خلیفہ نے کہا کہ ابوالعینا۔ یہ کیا بات ہے کہ لوگ تمکو دیکھکر ہنستے ہیں فوراً کہا "ان الذین اجرموا کانوا من الذین آمنوا یضحکون"۔

ابن مکرم وزیر کے یہاں دعوت تھی۔ تین بار ابوالعینا۔ کو پانی ٹھنڈا ملا۔ چوتھی بار گرم ملا۔ کہا شاید تمہاری صراحی کو چوتھیا کا بخار آیا کرتا ہے۔

ایک بار ایک گلی سے گذرا۔ غلام نے کہا کہ ایک بکری کا بچہ بڑا فربہ ہے۔ کہا دیکھو گلی میں کوئی ہے تو نہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ حکم دیا کہ پکڑ لو۔ پھر چادر میں لپیٹ کر بغل میں دبالیا۔ اور گھر لاکر ذبح کرکے کھاگیا۔

دوسرے دن اس محلہ کے رئیس کا ایک رقعہ پہنچا کہ کل سے ہمارا بزغالہ غائب ہے۔ یہاں کے بچے کہتے ہیں کہ آپ پکڑ کر لے گئے۔ لہذا حامل عریضہ کے ہاتھ واپس بھیجئے۔ جواب لکھوایا کہ میرے محلہ کے بڑے بوڑھے آپ کے حق میں کہا کرتے ہیں کہ ابون ہے اور کذاب۔ مگر میں نے ہمیشہ انکی تکذیب کی تعجب ہے کہ ایک حقیر جانور کے متعلق آپ میرے بارے میں اپنی گلی کے بچوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ خفیف ہو کر چپکا بیٹھ رہا۔

ایک دن متوکل کے دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھا کسی نے اس کے آگے سے شوربہ کا پیالہ اٹھاکر سرکہ کی پیالی رکھدی۔ جب لقمہ کھایا تو ترشی کی وجہ سے چہرہ ایسا بگاڑا جس کو دیکھکر سب لوگ ہنس پڑے۔ کہنے لگا کہ امیرالمومنین میں معذور ہوں۔ معاذاللہ غضب کی ترشی ہے کہ قلب سے ایمان کی حلاوت تک مٹ گئی۔

باپ کی طرف التفات کم کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ دیکھو اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر کے ساتھ والدین کا شکر بھی انسان پر فرض کیا ہے اور فرمایا ہے "ان اشکرلی ولوالدیک"

کہا کہ بے شک - مگر اولاد کے حق میں والدین کی امانت پر اعتماد نہیں کیا اس لئے فرمایا
"لا تقتلوا اولادکم الایہ" بخلاف اس کے اولاد پر والدین کے بارے میں پورا اطمینان
تھا اس وجہ سے انکو اس قسم کا حکم دینے کی ضرورت نہ سمجھی -

ابن طوق ایک متکبر مگر نہایت کم عقل رئیس تھا - کسی نے ابو الضیاء سے اس کی
بابت پوچھا - کہا کہ اگر بنی اسرائیل میں یہ اسوقت ہوتا جب انکو گائے ذبح کرنے کا
حکم دیا گیا تو یقیناً وہ اسی کو ذبح کرتے -
۲۸۲ھ میں بغداد میں مرا -

(۱۸) ابو العلاء معری - ذہن وذکا اور حافظہ میں اعجوبۂ روزگار تھا - اور شعر وادب اور
عربیت میں یگانۂ دہر - شعرا میں متنبی کا بہت قائل تھا - اور اسکو بشار - ابو نواس
بلکہ ابو تمام پر بھی ترجیح دیتا تھا - شریف مرتضیٰ اس کے برخلاف متنبی کو ناپسند کرتے
تھے - یہ ان کی محفل میں جایا کرتا تھا - ایک دن اسکے سامنے انہوں نے متنبی کے
کلام کے عیوب چن چنکر بیان کرنے شروع کئے - ابو العلاء نے کہا کہ اگر اس نے بجز
اس قصیدہ کے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے -

لک یا منازل فی القلوب منازل

اور کچھ نہ کہا ہوتا تو یہی اسکی فضیلت کے لئے کافی ہوتا - شریف مرتضیٰ نے غضبناک
ہو کر اسی وقت اس کو مجلس سے نکلوا دیا - پھر لوگوں سے بولے کہ اندھے کا مطلب
بھی تم سمجھے - متنبی کے اس قصیدہ میں ایک شعر یہ ہے ؎

فاذا اتتک مذمتی من ناقص　　　فھی الشھادۃ لی بانی کامل

جب کوئی ناقص آدمی میری مذمت کرے تو یہی میرے کامل ہونے کا ثبوت ہے -
اس کا اشارہ اسی کی طرف تھا -

ابو العلاء نے آغاز جوانی میں طرابلس شام میں تحصیل علم کی - پھر لاذقیہ میں آیا - وہاں ایک

راہب کی صحبت میں جو فلسفیانہ خیالات سے آشنا تھا کچھ دن گزارے جس کے اثر سے عقائد اسلامیہ میں اس کو شکوک پڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام سے جابجا الحاد ٹپکتا ہے چنانچہ بہت سے لوگ ہیں جو اسے زندیق سمجھتے ہیں۔ اور کم ہیں جو اس کے الحاد میں شک کرتے ہیں۔ اور یہ مسئلہ ایک مابہ النزاع مسئلہ ہوگیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اسکے مذہب کے متعلق ایک فیصلہ کن بحث لکھدوں لیکن مجھے اس کی دینی منزلت اس قابل نہ معلوم ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے الحاد میں بحث کی گنجایش بھی کم ہے [۱]

وہ اپنے اشعار میں اسلامی عقائد یا فقہی مسائل پر جو اعتراض کرتا ہے وہ نہایت سفیہانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً۔

یدٌ بخمس مئین عسجد و دیت ۔۔۔ ما بالها قطعت فی نصف دینار

یعنی وہ ہاتھ جس کی دیت پانچ سو دینار زر سرخ ہے محض نصف دینار کی چوری میں کیوں کاٹ لیا جاتا ہے۔ یاقوت رومی نے لکھا ہے کہ یہ شخص فقاہت سے کسقدر نابلد ہے کہ اتنا نہیں سمجھتا کہ اگر ہاتھ پانسو دینار سے کم پر نہ قطع کیا جائے تو سرقہ کی وارداتیں بڑھ جائیں اور دیت اگر نصف دینار ہو تو لوگ کثرت سے اپنے دشمنوں کا ہاتھ کاٹ لیا کریں۔

حال میں جامعہ مصریہ کے استاد ڈاکٹر طہٰ حسین نے جو وہاں جمعیۃ الحاد و زندقہ کے روح رواں ہیں اسکو بطل الحاد قرار دیکر اس کے کارناموں کو چمکانے اور فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اسکے ایک رفیق کار حسن گیلانی نے اس کے رسالۃ غفران

---

[۱] ناصر خسرو علوی مشہور سیاح اس کے زمانہ میں معرۃ النعمان میں گیا تھا۔ اس کے بیان سے بھی جو اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ راہبانہ اور فلسفیانہ زندگی گذارتا تھا۔

کو جو شیخ ابن القارح کے جواب میں ہے اور جس میں جنت اور دوزخ کا مذاق اُڑایا گیا ہے نہایت آب و تاب سے شائع کیا ہے اور اس کے علاوہ مضامین کی مدح سرائی کرتے ہوئے نعوذ باللہ اس کو قرآن کے ہمسر بنایا جا رہا ہے۔ علماء نے برافروختہ ہو کر عدالت میں چارہ جوئی کر دی ہے۔ اور مقدمہ چل رہا ہے۔

معری نے سنہ ۴۴۹ھ میں وفات پائی۔ تین سال کی عمر میں چیچک میں آنکھیں ضائع ہوئی تھیں۔ کہا کرتا تھا کہ مجھکو سوائے سُرخ رنگ کے اور کوئی رنگ یاد نہیں ہے کیونکہ بیماری کے زمانہ میں اسی رنگ کا کپڑا میرے بدن پر ڈالا جاتا تھا۔

ہندوستان کی زراعتی کمزوریاں

(۲)

ہندوستان کا مقروض کاشتکار

ہندوستان کی زراعتی کمزوریوں کے عنوان سے ہم نے جو سلسلہ مضامین شروع کیا تھا اس کے پہلے نمبر میں ہم ہندوستانی زراعت کے اہم ترین عامل پیدائش یعنی "زمین" کی حالت پر غور کر چکے ہیں۔ آج کے اس عنوان میں ایک دوسرے عامل پیدائش یعنی 'اصل' کے لحاظ سے ہندوستانی کاشتکار کی جو حالت ہے اسکا ذکر ہوگا۔

ہندوستانی کاشتکار کا افلاس اور اسکے اصل کی کمی ضرب المثل ہے۔ اس کے اصل کی کمی کا اندازہ کرنیکے لئے بہت سے اعداد و شمار پیش کرنیکی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کی ظاہری حالت ہی پر اگر ہم ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو اسکا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ آبپاشی کے لئے کنواں کھودنا۔ ضروری آلات کار مثلاً ہل، کھرپا، کدالی، پھاوڑا وغیرہ مہیا کرنا، مویشی اور انکے چارے کا انتظام اور کھاد کی فراہمی یہی وہ مدات ہیں جن میں ہندوستانی کاشتکار عموماً اپنا اصل صرف کرتا ہے۔ جن صوبوں میں نہروں کی قلت ہے وہاں زیادہ تر کنوؤں سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے، اور نسبتاً ہندوستانی کاشتکار اس مد پر بہت زیادہ اصل صرف کرتا ہے۔ اس کے آلات کار مثلاً ہل، کدالی، کھرپا، وغیرہ بہت ہی معمولی قسم کے اور کم قیمت کے ہوتے ہیں۔ خراب ہونیکی صورت میں انکی مرمت بھی بآسانی کیجا سکتی ہے۔ چونکہ ابھی مشینوں سے زراعت میں بہت کم کام لیا جاتا ہے۔ اس لئے کاشتکار کو مویشیوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے ساتھ ہی ساتھ انکے چارے کا انتظام بھی ضروری ہے خود کاشتکار کے لئے اچھی غذا کی جتنی ضرورت ہے اتنی ہی اسکی زمین کے لئے اچھے کھاد کی مناسب مقدار کی ضرورت ہوتی ہے

کیونکہ بلاکھاد کے زمین کی پیداآوری برقرار نہیں رہ سکتی۔ لیکن جب غریب کاشت کار کو خود ہی فاقہ کشی کرنا پڑے تو وہ ان مدات میں گو وہ لاکھ ضروری سہی کہاں سے اور کس طرح خرچ کر سکتا ہے۔ پھر بھی چونکہ اس کی گذر اسی پر ہے وہ کسی نہ کسی طرح ان مدات پر تھوڑا بہت خرچ کر ہی لیتا ہے۔ البتہ اپنے ذاتی اصل کی عدم موجودگی میں اسے ساہوکار کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے اور وہ قرض پر اپنا کام چلاتا ہے۔

دنیا کی زرعی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کاشتکار کے لئے قرض لینے کی ضرورت ہمیشہ سے رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ خاصکر ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کاشتکار کی زندگی کا دارومدار بارش پر ہو اور جہاں آبادی نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہو اور زمین کی پیداآوری اس نسبت سے کم ہو رہی ہو کاشتکار کے لئے قرض لینا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی کاشتکار کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرض کی ایک مقدار ورثے میں پاتا ہے۔ اپنی حین حیات میں اس میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے اور مرنے پر خود جتنا قرض ورثے میں پایا تھا اس سے کہیں زیادہ اپنے وارثوں کو سونپ جاتا ہے ہندوستانی کاشتکار کے قرضہ کے متعلق قابل اعتماد اعداد و شمار ابھی مہیا نہیں ہوئے ہیں پھر بھی اس کی قرض گیری کا اندازہ لگانیکے لئے ذیل کی تفصیل کافی ہوگی۔

۱۸۷۵ء کے قحط کمیشن نے دکن کے ۱۲ گاؤں کی تحقیقات سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ کاشتکاروں کی کل تعداد کا ⅓ حصہ بہت زیادہ مقروض تھا۔ انکے قرض کی مقدار انکی سالانہ مالگذاری کی مقدار سے ۱۸ گنی تھی۔ اور اس قرض کا ⅖ حصہ انہوں نے جائدادیں رہن رکھ کر حاصل کیا تھا۔

احمدنگر کے ضلع کے ۱۰ گاؤں میں ۴۲ فیصدی کاشتکاروں کے قرض کی مقدار ان کی سالانہ مالگذاری سے ۱۵ گنی تھی۔ اور بعض بدبختوں کا تو یہ حال تھا کہ انکا قرض سالانہ مالگذاری سے ۵۴ گنا تھا۔ زمین کا ⅛ حصہ ساہوکاروں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ اور باقی حصے میں بھی بہت بڑا حصہ ایسا تھا جس پر سے اگر ساہوکار چاہتے تو کاشتکاروں کو قانوناً

علیحدہ کر سکتے تھے سلہ

سر فریڈرک نکلسن نے صوبہ مدراس کے کسانوں کے مجموعی قرض کا اندازہ ۴۵ کروڑ کیا تھا اور کہا تھا کہ "اگر اس قرض پر ۱۲ فیصدی قرض شمار کیا جائے - جو بلا شبہ زیادہ نہیں ہے کیونکہ اکثر عدالتی کارروائیوں سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ کسان اس سے کہیں زیادہ شرح سود ادا کرتے ہیں - تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ صوبہ مدراس کے کسان سالانہ ۶ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ صرف سود کی ادائیگی میں صرف کرتے ہیں ۔ اگر یہی شرح سود ۱۸ فیصدی شمار کیجائے تو یہ رقم ۸ کروڑ تک پہنچتی ہے ۔ اس میں اگر رجسٹری اور اسی قسم کی دیگر عدالتی کارروائیوں کے اخراجات کا اضافہ کیا جائے تو یہ رقم بآسانی ۱۰ کروڑ یا کم از کم ۹ کروڑ تک پہنچتی ہے ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر صوبہ مدراس کے زرعی پیداوار کا سالانہ تخمینہ ۹۰ کروڑ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ہر سال زرعی پیداوار کا ۱۵ فیصدی سود کی نذر ہوتا ہے سلہ

صوبہ بمبئی میں ۱۹۰۱ء میں جو قحط کمیشن مقرر ہوا تھا اس کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ کاشت کاروں کا ۱/۴ حصہ اپنی ملک کا قبضہ کھو چکا تھا اور ایسے خوش قسمت جو قرض کی لعنت سے پاک ہوں کل تعداد کے ۱/۵ سے بھی کم تھے اور باقی کم و بیش مقروض تھے سلہ

صوبہ پنجاب کا بھی یہی حال ہے ۔ کاشتکاروں کے مجموعی قرض کی مقدار ۹۰ کروڑ روپے ہے جو سالانہ مالگذاری سے ۹ گنی زیادہ ہے ۔ صوبہ کے مالکان آراضی میں سے صرف ۱۷ فیصدی مقروض نہیں ہیں ۔ صوبہ کے مجموعی قرض سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر کاشت رقبے کے

سلہ تقریر سر ٹی ہوپ ۔ گورنر جنرل کی کونسل میں بروز ۱۷ جولائی ۱۸۹۷ء منقول از S. C. Ray's Agricultural Indebtedness in India.

سلہ ملاحظہ ہو رپورٹ بابت Possibility of Introducing Land & Agricultural Banks into the Madras Pr. صفحہ ۱۸ - ۲۰

سلہ ملاحظہ ہو رپورٹ قحط کمیشن ۱۹۰۱ء دفعہ ۳۳۴

ہر ایک شخص پیچھے ۳۱ روپیہ قرض ہے۔ اور جن لوگوں کی گذر صرف زراعت پر ہوتی ہے ان پر فی کس ۷۰ روپیہ قرض ہے۔ اس قرض کا سالانہ سود ۱۳ کروڑ روپیہ ہے جو صوبے کی سالانہ مالگذاری سے تگنا ہے۔ (۱)

ان اعداد و شمار کو مدنظر رکھکر مختلف اوقات میں لوگوں نے ہندوستان کے زرعی قرضے کا تخمینہ کیا ہے۔ ۱۸۹۵ء میں سر فریڈرک نکلسن نے صوبہ مدراس کے قرض کا تخمینہ ۴۵ کرور لگایا تھا اور اسی کی بنیاد پر سر ایڈورڈ میکلیگن نے ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کے مجموعی قرض کا تخمینہ ۳۰۰ کرور لگایا تھا۔ (۲) سر اینڈریو فریزر کا تخمینہ ۵۰۰ کرور تھا (۳) اور ایم ایل۔ ڈارلنگ نے اپنی کتاب **The Punjab Peasant in Prosperity and Debt.** میں بھی تخمینہ ۶۰۰ کرور کیا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے ثابت ہوا کہ ہندوستانی کاشتکار بہت زیادہ مقروض ہے اور اسکے قرض کا بار برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ اصل کی ادائگی تو ایک طرف وہ سود ہی کی ادائگی سے خستہ حال ہو رہا ہے۔ آخر اسکی کیا وجہ ہے؟ دوسرے ممالک کے کاشتکار بھی قرض لیتے ہیں اور انہیں بھی بلا سود کے قرض نہیں ملتا لیکن باوجود اس کے انکی حالت دن بدن بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک بڑا فرق جو ان دو کاشتکاروں کی پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے وہ یہی ہے کہ غیر ممالک کے کاشتکاروں کے قرض کا بڑا حصہ دولت آفرین کاموں میں

---

(۱) ملاحظہ ہو M. L. Darling: The Punjab Peasant in Prosperity and Debt. P. 20

(۲) ملاحظہ ہو " " " P. 18

(۳) ملاحظہ ہو Sir Andrew Fraser: Among Indian Rajas and Rayats. Page 203.

بطور اصل کے صرف ہوتا ہے بخلاف اس کے ہندوستانی کاشتکار کے قرض کا کثیر حصہ ایسے کاموں میں صرف ہوتا ہے جسے اصلاح زراعت یا اضافہ پیدا آوری زمین سے کوئی تعلق نہیں وہ وقتی ضروریات کی نذر ہو جاتا ہے۔

ہندوستانی کاشتکار کی قرضگیری کی اس قدر تفصیل کے بعد ہم مختصراً ان اسباب کا ذکر کرینگے جن کی وجہ سے وہ قرض لینے پر مجبور رہے۔ یہ اسباب ایسے ہیں جو نہ صرف اسے قرض لینے پر مجبور کرتے ہیں بلکہ اگر ان پر غور کیا جائے تو انہی میں اس کے قرض کے روزافزوں اضافی کے اسباب کا بھی پتہ چل جائیگا۔ کیونکہ انہی کی وجہ سے وہ ایکمرتبہ جو قرض لے لیتا ہے اس کی ادائگی سے بھی معذور رہتا ہے اور اپنا کاروبار کسی نہ کسی طرح جاری رکھنے کے لئے اسے سوائے اسکے چارہ کار نہیں رہتا کہ مزید قرض لیتا رہے۔

۱۔ افلاس | سب سے پہلے جس چیز پر ہماری نظر پڑتی ہے وہ ہندوستانی کاشتکار کا ناگفتہ بہ افلاس ہے اس کے افلاس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے اسکی تفصیل حسب ذیل لکھی ہے (۱)

مویشی	۱۲۵	روپے	
آلات کار	۲۰	"	(مثلاً ہل وغیرہ)
مکان	۵۰	"	
دیگر اشیاء	۲۰	"	
میزان کل	۲۱۵	"	

اصل کی اس حیرتناک قلت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محنتی اور جفاکش کاشتکار کو بھی مجبوراً قرض لینا پڑتا ہے اور ایک مرتبہ قرض لینے کے یہ معنی ہیں کہ وہ ہمیشہ مقروض رہے کیونکہ اس کی محدود

---

(۱) ملاحظہ ہو S. C. Ray's Agricultural Indebtedness of India. صفحہ ۳

آمدنی سے اعلیٰ شرح سود ادا کرنا اور پھر اصل قرض کے بارے بھی سبکدوش ہونا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

۲۔ فصل کی خرابی | ہندوستان کے جن صوبوں میں نہروں کے ذریعے آبپاشی کا معقول انتظام نہیں ہے وہاں زراعت کا دارومدار زیادہ تر بارش پر ہوتا ہے اور بارش کا ہونا نہ ہونا ایک اتفاقی امر ہے جس میں کاشتکار کی مرضی کو ذرا بھی دخل نہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اوسطاً ہر تین سال میں ایک سال تو خشک سالی کا ہوتا ہے اور بقیہ دو میں سے ایک میں فصل اچھی ہوتی ہے اور ایک میں معمولی۔ بارش کی کمی بیشی نیز وقت سے قبل یا وقت کے بعد ہونیکا اثر فصل پڑتا ہے اور ہمارے کاشتکار کے پاس چونکہ اندوختہ شاذونادر ہی ہوا کرتا ہے اس لئے خرابیٔ فصل کے لازمی معنی قرضگیری ہوتے ہیں۔

۳۔ ناعاقبت اندیشی | ہندوستانی کاشتکار کی ناعاقبت اندیشی کی مثال مشکل ہی سے کہیں اور ملے گی۔ شادی بیاہ اور ماتمی رسوم کے مواقع پر وہ جو رقوم خرچ کرتا ہے انہیں اس کی آمدنی یا معیار زندگی سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ ان مواقع پر اپنی حیثیت سے کہیں زائد خرچ کرنا اس کے لئے ضروری سا ہو گیا ہے ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ اس نے اپنی پانچ سال کی مجموعی آمدنی ایک شادی پر صرف کی ہے۔ یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ جو کاشتکار اپنی ضروریات کو گھٹاتے گھٹاتے اس درجہ پر لے آیا ہے کہ خشک ٹکڑا اور موٹے جھوٹے کپڑے پر بسر کر لیتا ہے آخر شادی بیاہ میں اس قدر اسراف کیوں کرتا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عرصہ تک ایک ہی طرز کی زندگی بسر کرنے سے اسکی طبیعت اکتا جاتی ہے اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ زندگی بھر میں کم از کم ایک مرتبہ خوب دل کھول کر خرچ کرے لیکن یہ خیال زیادہ صحیح نہیں ہے۔ اسکی اصل وجہ معلوم کرنا ہو تو ہمیں ہندوستانی کاشتکار کی اجتماعی زندگی پر غور کرنا چاہئے۔ ہندوستان میں صدیوں سے مشترکہ خاندان کا رواج چلا آرہا تھا اور اسی وجہ سے فرد کو ہمیشہ خاندان کے ایک رکن کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ شادی بیاہ اور اسی قسم کی دیگر مراسم میں خرچ کا جو معیار قائم ہوا وہ ظاہر ہے کہ مشترکہ خاندان کا معیار تھا۔

اب بدقسمتی سے شترکہ خاندان تو باقی نہیں رہا لیکن اس زمانے میں اجتماعی مواقع پر خرچ کا جو معیار قائم ہو چکا تھا وہ بطور روایت کے ابتک برابر چلا آرہا ہے۔ معاشی حالات نے کاشتکار کو اس درجہ پر مجبور کر دیا ہے کہ جہاں صرف اس کی ذات واحد کا تعلق ہے وہ فاقہ کشی تک گوارا کر سکتا ہے لیکن جہاں پوری جماعت کا تعلق آتا ہے وہ اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھنا ازحد ضروری سمجھتا ہے اور چاروناچار قرض لیتا ہے۔ اور یہ خصوصیت صرف کسانوں ہی تک محدود نہیں بلکہ ہندوستان کے کسی طبقے کی حالت پر بھی غور کرنے سے یہی نتیجہ مرتب ہوگا۔ آمدنی خواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو جائے خود فاقہ کر لیں گے لیکن رسوم کی پابندی میں فرق ناممکن ہے۔ نسبتاً ہندوستانی کاشتکار اس مد میں جو فضول خرچی کرتا ہے اس پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور یہی اس کی تباہی کا سب سے بڑا سبب بتایا جاتا ہے۔ اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ یکمشت اتنا روپیہ کسی اور کام میں صرف نہیں کرتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اخراجات کتنے ہی کثیر کیوں نہ ہوں پھر بھی اتفاقی ہیں۔ اس کی تباہی کا اصل سبب تو وہ دائمی اخراجات ہیں جو خوراک، مویشی، بیج اور ادائگی مالگذاری جیسی مستقل مدات کی صورت میں اسے پیش آتے ہیں جو اپنی خستہ حالی کی وجہ سے وہ بلا قرض لئے پورے نہیں کر سکتا۔

۴۔ اضافۂ آبادی اور زمین کی تقسیم در تقسیم | گذشتہ مضمون میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان کی آبادی کے اضافے کا سارا بار زراعت پر پڑ رہا ہے دوسرے پیشوں کی عدم موجودگی میں لوگ مجبوراً زراعت کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ قوانین وراثت کے ماتحت زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی ہے جس کا اثر پیداآوری پر بہت برا پڑ رہا ہے۔ اس سے قبل سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی صنعت کا ہندوستان میں عام رواج تھا جس کی وجہ سے قحط سالی کے زمانے میں کاشتکار کو تھوڑی بہت مدد مل جاتی تھی لیکن اب چونکہ وہ ذریعہ بھی مفقود ہو گیا ہے کاشتکار کو سوائے قرض لینے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا۔

۵۔ گرانی اجناس | گرانی اجناس کا اثر بظاہر کاشتکار کے حق میں مفید ہونا چاہئے کیونکہ اس تصور

میں اسکی پیداوار کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اور آمدنی بڑھتی ہے۔ دنیا کے ہر متمدن ملک میں یہی ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستانی کسان ہر حیثیت میں دنیا سے نرالا ہے۔ وہ اپنے محدود ذرائع پیدائش کی وجہ سے جو کچھ پیدا کرتا ہے وہ اس کے ذاتی خرچ کے لئے بمشکل کافی ہوتا ہے یہاں کاشتکاروں کے بڑے حصے کو اپنی پیداوار بیچنے کی نوبت ہی نہیں آتی اور اگر آتی بھی ہے تو وہ اپنی بے بسی کی وجہ سے اسے بہت سستے داموں پر فروخت کرتا ہے۔ بخلاف اس کے جب اسے خود خریدنے کی ضرورت ہوتی ہے تو بہت زیادہ دام دینے پڑتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ گرانی اجناس سے اس پر دوطرفہ مار پڑتی ہے اور اسکی مجبوریوں میں اضافے کا باعث نکر وہ ساہوکار کا شکار رہتا ہے۔

۶۔ خاندانی قرض | ہندوستانی کاشتکار کی بدقسمتی کا یہیں پر خاتمہ نہیں ہوتا کہ ناساعد حالات کی بناپر بوجہ مجبوری اسے قرض لینا پڑتا ہے بلکہ وہ غریب تو قرض کی ایک کثیر مقدار ورثہ ہی میں پاتا ہے اور اگر اپنی قابلیت وحسن انتظام سے آمدنی وخرچ کی مدات کو کسی طرح مساوی بنا بھی سکا تو خاندانی قرض کے سود کی ادائگی اسے دم لینے نہیں دیتی۔ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے اپنی رپورٹ میں صاف الفاظ میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ "کاشتکاروں کے مقروض ہونیکی اصل وجہ انکا وہ قرض ہے جو ورثتاً انکے حصے میں آتا ہے" (۱)

۷۔ قرضگیری کی آسانیاں | علاوہ اسباب مندرجہ بالا کے ملک کے سیاسی اور معاشی حالات میں جو تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ اور جنکی وجہ سے کاشتکار کو قرض لینے میں دن بدن آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں انکا بھی اسکی قرضگیری میں بہت بڑا حصہ ہے انمیں سے ہم صرف دو پر غور کرینگے جو بہت زیادہ اہم ہیں۔

(الف) زمین کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ۔

(ب) قرض دہندہ کو قرض کی وصولیابی میں قانونی آسانیاں اور انکی وجہ سے قرض دینے

---

(۱) ملاحظہ ہو S.C. Ray: Agricultural Indebtedness of India, Page 5.

پر اسکی غیر معمولی آمادگی۔

(الف) ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد سے زمین کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔ اس اضافے کے مختلف اسباب ہیں اس سے قبل ہر گاؤں اپنی ضروریات آپ پوری کیا کرتا تھا۔ اور زمین کی خرید و فروخت بہت کم ہوا کرتی تھی۔ اپنی ضروریات پوری کرنیکے بعد کسان کے پاس غلہ بچ رہتا تو اس کی اتنی زیادہ طلب نہ ہوتی تھی جتنی کہ آج کل ہے۔ ریلوں کے انتظام سے ذرائع آمد و رفت و باربرداری میں جو آسانیاں پیدا ہوئی ہیں وہی غلہ کی اس اضافہ طلب کا اصل باعث ہیں۔

غلہ کی طلب و اضافے سے اسکی قیمت میں اضافہ اور اس اضافے کا اثر زمین کی قیمت پر اسکا لازمی نتیجہ تھا۔ اب بجائے اس کے کہ زمیندار کسان کو تلاش کرتا پھرے کسان کو زمیندار کی تلاش رہتی ہے علاوہ اس کے ملک میں اندرونی امن و امان کی وجہ سے آبادی میں بھی غیر معمولی اضافہ ہونے لگا۔ اور جیسا کہ ہم گذشتہ مضمون میں دیکھ چکے ہیں زمین کی تقسیم در تقسیم ہوتے ہوتے نوبت یہانتک پہنچی کہ اکثر کسانوں کے پاس اتنی زمین بھی نہ رہی جس پر انکی اور انکے اہل و عیال کی آسانی سے گذر ہو سکے۔ لیکن چونکہ زراعت کے علاوہ کوئی اور پیشہ بھی نہیں ہے جس کی طرف کسان رجوع کر سکے مجبوراً وہ بہت زیادہ قیمت دیکر زمین خریدنا چاہتا ہے۔ زمین کی قیمت میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد جو غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اسکا اندازہ اعداد ذیل سے ہوگا۔

ابتداءً صوبۂ پنجاب میں زمین کی قیمت صرف ۶ر فی ایکڑ تھی ۱۸۶۹ء میں یہی قیمت دس روپے فی ایکڑ ہوگئی ۱۸۸۰ء میں ۲۰ ۱۸۹۵ء میں ۳۰ اور ۱۹۰۰ء میں ۷۷ روپے ہوگئی ۱۹۱۰ء میں یہی اوسط ۱۲۲ روپیہ فی ایکڑ تھا اور ۱۹۱۶ء میں اس میں اور اضافہ ہوکر ۱۲۷ روپے ہوگیا۔

زمین کی قیمت کے اس اضافے کا یہ اثر ہوا کہ ساہوکار کسانوں کو اسی مقدار زمین کی ضمانت پر زیادہ قرض دینے لگے۔ زمین کی قیمت دیکھکر کسان کی بھی ہمت بڑھی۔ وہ بلا تکلف بڑی بڑی رقمیں قرض لینے لگا۔ اور بجائے اصلاح زراعت یا دولت آفریں کاموں میں اسے صرف کرنے کے اپنی وقتی ضروریات میں اڑانے لگا۔ ہندوستانی کسان کے اخراجات کی ایک بڑی مداس کی لامتناہی عدالتی کارروائیاں ہیں۔ آئے دن وراثت کے جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اور بہت لوگوں کو تو اب مقدمہ بازی کی لت سی پڑگئی ہے اور بعض لوگوں کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ ہندوستانی عدالتیں ہندوستانی کاشت کاروں کے حق میں وہی درجہ رکھتی ہیں جو Monte Carlo یورپ اور امریکہ کے کروڑپتی جواریوں کے حق میں۔ جس طرح جواری بازی پر بازی لگاتا چلا جاتا ہے بعینہ ہمارا مقروض کسان قرض کی بڑی بڑی رقوم بلاتکلف مقدمہ بازی پر صرف کرتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جہاں اسکی جائداد کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہورہا ہے وہیں اس کے قرض کی مقدار بھی حد سے آگے بڑھ رہی ہے۔

(ب) انگریزی حکومت کے قیام کے بعد سے قرض دہندوں کو اپنے قرض کی وصولیابی میں جو آسانیاں پیدا ہوتی ہیں انکا بھی کسانوں کی قرضگیری میں بہت بڑا حصہ ہے۔ اس سے قبل ملکیت پر چونکہ پورے خاندان کا مشترکہ قبضہ ہوتا تھا اس لئے عدم ادائگی قرض کی صورت میں قرض دہندہ کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ زمین پر قبضہ کرے لیکن انگریزی حکومت میں قانون نے انفرادی ملکیت کو تسلیم کرکے عدم ادائگی قرض کی صورت میں قانونی چارہ جوئی کے بعد زمین پر قبضہ کرنے کا ساہوکاروں کو جو اختیار عطا کیا ہے اس کی وجہ سے ساہوکار قرض دینے میں بہت کم پس وپیش کرتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب تک ساہوکار گاؤں والوں کو اپنا حامی نہ بنالے کسی نادہند قرضدار سے روپے کی وصولی بہت مشکل تھی۔ گاؤں والوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اسے عجیب وغریب ترکیبیں لڑانا

پڑتی تھیں جنمیں ایک بہت ہی دلچسپ تھی جو دھرنا کے نام سے مشہور تھی۔ اسکا طریقہ یہ تھا کہ یا تو وہ خود نادہند قرضدار کے دروازے پر جا بیٹھتا تھا۔ یا اپنی بجائے کسی برہمن کو متعین کرتا تھا جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ مختلف طریقوں سے قرضدار پر اثر ڈالے۔ چنانچہ جبتک قرض ادا نہ ہو وہ کھانا پینا بند کردیتا تھا بعض اوقات اپنے سر پر بڑا سا پتھر رکھ لیتا تھا اور کبھی کبھی اپنی چوٹی قرضدار کے برآمدے کی کسی کھونٹی میں باندھ کر اس میں لٹک جاتا تھا۔ مقصد یہ ہوا کرتا تھا کہ یا تو قرضدار تنگ آکر خود ہی قرض ادا کردے یا گاؤں والوں کو اسکی تکالیف دیکھ کر رحم آئے اور وہ قرضدار کو ادائگی قرض پر مجبور کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں قرضدار سے اصل مع سود وصول کرنا ہی ساہوکار کے لئے غنیمت تھا۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ قرضدار نے ادائگی میں ذرا دیر کی اور ساہوکار نے فوراً ہی قانون کی آڑ تلاش کرکے اس پر وارنٹ جاری کرادیا۔ ۱۸۷۵ء میں صرف صوبہ بمبئی میں کسانوں کو محض دھمکانیکی خاطر ...۱۵۰ وارنٹ جاری کیے گئے۔
ان تمام قانونی آسانیوں کا جو ساہوکاروں کو حاصل ہوئیں نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بلا دریغ کسانوں کو قرض دیا اور ان ناعاقبت اندیشوں نے بھی خوب ہی خرچ کیا۔
اس پر کسانوں کی جہالت اور قانون سے ناواقفیت نے اور بھی غضب ڈھایا۔ عموماً ساہوکار بہت زیادہ ایماندار نہیں ہوتے اور جب کسان اپنی مجبوریوں سے تنگ آکر انکے پاس پہنچتا ہے تو وہ جس قسم کا بھی چاہتے ہیں وثیقہ لکھوا لیتے ہیں اور وہ غریب بلا چون وچرا اپنے انگوٹھے کا نشان ثبت کرکے ہمیشہ کے لئے انکے پھندے میں پھنس جاتا ہے۔

۸۔ ناقابل برداشت مالگذاری کاشتکاروں کی موجودہ حالت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ حکومت ان سے جو مالگذاری وصول کرتی ہے وہ بہت زیادہ ہے اور کاشتکاروں کی قرضگیری میں اضافہ کا باعث۔ عام طور پر انگریز مصنفین یہ ثابت کرنیکی کوشش کرتے ہیں کہ موجودہ

شرح مالگذاری نسبتاً کم ہے۔ بہت ممکن ہے یہ خیال صحیح ہو لیکن ہم گذشتہ مضمون میں دیکھ چکے ہیں کہ آراضی کے بڑے حصہ کی وہ حالت نہیں رہی جو اس سے قبل تھی۔ اضافہ آبادی، گرانی اجناس اور زراعت کے علاوہ اور پیشوں کا نقدان اور اسی قسم کے دیگر اسباب نے اکثر آراضی کو غیر معاشی معیار پر لا رکھا ہے۔ بحالت مجبوری کاشتکار اپنے پیشے کو جاری رکھتا ہے اور اس کی آمدنی اسکی گذر کے لئے ناکافی ہے ایسی حالت میں شرح مالگذاری کتنی ہی کم کیوں نہ ہو وہ کاشت کار کے حق میں تو بہرحال ایک بار ہے واقعہ تو یہ ہے کہ غیر معاشی آراضی پر مالگذاری وصول کرنا کسی طرح بھی قرین انصاف و مصلحت نہیں کہا جا سکتا۔ انگریزی حکومت میں مالگذاری وصول کرنیکے جو طریقے ہیں انہوں نے اور آفت مچا رکھی ہے۔ اس سے قبل حکومت نفع و نقصان دونوں میں کاشت کار کی شریک رہتی تھی کیونکہ مالگذاری کی کوئی رقم مقرر نہ تھی اور ہر سال کی پیداوار کا ایک حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ اب چونکہ حکومت نے ایک رقم معین کر دی ہے کاشتکار اس کی ادائگی پر مجبور ہے خواہ فصل کی حالت کیسی ہی خراب کیوں نہو۔ چنانچہ ہندوستانی کاشتکار "قرض کے روپے سے مالگذاری ادا کرتا ہے جس پر اسے ۲۵ سے لیکر ۳۰ فیصدی تک سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور جو شرح مالگذاری سرمایہ داروں کے معیار سے مقرر کی گئی ہو وہ ایسی قوم کے حق میں جو جنس کی صورت میں قرض کے ادائگی کی عادی رہ چکی ہو اور جس کی معاشی ذمہ داریوں کا معیار ایک فصل کی پیداوار سے طے پاتا ہو بلاشبہ ناقابل برداشت ہو گی" (۱)

اصلاحی کوششیں اور انکے نتائج کاشت کاروں کی اس تباہ حالی نے بالآخر حکومت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ ۱۸۸۰ء اور ۱۹۰۱ء کے قحط کمیشنوں نے اپنی رپورٹ میں حکومت کو اس طرف متوجہ کیا اور چند اصلاحی تجاویز بھی پیش کیں۔ سب سے قبل قانون دیوانی کی اصلاح

---

(۱) ملاحظہ ہو R. Macdonald: The Awakening of India P. 157-58. صفحہ ۱۵۷-۵۸

کا خیال پیدا ہوا اور اسمیں کسی قدر تبدیلیاں بھی ہوئیں لیکن وہ حسب ضرورت اور کافی نہ تھیں اسلئے
انکا زیادہ اثر نہ ہوا دوسری صورت قحط سالی کے زمانے میں پوری مالگذاری یا اسکے ایک حصہ کی
معافی تھی۔ اس صورت سے کسانوں کو کسیقدر آسانی تو ضرور ہوئی لیکن انکا بار اتنا زیادہ تھا کہ
باوجود اس آسانی کے ابتک مالگذاری کی ادائگی کے لئے قرض لینے کا سلسلہ برابر جاری ہے
چنانچہ ۱۸۹۶ء میں صوبہ پنجاب میں کسانوں کے مجموعی قرض کا ۱۲ فیصدی حصہ اسی مالگذاری
کی ادائگی کی خاطر قرض لیا گیا تھا حتیٰ کہ ۱۹۲۰ء میں انجمنہائے امداد باہمی نے کسانوں کو جتنا قرض
دیا اسکا بھی ۱۲،۵ فیصدی کسانوں سے مالگذاری کی ادائگی میں صرف کیا۔(۱)

۱۸۸۳ء میں Land Improvements Loans Act اور ۱۸۸۴ء
میں Agriculturists Loans Act پاس کرکے۔ دیوانی قانون کی اصلاح
اور مالگذاری کی معافی کے علاوہ کاشتکاروں کو ایسے کاموں میں صرف کرنیکے لئے جن سے
زمین کی پیداآوری میں اضافہ ہو حکومت کیطرف سے مناسب شرائط پر امدادی قرض دینے
کا انتظام کیا گیا۔ جو "تقاوی" کہلاتا ہے۔ لیکن یہ قرض حاصل کرنے میں کاشتکاروں کو کچھ تو
اپنی جہالت کیوجہ سے اور کچھ حکام کی زیادتی اور قانونی پابندیوں کی وجہ سے اتنی دقتیں پیش آتی
ہیں کہ اس سے بہت کم لوگ فائدہ اٹھانا پسند کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں زمین کے آئندہ تبادلے پر قانونی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ انفرادی
ملکیت کے خیال کو تقویت پہنچنے سے ہندوستانی کاشتکاروں کے اجتماعی نظام میں جو
خلل پڑ رہا ہے اس کے تباہ کن اثرات کا ازالہ ان قانونی پابندیوں کا اصل مقصد ہے اس
کے قوانین کی ایک مثال کے طور پر ۱۹۰۱ء کا The Punjab Land Alienation Act
پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس قانون کا مقصد زمین کے مزید تبادلے کو روک کر

---

(۱) Calvert: Wealth and Welfare of the Punjab. P. 131

اسے کسانوں ہی کے قبضے میں رکھتا ہے۔ اس قانون کی رو سے ڈگری حاصل کر کے زمین کا نیلام کروانا۔ اپنی قوم کے علاوہ کسی دوسری قوم والے کے ہاتھ زمین فروخت کرنا اور بشرط عدم ادائگی قرض قرضدار کو زمین بیچنے کا اختیار دیکر زمین رہن رکھنا خلاف قانون قرار دیا گیا ہے۔

باوجود ساہوکاروں کے طبقے کی شدید مخالفت کے اس قانون کا بہت اچھا اثر ہوا اور اراضی کی خرید فروخت میں نمایاں کمی واقع ہوئی جسکا اندازہ اعداد ذیل سے ہو سکیگا۔ اس قانون کے اجراء سے پانچ سال قبل اوسطاً ۱۶۲۰۰۰ ایکر زمین فروخت ہوئی تھی۔ لیکن اجراء قانون کے پانچ سال بعد یہی اوسط گھٹکر ۱۳۵۰۰ ایکر رہگیا۔ ۱۹۰۶ء میں اس میں اور بھی کمی واقع ہو کر اس عرصے میں صرف ۱۲۱۰۰۰ ایکر زمین فروخت ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ اب کسان زمینیں کم فروخت کرتے ہیں بلکہ اور طبقے جو زمینیں فروخت کرتے ہیں۔ اسے زیادہ تر کسان ہی خریدتے ہیں۔ گو اس سے قبل جو زمینیں کسانوں کے قبضے سے نکلکر گئی تھیں ان پر پھر کسانوں کا قبضہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اعداد ذیل اس پر شاہد ہیں:-

	۱۹۰۲-۱۹۰۶ء	۱۹۰۶-۱۹۱۱ء	۱۹۱۱-۱۹۱۶ء	۱۹۱۶-۱۹۱۷ء	۱۹۱۹-۱۹۲۰ء
کسانوں نے جو زمین اوروں کے ہاتھ بیچی	۱۵۰۰۰۰	۱۷۰۰۰۰	۱۸۸۰۰۰	۱۸۳۰۰۰	۱۶۶۰۰۰
اور لوگوں نے جو زمین کسانوں کے ہاتھ بیچی	۱۴۹۰۰۰	۱۷۸۰۰۰	۲۱۷۰۰۰	۲۰۳۰۰۰	۱۹۱۰۰۰
کسانوں کا نفع نقصان	-۱۰۰۰	+۸۰۰۰	+۲۹۰۰۰	+۲۰۰۰۰	+۲۵۰۰۰

اسی طرح رہن مقبوضہ کے رقبے میں بھی رفتہ رفتہ کمی ہو رہی ہے جو کسانوں کے قرض ہونیکی علامت ہے۔ ۱۹۰۱-۰۲ء میں ایسا رقبہ ۳۲۸۰۰۰ ایکڑ تھا وہی ۱۹۱۶-۱۷ء میں ۳۲۰۰۰۰ ایکر ہو گیا اور ۱۹۱۹-۲۰ء میں اور کم ہو کر ۳۱۱۰۰۰ ہو گیا۔ اسی زمانے میں مرہونہ رقبے کا تناسب مجموعی زیر کاشت رقبے سے ۱۲٫۸ فیصدی سے کم ہو کر ۱۰٫۸ فیصدی رہ گیا (۲)

پنجاب کے علاوہ بند ملکھنڈ، بمبئی اور اودھ میں بھی اسی قسم کے قوانین کا اجرا کیا گیا اور ان صوبوں میں بھی کسانوں کی حالت کی اصلاح میں وہ مؤثابت ہوئے

ان قوانین کا اثر کسانوں کے حق میں کتنا ہی مفید کیوں نہ ہوا ہو ان سے ایک دشواری بھی پیدا ہوائی اور شرح سود میں اضافہ تھا۔ اب چونکہ ساہوکاروں کے اختیارات کم ہوگئے اور قرض کی ضمانت میں زمین پر قبضہ ناممکن ہوگیا۔ اس لئے انہوں نے شرح سود بڑھائی چنانچہ پنجاب میں اسکا اثر صاف نمایاں ہوا اور شرح سود بڑھکر ۱۲ فیصدی سے لیکر ۵۰ فیصدی تک پہنچی

اب حکومت کے سامنے مناسب شرائط پر قرض دیکر کسانوں کی مشکلات رفع کرنیکا اور ساہوکاروں کے پنجے سے انہیں نجات دلانیکا مسئلہ پیش ہوا اور اسی غرض سے انجمنہاے امداد باہمی کی (**Cooperative Credit Societies**) بنیاد پڑی۔ سب سے پہلے یہ خیال سر فریڈرک نکلسن کے ذہن میں پیدا ہوا انہوں نے جرمنی میں رائفیسن نے جن اصولوں پر یہ انجمنیں قائم کی تھیں انہی اصولوں پر ہندوستان میں انجمنیں قائم کرنیکی تجویز ۱۹۰۱ء میں پیش کی چنانچہ ۱۹۰۴ء میں **Cooperative Credit Societies Act** کی روسے حکومت نے ان انجمنوں کے قیام کا انتظام کیا اور ابتدائی ۸ سال میں زائد از توقع کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں ان انجمنوں کی تعداد ۸۱۷۷ تھی اور انکے اراکین ۴۰۳۳۱۸ تھے۔ انجمنوں کے اصل کی مجموعی مقدار ۲۱۶۴۷،۳۳۵ روپئے تھی۔ ۱۹۱۲ء میں ایک نئے قانون **Act of 1912** **Cooperative Societies** کی روسے ان انجمنوں کے دائرہ عمل کو وسعت دی گئی

اس کے بعد ان انجمنوں نے جو قابل غور ترقی کی ہے اسکا اندازہ اعداد ذیل سے ہوگا۔

۲۳-۱۹۲۲ء میں ان انجمنوں کی تعداد صرف برطانوی ہند میں ۵۱۶۸۷ تھی۔ اسی میں اگر دیسی ریاستوں کو شریک کرلیا جائے تو یہ تعداد ۵۶۱۳۶ تک پہنچتی ہے ان میں سے ۹۰ فیصدی محض کاشتکاروں ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ اب گویا ملک کی ہر ۶۰۰ کی آبادی پر ایک انجمن

کا اوسط پڑتا ہے۔ اراکین کی کل تعداد (برطانوی ہند میں) ۱۹۴۰۹۴۳ تھی جن میں ۱۵۰۶۴۵۰ ان انجمنوں کے رکن تھے جو زراعت پیشہ لوگوں کے لئے مخصوص ہیں۔ گویا آبادی میں فی ہزار سات آدمی ان انجمنوں کے رکن ہیں۔ برطانوی ہند کے انجمنوں کے اصل کی مجموعی مقدار ۳۴۴۲۱۱۰۰۰ تھی۔

ان انجمنوں کے نظام کا اور مختلف صوبوں میں وہ جو مفید کام کر رہے ہیں اسکا بہ تفصیل ذکر اسی مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ اشارتاً یہ کہدینا کافی ہوگا کہ انکا بڑا حصہ کاشتکاروں ہی کی اغراض پوری کرنیکے لئے مخصوص ہے انکا نظام رائیفن کی انجمنوں کے نظام ہی پر مبنی ہے اور رفتہ رفتہ ان انجمنوں کی تعداد اور کارگذاری میں نہایت سرعت سے اضافہ ہو رہا ہے۔

تاہم ان انجمنوں کی بظاہر ترقی سے ہمیں زیادہ متاثر نہ ہونا چاہئے۔ اعداد و شمار کے اضافے کے یہ معنی نہیں کہ واقعتاً کام بھی اسی رفتار اور مستعدی سے ہو رہا ہے ان میں جو ابتدائی انجمنیں (Primary Societies) ہیں انہیں امداد باہمی کے اصولوں کا بہت کم احساس ہے۔ ان انجمنوں کا مقصد کاشت کاروں کو نہ صرف مناسب شرائط پر قرض دینا ہے بلکہ ان میں انتظامی قابلیت پیدا کرنا بھی انکا فرض ہے۔ موخرالذکر فرض کی کماحقہٗ ادائگی کے لئے ضرورت ہے کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو ان انجمنوں کا پورا انتظام عوام کے ہاتھ میں دیدیا جائے اور حکومت اس میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرے۔ لیکن باوجود ربع صدی گذر جانیکے ابھی حکومت کا اثر اور دخل بدستور جاری ہے۔ بلکہ بدقسمتی سے بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ حکومت کا اثر اور زیادہ ہو۔

ان انجمنوں کے ذرائع بھی اسقدر محدود ہیں کہ انکی قوت پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ہمارے کاشتکاروں کی قرضگیری جس انتہا کو پہنچ چکی ہے اسکا مقابلہ اگر ان انجمنوں کے محدود ذرائع سے کیا جائے تو یہ کسی طرح بھی ممکن نظر نہیں آتا کہ مستقبل قریب میں یہ انجمنیں ہمارے کاشت کاروں کی جملہ ضروریات کی کفیل بن سکیں۔

باوجود ان انجمنوں کے قیام کے ابھی مہاجنوں کے لئے قرض دینے کے کافی مواقع باقی ہیں. خصوصاً شادی بیاہ جیسی رسوم میں خرچ کرنے کے لئے جب انجمن سے قرض نہیں ملتا تو کسان مجبوراً پھر مہاجن کے پاس جاتا ہے. نہ صرف یہ کہ زرعی ضروریات کے علاوہ اور کاموں کے لئے یہ انجمنیں قرض نہیں دے سکتیں بلکہ قحط سالی کے زمانے میں کاشتکار اور اسکے کنبے کی پرورش بھی ان انجمنوں کے احاطہ سے باہر ہے۔ اور انکی موجودہ حالت دیکھکر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اتنی قوت پیدا ہونیکے لئے ابھی ایک عرصہ درکار ہے۔

جو کاشت کار اپنی غیر محدود ذمہ داری پر ان انجمنوں کے رکن بنتے ہیں انکے لئے بعض اوقات بڑی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ پھر اسکا مہاجن کے پاس جانا تقریباً ناممکن ہے لے دیکر قرض حاصل کرنیکا ایک ہی ذریعہ باقی رہتا ہے اور وہ زرتقاوی ہے۔ اس صورت میں حکومت کو انکی جائداد پر اختیار کلی حاصل ہوجاتا ہے اور باوجود بعد میں زرتقاوی لینے کے عدم ادائگی کی صورت میں سب سے پہلے حکومت ہی کو اس جائداد پر اپنا حق ملکیت ثابت کرنیکا موقع ملتا ہے اور اس طرح انجمنہاے امداد باہمی کو نقصان پہنچتا ہے۔

غرض بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان انجمنوں میں بھی باوجود انکی مفید کارگذاری کے ابھی اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ ہمارے کاشتکاروں کو قرضگیری کی لعنت سے ہمیشہ کے لئے نجات دلاسکیں۔ صورت حال کی اصلاح کا وہی ایک ذریعہ ہوسکتا ہے جس کا ہم گذشتہ مضمون میں بھی ذکر کر چکے ہیں یعنی کاشت کاروں کو انکے فرصت کے وقت میں جو وہ بیکاری میں گذاتے ہیں کوئی کام دیا جائے جس سے وہ اپنی آمدنی میں تھوڑا بہت اضافہ کرسکیں۔ صرف اسی صورت میں انکے بڑھتی ہوئی قرضگیری کی کسی حد تک روک تھام ہوسکتی ہے. علاوہ اس کے اشاعت علم اور اصلاح رسوم کا بھی انتظام ضروری ہے۔

احوالِ غالب از کلامِ غالب

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

غالب کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ اسکی قدر نہ صرف اس کی زندگی میں ہوئی بلکہ موت کے بعد اس سے زیادہ ہوئی۔ زندگی میں بہت سے ایسے حالات و اسباب ہو سکتے ہیں کہ بے لوث و غیر جانبدارانہ قدر و ستایش کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے لیکن ایسے زمانے میں جب کہ شاعر کے دیکھنے والے بھی گنتی کے رہ گئے ہوں شاعر کی قدر ہونا بے شبہ اس کی اصلی قدر اور اسکے کمال کی واقعی دلیل ہے۔

غالب کے کلام پر تبصرے اور تنقیدیں، شرحیں اور دیباچے بہت لکھے گئے۔ لیکن اس کے حالات اور خصائص طبعی پر کافی نظر تنقید نہیں ڈالی گئی۔ صرف مولانا حالی نے حق شاگردی ادا کیا ہے۔ اور اگرچہ نہایت تفصیل سے حالات لکھے ہیں لیکن ان میں شاگردانہ ارادت کیشی و عقیدت مندی کا رنگ غالب ہے۔ غالب صرف اعلیٰ دماغ کا انسان نہ تھا بلکہ بڑا دل بھی رکھتا تھا۔ لیکن انسان تھا اور انسان لغزشوں سے پاک نہیں ہوتا۔ غالب خوددار، پابند وضع، وسیع الاخلاق اور بقول حالی "حیوان ظریف،، تھا۔ لیکن خودداری کے ساتھ حسد و خوشامد، قناعت کیساتھ بے صبری، خوش خوئی کے ساتھ طعن و شکایت، ظرافت کے ساتھ ہجو و بدگوئی بھی ہندوستان کے اس بہترین و برترین شاعر کی سرشت میں نہاں تھی۔ لیکن جس طرح شکسپیر کا سرقہ شکار اس کے کمال شاعری کو داغدار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح انسانی کمزوریوں کے اتفاقی و ہنگامی اظہار سے غالب کا پایہ بلندیت نہیں ہوتا۔ کسی انسان کے حالات کے دوران تحقیق میں اس کے کسی عیب کی طرف

اشارہ کرو دنیا طلبی نقطۂ نظر سے نہ آذ گرو اگمو تا گم یا بخیر کے منافی ہے۔ نہ اس کی شہرت کو دا فدار بنانیکے مترادف۔ بلکہ فطرت انسانی کے تنوع کا مطالعہ ہر اور دلچسپ مطالعہ ۔

غالب کا مذہب بھی آج کل معرض بحث میں ہے اس نے ایک مثنوی میں اپنے عقائد جس خوبی و صفائی سے لکھے ہیں وہ اگرچہ کسی کی فرمائش سے سہی لیکن بلاشبہ اس کے ذاتی معتقدات ہیں۔ اس فرمائش کا اثر گرفتاری کا خوف نہ تھا جس نے بے تکلف کہلوایا تھا "صاحب آدھا مسلمان۔ اس لئے کہ شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا"

اس مختصر تمہید کے بعد ہم اس کے حالات و عادات جو اس کے کلام اُردو فارسی میں دستیاب ہو سکے ہیں بغیر اپنے فریدیار کے غالب ہی کی زبان سے پیش کرتے ہیں۔

حامد حسن قادری بچھرایونی۔ از کانپور

غالب کی ولادت

غالب چوز ناسازی فرجام نصیب ہم ہم عدو دارم و ہم ذوق حبیب

تاریخ ولادت من از عالم قدس ہم شورش شوق آمد و ہم لفظ غریب ۱۲۱۲

غالب کا نسب

غالب از خاک پاک تورانیم لاجرم در نسب فرومندیم

ترک زادیم و در نژاد ہمے بسترگان قوم پیوندیم

ایبکم از جماعۂ اتراک درتمامی زماہ دہ چندیم

پیشہ آبائی

فن آبائے ما کشاورزی است ——— مرزبان زادۂ سمرقندیم

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غالب بگہر ز دودۂ زادشم — زاں رو بہ صفائے دم تیغ است دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر — شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

غالب کا مذہب

شرط است کہ بہر ضبط آداب و رسوم — خیزد بعد از نبی امام معصوم
زاجماع چہ گوئی بہ علی باز گرائے — مہ جائے نشیں مہر باشد نہ نجوم
علی راست بعد از نبی جائے او — ہماں حکم کل دارد اجزائے او
ہمانا پس از خاتم المرسلیں — بود تا بہ مہدی علی جانشیں
نژاد علی با محمد یکے است — محمد ہماں تا محمد یکے است
زاحمد الف نام ایزد بود — زمیم آشکارا محمد بود
الف میم را چوں شوی خواستار — نماند ز احمد بجز ہشت و چار
منصور فرقۂ علی اللہیان منم — آوازۂ انا اسد اللہ بر آورم
غالب نام آورم نام و نشانم مپرس — ہم اسد اللہ ام و ہم اسد اللہیم

غالب کا مسلک

غالب آزادہ موحد کیشم — بر پاکی خویشتن گواہ خویشم
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

غالب کے عقائد

استمداد از اولیا

نور حق است احمد و لمعان نور — از نبی در اولیا دارد ظہور
ہر ولی پرتو پذیر است از نبی — چوں مہ از خورشید نیر است از نبی
از نبی ور از ولی خواہی مدد — تا نہ پنداری کہ ناجائز بود
بہ نیاید کار بے فرمان شاہ — لیک آئین ہاست بر خاصان شاہ

هر که اورا نور حق نیرو فزاست | هر چه از وی خواستی هم از خداست
بر لب دریا گر آبی خورده | آب از موجی بجام آورده
آب از موج آید اندر جام تو | لیکن از دریا بود آشام تو
وقت حاجت هر که گوید یا علی | با نقش کار است و پوزش با علی
یا محمد جان فزاید گفتنش | یا علی مشکل کشاید گفتنش
چون اعانت خواهی از یزدان پاک | یا معین الدین اگر گوئی چه باک
ابلهان را زانکه دانش نارساست | گفتگوها بر سر حرف نداست
مولوی معنوی عبد العزیز | وان رفیع الدین دانشمند نیز
شاه عبد القادر دانش سگال | کاین دو تن رابود در گوهر کمال
بردن نام نبی و اولیا | خود روا گفتند با حرف ندا
تا نه پنداری ز پیران خواستیم | حاجت خود را ز یزدان خواستیم
لیک در پوزش بدرگاه رفیع | ما همی آریم پیران را شفیع
این چنین پوزش روا نبود چرا | بحث با عارف خطا نبود چرا

مولد پیغمبر

در سخن در مولد پیغمبر است | بزم گاه دلکش و جان پرور است

موی مبارک

نکهت موی مبارک جانفزاست | بارگ جانش همی پیوند هاست
بر تن نیکوتر از جان رسته است | لاجرم از آب حیوان رسته است
دلنشین با بود زان رشته موی | وه که گرد اندکی زان تو روی

نقش قدم

هر کرا دل هست و ایمان نیز هم | چون نواز د عشق با نقش قدم
در ره دین تا قدم بنهاده اند | عشق بازان را نشانها داده اند
برد از خویشتم دو صد فرهنگ شک | می برم این نقش پا بر سنگ شک
نقش پای کاینچنین افتاده است | اهل دل را دل نشین افتاده است

کے نشیند در دل آں بدگہر — کش دلے از سنگ باشد سخت تر

پیرہن مبارک

پیر ردا و پیرہن کز مصطفیٰ است — جاں نیفشاندن زانت کے رواست

عشق گر با پیرہن دربار داست — نیست بہر جامہ از بہر خدا است

عرس وایں شمع و چراغ افروختن — عود در مجمر بر آتش سوختن

جمع گشتن در سیجے ایواں ہمی — پنج آیت خواندن از قرآں ہمی

تاں بناں خواہندگاں دادن دگر — مردہ را رحمت فرستادن دگر

گر پے ترویح روح اولیاست — درحقیقت آنہم از بہر خداست

اولیا را گر گرامی داشتیم — زپے رومی و شامی داشتیم

از براے آں کہ ایں آزادگاں — از رہ حق جاں بجاناں دادگاں

از شہود حق طرازے داشتند — با خدائے خویش رازے داشتند

نور چشم آفرینش بودہ اند — شمع روشن ساز بینش بودہ اند

ہست رسم خاص در ہر مرز و بوم — خود چہ می خواہی ز نفی ایں رسوم

نفی رسم کفر ما ہم مے کنیم — داد با داتش فراہم می کنیم

نفی کفر آئین ارباب صفاست — نفی فیض اے تیرہ دل رسم کجاست

نفی رسم و رہ ہوا را می کشد — نفی فیض است آنکہ ما را می کشد

اے گرفتار رخم و پیچ خیال — نفی بے اثبات نبود جز ضلال

معجزات

ور تو گوئی می کنم اثبات حق — از چہ روئی منکر آیات حق

معجزات انبیا آیات کیست — ویں صفت ہا را ظہور از ذات کیست

امکان نظیر

ویں کہ می گوئی توانا کردگار — چوں محمد دیگرے آرد بکار

با خداوند دو گیتی آفریں — ممتنع نبود ظہور ایں چنیں

گرچه فخر دودهٔ آدم بود　　هم بقدر خاتمیت کم بود

صورت آرایش عالم نگر　　یک مه و یک مهر و یک خاتم نگر

این کرمی گویم جوابی بیش نیست　　مهر و مه را جلوه تابی بیش نیست

آنکه مهر و ماه و اختر آفرید　　می تواند مهر دیگر آفرید

حق تو مهر از سوئے خاور آورد　　کور باد آں کو نه باور آورد

قدرت حق بیش ازیں هم بوده است　　هرچه اندیشی کم از کم بوده است

یک در یک عالم از روی یقین　　خود نمی گنجد دو ختم المرسلین

یک جهاں تا هست یک خاتم بس است　　قدرت حق را نه یک عالم بس است

خواهد از هر ذره آرد عالمی　　هم بود هر عالمی را خاتمی

هرکجا هنگامهٔ عالم بود　　رحمة للعالمینی هم بود

کثرت ابداع عالم خوب تر　　یا بیک عالم دو خاتم خوب تر

در یکی عالم دو تا خاتم مجوی　　صد هزاراں عالم و خاتم بگوی

غالب ایں اندیشه نپذیرم همی　　خرده هم بر خویشتن می گیرم همی

ای که ختم المرسلینش خوانده　　دانم از روی یقینش خوانده

ایں الف لامی که استغراق راست　　حکم ناطق معنی اطلاق راست

نشاء ایجاد هر عالم یکیست　　گر دو صد عالم بود خاتم یکیست

خود همی گوئی که نورش اول است　　از همه عالم ظهورش اول است

اولیت را بود شانی تمام　　کی بهر فردی پذیرد انقسام

جوهر کل برنتابد تثنیه　　در محمد ره نیابد تثنیه

تا نورزی اندر امکاں بود رنگ　　حیز امکاں بود بر شکل تنگ

سیم امکاں اندر احمد منزوی است　　چوں ز امکاں بگذری وای که حبیب

صانع عالم چنیں کرد اختیار — کش بعالم مثل نبود زینہار
ایں نہ عجز است اختیار است اے فقیہ — خواجہ بے ہمتا بود لا ریب فیہ
ہر کرا باشد شبیہ نبود خدا — ہمچو اوئی نقش کے بندد خدا
ہم گہر مہر منیرستش چوں بود — سایہ چوں نبود نظیرستش چوں بود
منفرد اندر کمال ذاتی است — لاجرم مثلش محال ذاتی است
زیں عقیدت بر نگردم والسلام — نامہ را در می نوردم والسلام

غالب کا مشرب

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن — خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

در عالم بے زری کہ تلخ است حیات — طاعت نتواں کرد بامید نجات

اے کاش ز حق اشارت صوم و صلوٰۃ — بودے بوجود مال چوں حج و زکوٰۃ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار — ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند — حق را بسجودے و نبی را بدرودے

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم — دانی کہ اصل گوہرم از دودہ جم است
میراث جم کہ مے بود اینک بمن سپار — زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

در من ہوس بادۂ طبیعی است کہ غالب — پیمانۂ جمشید رساند نسبم را

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن — حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

کارے عجب افتادہ بدیں شیفتہ ما را — مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت

زاہد ز طعنہ برق فسوسم بجاں مریز — نسبت مکن بزندقہ اے زشت خو مرا
گوئی کہ با کلام مجیدت رجوع نیست — دل تیرہ شد ز کلفت ایں گفتگو مرا
حق است مصحف و بود از روے اعتقاد — در عزت کلام الٰہی غلو مرا

ہر صبح زاں صحیفہ شکیں تبسم بچشم — باشد نکو ترا ز خط روے نکو مرا
شیطان علم ہست لیک انسان نامہ سر ورق — بخشد خط اماں ز نہیب عدو مرا
دانم کہ امر و نہی بود در کلام حسن — سیرابی نمی است از آں آب جو مرا
بااین ہمہ کہ در خم و پیچ و غم و تعب — سرگشتہ وارد ایں فلک جنگجو مرا
برخاستست گرد ز سر چشمۂ حواس — وز حافظہ نماندہ نمے در سبو مرا
لاتقربوا الصلوٰۃ ز نہیم بخاطر است — وز امر یاد ماندہ کلوا واشربوا مرا

غالب کے اخلاق

خودداری | اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

علو ہمت | بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں — اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

تھی نو آموز فنا ہمت دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلا — قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

یاد رفتگاں | بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب — رگ جاں کردہ ام شیرازۂ اوراق کتابش را

مارا مدد ز فیض ظہوری است در سخن — چوں جام بادہ راتبہ خوار رحیم ما

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذکر احباب | یکہ راندی سخن از نکتہ سرایان عجم — چہ بما منت بسیار نہی از کم شان
ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود — باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شان
مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ — حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان

غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار — ہست در بزم سخن ہمنفس و ہمدم شان
غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل — چوں او تلاش معنی و مضموں نکرد کس
غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او — ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد
غالب اگر بہ بزم شعر دیر رسید دور نیست — کش بفراق حسرتی دل ز سخنوری گرفت
غالب آزردہ بسر و شیفتہ گر از مستی قرب — ہم بداں وحی کہ آوردہ غزلخواں شدہ است
شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر — خونابہ بدل ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگ مومن — چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر
غالب ز ہند نیست نوائے کہ می کشیم — گوئی ز اصفہان و ہرات و قمیم ما
غالب سخن ز ہند بروں بر کہ کس اینجا — سنگ از گہر و شعبدہ ز اعجاز ندانست
غالب از آب و ہوائے ہند بسمل گشت نطق — خیز تا خود را بہ اصفاہان و شیراز افگنم
غالب از ہندوستاں بگریز فرصت مفت تست — در نجف مردن خوش است و در صفاہاں زیستن
غالب از خاک کدورت خیز ہندم دل گرفت — اصفہان ہے، یزد ہے، شیراز ہے، تبریز ہے
گر ذوق سخن بدہر آئین بودے — دیوان مرا شہرت پروین بودے
غالب اگر این فن سخن دین بودے — آں دین را ایزدی کتاب این بودے
ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب — شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما
ز انجم گر بصورت از گدایاں بودہ ام غالب — بدار الملک معنی می کنم فرماں روائی ہا
شعر غالب نبود وحی و نگوئیم ولے — تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست
چند رنگیں نکتۂ دلکش تکلف برطرف — دیدہ ام دیوان غالب انتخابی بیش نیست
چوں نیست تاب برق تجلی کلیم را — کے در سخن بہ غالب آتش بیاں رسد
از نازکی بدہر مکرر نمے شود — نقشیکہ کلک غالب خونیں رقم کشد
اندریں شیوۂ گفتار کہ داری غالب — گر ترقی نکنی شیخ علی را ثانی

نسخہ ہائے وفا زندگی اپنی جب اس طرح سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کچھ تو دیجے اے فلک ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

لوں دام بخت خفتہ سے اک خواب خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

با ایں ہمہ آرایش گفتار کہ گفتم
از جبہہ بختم نشود فاصلہ چیں را

بخت صلۂ مدح و قبول غزلم نیست
تسکیں بچہ بخشم دل ہنگامہ گزیں را

در بانگ زنی کاں ہمہ دادند بحافظ
گویم بحلش باد و لیکن چہ شد ایں را

ملزم کردہ اند ہاں بدروغ
حق من خوردہ اند ہیں بگزاف

آہ از اقربائے بے آزرم
داد از حاکماں ناانصاف

ای کہ در بزم شہنشاہ سخن ور گفتہ
کے بہ برگوئی فلاں در شعر ہم سنگ منست

راست گفتی لیک می دانی کہ بود جائے طعن
کمتر از بانگ دل گر زمزمۂ چنگ منست

نیست نقصاں یکدو جزو است ار سواد ریختہ
کاں ورق برگے ز گلستان فرہنگ منست

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال
مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارژنگ منست

کے درخشد جوہر آئینہ تا باقیست زنگ
صیقل آئینہ ام این جوہر آں زنگ منست

ہاں من یزداں نہ جائے شکوہ بر مہر و وفات
تا نہ پنداری بہ پرخاش تو آہنگ منست

دوست بودی شکوہ سر کردم و نے جرم تو نیست
کایں ہمہ بیداد بر من از دل تنگ منست

بخت من ناساز و خوی دوست ازاں ناسازتر
تا چہ پیش آید کنوں با بخت خود جنگ منست

دشمنی با هم فنی شهر طراست و آن ما ی گریست
در سخن چون همزبان و همنوای من نه
راست میگویم من و از راست نتوان کشید
هزار معنی سرجوش خاص نطق منست
ز زنگان بیکی گر توارد می رود او
مرا است ننگ و ی فخر اوست کان سخن
مبر گمان تو اردی یقین شناس که وزو
غالب بدین زمانه هرکس که ورد سی
زین پایه از کجا که ببالد بخویشتن
کس را ز دست برد خیالش نجات نیست
مضمون هر کرا خوش ادا می کند به ناز
اما بکنه حسن ادا نا رسیده است
جز من کسی بدر و سخن در نمی رسد
آری نه خلب بود نه تمسک زهر که هست
مضمون شعر توشه بود فی زمانا
اضطراب بلبل از ما ترکتاز از هم فغان
او دردو داغ و همکاران ما برگ و ساز
ظرافت | ایا زیان زده غالب که از صدیقه بخت
چو لازم است که پروردگار تا دم مرگ
چراست اینکه نداری زر از سیاه و سفید
فتاده در سر این رشته عقده در نه

از تو نبود نغمه و سازی که در چنگ منست
چون دولت را بیچ و تاب از رشک آهنگ منست
هرگز در گفتار فخر تست آن ننگ منست
گر ز اهل و ذوق دل وگوی از عسل بر داست
مدان که خوبی آرایش غزل برداست
بسعی فکر رسا جا بدان محل بر داست
متاع من ز نهانخانهٔ ازل بر دست
مضمون غیر و لفظ خودش بر زبان اوست
سر گنج شائگان که بود رائگان اوست
گر پیش از و گذشته و گر در زمان اوست
گوئی به بزم اهل سخن ترجمان اوست
می لرزد از (؟) و دلم راز دان اوست
گو خوش بخوان که ابجد مدح خوان اوست
نی دستخط نه مهر نه نام و نشان اوست
یعنی بدست هر که بیفتد از آن اوست
اضطراب بلبلی و ترکتازی بوده است
درد و داغی بوده است و برگ و سازی بوده است
نمی رسد بتو خار و خسی ز هیچ سبیل
بود برزق ضرور یه عباد کفیل
چراست اینکه نیابی بر از کثیر و قلیل
نمردهٔ تو و نه رازق العباد بخیل

ز چند سال بمرگ تو و تباهی رزق — شد است حکم خود از پیشگاه رب جلیل
فرشته که وکیل است بر خزائن رزق — نکرد هیچ توقف به رزق در تعطیل
دوم فرشته که یا وشش بخیر مقرون باد — روا نداشت در افلاک شیوهٔ تعجیل
لطیفه گفتم از قول شاعرے تضمین — که در لطیفه مرا در اکسے نبود عدیل
اگر خدائے بداند که زندهٔ تو هنوز — هزار مشت زند بر دهان عزرائیل

چوں الف بیگ در کس سالی — پسرے یافت سر بسر غمزه
نام او همزه بیگ کرد ابے — الف منحنی بود همزه

هرکس ز حقیقت خبرے داشته است — بر خاک ره عجز سرے داشته است
زاهد ز خدا ارم بدعوے طلبد — شداد بهانا پسرے داشته است

به آدم زن، به شیطاں طوق لعنت — سپردند از ره تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم — گراں تر آمد از طوق عزازیل

کرده جهدے که در ویرانی کاشانه ام — چرخ در آرایش هنگامهٔ عالم نکرد
گر به هجوت رانده باشم نکتهٔ بر خود مپیچ — زانکه حرفے زانچه گفتم خاطرم خرم نکرد
بیتے از استاد دیدم. ذوق کے بخشد لیک — هیچ در تسکین نغز و دو ز وحشت کم نکرد
هجو تو نا قابلے در صلب آدم دیده بود — زاں سبب ابلیس ملعون سجده بر آدم نکرد
ماشاء الله بودنت در صلب آدم تهمت است — پیش هرکس گفتم ایں اندیشه باور هم نکرد

وید ی آں بدگهر و مهر و دلالیش به یزید — که بخشم آید اگر زشت و پلیدش گویند
زانکه او خود پسر ابن علی تیغ ترا اند — خواجه از ننگ نخواهد که یزیدش گویند
گفتم البسته که شبیر بداں سے ارزد — که شهیدش بنویسند و سعیدش گویند
گفت زاں رو که عزیزاں همه مسلم بودند — نتواں کرد گوارا که شهیدش گویند

ایکه شایستهٔ آنی که ترا — جم و فغفور و سکندر گویم

چوں نداری سر شاہی ناچار　　حاکم و والی و داور گویم
لیک غم سخت گرفتست مرا　　غم نگویم در از در گویم
زاں نیارم کہ باندازۂ شوق　　مدح نواب گورنر گویم
چارہ اینست کہ چوں غمزدگاں　　غم دل پیش تو کمتر گویم
گر زبے مہری گردوں نالم　　گر ز ناسازی اختر گویم
چوں تو دانی کہ چہ حالست مرا　　از ادب نیست کہ دیگر گویم
گویم ایں سال مبارکبادت　　ویں دو صد سال برابر گویم

ہزار بار فزوں گویم و کم است ہنوز　　گورنری بہ چنیں تا من مبارکباد

اے خداوند ہنر مند خبیر دوربین　　مہر دیدار ز فلک مرتبہ سلیل بدن
بامید توام از یاری اختر فارغ　　در پناہ توام از گردش گردوں ایمن
حیف باشد کہ ز الطاف تو ماند محروم　　ہمچو من بندۂ دیریں و نمکخوار کہن
نالم از غم کہ نہ شائستہ و درخور باشد　　خاص در عہد تو ناکامی و نومیدی من

غالب کی مرغوب اشیاء

غالب من و خدا کہ سر انجام برشگال　　غیر از شراب و انبہ و برفاب و قند نیست
ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد　　غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

تعلقات خانگی کی ناخوشگواری

زانجا کہ دلم بوہم دربند نبود　　با ہیچ علاقہ سخت پیوند نبود
مقصود من از کعبہ و آہنگ سفر　　جز ترک دیار و زن و فرزند نبود

اے آنکہ براہ کعبہ روے داری　　دانم کہ گزیدہ آرزوے داری
ایں گونہ کہ تند می خرامی، دانم　　در خانہ زن ستیزہ خوے داری

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود　　از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بجہاں خانہ و زن نیست درو　　نازم بخدا چرا توانا نبود

گیر کہ در روز حشر چوں تو یقینی　　بر سر دوزخ نہند تیرہ نشیمن

لیک نباشد دراں ضیق مصیبت — درطلب نان و جامہ کشمکش از زن
لیک نباشد دراں مقام صعوبت — شور تقاضائے نارواے مہاجن

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ہرچند سبکدوش ہوئے بت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود — قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہمکو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ — جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے — ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ز وہم نقش خیالی کشیدہ ورنہ — وجود خلق چو عنقا بد ہر نایاب است

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است — بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہاں مارا — قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ تست

رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند — دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست — ہرجا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

کفر و دیں چیست جز آلایش پندار وجود — پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دیں تو شود

خرابیم در رضایش در خرابی ہائے ما باشد — ز چشم بد نگہدار و خدا ما دوست کاماں را

قفس و دام راگناہے نیست — ریختن در نہاد بال و پر است

سپہر با تو بتاراج ما کمر بستہ — نہ ہرچہ وزد و ز ما برد در خزانۂ تست

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود — خوش بود گر وانہ نبود دام را

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے — مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بیخبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

بس ہجوم ناامیدی خاک میں ملجائے گی — یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — ناامیدی اسکی دیکھا چاہیے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

شادم زورود دل کہ بمغز شکیب ریخت — نومیدئے کہ راحت جاوید بودہ است

ہرگونہ حسرتے کہ ز ایام مے کشیم — در وتہ پیالہ امید بودہ است

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق ای خضر — نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی!

پاک خورام روز و زنہار از پے فردا منہ — در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش است

"بادہ زمے بر آئینہ پرہیز" گفتہ اند — آرے ورع مصلحت آمیز گفتہ اند

درقالب طلا اثر ش پردہ کش شد — خاکے کہ قضا در تن گوسالہ فرو ریخت

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت — پرسد چرا کہ نرخ مے لعل فام چیست ؟

رضواں چو شہد و شیر بغالب حوالہ کرد — بیچارہ بازداد و مے مشکبو گرفت۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد   یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اپنی شاعری کے متعلق پیشین گوئی

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن   این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است   شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن
مطرب از شعرم بہ بر زمے کہ خواہد زد نوا   چاک ہا از جیب پیراہن خواہد شدن
حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت   دستگاہ ناز شیخ و برہمن خواہد شدن

نفس شاعری کے متعلق پیشین گوئی

ہے چہ میگویم! اگر این ست وضع روزگار   دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن
چشم کور آئینہ دعوے تکلف خواہد گرفت   دست شل مشاطہ زلف سخن خواہد شدن
شاہد مضمون کہ اینک شہری جان و دل است   روستا آوارہ کام و دہن خواہد شدن
زاغ زاغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زنان   ہم نوائے پردہ سنجان چمن خواہد شدن

انجام گیتی

کل من علیہا فان

شاد باش اے دل درین محفل کہ ہر جا نغمہ ایست   شیون رنج فراق جان و تن خواہد شدن
ہم فروغ شمع ہستی تیرگی خواہد گزید   ہم بساط بزم مستی پر شکن خواہد شدن

ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

گرد پندار وجود از رہگزر خواہد نشست   بحر توحید عیانی موجزن خواہد شدن

غزل

مصورِ جذبات حضرت ثاقب لکھنوی مدظلہٗ

تیرا بسمل بھی کر پھر کیوں بمشکل رہ گیا
اے شبِ وصلت یہ کیا داغ دل پر رہ گیا

موت ہی اچھی کہ آئی تو مراد اہلِ ہجر
میری شہ رگ سے لپٹکر اُن کا خنجر رہ گیا

عشق کی دو ایک راہیں ہیں تو دل کو ڈھونڈلو
مجھکو کیا معلوم کس کوچے میں مر کر رہ گیا

رات بھر نقش و نگارِ خونِ دل میں تھی نمود
صبح کے ہوتے ہی سادہ ہو کے دفتر رہ گیا

اس اندھیرے گھر میں تھی یارب یہ کیسی روک ٹوک
جتنا مجمع ساتھ تھا تربت کے باہر رہ گیا

نبلے عبرت کی زباں کتنا رہیگا کچھ نہ پوچھ
صحنِ گلشن میں اگر میرا کوئی پر رہ گیا

مرنیوالوں کو نہ پوچھ اے کشتۂ نیرنگِ دہر
بس اسی کی زندگی ہے جو تڑپ کر رہ گیا

خوب سنبھلا میں نگاہِ مست ساقی کے حضور
کانپتے ہاتھوں سے گرتے گرتے ساغر رہ گیا

میں نہیں لیکن مرا افسانہ اُنکے دل میں ہے
جانتا ہوں کہ کس رگ میں یہ نشتر رہ گیا

مٹ گیا دنیا سے ہر نقشِ وفا اے دل مگر
یہ تعجب ہے کہ تیرا نام کیونکر رہ گیا

سر فروشِ مے ہیں ہم ساقی رہے اسکا خیال
خون آ لیگا جو خالی کوئی ساغر رہ گیا

امتحانگاہِ جہاں میں انتخاب اتنا ہوا
اک مرا سر ایک قاتل ایک خنجر رہ گیا

انکی بزمِ ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی
نالہ کش برسوں کا اک تصویر بنکر رہ گیا

ایک رگ باقی ہے اسپر بھی ہے قاتل کی نگاہ
عمرِ ہمدم اور تیرا ساتھ دم بھر رہ گیا

رات دن کرتے ہیں ثاقب دوست کے گھر کا طواف
کچھ ملے ہی گا جو گردش میں مقدر رہ گیا

ولہ

دل کہاں ہاں ذکرِ دل سینے کے باہر رہ گیا
خنجر آنکے پاس میرے دوش پر سر رہ گیا

آشیانے کے تنزل سے بہت خوش ہیں گل و
اس قدر اترا کہ پھولوں کے برابر رہ گیا

شام ہونیکے لئے کافی ہے بزم دہر میں
وہ جگر کا داغ جو آنکھوں کے اندر رہ گیا

دنگ ہے صیاد سنکر ذکر شبہائے قفس
عمر جو گزری چمن میں اُسکا دفتر رہ گیا

قصہ طوفانوں کا دھو دونگا دلوں سے ایکدن
گر شب فرقت رہی اور دیدۂ تر رہ گیا

مرنے والوں نے بڑی مشکل سے کھولی تھی زباں
آپ کے آگے کہاں وہ شور محشر رہ گیا

توڑ کر پھینک اس کو میرا خون ناحق پوچھکر
رات دن تجھکو رلائے گا جو خنجر رہ گیا

صبر کی سل رکھ کے دل پر پھر کوئی اٹھا نہیں
لوح تربت بنکے سینے پر یہ پتھر رہ گیا

ضعف میں تھک کر کہیں بیٹھا تو اٹھنا محال
نقش پا ہوں رہگیا جس سرزمیں پر رہ گیا

اک لحد پر لوح حسرت نصب ہے اے ظلم کیش
یہ ہے منزل اُس مسافر کی جو تھک کر رہ گیا

در پہ لینے کے لئے آیا تھا کچھ دینا پڑا
اٹھ گیا میں سنگ در پر جب مرا سر رہ گیا

کھل گیا دروازۂ زنداں ہمیشہ کے لئے
جو مرے سر نے بنایا تھا وہی در رہ گیا

دل کے نالے سد راہ صبح تھے شام فراق
ہو کے اونچا نعرۂ اللہ اکبر رہ گیا

شکوۂ کم یابی ہے دل کو زیبا ہو تو کیوں ؟
دیکھ کر ساقی کا منہ محفل میں ساغر رہ گیا

دست برد چرخ سے بچنا کسی کا تھا محال
درد دل ثاقب مرے سینے میں کیونکر رہگیا

تنقید و تبصرہ

" اصلاح سخن "

حضرت شوق سندیلوی نے ستم کیا کہ وقت واحد میں تیس چالیس استادوں کے شاگرد ہوگئے۔ یہ بھید کہ وہ دوسرے سے بھی اصلاح لیتے ہیں۔ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ اور ہر ایک کے پاس ایک ہی غزل بھیجکر اصلاح کی درخواست کی۔ استادوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق مختلف بلکہ بعض صورتوں میں متضاد اصلاحیں دیں۔ ایک ہی شعر کو کسی نے لغو بتا کے کاٹ دیا دوسرے نے اسی کی داد دی، اور کئی کئی صاد بنا ئے چند سال میں اصلاحوں کا کافی ذخیرہ جمع ہوگیا تو ہرجائی شاگرد نے اپنی اصلی غزلیں اور سب استادوں کی اصلاحیں " اصلاح سخن " کے نام سے یک جا چھاپ دیں کہ مشاہیر شعرائے عصر کے مذاق شعر کی یادگار رہے۔ استادوں نے اصلاح کے ساتھ جو خطوط وقتاً فوقتاً بھیجے تھے انہیں بھی اصلاح سخن کے ضمیمے میں شائع کر دیا ہے۔ ان میں بعض استادایسی بے تکلفی کی باتیں لکھ گئے ہیں، کہ شاید انہیں چھپا ہوا دیکھ کر شرمائیں گے۔ اور پیچ و تاب کھائیں گے۔ مگر لائق شاگرد اپنے التماس میں لکھتے ہیں کہ " اگر استاد کو یہ امر کچھ ناگوار گزرے تو مجھے معاف کریں میں نے جو کچھ کیا ہے وہ ضیافت طبع ارباب ذوق کے لئے کیا ہے اور اساتذۂ معتبر کے فیوض عام کرنے کے لئے " اس عذر گناہ کے باوجود مجھے امید نہیں کہ ہندوستان کے سنجیدہ حلقوں میں مصنف کی یہ شوخی مقبول ہو۔

بہر حال اصلاح سخن اپنی وضع کی بالکل نادر کتاب ہے اور اس میں ایک خاص قسم کی دلچسپی ایسی پیدا ہوگئی ہے کہ خواہ مخواہ پڑھنے کو جی گدگداتا ہے۔ لیکن موضوع کتاب کے اس اجمالی بیان پر تبصرہ ختم نہیں ہوتا۔ کیونکہ " اصلاح سخن " دراصل ہمارے شاعری

کے تخیل کا ایک سبق آموز مرقع پیش کرتی ہے اور شوق صاحب کی ان سولہ غزلوں اور انکی اصلاح کے اس مجموعے میں ہم اپنی شاعری کی بعض عجیب و غریب خصوصیات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ہر شاعر خاصکر ہر "استاد" کا دیوان ان خصوصیات کا حامل ہوتا ہے مگر ہمارے کلیاتِ دواوین کو اوّل سے آخر تک پڑھنا دشوار ہے۔ برخلاف اس کے اصلاح میں مختلف شعرا کی طبع آزمائی نے بزم مشاعرہ کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے اور اسکے مطالعہ میں دلچسپی قائم رہتی ہے۔ ان خصوصیات کے خلاف جنکا اوپر میں نے اشارہ کیا، مولوی حالی مرحوم اور نئے مذاق کے لوگوں نے پچاس برس سے لڑائی پائندہ رکھی ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ ہندوستان کے بیالیس مشہور معصر شعرا میں جن سے شوق صاحب نے اصلاح کی درخواست کی، سوائے سر محمد اقبال کے باقی سب اس قدیم طرز شاعری کے دلدادہ ہیں اور گو زبان سے اسے "وہبی" کہتے ہوں لیکن حقیقت میں اسے ایک اکتسابی چیز سمجھتے ہیں اور بے بھی یہی کہ ہم نے شعر کو ایسی محدود قسم کی صنعت بنالیا ہے کہ تھوڑی سی مشقت و مہارت سے ہر موزوں طبع شاعر بن سکتا ہے۔ گویا ہماری شاعری ایک ادنیٰ قسم کی موسیقی رہ گئی ہے۔ اگرچہ اسے گایا نہیں جاتا بلکہ بھونڈے پن سے تحت اللفظ پڑھا جاتا یا بصورت تحریر کاغذ پر لکھ دیا جاتا ہے۔

لیکن اس طول طویل بحث کو چھوڑ کر اصلاح سخن کے سلسلے میں ایک عجیب رسم کی مثال پیش کرتا ہوں جس کی معقولیت سمجھنے سے میں ہمیشہ قاصر رہا :-

شوق صاحب کی پہلی ہی غزل کا دوسرا مطلع یہ ہے ؎

آج پورا تھا مقدّر کا لکھا ہو جانا یوں ترے عشق میں انگشت نما ہو جانا

غالباً ہر استاد نے جن کے پاس غزل بھیجی گئی تھی۔ اس شعر میں کچھ نہ کچھ ترمیم فرمائی ہو گمر ذیل میں صرف آٹھ استادوں کے افادات نقل کرتا ہوں کہ انہوں نے اصلاح دے کر اس شعر کی کیا سے کیا صورت بنا دی۔

(۱) بزم اغیار میں اس بت کا خفا ہو جانا — جان نثاروں کا سبھی انگشت نما ہو جانا
(۲) مجھکو ڈر ہے کہیں تجھکو بھی کرے یہ بدنام — یوں مرا عشق میں انگشت نما ہو جانا
(۳) وہ ترا شرم سے پابند حیا ہو جانا — وہ مرا خلق میں انگشت نما ہو جانا
(۴) اہل باطن کیلئے عزت دارین ہے یہ — عشق دلدار میں انگشت نما ہو جانا
(۵) چاند کو دعوئے الفت ہے تو سیکھے — جستجو میں تری انگشت نما ہو جانا
(۶) شہرت عشق کی معراج ہے مانند ہلال — تیرے بدنام کو انگشت نما ہو جانا
(۷) کہہ رہا ہوں یہ نوسی کہ ہنسی کھیل نہیں — اس طرح عشق میں انگشت نما ہو جانا
(۸) آخر اس بت کی تغافل نے کیا کام تمام — آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہو جانا

میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ ان میں سے ہر شعر شاگرد کے شعر سے بہتر ہے مگر سوال یہ ہے کہ کوئی غیرتمند یا صداقت پسند شاگرد اس بات کو کیونکر گوارا کریگا کہ اپنا شعر کاٹ کے اس کی بجائے استاد کا شعر غزل میں داخل کرے اور اسے اپنا ہی سمجھے اور اپنا ہی کہہ کے دوسروں کے سامنے پیش کرے ؟

ہمارے ملک میں شاعری کا جو مضحکہ انگیز تخیل لوگوں کے دل میں جاگزیں ہے۔ اس کے ثبوت میں شاید یہی ایک مثال پیش کردینی کافی ہوگی۔

اصلاح سخن (۲۳۴) صفحے پر بہت صاف ستھری چھپی ہے اور تین روپے میں حکیم بہاؤالدین صاحب صدیقی وہائٹ گنج ہردوئی کے پتے سے مل سکتی ہے فقط

اندھیرا

ابھی سورج ڈوبا نہیں تھا لیکن اسکی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ آسمان پر بادل پچھم کی طرف سر جھکائے ہوئے سنہری کرنوں میں اُبنے ہوئے پیتل کی طرح چمک رہے تھے۔ ہوا دن بھر کی تھکی ہوئی رُک رُک کر چل رہی تھی، چڑیاں بسیرے کیلئے اونگھتی درختوں پر جمع ہو رہی تھیں۔ بھگواندین ایک پاسی، اور منگل، اسی گانوں کا ایک کرمی شہر سے گھر واپس جا رہے تھے انکے سامنے سڑک ایک سفید تاگے کیطرح جس کا سرا کھو گیا ہو، دور تک پڑی دکھائی دیتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف جیسا کہ ہندوستان میں ہر جگہ پایا جاتا ہے نالے تھے۔ نالے کے پار کبھی ادسر کبھی کھیت، اور ذرا دور درختوں کے آڑ سے جھانکتے ہوئے گانوں، یا جھومتے ہوئے آموں کے کنج۔

رات اندھیری ہونے والی تھی اور انکا گانوں ابھی بہت دور تھا، اس لئے دونوں قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد بھگواندین ٹھہر گیا اور چاروں طرف دیکھ کر کہنے لگا

"اب سانجھ ہوئی گئی، دن دن تو پہنچ نہ پیبا[۵۱] آؤ جرا سستائی لیں"

سستانے کی ضرورت سب سے بڑی دلیل اُس کے پاس یہ تھی کہ وہ دونوں پسینہ میں نہائے ہوئے تھے، اور ہانپ رہے تھے۔ منگل بھی کافی تھک گیا تھا، لیکن وہ بیکار دیر کرنے پر راضی نہیں ہو سکا۔

"سستائی سکے کا کری ہو، سہج سہج چلے چلو۔ اندھیری رات مال کا مالوم کا ہوئی جائے"

"ہوئی کا جئی[۵۲] ہے؟ کون سا کھجانا لئے جات ہو جو تم کا چورن کا ڈر ہے" بھگواندین نے کہا، اور سڑک کے کنارے ایک درخت کی جڑ پر جا کر بیٹھ گیا۔ منگل نے پورب سے بڑھتے ہوئے اندھیرے کی طرف دیکھا، پھر آگے کی طرف مگر بھگواندین کے پاس ایک جگہ ڈھونڈ لی۔

---

[۵۱] پائیں گے۔

[۵۲] ہو کیا جائے گا

تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا

"ہم کہن کہ رات اندھیری ہوئی ہے، سڑک جیسی ہے تم آپے جانت ہو۔ کہوں گڈھا مان پیر پڑگوا تو رات بھر بیٹھ کے کون ما ٹانگ سینکی ہے۔"

گڑھے وڑھے کچھو ناہیں ہیں۔ تم یار اندھیارے مان ڈرات ہو" بھگواندین نے سکرا کر کہا اور اپنی بات کا اثر معلوم کرنے کے لئے اُس نے منگل کی طرف دیکھا منگل نے تیوری چڑھائی اور زمین کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"تم جیسے پہلوان کے ساتھ بھلا کون ڈرتی ہے۔ تم تو ایک ہاتھ مان دس چورن کا لٹائی دیو......"

ای مان گستہ کھوئی کی کون بات ہے۔ ہم تو ایسن ہنسی ماں کہدے رہن ..." بھگواندین کے لہجہ میں اس قدر افسوس اور پشیمانی تھی کہ منگل کی خفگی جاتی رہی لیکن اُس نے اسے چھپانے کی کوشش کی اور کہا

"جانت ہن تم ہاسی جات کے ہو۔ لاٹھی باندھت ہو۔ مگر دوسرے آدمی کا کھیال تو رکھا کرو...."

بھگواندین نے اس کے جواب میں صرف اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا، ٹھنڈی سانس بھری اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

جب وہ اُٹھ کر پھر چلے تو سورج ڈوب چکا تھا۔ پچھم کی طرف سے کچھ دھندلی سی روشنی کے سوا راستہ دکھانے کے لئے اور کوئی سامان نہ تھا۔ سڑک جیسی خراب اور خطرناک منگل نے بتائی تھی نہ تھی، مگر شام کے وقت راستہ چلنے والے کو ڈرانے کے لئے، اگر وہ دل کا کمزور بھی ہو سڑک کے دونو طرف گڑھے کافی تھے، اور چھوٹے چھوٹے پل بھی، جن میں خواہ مخواہ خیال ہوتا ہے کہ چور چھپے بیٹھے ہیں۔ رفتہ رفتہ جو ذرا سی روشنی تھی وہ بھی جاتی رہی، سڑک بجائے سفید کے

لہ سینکے گا۔ ۲ عرصہ ہوئے

مٹیالے رنگ کی ہوگئی۔ گڑھوں میں اندھیرا گاڑھے پانی کی طرح بھر گیا۔ جھاڑیوں اور درختوں نے ایک کالی کالی سی لٹ ڈال لی۔ درختوں پر چڑیاں چپ چاپ سو رہی تھیں اور سوا منگل اور بھگواندین کے قدموں کی آہٹ کے ہر طرف، ہر طرف خاموشی تھی۔

منگل کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، اور اتنا روپیہ بھی نہ تھا کہ اسے چوروں کا ڈر ہو لیکن اُس کی حرکتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے حواس قائم رکھنے کی خاص کوشش کر رہا ہے۔ اگر کبھی اُس کا پیر لے اُٹکل تو وہ کانکھتا یا گالی دیتا کسی طرح سے اپنی جھنجھلاہٹ اور گھبراہٹ کو ظاہر کرتا۔ اگر کبھی اسے کوئی چیز ہلتی یا چلتی نظر آتی تو وہ کانپ جاتا اور غور سے اُس طرف دیکھنے لگتا۔ بھگواندین نے اُس کی کیفیت کو محسوس کیا اور دلاسے کے لئے کہنے لگا

"ہمری سمجھ ماں یو کبھوں نہ آوا کہ لوگ بھلا ڈرات کاہے کا ہیں جو کبھوں جنگل ماں ہوئے شیر چیتے ہوئیں، سانپ بچھو ہوئیں تو بات تو ہے۔ یہاں تو سب آپے آپ ڈرائے جات ہیں" اور یہ دکھانے کے لئے کہ اُس کا اشارہ منگل کی طرف نہیں اُس نے ایک بات[1] اور جوڑ دی

"اب ہمرے اپنے گاؤں دیکھو۔ کیو ڈرات کا گھر سے دس کدم باہر نا ہیں جات ہے۔ بھلا یو بات کا ہوئے؟"

لیکن منگل نے تقریر کے آخری حصہ کا خیال نہیں کیا اور سمجھ گیا کہ بھگواندین نے سارا حال معلوم کر لیا ہے اور اب اُسے اپنی بہادری دکھانا چاہتا ہے۔ بھگواندین نے اُس کی بدگمانی اور بڑھا دی:

"ہم سے سب ہیچار بار کہن، رات کا ہواں نہ جاؤ، دن کے بارہ بجے شہید مردن پر نہ جاؤ، درکھت پر نہ چڑھو، یو نہ کرو، اُو نہ کرو۔ ہم ایک نہ مانن، جو من ماں آوا سو کیا، اور ابہیں تک دیکھو جندہ ہن۔"

منگل نے اپنی جھنجھلاہٹ دکھانے کے لئے بجائے خود بھگواندین پر حملہ کرنے کے اُس کی بات کو

---

[1] ایک بات بھی ہے۔

غلط ثابت کرنا چاہا اور منہ بنا کر کہا۔

"مونھرا یو تو سب ہی گر گاؤں والن پار سال جون موچی مرگوا رہے۔ اُوسے پو چھو سے کہن کہ ای راستے پر ہم کا وہی بھوت ملے ہے جون¹ دوئی برس پہلے ایک ابہیر کا پچھا کیو رہے ایک نہ سنی۔ آخر بھیّا² کا۔ دوئی دن بہوس پڑے رہے تیسرے دن ٹھنڈے ہوئی گئے۔"

منگل کے لہجے سے بھگوانڈین سمجھ گیا کہ اس نے اس کی بات بری مانی ہے، مگر بجائے جواب دینے کے اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ۔ ۔ ۔"

"اب ای کا کوئی کا کرے۔ جی کا مرنا ہوت ہے اوکی بہوس کب ٹھیک رہت ہیں"

"یو تو سبھی جانت ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

"ہم تو یو جانت ہن ۔ ۔ ۔ آدمی کا نہ چور ڈرائے سکت ہیں نہ شیر چیتے نہ بھوت پریت ۔ ۔ ۔ آدمی خودی اپنے آپ کا ڈراوا کرت ہے ۔ ۔ ۔ ہمرے چاچا ناوت رہیں ۔ ۔ ۔"

اور یہاں پر بھگوانڈین نے ایک قصہ سنایا جو اُسکے چچا کے بچپن کا ایک واقعہ تھا۔ اسی گاؤں میں جاڑے کے موسم میں ایک مرتبہ رات کے وقت کچھ لوگوں نے آگ جلائی تھی اور اُس کے چاروں طرف بیٹھے ہاتھ پیر گرم کر رہے تھے۔ ہر طرف سے انہیں اندھیرا گھیرے ہوئے تھا۔ ایسا اندھیرا جس میں ستاروں کی نازک شرمیلی روشنی زمین سے کہیں اوپر ہی رہ جاتی ہے۔ جیسے تیر گھنے درخت کی شاخوں میں اٹک جاتا ہے۔ مگر یہ اُس اندھیرے کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک کالا ہیبت ناک دیو اُس بیچاری آگ کو بھی نگل رہا ہے۔ کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے اس کی طرف لپکتا ہے اور اُسکی گردن مروڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آگ ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح کبھی جھپٹ کر اس کونے میں پناہ لیتی کبھی اس میں۔ کچھ دیر تک تو لوگ یہ تماشا دیکھتے رہے لیکن رفتہ رفتہ ان پر بھی اسکا اثر پڑنے لگا۔ اور آخر کار جب اندھیرا حملہ کرتا اور آگ اُس سے بچنے کی کوشش کرتی تو انکے

---

¹ جس نے۔ ² کیا تھا۔ ³ ہوا کیا۔

بھی، رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور وہ ایک دوسرے سے اور لس کر بیٹھ جاتے، گویا کہ انہیں اپنی جان بھی خطرہ میں معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت انہیں چاہئے تھا کہ کسی طرح کی گفتگو چھیڑ دیں اور اپنی توجہ دوسری طرف کرلیں۔ مگر جب کھیتی پر رانے زنی ہو چکی تو سب خاموش ہو گئے اور اندھیرے کے خوف کو دور کرنیکے لئے انکی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ کوئی ایک گھنٹہ تک سب ایسے ہی سہمے بیٹھے رہے، اور کسی کے منہ سے ایک بات نہ نکلی۔ سونے کا وقت بھی آگیا۔ لیکن آگ کے پاس سے کوئی نہ اٹھا۔

بھگوا ندین کا چچا جو اس زمانہ میں ایک لڑکا تھا اور اپنے بے تکے پن کے لئے مشہور تھا، سب کے چہروں کو دیکھ کر بول اٹھا

"یہ تو جان پڑت ہی، ایسی رات ہوے جے اں بھوت پریت مہوں کی طرح درکھت پر سے ٹپکت ہیں"۔

یہ سنتے ہی سب کے سب چلا اٹھے۔ عورتوں نے اُسے برا بھلا کہنا شروع کیا مرد اُسے سمجھانے لگے لیکن جس خیال کو بھگوا ندین کے چچا نے ظاہر کیا تھا وہ سب کے دلوں میں موجود تھا۔ بے اختیار سب ڈراونے قصہ سننے سنانے لگے، اور جتنا انکا ڈر بڑھتا تھا اتنے ہی زیادہ شوق سے سب قصہ سنتے تھے۔ ایک پیاس سی سب کو لگ گئی جو بڑھنے سے اور تیز ہوتی تھی۔ ایک نے پاس کے گاؤں کے ایک پہلوان کا قصہ سنایا۔ وہ ایک بہت بہادر آدمی تھا اور بھوت پریت کی کہانیوں پر ہنسا کرتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ جب وہ ایک باغ سے اندھیری رات کو گذرا تو کسی نے ایک درخت پر سے کہا،

"اب کی بچا اچھے پھنسیو[1]"

پہلوان سے لوگوں نے کہا تھا کہ بھوت پریت ناک سے بولتے ہیں، اور یہ آواز بھی ویسی ہی تھی۔ مگر پہلوان کو پھر بھی یقین نہ آیا، وہ سمجھا کہ کوئی اُسے ڈرانا چاہتا ہے

---

[1] پھنسے

اور اُس نے للکار کر کہا :

"آؤ نکل آؤ۔ دیکھیں تم کا کرتے ہو"

اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا۔ دوسرے دن ایک اہیر نے اُسے باغ کے کنارے پڑا پایا۔ اُسکا چہرہ نیلا ہو گیا تھا آنکھیں باہر گری پڑی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی نے اُس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اُسی کے پاس ایک ٹوٹی لاٹھی بھی پڑی تھی۔

سُننے والوں نے "دیّا رے دیّا رے" کی صدا بلند کی پیچھے پھر پھر کر دیکھنے لگے ایک کوچھینک آئی تو سب کانپ گئے اور چلا اُٹھے مگر یہ قصہ ختم ہی ہوا تھا کہ ایک بڈھا اپنی بیتی ایک کہانی سنانے لگا اور سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بڈھے کی عمر کوئی ستر سال کی تھی اور وہ بولتے بولتے اکثر کھانسنے کھنکھارنے کے لئے رُک جاتا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اُسکا بیان اتنا اچھا تھا کہ سب سانس روکے سنتے رہے

بڈھے نے پہلے تو اپنی جوانی کا حال بتایا۔ وہ بہت تیز دوڑا کرتا تھا، اور راور کئی میل ایک ہی رفتار سے جا سکتا تھا۔ آس پاس کے زمینداروں میں وہ ڈاک گاڑی کے نام سے مشہور تھا اور جب کبھی کوئی سندیس بہت جلد بھیجنا ہوتا تو وہ اُسے بلایا کرتے تھے ایک مرتبہ وہ ایسے ہی کسی کام سے رات کو واپس آرہا تھا، اندھیرے میں راستہ بھول گیا اور ایک کنج میں گھس گیا جہاں ایک بھوت رہا کرتا تھا۔ وہ ایک درخت کے نیچے سے گذر رہا تھا کہ ایکبارگی اُس کی نگاہ اوپر کی طرف اُٹھ گئی اور اُس نے دو گول گول، زرد اور چمکیلی آنکھیں دیکھیں جو اُسے گھور رہی تھیں۔ وہ جا ہے جس کی آنکھیں رہی ہوں، اس کو معلوم ہو گیا کہ کوئی اُس پر جھپٹنے والا ہے اور وہ الٹا بھاگا۔ جیسے وہ نیچے بھاگ رہا تھا ویسے ہی درختوں پر کی کوئی چیز اُچھلتی پھاندتی ہوئی اُسکا پیچھا کر رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک کھلے میدان میں پہنچ گیا اور اسی وقت کسی نے ناک سے چلا کر کہا۔

"اب کے سار نکل گیو، مگر پھر کبھوں اَیو تو گلا گھونٹ دیبا"

ڈبا خاموش ہو گیا۔ اُس کے بعد ہی کسی اور نے اپنی کہانی سنائی اور یوں ہی سلسلہ جاری رہا، بھوتوں کے ڈر نے سب کو ایسا بدحواس کر دیا تھا کہ وہ آگ میں لکڑی ڈالنا بھول گئے اور جب اسکا خیال آیا تو کسی کی جرات نہ ہوئی کہ جا کر اودھر اودھر سے کچھ لکڑیاں بین لائے ایک دوسرے کو للکارتے اور شرم دلاتے رہے لیکن معلوم ہوا کہ سب مجبور ہیں۔ وہ سب گویا کسی طاقت کے قبضے میں آ گئے تھے اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ آگ بجھتی گئی۔ اُس کی گرمی کم ہونے لگی تو ایک دوسرے کو دھکے دے کر حلقہ سے باہر نکالنے لگے۔ کچھ لوگ ان دھکوں سے بچنے کے لئے ہمت کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور آپس میں گھر جانے کے متعلق غور کرنے لگے۔ کوئی اکیلا جانے پر راضی نہیں تھا اور سب کے سب دو دو، نہیں تو الگ الگ ضرور تھے۔ مگر وہ بحث ہی میں مشغول تھے کہ ایک لڑکی کے ماتھے پر ایک سوکھی پتی آ کر لگ گئی جیسے ہوا کسی طرف سے اڑا لائی تھی۔ لڑکی چیخ اٹھی جو لوگ گھر جانے کے لئے کھڑے ہوئے تھے وہ سب بھاگ کر واپس آ گئے اب سارے کے سارے کھڑے ہو گئے۔ سردی اور ڈر سے سب کانپ رہے تھے۔ ہرنوں کے ایک غول کی طرح جسے شکاریوں نے گھیر لیا ہو، کوئی ادھر بھاگنے کی صلاح دیتا تھا کوئی اُدھر لیکن دس قدم چل کر سب پھر واپس بھاگ جاتے اور پھر ایک ہی جگہ پر جمع ہو جاتے۔ . . .

"اب بتاؤ" بھگوا ندین نے منگل سے پوچھا "ای سب کون بھوت دکھین رہیں؟ سب آپے آپ تو ڈرات رہیں . . . . ."

منگل نے باوجود اپنی خفگی کے سارا قصہ بڑے غور سے سنا تھا، اور رات کی بھی آخرکار وہی حالت ہو گئی جو قصہ میں ان لوگوں کی تھی۔ درخت اُسے کالے بھجنگ بھوت معلوم ہونے لگے۔ جھاڑیاں عجیب عجیب خوفناک جانور بن گئیں۔ اگر آنکھیں کھولتا تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں کچھ دکھائی نہ دے، اگر بند کرتا تو ٹھوکر کھانے کے علاوہ یہ ڈر تھا کہ کہیں اُس پر کوئی اچانک حملہ نہ کر دے۔ اس کی کمر ٹیڑھی ہو گئی، سر جھکا کر کھانے لگا پیروں میں کپکپی آ گئی

بھگوانڈین کی بات کا اُس نے کچھ جواب نہ دیا، اور نہ اپنے آپ سے یہ پوچھا کہ یہ ڈر کس کا ہے اور کیوں ہے۔ بھگوانڈین نے یہ دیکھ کر منگل باتیں نہیں کرنا چاہتا اپنا مطلب سمجھانے کی اور زیادہ کوشش نہیں کی۔ اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دور وہ اسی طرح چلے تھے کہ منگل ایک مرتبہ سہمی ہوئی آواز میں "ہائے رے" چلایا اور اچک کر بھگوانڈین کے پیروں کے پاس گر پڑا۔ اُس نے اتفاق سے کہیں آنکھیں پوری کھول لیں اور آگے سڑک کے پاس اسے ایک بڑا چتکبرا جانور پچھلے پیروں پر بیٹھا نظر آیا اُس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ وہ ایک جھاڑی ہے اور کچھ نہیں، لیکن اندھیرے میں نہ حواس کہنا مانتے ہیں نہ خیال۔ جب وہ چل ذرا اور پاس پہنچا تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ جانور اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے منگل نے پھر اپنے حواس درست کرنے کی کوشش کی، لیکن دماغ میں جو تصویر بنی شروع ہوئی تھی وہ بنتی رہی۔ آنکھیں اسکی قریب قریب بند تھیں، مگر اس پر بھی اُسے دکھائی دیتا تھا اُس نے دیکھا کہ جب وہ جانور کے برابر پہنچا تو جانور نے ایک چھلانگ ماری۔ . . منگل اچک کر اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا، مگر وہ صرف لڑکھڑا کر بھگوانڈین کے پاؤں پر گر گیا۔

بھگوانڈین خود گھبرا گیا۔ اُس نے جلدی سے منگل کو اٹھا کر کھڑا کیا، اُس کے کپڑے جھاڑے اور پوچھا:

"تو تم کا بھلا ہوئی کا گوا جو آپے آپ گر پڑیو؟"

منگل نے ادھر اُدھر غور سے دیکھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ دراصل سب خیال ہی خیال تھا تو اُسے بہت شرمندگی ہوئی اور اپنے اوپر غصہ بھی آیا۔ مگر بھگوانڈین کے سوال کا اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بھئی دیکھو" بھگوانڈین نے کچھ دیر انتظار کر کے کہا، "تم پھر ایسا کری ہو تو ہم تم کا چھوڑ کے چلے جیبا۔ تم تو ہم ہوں کا ڈرائے دے ہو" [۱]

---

[۱] چلے جائیں گے

"جاؤ، چلے جاؤ۔ تم کا ہم کب روکے رہیں،" ننگل نے سوکھے لہجہ میں کہا۔ "ہم کا ترے نباگھر نہ پہنچ پیہا[1]۔"

بھگواندین کو ننگل کی حرکت بہت ناپسند آئی تھی، کیونکہ وہ سمجھ گیا کہ ننگل آپ ہی آپ ڈر گیا تھا۔ اُس کے بعد جب ننگل نے بجائے اُسکا احسان ماننے کے اور زبان درازی شروع کی وہ خفا ہو گیا اور ارادہ کر لیا کہ ننگل کو چھوڑ کر آگے نکل جائے گا لیکن کچھ قدم آگے چلنے کے بعد اسے رحم آگیا اور اُس نے ارادہ بدل دیا۔ اب ننگل کی باری تھی:

"جاؤ جاؤ، چلے کاہے ناہیں جات ہو!" اس نے دانت پیس کر کہا، جب اُس نے دیکھا کہ بھگواندین ٹھہر گیا، "تم سار بدنام ہم کا کرت ہو اور ڈرات کھودہو۔"

بھگواندین اسکے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ہم پچاس بار ای سڑک پر گئے ہیں، ہم کا کبھوں کچھ نہ دکھائی دیا۔ نہ ہم کبھوں ڈرائن آج بھگوان جانے ہم کا کا سوجھا جو تم جیسے نامرد کے ساتھ ہولئین[2]۔ کا کہن تری بڑھیا کا کھیال آئی جات ہی نہیں تو گردن مروڑ کے تم کا ای نالی ماں پھینک دیتین۔ تم جیسے نامردے . . . ."

ننگل پہلے تو بھگواندین کو غور سے دیکھتا رہا۔ جب بھگواندین نے گردن مروڑنے کی دھمکی دی تو اُس سے نہ رہا گیا، اور بھگواندین نے اپنا جملہ ختم بھی نہیں کیا تھا کہ اُس نے گھما کر بھگواندین کے ایک لاٹھی ماری۔ لاٹھی کنپٹی پر پڑی اور بھگوان دین چکر کھا کر گر پڑا لیکن ننگل نے اپنے وار کا نتیجہ نہیں دیکھا۔ لاٹھی مارتے ہی اس کے کانوں میں شور سا ہونے لگا۔ آنکھوں کے سامنے ایک پردہ پڑ گیا اور بغیر سوچے سمجھے وہ اُس جگہ سے بھاگا۔ جتنا وہ تیز بھاگتا تھا اور جتنی دور وہ نکلتا جاتا تھا اُتنا ہی اس میں اسکا احساس بڑھتا جاتا تھا کہ اُس کی حرکت کی خبر مشہور ہو گئی ہے۔ زمین درخت، ہوا سب جان گئے ہیں اور

---

[1] پائیں گے۔ [2] ہو لئے

اُس کے لئے کوئی بچنے کا طریقہ نہیں کبھی ایکبارگی اُسے سامنے ایک گڈھا نظر آتا، اور جب وہ اسے پھاند کر دوسری طرف پہنچتا تو معلوم ہوتا کہ کچھ بھی نہیں تھا، کبھی اُسکے سامنے درخت کا درخت آکر کھڑا ہوجاتا اور جب وہ سمجھا کہ بس اب ٹکر لگی اور سر پھٹا تو معلوم ہوجاتا تھا کہ سوائے ہوا کے کچھ نہیں۔ کبھی اُسے خیال ہوتا کہ درخت نالے نالیاں سب اُس کے پیچھے دوڑے آرہے ہیں اور سب مل کر اُسکا راستہ روک لیں گے۔ درختوں اور نالے نالیوں کی عداوت نے تو اُس کے دل میں اتنی وحشت نہیں پیدا کی۔ لیکن جب اسے ایکبارگی وہ قصے یاد آتے جو بھگوان دین نے اسے سنائے تھے تو اس کی ہمت جواب دیدیتی۔ مگر کیا ہوسکتا تھا؟

منگل بھاگتا رہا۔ کچھ دیر بعد جب اُسکا دم ٹوٹ گیا تو اس نے اپنی رفتار کم کی اور اپنے آپ سے پوچھا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔ اتفاق سے وہ سڑک ہی پر جارہا تھا اور کچھ سوچنے کے بعد اُس نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ وہ گاؤں ہی کی طرف جارہا ہے لیکن اسی پر اُسے یاد آگیا کہ آگے کے راستہ پر درخت بہت گھنے ہیں اور سڑک کے دونو طرف اونچے اونچے ٹیلے بھی ہیں۔ منگل نے پکا ارادہ کیا کہ اب بیکار کسی چیز سے نہ ڈرے گا۔ دل میں جو وہم باقی تھا اُسے نکالنے کی کوشش کی۔ مگر دیکھا تو ہاتھ میں لاٹھی بھی نہیں تھی۔ واپس جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔

پہلے تو وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا، اور اپنے اوپر قابو رکھا لیکن پھر بھی ذراسی آہٹ بھی ہوتی تو اُس کے کان کھڑے ہوجاتے۔ ایک مرتبہ سڑک کے پاس ایک درخت پر کچھ آواز سی ہوئی تو اُس نے اپنی چال تیز کردی۔ پھر یہ سوچ کر کہ اس رفتار سے چلا تو بہت دیر ہوجائیگی اُس نے دوڑنا شروع کردیا۔ دوڑرہا تھا کہ اُسے پیچھے سے کسی جانور کے چلنے کی آواز سنائی دی، اور مڑکر دیکھا تو واقعی کتے کے قد کا کوئی جانور آرہا تھا منگل نے فوراً طے کرلیا کہ یہ بھیڑئیے کے سوا کچھ نہیں اور پھر اسی طرح سے بدحواس ہوکر بھاگا۔ اگر

اُس نے اپنے پیچھے ایک نظر اور ڈالی ہوتی تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ جیسے وہ ایک طرف کو بھاگا تھا ویسے ہی لومڑی بھی دوسری طرف کو بھاگ گئی تھی۔ لیکن اُس میں اب اتنی جرأت کہاں تھی.....

وہ اس قدر تھک گیا تھا کہ بیہوش ہو کر گرنے والا تھا، مگر آخری وقت اُس کو دور سڑک پر ایک لمبا سا جسم پڑا ہوا دکھائی دیا۔ منگل نے دیکھتے ہی پکارنا شروع کیا:

"بھگوان دین! بھگوان دین!"

اُس کے پکارنے سے پاس کے درختوں پر کچھ چڑیاں جاگ اُٹھیں اور پر پھڑپھڑانے لگیں۔

شذرات

کیمبرج یونیورسٹی نے عہد جدید کی تاریخ پر مستند اور جامع کتابوں کا جو سلسلہ شائع کیا ہے وہی اہل علم کو اس علم پرور یونیورسٹی کا ممنون احسان بنانے کے لئے کافی تھا اب جو نیا سلسلہ عہد قدیم کی تاریخ کا چھپنا شروع ہوا ہے وہ اس علمی کارنامے کی تکمیل کردے گا اور کیمبرج کی عزت و احترام اور احسان مندی کا نقش طالبان علم کے دلوں میں اور بھی گہرا بٹھادے گا۔
اس سلسلہ میں تمام اقوام عالم کی قدیمی تاریخ لکھی جائے گی لیکن مرکزی حیثیت یونان و روما کی تاریخ کو حاصل ہوگی

بعض وقت دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یورپ کے علمی حلقوں میں قاموسوں، معلموں وغیرہ کی اتنی کثرت کہیں ذہنی انحطاط کا پیش خیمہ تو نہیں ہے مختلف قوموں خصوصاً مسلمانوں کی تمدنی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب لوگوں کے ذہن میں جودت، نظر میں بلندی اور فکر میں اجتہاد نہیں رہتا تو وہ بجائے نئی کتابیں لکھنے کے پرانی کتابوں کے مضامین کو جمع کرکے قاموس اور معلم بنایا کرتے ہیں یا انکی شرحیں لکھا کرتے ہیں یوروپ میں بظاہر یہاں تک تو نوبت نہیں پہنچی کیونکہ جو قاموس وہاں شائع ہوتے ہیں محض پرانی کتابوں کا مجموعہ اور خلاصہ نہیں بلکہ نئے مصنفوں کی علمی جدو جہد کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ یوروپ کو فکر و تحقیق کی جو داد دینا تھی دے چکا اب وہ محض اپنی ذہنی کمائی کو جمع اور محفوظ کرنے کی فکر میں ہے۔

حال میں جرمنی میں قدر دانان شکسپیر کی انجمن کا باسٹھواں سالانہ جلسہ ہوا تھا جس میں بہت سے وقیع مقالے شکسپیر کی تصانیف پر پڑھے گئے جن میں خاص طور پر قابل ذکر فریڈرک

گونڈولفٹ کا مضمون انسانی دکلیوپٹرا پر ہے۔ علاوہ شیکسپیر کی تصانیف کی ادبی اور علمی تنقید کے اس انجمن کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنے ملک کی اسٹیج کو شیکسپیر کے ڈراموں کا قدردان بنائے۔ انجمن کی رپورٹ میں بیان کیا گیا کہ ۱۹۲۰ء میں شیکسپیر کے مختلف ڈرامے ۱۸۰۵ بار جرمنی کے تھیٹروں میں دکھائے گئے۔ اس انجمن کے جلسوں اور سالانہ کارگذاری کی کیفیت ہر سال ایک **Year Book** میں چھپتی ہے جس کا مطالعہ ہر شیکسپیر کے شیدائی کے لئے لازمی ہے۔

لندن میں گذشتہ ماہ ڈاکٹر مانٹیسوری نے اپنے طریقۂ تعلیم کو سکھانے کے لئے متعدد لکچر دئے۔ انہوں نے کہا کہ اس طریقۂ تعلیم کے بنیادی اصول دو ہیں ایک تو یہ کہ اشیاء کے علم کے لئے محض تصور یا مشاہدہ کافی نہ سمجھا جائے بلکہ جس شے کا علم حاصل کرنا ہو اُسکا استعمال کرایا جائے۔ دوسرے یہ کہ تعلیم کے عمل میں بچہ کی توجہ کا مرکز استاد یا اُسکا حکم نہ رہے بلکہ خود اپنے افعال۔ انہیں اصولوں کے ماتحت بچوں کے ہاتھ سے ایسے بہت سے کام کرائے جاتے ہیں جن میں خاص توجہ کی ضرورت ہو تاکہ ایک تو کام کی فکر میں بچہ استاد کی موجودگی کو بھول جائے اور دوسرے اپنے کام کے موضوع کا واضح اور گہرا علم اُسے حاصل ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے مثال کے طور پر کئی کاموں کا ذکر کیا مثلاً کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح دوڑنا کہ شور نہ ہو۔ ایک گلاس سے دوسرے گلاس میں پانی اس طرح اونڈیلنا کہ ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے وغیرہ وغیرہ

ان میں سے پہلا اصول ظاہر ہے کہ بہت محدود دائرہ میں کام آسکتا ہے جو چیزیں علم کی موضوع ہیں اُنمیں سے بہت کم اُس طرح "استعمال" ہو سکتی ہیں جس طرح ڈاکٹر صاحبہ چاہتی ہیں۔ پھر بھی جہاں محسوسات کا تعلق ہے واقعی اس طریقہ سے بہتر کوئی طریقہ مشاہدہ کا نہیں ہے

ڈاکٹر صاحبہ کا دوسرا اصول بھی بعض شرطوں کے ساتھ قبول کئے جانے کے قابل ہے اس میں شبہ نہیں کہ بچوں کی طبیعت کو کسی چیز پر پوری طرح جانے سے اُن میں یکسوئی، سلیقہ اور صحت نظر پیدا ہوگی اور اپنی شخصیت اور ذمہ داری کا احساس بھی ہوگا لیکن یہ طریقہ ہمیشہ مفید نہیں ہے تعلیم کی جان وہ تعلق ہے جو اُستاد اور شاگرد میں ہوتا ہے اور وہ اثر جو ایک کا دوسرے پر پڑتا ہے اس لئے جہاں استاد کے لئے بچہ کی "شخصیت" کا احساس ضروری ہے وہاں کبھی کبھی بچہ کے لئے بھی یہ بہتر ہے کہ اُسکی توجہ کا مرکز استاد کی شخصیت ہو۔

کسی پچھلی اشاعت میں کلکتہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر جادو ناتھ سرکار کے خطبۂ صدارت پر تبصرہ کر چکے ہیں۔ حال میں پروفیسر رادھا کرشن نے بنگال کی انجمن مدرسین کالج و یونیورسٹی کے جلسہ میں جو تقریر کی ہے وہ ہمارے اُن خیالات کی بہت پر زور تائید کرتی ہے جنکا اظہار ہم نے اس موقعہ پر کیا تھا۔ پروفیسر صاحب دوران تقریر میں فرماتے ہیں "حکومت (ہند) کی تعلیمی پالیسی اپنے مقصد اور دائرہ عمل کے لحاظ سے بہت محدود رہی ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو ایک بیرونی حکومت کے اطاعت کیش اور کارگذار آلۂ کار بنانے میں کامیاب ہوئی لیکن انہیں ایک آزاد قوم کے خوددار شہری بننے میں اُس نے کوئی مدد نہیں دی"۔

جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ہندوستانی مدارس میں تعلیم دیجاتی ہے انکے متعلق پروفیسر صاحب فرماتے ہیں۔

"تاریخ ہندوستان کی تعلیم محض اس غرض سے دیجاتی ہے کہ ہمارے دل پر یہ نقش ہوجائے کہ ہندوستان ناکام رہا۔ غلامی کی سب سے بڑی شکل وہ مایوسی اور افسردہ دلی ہے جو مفتوح قوموں میں پیدا ہوجاتی ہے اور جس کے سبب سے انہیں اپنی ذات پر بھروسہ نہیں رہتا۔ سچی تعلیم کا منشا یہ ہونا چاہیے کہ افتخار قومی اور خودداری کی چنگاری

کو اُن (طوفانوں) سے بچا کر جو اُسے معدوم کرنا چاہتے ہیں روشن رکھے۔ اگر ہماری دولت اور وسائل معاش جاتے رہیں تو ہم انہیں کل حاصل کر سکتے ہیں لیکن اگر ہمارے دل سے قومی احساس جاتا رہے تو ہمارے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ گرے ہوئے اٹھ سکتے ہیں مگر مردے زندہ نہیں ہو سکتے ۔"

پروفیسر صاحب حکومت پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اُس نے قومیت کو زندہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ورنہ جب امریکہ باوجود اس قدر اختلاف کے ایک قوم بن گیا تو ہندوستان میں قومیت پیدا ہو جانا محال کیوں سمجھا جائے۔ آپ یونیورسٹی میں رفارم کے بڑے حامی ہیں۔ آپکے خیال میں یونیورسٹیوں کو قوم سے بہت گہرا تعلق ہونا چاہئے اور ہر یونیورسٹی کی مجلس تعلیمی میں قوم کے نمائندوں کی کافی تعداد ہونا چاہتے۔ موجودہ صورت کہ یونیورسٹیل کی مجالس تعلیمی ایک طرح کا دربار بن گئی ہیں جن میں کرسی دینے کے لئے صاحبان منصب وجاہ کی تلاش ہوتی ہے۔ آپ کے خیال میں سخت قابل افسوس ہے۔

خدا کرے پروفیسر صاحب کی یہ تقریر محض بنگالی خطابت کا نمونہ ثابت ہو بلکہ اسکا کوئی اثر خود پروفیسر صاحب کی سیرت و عمل پر بھی ظاہر ہو۔

کتبہ الیس ایم نصیر

جامعہ

نمبر ۶	ماہ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ مطابق جون ۱۹۲۷ء	جلد ۸

وائے براؤن!

ذهبوا به ولكل باك خلفه　　صعقات موسى يوم دك الطور

فيه الفصاحة والسماحة والتقى　　والبأس اجمع والحجى والخير

يبكي عليه وما استقر قراره　　في اللحد حتى صافحته الحور

فالشمس في كبد السماء مريضة　　والارض واجفة تكاد تمور

(متنبی)

کون علم دوست ہے جس نے علوم عربیہ و فارسیہ کے زبردست حامل اور مشرق کے فدائی، پجاری براؤن کا نام نہیں سُنا! ان علوم کا کون ایسا شایق ہے جو اُن سے واقف نہیں! کون ہے جو اُس شخصیت کا شناسا ہوا اور اس کی علم دوستی، مشرق پرستی اور مشرق نوازی سے متاثر نہوا اور مرحوم براؤن کی شخصیت سے آشنا ہونے کے بعد کون ہے جس نے اُنکی جانکاہ وفات پر خون کے آنسو نہ بہائے!!!

پروفیسر مرحوم کی [illegible] اور ایرانیوں کے ساتھ فطری محبت والفت، انکی طبعی مشرق پسندی اور مشرق پرستی، ایران اور ایرانیوں کے لئے انکا عشق مفرط شغف شدید اور ازخود رفتگی، علوم شرقیہ کی طرف انکا طبعی ذاتی میلان، انکی تحصیل میں انکی مافوق العادت جد وجہد، ان علوم کی خدمت میں انکی غیر معمولی محنت، جانفشانی، تن دہی، فداکاری، ازخود گذشتگی، اور دائمی مستعدی، انکا علمی مذاق سلیم، انکی وسعت نظر، انکی گوناگوں اور بوقلموں علمی دلچسپیاں، انکی حق پسندی اور صداقت پروری، اور سچائی کی راہ میں انکی مختلف النوع ذاتی قربانیاں احباب کے ساتھ انکی محبت قلبی، اور طلبہ کیساتھ انکا مخلصانہ مربیانہ بلکہ پدرانہ برتاؤ، انکی طبعی ظرافت، سلسل عالمانہ گفتگو اور دلکش تقریر، تحریر، انکے عادات و اطوار، رفتار و گفتار، الغرض انکی ہر ادا اور انکا ہر انداز اہل مشرق کی محبت و مودت میں ڈوبا ہوا تھا، اور مشرقیوں کی دلکشی، اور دلربائی کے لئے ساحرانہ اثر رکھتا تھا۔

مشرق کی فرط محبت، عشق مفرط اور غایت غلو کیوجہ سے اسکی کمزوریوں میں انکو فطرت کی اصلی طاقت دکھائی دیتی تھی، مشرق کے پرانے نیچے کچے جو نیڑے، گندے شہر، تاریک مکانات بیجا تکلفات اور تکلیف دہ رسوم میں انکو روح پرور خوبیاں اور حقیقی انسانیت کی سچی تصویر نظر آتی تھی. برون کے سفرنامہ ایران کا ایک ایک حرف غور سے پڑھو اور دیکھو کہ ایرانیوں کی کمزوریوں کو کیسے دلچسپ الفاظ میں بیان کرتے ہیں اور انکی ہر ادا پر کس طرح لوٹ ہوئے جاتے ہیں، انکے تہذیب و تمدن پر کس طرح دل دیتے ہیں کل مستشرقین یورپ کی زندگی کا بغور مطالعہ کرو اور پھر انکا برون کی زندگی سے مقابلہ کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ برون اور دیگر مستشرقین یورپ میں کیا فرق ہے۔ مرزا محمد قزوینی کی رائے بالکل صحیح ہے کہ جبسے یورپ اور امریکا میں مشرقی عربی اور فارسی علوم و فنون کا چرچہ ہوا اس زمانہ سے آجتک ایک بھی ایسا مستشرق نہیں پیدا ہوا جس نے ان علوم و فنون کی خدمت خلوص نیت، اور مشرق اور علوم مشرقی کی محبت خالص اور مودت محض کی وجہ سے کی ہو اس کلیہ سے اگر کوئی مستثنیٰ ہے تو صرف برون کی ذات۔ انکے علاوہ ایک یورپین یا امریکن مستشرق نے بھی اس محبت خاص خالص قلبی سے جو زوایا نہخا یائے روح میں جاگزیں ہو

اور تمام شوائب اغراض سیاسی و جاہی و مالی سے بالکل مبرا او دھرا ہو، ادبیات، ذوقیات اور معنویات ایران کی آجتک ایسی زبردست خدمت نہیں کی۔ یورپ میں علوم عربیہ و فارسیہ کی تاریخ پر ایک غائر نظر ڈالو تو تمہیں مرزا محمد کی رائے واضح و لائح ہو جائے گی اور معلوم ہوگا کہ مستشرقین یورپ میں ایک ہی ایسی ہستی پیدا ہوئی جس کو مشرق اسکے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کیساتھ دلی ہمدردی، اور بچی دلچسپی تھی اور وہ ہستی براون کی تھی۔

ممالک مغربی میں علوم مشرقی کی تحصیل و تدریس کی ابتدا تیرہویں صدی سے خیال کیجاتی ہے جبکہ مجلس مستشرقین یورپ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ عربوں کے علوم و فنون کو پوری سعی و کوشش کیساتھ حاصل کیا جائے، اسی فیصلہ کے بعد فرانس، انگلستان، اور اٹلی کی یونیورسٹیوں میں عربی پروفیسر کا عہدہ قائم کیا گیا اور عربی زبان کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ فرانس انگلستان اور اٹلی کے افکار و اعمال کا اثر جرمنی پر بھی پڑا۔ ۱۵ صدی کے وسط میں آلات طباعت کی ایجاد و اختراع کیوجہ سے عربی کتابوں کے لاطینی تراجم تمام یورپ میں شائع ہو گئے، اور سولہویں اور سترہویں صدی میں بھی لاطینی تراجم یورپ کی اکثر یونیورسٹیوں میں درس میں رہے اٹھارہویں صدی میں پرشیا کے بادشاہ فریڈرک دی گریٹ کی علم دوستی اور علما پروری کی بدولت جرمنی میں علوم مشرقیہ کے مذاق کو بھی بہت زیادہ ترقی ہوئی، رفتہ رفتہ یہ ذوق و شوق یورپ کے چپہ چپہ میں سرایت کر گیا، اور انیسویں صدی میں جب مشرق کا تعلق یورپ کیساتھ مختلف سیاسی وجوہ سے بڑھا اور اسٹیم شپ کی ایجاد کی بدولت یہ تعلق اور زیادہ گہرا ہوا تو اہل یورپ میں مشرقی علوم کا مذاق بھی زیادہ عام اور وسیع ہو گیا۔

اٹھارہویں صدی کے آخری حصہ سے نقل و تقلید کی جگہ عقل و حجت نے لینی شروع کی اصول استدلال طریقہ فکر اور انداز تخیل میں ایک زبردست تغیر پیدا ہونے لگا۔ ان جدید حالات کیوجہ سے ایک طرف تو علوم جدیدہ کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی۔ دوسری طرف قدیم علوم کی نئے اصول کے مطابق تحقیق و تدقیق اور تنقید کیجانے لگی۔ تلاش اور جستجو کی زبردست لہر زندگی اور

اس کی ہر فتاخ میں نفوذ کر رہی تھی، ہر علم اور ہر فن کی بنیاد استقرا، کے اصولوں پر رکھی جاتی تھی۔ مشرقی علوم اس رو کے اثر سے نہ بچ سکتے تھے نہ بچے۔ قدیم غلط لاطینی تراجم پر اعتبار کرنے کی جگہ اصل عربی کتابوں کا مطالعہ کیا جانے لگا اور عربوں کے علوم وفنون کی از سر نو تحقیق و تدقیق شروع ہوئی۔ انیسویں صدی میں ڈچ جرمن فرانسیسی اور چند انگریزی مستشرقین نے اس کے متعلق جان توڑ کوششیں کیں، نایاب عربی کتابوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر انکی تصحیح کی، اور رعایت احتیاط کے ساتھ انہیں شائع کیا اور انکے ساتھ مختلف قسم کی فہرستیں ضم کیں جنکی وجہ سے انکے مطالعہ میں آسانی ہو گئی۔ بعض کتابوں کے صحیح جدید تراجم شائع کئے۔ یورپ کے مختلف کتبخانوں میں عربی و فارسی وغیرہ کی کتابوں کی جو کثیر تعداد اب تک جمع ہو چکی تھی انکا تنقیدی مطالعہ کیا اور انکی تفصیلی فہرستیں طبع کرائیں۔ یونانی اور دیگر زبانوں کے عربی تراجم کا اصل کتابوں سے مقابلہ کیا اور عربوں کی محنت و شفقت کی داد دی اور بعض مقامات میں انکی غلطیاں بیان کیں۔ بعض موضوع پر مختلف زمانوں کے عرب مصنفین اور نیز ایک ہی زمانے کے مختلف مصنفین کی تصنیفات کا مقابلہ کر کے ان موضوعوں پر قابل قدر تنقیدی کتابیں لکھیں، عرب علوم وفنون اور اسلامی اقوام کی تاریخ پر محنت و جانفشانی کے ساتھ کتابیں تحریر کیں، عربی فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں اور علوم کی اشاعت اور ترقی کے لئے انجمنوں اور رسالوں کی بنیادیں رکھیں جنکی ایک کثیر تعداد آج بھی قابل قدر کام کر رہی ہے اسطرح انیسویں صدی میں فلائشر، دی سیسی، دوزی، خولسن فلوگل، گولڈزیہر، دخوئے، اسٹائن شنائیڈر، ہامر، رائٹ، نولڈکے، زخاؤ، وغیرہم نے علوم شرقیہ کے بعض شاخوں سے تنقیدی مطالعہ کو حد تک پہنچا دیا، اور بعض علوم کے جدید طریقہ مطالعہ کی بنیاد رکھدی۔

یہ ہے یورپ کے علوم شرقیہ عربیہ و فارسیہ کے متعلق جد و جہد اور کوشش اور تلاش و جستجو کا مختصر خاکہ مغرب کی اس محنت و جانفشانی کا شکریہ ادا کرنیکے لئے اگر مشرق کا ایک ایک ذرہ بھی یک تن اور یک زبان ہو کر کوشش کرے تو منت پذیری کا حق ادا نہ ہوگا۔ لیکن اگر

اس تاریخ کا نظر غائر سے مطالعہ کیا جائے اور اس مبارک اور قابل آفریں ارادہ و اہتمام احیائے علوم مشرقیہ کے مالہ و ماعلیہ کا تجزیہ و تحلیل کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری کدو کاوش تن دہی اور بغداد کاری، مشرق کی خالص محبت اور علوم مشرقیہ کی ان میں مودت کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ اس کے ہر طبقہ میں خود غرضی کا قوی عنصر اس زبردست حرکت کا اصلی باعث تھا۔

تیرہویں صدی کا یورپ کا اہم فیصلہ جو اس تمام تحریک کا اصلی ابتدائی باعث تھا، وہ خود مشرق کی ہمدردی پر مبنی تھا، بلکہ اس سے نفرت و کراہت پر، حروب صلیبیہ میں عربوں سے زبردست اور فاش شکستیں کھانے کے بعد عیسائی یورپ کو یہ خیال ہوا کہ عربوں پر فتح حاصل کرنے کے لئے انکے علوم کو حاصل کرنا ضروری ہے جب عربوں کے علوم یورپ کے قرون وسطیٰ کے علوم و فنون سے اعلیٰ و افضل ثابت ہوئے تو انہوں نے قوائے دماغی کی تربیت و تکمیل کے لئے انہیں علوم و فنون کو پڑھنا شروع کر دیا، اور جب اس میں انکو فی الجملہ کامیابی حاصل ہوئی تو اسے ان لوگوں نے اپنی مشرقی فتوحات کا آلہ اور ذریعہ بنالیا، یہی وجہ ہے کہ یورپین مستشرقین کی تصنیفات میں اکثر اہل مشرق کے متعلق بیجا حملے، یونانیوں اور رومیوں کی اہل مشرق پر تقریباً ہر حیثیت سے تفوق کی غیر منصفانہ کوشش اکثر نظر آتی ہے۔

برون کی ذات ان تمام کمزوریوں سے پاک ہے انکا علوم عربیہ کے ساتھ شغف اور شوق خالص محبت اور مودت پر مبنی ہے انہوں نے تو جیسا کہ آئندہ کی تفصیل سے معلوم ہوگا، خود انگلستان کی ایران کے متعلق جابرانہ سیاست کے خلاف ایسی زبردست آواز بلند کی کہ حکومت برطانیہ کو بھی سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ برون کی زندگی کی تصویر کے ہر خط اور ہر رنگ روپ سے صداقت اور حق پرستی کی ادا ظاہر ہوتی ہے اور ہمارے ملک کے نوجوان تو اس کے ہر خط و خال سے اپنی آئندہ زندگی کا پورا خاکہ تیار کر سکتے ہیں۔

اب تک ہندوستان کے چند رسائل میں پروفیسر مرحوم کے متعلق جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں انکی زندگی کا ایک رخ بھی اچھی طرح نہیں دکھایا گیا ہے لہذا آئندہ چند صفحات میں برون کی زندگی کے عام حالات ان کی علمی خدمات اور انکی شخصیت کے متعلق ایک مختصر لیکن حتی الوسع مکمل اور تنقیدی

تبصرہ پیش کرنے کی کوشش کیجائے گی۔

براؤن کی پیدائش اور انکی ابتدائی تعلیم

انگلستان کے حصہ گلوسٹر شایر میں دورسلے کے قریب ایک جگہ اولے ہے اسی مقام میں پروفیسر ایڈورڈ گرینول براؤن ۷ فروری ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے تھے انکے والد سر بنجامن براؤن خوشحال آدمی تھے، ہاتھورن لیسلی کمپنی جہاز سازان Hawthorn Leslie & Co Engineers & Shipbuilders سے تعلق رکھتے تھے، زمانہ مدید تک کمپنی مذکور کے رکن رکین اور صدر رہے تھے۔ بنجامن موصوف کا خیال تھا کہ اپنے نوزائیدہ صاحبزادہ کو انجنیری کی تعلیم دیکر اپنا قائم مقام بنائیں۔ چنانچہ انہوں نے اسی خیال سے اپنے ہونہار بچہ کو پہلے تو گلینالمونڈ کے اسکول میں داخل کیا اور اسکے بعد ایٹن کے مشہور آفاق مدرسہ میں بھیجدیا لیکن فطرت کی نیرنگیاں اور طبائع کا تقاضا دیکھو کہ جس انداز کے اسکولوں کی تعریف و تمہید میں گبن جیسا ذہین طباع اور نقاد مورخ اور مشہور انشا پرداز اپنی ذاتی تحریر کردہ سوانح عمری میں رطب اللسان ہے وہ براؤن جیسے زبردست عقیل و فہیم اور دوربین اور غائر دماغ رکھنے والے ادیب اور مشہور و معروف مورخ ادبیات کی نظر میں نوجوانوں کے قوائے عقلی و دماغی کے لئے سراسر مضر اور نقصان رساں دکھائی دیتے ہیں۔ بہرحال کمسن براؤن نے بادل نخواستہ اپنی ابتدائی زندگی کے چند عزیز سال یہاں کسی طرح صرف کئے اور ۱۸۷۷ء میں تقریباً ساڑھے پندرہ سال کی عمر میں یونانی اور لاطینی زبانوں کا علم و شوق حاصل کئے بغیر، انہوں نے ایٹن کے اسکول کو خیرباد کہا۔

اس کے بعد کچھ تو کمسنی اور کچھ انجنیری سے طبعی نفرت کی وجہ سے تقریباً دو سال کسی کالج اور یونیورسٹی میں داخل نہ ہوئے۔ اسی زمانہ میں ترکوں اور روسیوں کی جنگ چھڑی، اور ترقی کرتی رہی اس جنگ نے براؤن کی آئندہ زندگی کی کایا پلٹ دی، اور ایڈورڈ براؤن کے متعلق انکے والد کے سارے خیالات پر پانی پھیر دیا۔ ابتدا سے تو یہ اس جنگ میں عام کمسن انگریز طلبہ کی طرح معمولی دلچسپی لیتے رہے اور جنگ کی خبریں اور ارباب حل و عقد حکومت برطانیہ کے اس جنگ کے متعلق عام خیالات آرا، اور روسیہ کا نقادانہ اور غائر مطالعہ کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ ترکوں کی شجاعت، حقانیت

مظلومیت انکی پے در پے شکست، اور حب وطن میں انکی غیر معمولی قربانیوں نے کمسن برون کے ننھے سے دل کو موہ لیا، یہ معصوم اور حق پسند بچہ انگریزوں سے ترکوں کے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ انکے خلاف متعصبانہ پروپگینڈا، اور جانبدارانہ جانبداری کی تاب نہ لاسکا۔ اسکا دل ترکوں کی محبت و عشق سے لبریز ہوگیا چنانچہ برون اپنے سفرنامہ ایران میں خود لکھتے ہیں۔ کہ جنگ کے ختم ہونیکے قبل ترکوں کی حمایت میں اپنی جان بھی دیدینے کو تیار تھا، اور سقوط قلبونا کا میرے دل پر ایسا سخت صدمہ پہنچا تھا کہ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ یہ مصیبت خود میرے ملک کے کسی حصہ پر نازل ہوئی ہے۔

اس جوش محبت اور عشق مفرط کا یہ قدرتی تقاضا تھا کہ انکے دل میں ترکوں کی امداد و اعانت کا خیال پیدا ہو چنانچہ ایسا ہی ہوا، اپنی کمسنی کے جوش و خروش میں انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ بجائے انجنیری کے فوجی تعلیم حاصل کریں اس کے بعد انگریزی فوج میں داخل ہوکر اپنی فوجی تعلیم کی تکمیل کریں جب انگریزی فوج میں کپتان کے عہدے تک ترقی کرجائیں تو انگریزی ملازمت سے استعفاء داخل کرکے ترکی میں داخل ہوجائیں۔ برون خود لکھتے ہیں کہ ان خیالات کو لوگ مجنونانہ یا احمقانہ ہوتونی اور کمسنی کی بدعقلیوں سے زیادہ وقعت نہ دینگے، لیکن وہ کمسنی کی بدعقلی کا نتیجہ ہو یا حق پسندی اور صداقت پرستی کا یہ سچے حقایق ہیں اور میرے اُس زمانہ کے تخیلات کی ہوبہو تصویر پیش کرتے ہیں۔

ان خیالات کی تکمیل و تعمیل کے لئے ایک مدت مدید کی ضرورت تھی اور بچپن کے جوش و خروش کا یہ تقاضا تھا کہ خیال و عمل میں زمانی اتحاد ہو، لہذا محبت و شغف کے جوش اور موج نے اپنے لئے ایک دوسرا راستہ نکالا، اور برون نے ترکی زبان سیکھنے کا قصد کیا۔ انگلستان کے جس حصہ میں برون کا قیام تھا وہاں ترکی زبان سیکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ بلکہ وہاں کے کسی باشندے کو یہ خبر بھی نہ تھی کہ دنیا میں کوئی ترکی زبان بھی ہے، نہ اسکی اطلاع تھی کہ اس زبان کے حصول کی کیا صورتیں اور ذرائع ہوسکتے ہیں۔ بہت جستجو اور تلاش کے بعد برون کو بارکر کی ٹرکش گرامر کا پتہ چلا، اور کسی استاد کے نہ ملنے کی وجہ سے انہوں نے خود ہی اسکا مطالعہ شروع کیا۔ ابتداء میں تو انکو اسکے مطالعہ میں

بڑی دقتیں پیش آئیں غیر زبان جس کی الف بے بھی نہ معلوم اُس کے قواعد کا بلا امداد واصد سے سمجھ لینا کوئی آسان کام نہیں ہے اور وہ بھی ایسی زبان جبکا ہر عنوان انگریزی اور یورپین زبانوں سے بالکل علیحدہ اور جداگانہ ہو لیکن جب سچا شوق راہبر ہوتا ہے تو وہ خود ہی سیدھے راستہ پر لگا دیتا ہے ۔ ابتدا میں تو برون کو اس بات کا پتہ نہی مشکل سے اور ایک عرصہ کے بعد چلا کہ ترکی زبان دہنی جانب سے لکھی جاتی ہے ۔ باوجود ان تمام دقتوں کے انہوں نے کچھ دنوں اپنا ذاتی مطالعہ جاری رکھا تقضا وقدر کے فرشتوں کو انکی ستعدی اور ہمت پر رحم آیا اور قدرت کیطرف سے انکو دو تین مہینوں کے بعد ایک اُستاد مل گیا یہ ایک غریب پادری تھا جو ایک زمانہ تک ترکی میں مقیم رہا تھا اور انگلستان میں ترکوں کی عام مخالفت اور نفرت کی وجہ سے اپنے مقلدین کی اٹھکیلیوں اور ستم ظریفیوں کا شکار رہا تھا کیونکہ اُس کے خیال میں ترک برسر ناحق نہ تھے ۔ برون نے اس پادری کو ایک خداداد نعمت خیال کیا ، اور اس سے ترکی زبان سیکھنے میں مدد لینے لگے

سر بنجامن کو ایڈورڈ برون کے نوجی تعلیم کے خیال سے سخت اختلاف تھا ، اور ایڈورڈ برون کو انجینیری تعلیم سے نفرت ۔ باپ بیٹے میں یہ کشمکش کچھ دنوں جاری رہی ، آخر کار سر بنجامن نے انجینیری کی جگہ ڈاکٹری کی تعلیم پر اپنی رضامندی ظاہر کی ایڈورڈ برون بھی اس پر راضی ہو گئے ، اور ۱۸۷۹ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں پیمبروک کالج میں داخل ہو گئے ۔ اور جس برون کو ایٹن کی فضا سے نفرت تھی اُسے کیمبرج کی آزادانہ زندگی ، اعلیٰ طریقہ تعلیم اور وہاں کے ماہرین علوم کے زبردست فاضلانہ لکچر اتنے پسند آئے کہ وہ کیمبرج پر فریفتہ ہو گئے ۔ برون لکھتے ہیں کہ جو اس یونیورسٹی کی آب وہوا میں رہ کر خوش نہوا ۔ اُس میں خوش ہونیکی نہ صلاحیت ہے نہ وہ کبھی خوش ہو سکتا ہے ۔ آکسفورڈ سے گبن کو ایسی نفرت تھی کہ مرتے دم تک وہ اس کی شکایت کرتا رہا ، لیکن کیمبرج سے برون کو وہ الفت تھی کہ انہوں نے مرتے دم تک کیمبرج کو چھوڑا ۔ یہ بھی طبائع کے قدرتی اختلاف کا نتیجہ تھا ، ورنہ ان دونوں یونیورسٹیوں میں اگر فرق ہے تو وہ اتنا زبردست نہیں جتنا ان دونوں کے انداز خیال اور تباین آرا سے ظاہر ہوتا ہے ۔

کیمبرج میں اگرچہ اصل موضوع علم طب تھا، لیکن علوم شرقیہ کا سچا شوق اور صحیح ذوق دیکھو کہ اپنی مختلف قسم کی مصروفیتوں کے باوجود بھی انہوں نے شرقی زبانوں کا دامن نہ چھوڑا۔ ترکی زبان کی تعلیم کا انتظام اُس زمانہ میں کیمبرج میں نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ ترکی پڑھنے کے لئے ہر پندرھویں دن کیمبرج سے لندن جایا کرتے تھے، اور کیمبرج میں علم طب کے ساتھ ساتھ اپنے فرصت کے وقتوں میں پروفیسر پامر سے عربی پڑھا کرتے تھے کیونکہ انکو ابتک کی ترکی کی تعلیم سے یہ معلوم ہو گیا تھا، کہ اس زبان کی پوری مہارت اور اسکا پختہ علم عربی پڑھے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا۔ پروفیسر پامر کی قابلیت اور طریقہ تعلیم کی خوبی اور جدت، اور ذاتی شوق اور فطرتی صلاحیت کی وجہ سے تقریباً تین مہینہ میں ایڈورڈ براؤن نے اتنی عربی سیکھ لی کہ وہ خود لکھتے ہیں کہ ساڑھے پانچ برسوں میں ایٹن میں اُتنی یونانی اور لاطینی نہ سیکھ سکے تھے

جب انہوں نے ایک حد تک عربی اور ترکی زبانیں سیکھ لیں تو انکو فارسی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا، لیکن اس کے لئے وقت کہاں سے آئے۔ خود طب کی تعلیم، عربی اور ترکی زبانوں کا سیکھنا، اور کیمبرج کی مختلف النوع اور کثیر التعداد اعمال و اشغال کیا کم تھے کہ ان پر اضافہ کیا جاتا، لیکن براؤن کے شوق و ذوق نے اس کے لئے بھی وقت نکال ہی لیا۔ ۱۸۸۲ء کی گرمیوں کی تعطیل میں انہوں نے ایک ہندو طالب علم سے فارسی شروع کی۔

اس طالب علم کو فڈل (ستار جیسا ایک باجہ) بجانے کا نہایت شوق تھا، لیکن اسکو اس کا کوئی سلیقہ نہ تھا اسوجہ سے کوئی داد دینے والا نہ ملتا تھا۔ براؤن سے اُس نے یہ شرط کی اگر یہ ایک گھنٹہ روزانہ اُس کی فڈل سنینگے تو وہ انہیں ایک گھنٹہ فارسی پڑھائے گا، براؤن کو اس باجے کا کوئی خاص ذوق نہ تھا، لیکن فارسی پڑھنے کے خیال سے انہوں نے یہ مصیبت بھی گوارا کر لی۔ بیچارے روزانہ گھنٹہ بھر بیٹھکر اُس کی ٹن ٹن سنتے اور جھوٹ موٹ داد بھی دیا کرتے جب جا کے کچھ فارسی پڑھنا نصیب ہوتا۔

تین سال تک براؤن ایک طرف ذاتی شوق سے عربی ترکی اور فارسی پڑھتے رہے دوسری طرف اپنے والد کے حکم سے تحصیل علم طب میں مشغول رہے جب یونیورسٹی کے امتحان کا زمانہ آیا تو

انکے والد نے ان سے یہ وعدہ کیا کہ اگر یہ طب میں ٹرائپوس پاس کرلینگے تو وہ انکو تعطیلوں میں استنبول کی سیاحت کے لئے انعام روپیہ دینگے۔ برون کو یہ رشوت ایک نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوئی۔ انہوں نے محنت کی اور انعام حاصل کرکے تعطیلوں میں استنبول سیاحت کرآئے۔ اس سیاحت نے ان کے دل میں اہل مشرق کی محبت اور بھی بڑھا دی۔

اس کے بعد اپنی طبی تعلیم کے سلسلہ میں کچھ دنوں اور کیمبرج میں مقیم رہے اور مشرقی زبانوں کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ جب یہ اپنی طبی تعلیم کی تکمیل عملیات کے لئے لندن گئے تو وہاں ایک فارسی فاضل مرزا محمد باقر، سے ملاقات ہوئی۔

مرزا محمد باقر بہت بڑے سیاح تھے، عربی فارسی میں ید طولےٰ رکھتے تھے اور اپنے دوران سیاحت میں انہوں نے اور کئی زبانیں بھی سیکھ لی تھیں مختلف وقتوں میں مختلف مذاہب اختیار کئے تھے اور آخر میں انہوں نے ایک نیا ذاتی مذہب اختیار کرلیا تھا جس میں مختلف مذاہب کے عناصر شامل تھے مرزا کے اندر بہتیری کمزوریاں بھی تھیں اور یہ تصوف کیطرف بھی بہت مائل تھے۔

مرزا سے برون نے دیوان حافظ اور مثنوی جلال الدین رومی پڑھنی شروع کی لیکن مرزا روزانہ کچھ دیر پڑھانے کے بعد اپنی تصانیف پر لکچر دینا شروع کر دیتے تھے، اور قلیل الفرصت برون کے اوقات کا کثیر حصہ اپنے مذہب کی تعریف اور خود اپنی توصیف میں ضائع کر دیا کرتے تھے۔ مگر مرزا کی قابلیت اور فضل کیوجہ سے برون نے سب کچھ گوارا کیا، اور باوجود مرزا کی ضدی لڑاکی اور خود پسند طبیعت کے انکے ساتھ اپنے تعلقات قائم رکھے۔ یہ مرزا کے یہاں روزانہ جایا کرتے اور انکی صحبت میں گھنٹوں صرف کیا کرتے۔ انہیں کی صحبت میں انہوں نے فارسی زبان کے ہندوستانی لب ولہجہ کو جو ہند وطالب علم کی تعلیم کا نتیجہ تھا، اور جس سے انکو نہایت نفرت تھی بدل کر ایرانی تلفظ اور لب ولہجہ سیکھا، اور انہیں کی صحبت کی وجہ سے برون کی طبیعت پر بھی تصوف کا رنگ چڑھ گیا۔

۱۸۸۷ء میں برون نے ڈاکٹری کا آخری امتحان پاس کیا، اور علاج و معالجہ کی سند حاصل کی لیکن علم طب کے متعلق برون کی کدوکاوش صرف حکم پدری کی تعمیل کے خیال سے تھی خود انکو

علم طب سے نہیں بلکہ السنہ شرقیہ سے شغف تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنی خواہش سے السنہ شرقیہ کے حاصل کرنیکے بعد انڈین لینگویجز میں ٹرائیوس پاس کیا، اور اس امر کی انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح کوئی ایسا موقع ملے کہ مشرق اور علوم مشرقیہ کی خدمت میں تمام عمر صرف کرسکیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے کونسلر سروس کے لئے بھی سعی بلیغ کی۔ اور انکا خیال تھا کہ السنہ شرقیہ کا علم شرقی ملازمت کے لئے مفید ہوگا۔ لیکن حکومت برطانیہ کے اصول دنیا سے نرالے ہیں۔ انکی درخواست کے جواب میں سرکار کیطرف سے اطلاع دی گئی کہ شرق میں ملازمت کرنیکے لئے مشرقی زبانوں کا علم ضروری نہیں۔ بلکہ یونانی، لاطینی اور ہسپانی زبان کا جاننا ضروری ہے خلاصہ یہ کہ انکی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اور آخر کار انکو مجبور ہوکر ڈاکٹری ہی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

لیکن جس زبردست طاقت نے برون کے دل میں مشرق کی محبت ودیعت کی تھی، اُس نے سارا انتظام پہلے ہی کرلیا تھا جس کی بیچارے برون کو کوئی خبر نہ تھی جب برون ناامید ہوکر ڈاکٹری شروع کرنیکا اہتمام کررہے تھے تو قضا۔ وقدر کے فرشتے انسان کی کم بینی عقل و دماغ پر ہنس رہے تھے۔ انکی اٹھکیلیاں دیکھو کہ جب برون کی حسرت و یاس انتہا کو پہنچ گئی اور یہ ڈاکٹری شروع کرنیکا انتظام کرنے لگے تو ایک روز بے نشان و گمان انکے پاس کیمبرج سے ایک تار آیا۔ اس تار میں انکی آئندہ زندگی کا فیصلہ مخفی تھا۔ پہلے تو انہوں نے حالت یاس میں نہایت بے توجہی سے اس تار کو کھولا اسکے مضمون کو پڑھا تو اچھل پڑے۔ کہ جس چیز سے غایت کوشش کے بعد ناامید ہوکر ہاتھ دھو بیٹھے تھے وہ اب بے محنت وکوشش مل گئی، اس تار میں انکو اطلاع دی گئی تھی کہ یہ پمبروک کالج کے فیلو منتخب کئے گئے۔

دوسرے دن برون کیمبرج گئے اور وہاں انہوں نے تمام معاملات اور حالات کی تنقیح کی اور تفصیل معلوم کی۔ اب تو انکو مانگی مراد ملی تھی فیلوشپ کے پہلے سال میں انہوں نے کالج سے فارس جانے کی اجازت حاصل کی اور ترکی کے راستہ سے فارس گئے اور اس قدیم ملک کے کل اہم شہروں کی سیر کی۔ وہاں کے ہر طبقہ اور ہر قسم کے لوگوں سے ملے۔ اور انکی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا، فارسیوں

کے مذاہب، ہر مذہب کے مختلف فرقوں، اُنکے رسوم، عادات، خیالات، افکار اور اعمال کا نہایت غائر اور نقادانہ مطالعہ کیا اور اس ملک اور اسکے باشندوں کے متعلق اپنے ایسے وسیع معلومات کی بنیاد ڈالی جنہیں بقول ڈاکٹر نکلسن یورپ کا ایک مستشرق بھی اُنکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ایران سے واپس آئے تو کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرر مقرر ہو گئے۔ چودہ سال کے بعد چارلس ریو کی جگہ پر عربک کی سرادم اسمتھ کی پروفیسری مل گئی اور جنوری ۱۹۲۶ء تک اسی پر رہے۔

۱۹۲۵ء میں تاریخ ادبیات ایران کی چوتھی جلد کی تکمیل کے کچھ ہی دنوں بعد یکایک قلب کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ چند ماہ کے بعد روبصحت ہو رہے تھے کہ جولائی میں یکایک انکی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس زبردست صدمہ کا جو اثر اُنکے قوٰی پر پڑا اُس سے وہ جانبر نہ ہو سکے، اور آخر ۵ جنوری ۱۹۲۶ء کو جاں بحق تسلیم ہوئے۔

عرب فرانسیسی ادبیات میں

فرانسیسی ازمنہ وسطیٰ کی ادبیات میں عربوں کا ذکر بہت ملتا ہے، یہ مضمون بجائے خود اسقدر وسیع ہے کہ اس پر بہت کچھ کام کیا جا سکتا ہے موسیو بیدئے اپرنسپل کالج دے فرانس) کے چند لکچر سنکر مجھے اس موضوع کے خاص طور پر مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوا جتنی تیاری کرنی چاہئے اتنی میں نہیں کر سکا کیونکہ میرے پاس اس کے لئے وقت نہیں جو کچھ تھوڑا بہت پڑھا یا سنا ہے وہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، موضوع اتنا وسیع ہے کہ شاید بہت دنوں تک میں سلسلہ وار طریقہ پر ناظرین جامعہ کی ضیافت طبع کے لئے تھوڑا تھوڑا حصہ بھیجتا رہوں گا۔ مضمون کی تیاری کیلئے میں نے موسیو گوتز موسیو پری، اور موسیو بیدئے کی مختلف کتابوں سے بلا تکلف فائدہ اٹھایا ہے۔

یوسف

ہر قوم کی ادبیات میں حمدیہ شاعری سب سے پہلے ظہور میں آتی ہے، حمدیہ شاعری انسان کے ان جذبات کا اظہار ہے جو فطرت کو دیکھکر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، ابتدائی انسان اپنے آپ کو مجبور اور بے بس دیکھکر، فطرت کی قہاریوں سے ڈر کر اور اسکی مہربانیوں سے بہرہ ور ہو کر تشکر میں اور خوف سے اپنا سر جھکاتا ہے، سر جھکاتے ہی منہ ہی منہ میں کچھ گنگناتا ہے، یہی گنگنانا حمدیہ شاعری کا آغاز ہے، دنیا کے ہر کونے میں انسانوں نے اپنے مالک کی تعریف میں بھجن گائے ہیں، اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ حمدیہ شاعری اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود وجود انسانی یا یوں کہئے کہ خود انسان کو فطرت سے علیحدہ اپنے وجود کا احساس و شعور۔

رزمیہ شاعری اسوقت شروع ہوئی جب انسان نے سماجی زندگی بسر کرنا سیکھی، اس صنف شعر کی بنیاد انسان کی پرانی اور فطری کمزوری شخصیت پرستی ہے، سماجی وجود قائم رکھنے کے لئے جن سورماؤں نے بڑی بڑی بہادریوں کے کام کئے، انکی تعریفیں ہوئیں انکی خدمتوں کے اعتراف میں

گیت بنائے گئے اور سارے سماج میں ان سورماؤں کی بوم مچ گئی، اُن سورماؤں نے سماج کی اس خلقی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا، انہوں نے ایسا ڈھنگ ڈالا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انکا اور انکی اولاد کا دنیا میں بول بالا رہے، بادشاہی اور نوابی اسی طرح قائم ہوئی، سورماؤں کی سورمائی ختم ہوگئی لیکن بھاٹوں کا جھوٹے سورماؤں کی تعریف کرنا ختم نہوا، ہر ملک میں ایسا ہی ہوا فرانسیسی رزمیہ شاعری کا بھی یہی حال ہے، شارلیمن، رولان اور رونیم اس کے مستحق تھے کہ سارا سماج انکی تعریفوں میں جتنے گیت بنائے اور گائے وہ کم ہیں، یہ فرانسیسی قوم کے اصلی سورما ہیں، انہوں نے عربوں کے چڑھتے سیلاب کو ہمیشہ کے لئے روک دیا، فرانسیسی قوم میں یگانگت اور ہم جنسی پیدا کی، سب کو اس بات کا احساس کرا دیا کہ فرانس انکا وطن ہے، یہاں تک ٹھیک ہے، لیکن چند صدیوں بعد سورمائی تو فرانس کی سرزمین سے مٹ جاتی ہے لیکن نوابی عہد میں جھوٹ موٹ کے سورماؤں کے سراہنے والے بھاٹ رہ جاتے ہیں، فرانسیسی ادبیات کا یہ طور ہمارے ایشیائی شعرا کے مبالغہ آمیز قصیدوں سے کم نہیں، ہر نواب کے یہاں بھاٹ ملازم رہنے لگے۔ بمصداق جسکا کھائے اسی کا بجائے، ان بھاٹوں نے اپنے اپنے ممدوحوں کی تعریف میں آسمان کے تارے توڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

مغربی شاعری کی تیسری بڑی قسم ناٹک ہے مجھے یہاں اسوقت کوئی بحث نہیں لیکن ضمناً اتنا کہدوں کہ ناٹک کا آغاز اسوقت ہوا جب لوگ جھوٹی رزمیہ شاعری سے تھک گئے، اُدھر کلیسا نے زندگی پر کافی قابو حاصل کرلیا، لوگوں نے اپنی وفاداریوں اور اپنا خلوص دنیاوی سورماؤں کی جانب سے اٹھا کر مذہبی پیشواؤں کے لئے وقف کر دیا، ناٹک کا آغاز کلیسا میں ہوتا ہے لیکن بعد میں یہی کلیسا کا پروردہ اپنے آقا کا گھر مسمار کرنے میں جو حصہ لیتا ہے وہ دنیا جانتی ہے، ناٹک کلیسا کی خدمت سے گھبرا کر زندگی کی خدمت شروع کرتا ہے، ناٹک کی نئی محبوبہ نظر زندگی ہے، زندگی اپنے اصلی رنگ و

۱؎ اگرچہ قومیت کا جدید تخیل نئی بات ہے لیکن رولان کے گیت کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسیوں کو وطنیت کا احساس گیارہویں صدی میں بھی دیسا ہی تھا جیسا اب ہے، چنانچہ رولان اور اس کے ساتھی پیارے فرانس کا ذکر شمالی ہسپین کی پہاڑیوں میں نہایت حسرت کے ساتھ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

روپ لیں۔

فرانسیسی رزمیہ شاعری کا آغاز فرانسیسی رزمیہ شاعری کے مختلف عناصر کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ذرا فرانس کے اندرونی اور بیرونی حالات و تعلقات کو پیش نظر رکھ لیا جائے۔ پہلے اندرونی حالت کو لیجئے۔ دسویں گیارہویں صدی عیسوی میں فرانس میں تین قوتیں اپنا اپنا کام الگ الگ کرتی دکھائی دیتی ہیں، وہ تین قوتیں یہ ہیں، گولوا رومن، جرمن اور کلیسا۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں جرمنوں کا طوفان سارے مغربی یورپ پر چھا گیا، فرانس تو پڑوس میں تھا بھلا اس طوفان کے اثرات سے کیسے محفوظ رہتا۔ اسوقت فرانس میں سلٹ نسل کے لوگ آباد تھے، انہوں نے رومی تہذیب رسم و رواج اور زبان اختیار کرلی تھی، جرمنوں نے فتح کرنے کو یہ علاقے فتح تو کرلئے لیکن بالآخر رومی تہذیب کے آگے سر جھکاتے ہی بن پڑی، گو سوا رومن کمزور تھے، جرمنی کے جنگلوں سے جو تازہ دم لوگ نکلے تھے حوصلوں اور قوتوں میں ان سے بہت زیادہ تھے۔ لیکن گولوا رومن کے پاس ایک کاری ہتھیار تھا جسکا وار کبھی انسانی تاریخ میں خالی نہیں گیا، انہوں نے نہ زبان ہلائی نہ تلوار اٹھائی، بیٹھے بٹھائے وحشی جرمنوں کو رام کرلیا اور رام بھی ایسا کیا کہ چند صدیوں بعد یہی جرمن "پیارے فرانس" کی آبرو بچانے میں پیش پیش نظر آتے ہیں، چنانچہ فرانسیسی رزمیہ گیتوں کے سورماؤں کے نام بیشتر جرمن ہیں، مثلاً رومان، ریمنڈ وغیرہ۔ جرمن چند صدیوں میں اپنی زبان بھول بھلا گئے گولوا رومن کی روایات، زبان اور تہذیب اختیار کرلی، لیکن مزاج جو ایک ورثی چیز ہے بڑی مشکل سے بدلتا ہے۔ جرمنی کے جنگلوں میں جنگ و پیکار دن رات کا مشغلہ تھا۔ فرانس کے زرخیز میدانوں میں چین سے زندگی بسر کرنا دشوار معلوم ہوا آپس کی لڑائیاں شروع ہوگئیں لیکن شارلیمین کی شخصیت نے اس سلگتی آگ کو بجھا دیا۔

تیسری بڑی قوت جو اس زمانہ کی فرانسیسی سوسائٹی میں برسرکار تھی کلیسا ہے۔ باوجود کلیسا کی شانتی اور راہبی کی تعلیم کے جرمن مزاج پر اسکا ذرہ برابر اثر نہیں ہوا، بالآخر اپنی لاج رکھنے کے لئے، اور اپنا اثر قائم کرنے کے لئے کلیسا، نے عربوں کے خلاف جنگ کو ثواب کہنا شروع

کیا، فرانسیسی تازہ دم قوم جو گولوا، رومن اور جرمنوں کے میل سے بنی تھی، کلیسا کی اس آواز پر لبیک کہتی ہوئی عربوں پر ٹوٹ پڑی۔ یہ نئی فرانسیسی قوم تازہ دم تھی، جنگجو تھی اور مذہبی تھی۔ چنانچہ رزمیہ گیتوں میں خدا، یسوع، کنواری اور فرشتوں کا کثرت سے ذکر ہے۔ گولوا رومن کے پرانے گیتوں اور کہانیوں میں مافوق الفطرت مظاہر پری، دیو اور بھوت کی شکل میں دکھائے جاتے ہیں لیکن اس نئی قوم نے کلیسا کی ساری روایتوں کو بطور اعتقاد اپنے ادبیات اور اپنی زندگی میں داخل کر لیا۔

دسویں صدی میں فرانس کی اندرونی حالت یہ تھی، دو مختلف نسلوں کے میل سے ایک قوم تیار ہو رہی تھی، سلٹ تہذیب کی پرانی بنیادوں پر تازہ دم جرمنوں نے اپنے فطری جوش و خروش سے نئے رواج اور نئی روایتیں قائم کیں۔ کلیسا نے سب کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا، مرکزی حکومت کی مضبوطی نے آپس کے جنگ و پیکار کا خاتمہ کر دیا، ایک بڑی حد تک فرانس کے باشندے اپنے کو ایک قوم کہہ سکتے تھے۔ ان تمام باتوں سے بڑھ کر جس بات نے فرانسیسیوں کو اتحاد پر آمادہ کیا وہ عربوں کا خطرہ تھا، جنوبی اور مغربی فرانس تک عربوں کے حملے ہو چکے تھے، اسپین پر تو آٹھویں نویں صدی عیسوی ہی میں عربوں کا پورا قبضہ ہو چکا تھا۔

شارلیمن سے پہلے عربوں کے خطرہ کو فرانسیسیوں نے محسوس کر لیا تھا۔ لیکن اب وقت آگیا تھا کہ باقاعدہ عربوں کی بڑھتی فوجوں کی روک تھام کی جائے، نویں صدی عیسوی میں فرانسیسیوں کو شمالی اسپین کے پہاڑی علاقوں میں کو رونسیوالا کی مشہور شکست باسک قوم کے ہاتھوں کھانی پڑی، باسک قوم عرصے تک نہ مسلمانوں کی محکوم ہوئی اور نہ فرانسیسیوں کی اس نے اپنی آزادی قائم رکھی، لیکن اس شکست کو مسلمانوں کے سر تھوپا گیا۔ چنانچہ "رولان کا گیت" اسی شکست کی یاد میں لکھا گیا ہے، اور اسی شکست کے بعد شارلیمن نے عربوں سے خوب دل کھول کے بدلے لئے۔

فرانسیسی رزمیہ شاعری کا یہ پہلا دور ہے، فرانسیسی قوم وطن اور مذہب کی آبرو بچانے کے لئے عربوں کے خلاف تلوار اٹھاتی ہے، عربوں سے اسپین اور جنوبی فرانس میں جو معرکے ہوئے اور جن سورماؤں نے بڑے بڑے کارنامے اور قربانیاں کیں انکے تشکر اور اعتراف میں پوری

قوم نے گیتوں کا تحفہ پیش کیا۔ چنانچہ ابتک نہیں معلوم کہ ان رزمیہ گیتوں کا مصنف کون ہے۔ ان کے بنانے والوں کا نام کسی کو معلوم نہیں بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ میلوں اور مذہبی تیوہاروں کے موقعہ پر ہر جگہ یہ گیت گائے جاتے تھے اور ملک کے اس کونے سے لیکر اس کونے تک بچے بچے کی زبان پر تھے۔ اس دور کے گیتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر سورما وطن اور مذہب کی خاطر خلوص اور جوش سے بھرا ہوا ہے، شجاعت میں ایک خفیف جھلک سفاکی کی دکھائی دیتی ہے، عورت کا ذکر بہت کم ہے جہاں ذکر ہے نہایت سرسری طور پر محبت اور رندانہ مضامین بالکل نہیں، محبت اور عشق ان تمام داستانوں سے غائب ہے جو بعد کے دوروں میں ہر سورما کے لئے ایک ضروری وصف ہے، مذہبیت کے غلو کی وجہ سے تمسخر و مذاق بہت کم پایا جاتا ہے، جب مذاق کیا جاتا ہے تو نہایت بھونڈے پن سے۔

رزمیہ شاعری کا دوسرا دور (۱۱۰۰ - ۱۲۰۰) ہے، یہ وہ زمانہ ہے کہ فرانسیسیوں کو عربوں کی طرف سے کچھ اطمینان حاصل ہو چکا تھا، شارلیمین کے بعد مرکزی حکومت کمزور ہاتھوں میں چلی گئی شارلیمین کے جانشینوں میں کوئی بڑی شخصیت جو اپنے اندر کوئی خاص کشش رکھتی ہو، نہ تھی ملک کے انتظام میں خرابی پیدا ہونے لگی، ہر حصہ میں مرکزی حکومت کے خلاف بغاوتیں شروع ہوگئیں، بڑے بڑے زمیندار نے نوابی اختیارات حاصل کر لئے اب ان نوابوں میں آپس کی جو تا بیزار شروع ہوئی، ہر نواب کی کوشش تھی کہ وہ اپنی خود مختاری قائم رکھے، ہر نواب نے اپنی گدی کو اپنا دربار الگ جمایا۔ اپنے دربار میں اہل علم و اہل ہنر جمع کئے، مصاحبوں میں بھاٹ بھی داخل ہوگیا بھاٹ کی قدر و حرمت جتنی اس زمانہ میں ہوئی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، وہ گیت بناتا تھا گاتا تھا نواب صاحب کی تعریف میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا، نواب صاحب کے جذبہ خود ستائی کو تسکین ہوتی تھی، سورمائی تو نام کو باقی نہیں رہی تھی لیکن اپنے کو سورما اور بہادر کہلوانے میں مزہ آتا تھا۔ ان تعریفی گیتوں کو سنکر شاید ہمارے ایشیائی ممدوح بھی شرما جائینگے۔

اس دوسرے دور کے گیت پہلے دور کے گیتوں سے بالکل مختلف ہیں، ان گیتوں میں خلوص

سچائی، اور جوش نام کو نہیں، انکی زبان میں پھس پھسا پن ہے خیالات بلندی اور شرافت سے عاری ہیں، انداز اور طرز ادا میں زور بالکل نہیں، زور اور جوش آئے کہاں سے، یہ وہ متاع نہیں جسے پیسے سے خریدا جاسکے۔ بھاٹ نواب صاحب کا نمک خوار ہے، انکی تعریف میں گیت گاتا ہے، بس۔ ان گیتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ آپس کی خانہ جنگیوں کو مفصل بیان کیا گیا ہے، ہر بھاٹ اپنے نواب کو فرانس کے سارے نوابوں سے بڑھ چڑھ کر دکھانے کی کوشش کرتا ہے، زبان میں چونکہ زور اور روانی نہیں اس لئے تصنع ہے، عورت ان گیتوں کا خاص موضوع ہے۔ اس دور کے سورماؤں میں اگلے سورماؤں کی سی مذہبیت اور عورت کی طرف سے بے نیازی نہیں، ہر سورما (تقریباً) عاشق مزاج ہے اور کسی نہ کسی مہ جبین پر پہلی ہی نظر میں عاشق ہو جاتا ہے، باقی داستان ان تدابیر پر مشتمل ہوتی ہے جو ہمارا سورما اپنی محبوبہ سے وصل حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے یعنی کسی دوسرے نواب سے لڑائی، یا اپنی محبوبہ کے خاندان والوں پر جبر یا عنایات،

فرانسیسی رزمیہ شاعری کا تیسرا دور (۱۲۰۰-۱۴۰۰ء) مسیحی جہادوں کا زمانہ ہے، ہمیں یہ توقع ہونی چاہئے تھی کہ اس دور کے گیتوں (Chansons) میں پہلے دور کے گیتوں کی طرح جوش خلوص ہوگا کیونکہ مسیحی جہادوں کی محرک یہی چیز تھی جس نے تین صدی قبل پوری فرانسیسی قوم کو اسپین اور جنوبی فرانس کے عربوں کے خلاف ابھار دیا تھا، لیکن نہیں اب نہیں مسیحی جہادوں کی محرک کہاں تک سچی مذہبیت اور خلوص تھا، یہ مسئلہ اب تک تاریخ کا غیر فیصل شدہ مسئلہ ہے، ان جہادوں کے روح رواں کون تھے؟ کلیسا اطالوی تاجر اور فرانس کے بعض نواب اگرچہ بعد میں انگلستان اور اسٹریا بھی ان جہادوں میں شریک ہو گئے لیکن جہادوں کا خیال سب سے پہلے فرانس میں سوچا گیا سب سے پہلے مجاہدین یہیں تیار ہوئے اور آخر وقت تک ان جہادوں کو کامیاب بنانے کے لئے فرانس ہی زر گروٹ دیتا رہا۔

کلیسا کی نیت ہمیشہ سے یہ رہی کہ اپنا مذہبی اور دنیاوی اقتدار کسی طرح کم نہ ہونے دے اس مطلب کے لئے اس نے روز ایک نیا شگوفہ چھیڑا، "عالمگیر حکومت" کا بے معنی خواب وہ ہمیشہ دیکھا

کیا، اس خواب کو جب جب اس نے زندگی میں عملدرآمد کرنیکی کوشش کی تب تب اسے رسوائیاں
اٹھانی پڑیں، چند سالوں کے لئے اگرچہ بیت المقدس اور اسکے نواح میں مسیحیوں کو کامیابی حاصل ہوگئی
لیکن نوابی نے کلیسا کو وہاں بھی ذلیل کیا، بیت المقدس کی کنجی حوالہ کرکے ساری حکومت اپنے ہاتھوں میں
رکھی، نوابوں نے جو اسقدر ظاہری جوش و خروش سے کلیسائی آواز پر لبیک کہا اسمیں خلوص مطلق نہ تھا
چنانچہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ مسیحی جہاد نوابی استعماریت ([illegible] Colonization [illegible]) کے
علاوہ اور کچھ نہیں، نوابوں نے یہ کوشش کی تھی کہ فرانس کے باہر بھی بالکل اسی نہج پر جس طرح فرانس
میں اپنے لئے جاگیروں کا ڈول ڈالیں، چنانچہ بیت المقدس پر قبضے کے قلیل عرصہ میں ان نوابوں
میں جو جوتا پیزار ہوئی وہ ہرگز کسی قسم کے مذہبی خلوص پر دال نہیں؛ فرانس کی مرکزی حکومت نے اس
لئے جہادوں کو سراہا کہ اس طرح بادشاہ کو کچھ دنوں کے لئے نوابوں سے اطمینان حاصل ہو جائے، اس
طرح جہادوں کے ذریعہ خودسرے نوابوں کی توجہ دوسری طرف پلٹ گئی اور بادشاہ کی بلا دوسرے
کے سر پڑی۔ عام مجاہدین میں ممکن ہے بعض مخلص بھی ہوں جنہوں نے خاص مذہب کی خاطر جہادوں
میں حصہ لیا ہو لیکن اکثریت انمیں بھی ان لوگوں کی ہے جو دولت اور عورتوں کی خاطر گئے نہ کہ اللہ
کی خاطر، چنانچہ ان مجاہدین نے اپنے دوران قیام میں جس بربریت کا ثبوت دیا ہے اس سے مسیحی مورخ
بھی انکار نہیں کرتے، ان سب کو اطالوی تاجر اس لئے مالی مدد دیتے رہے کہ انہیں امید تھی کہ اس
طرح وہ ایشیائے کوچک کی ساری منڈیوں پر قابو پالینگے اور جب انہوں نے یہ امید پوری ہوتی
نہ دیکھی تو الگ ہوگئے۔ غرضکہ مسیحی جہادوں کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انمیں شریک ہونیوالوں
میں ہر ایک کا کوئی نہ کوئی دنیاوی اور خالص دنیاوی مطلب تھا، پھر یہ کس طرح ہو کہ اس دور
کی شاعری میں وہ جوش و خلوص ملے جو ہمیں صدی قبل کے گیتوں میں ہمیں ملتا ہے، ان گیتوں کا
بنانے والا بھی اپنا مخصوص مطلب پیش نظر رکھتا ہے اور وہ بھی جس کے لئے یہ گیت بنائے گئے ہیں؛
اصل میں یہ رزمیہ شاعری کے زوال کا زمانہ ہے، اس دور کے گیت ایسے ہیں جیسے بے خوشبو کے
پھول، زبان خوب سلجھی ہوئی اور شستہ ہے، شائستہ الفاظ کا طومار ہے جن کے کوئی معنی نہیں۔

میں نے اس تمہید میں فرانسیسی رزمیہ شاعری کے مختلف عناصر دکھا کر الگ الگ ان کو ناظرین با تمکین کی خدمت میں پیش کیا ہے، اب میں اپنے آئندہ مضمونوں میں ان گیتوں سے براہ راست بحث کروں گا جن میں عربوں کا ذکر ہے ان سے لڑائیوں کے بیان ہیں اور ان پر اپنی فوقیت بتائی گئی ہے۔ ان گیتوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق جن خیالات کا اظہار ہے وہ اس امر پر دال ہے کہ کلیسا نے کس کس بُری طرح اسلام پر الزامات جوڑے ہیں۔ ان گیتوں میں مسیحی سورماؤں کی بہادریاں اسی طرح مبالغے سے بیان کی گئی ہیں جس طرح ہمارے غلط مورخوں نے اگر انہیں مورخ کہا جا سکے حضرت خالد اور امیر حمزہ کے جنگی کارنامے بیان کئے ہیں، جس طرح اسلامی سورماؤں کی مدد کے لئے ملا اعلیٰ کی تمام قوتیں اپنی خدمات پیش کرتی ہیں

سلطنت برطانیہ کا جدید تخیل

(سلطنت میں نوآبادیوں کا درجہ)

سلطنت برطانیہ جس میں برطانیہ عظمیٰ[1] (یعنی انگلینڈ اور اسکاٹلینڈ) آئرلینڈ، کناڈا، جنوبی افریقہ آسٹریلیا، ہندوستان اور دوسرے مقبوضات ہیں۔ اب تک سلطنت کے اندر برطانیہ عظمیٰ کو ایک خاص درجہ امتیاز حاصل تھا، اور قانوناً ملک معظم اور برطانوی پارلیمنٹ ہی کو حکومت کا حق حاصل تھا۔ اگرچہ نوآبادیوں یعنی کناڈا، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا وغیرہ کو جنہیں انگریزی قوم کے لوگ نقل وطن کر کے جا آباد ہوئے ہیں حکومت خود اختیاری حاصل تھی، مگر قانوناً برطانوی یا انگریزی پارلیمنٹ کو انکے ہر معاملہ میں دخل دینے کا حق تھا، اور خارجی معاملات تو ہمیشہ برطانوی پارلیمنٹ ہی کے ہاتھوں میں رہا کئے۔

لیکن چند ماہ قبل امپیریل کانفرنس نے جو قرارداد منظور کی ہے اس سے سلطنت برطانیہ کے نظام اساسی میں عجیب و غریب تبدیلی ہو گئی ہے۔ اس قرارداد کی رو سے نوآبادیاں یعنی کناڈا، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا وغیرہ کی حکومتیں اپنے داخلی و خارجی معاملات میں پوری طرح آزاد ہو گئی ہیں، اور برطانوی پارلیمنٹ کو اس بات کا حق نہیں رہا کہ وہ نوآبادیوں کی حکومت میں ان کی مرضی کے خلاف کسی قسم کی مداخلت کر سکے۔ مرتبہ کے لحاظ سے بھی اب برطانیہ عظمیٰ کو نوآبادیوں پر کوئی فوق نہیں رہا۔ گویا سلطنت برطانیہ چھوٹے پیمانہ پر ایک طرح کی جمعیت اقوام [illegible] [illegible] ہو گئی ہے جس میں برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیاں مساوی الرتبہ اراکین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اراکین کو اس حد تک آزادی حاصل ہو گئی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو انکا سلطنت برطانیہ سے الگ ہو جانا بھی بعید از امکان نہیں ہے۔

اگرچہ امپیریل کانفرنس کے فیصلہ کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے، اور یہ محض برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیوں کے درمیان ایک سمجھوتہ تصور کیا جاتا ہے، لیکن پھر بھی عملاً اس کی اہمیت بالکل ان

---

[1] اس مضمون میں جہاں جہاں "برطانیہ عظمیٰ" کا نام آیا ہے اس سے مراد جزائر برطانیہ اور ان کی حکومت ہے

قوانین کی سی ہے جنہیں سلطنت کی قانون ساز جماعت یعنی برطانوی پارلیمنٹ منظور کرتی ہے

بصورت موجودہ برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیات میں اتحاد کا قانونی

رشتہ صرف شاہ برطانیہ کی ذات ہی یعنی تمام نوآبادیاں شاہ برطانیہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتی ہیں اور اس طرح قانوناً اس کی رعایا ہیں لیکن بادشاہ کا سیاسی اقتدار محض برائے نام ہے۔ کیونکہ نوآبادیوں کو حکومت خود اختیاری عطا کرنے کے بعد سے بادشاہ نے یہ دستور رفتہ رفتہ بالکل ترک کردیا ہے کہ وہ کسی ایسے قانون کو نوآبادیوں میں نافذ کرے جو ان کی مرضی کے خلاف ہو۔ اور امپیریل کانفرنس کے فیصلہ نے اس دستور کو اور بھی مستحکم کردیا۔ اور یہ بات اب محال ہوگئی ہے کہ بادشاہ نوآبادیوں پر کوئی جبری قانون نافذ کرے۔

اس اتحاد کو ہم ایک طرح کا شخصی اتحاد (Personal Union) کہہ سکتے ہیں جس میں متعدد آزاد سلطنتیں حق وراثت کے پہنچنے سے ایک ہی بادشاہ کے زیر حکومت آکر متحد ہوجاتی ہیں۔ لیکن انکا سارا انتظام داخلی و خارجی ایک دوسرے سے اس حد تک الگ رہتا ہے جس حد تک انکے مفاد مقتضی ہوں۔

موجودہ طریق عمل سے سلطنت برطانیہ کی جو شکل ہوگئی ہے اسکی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی کسی زمانہ میں بھی ایسی سلطنت نہیں قائم ہوئی جس کے اندر دنیا کے بڑے بڑے ملک اتنے دور دراز فاصلہ پر رہ کر اور تقریباً مکمل سیاسی آزادی کے رکھتے ہوئے ایک بادشاہ کی اطاعت میں جبر سے نہیں بلکہ برضا خود متحد رہیں۔ اور قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجزائے سلطنت اتنی آزادی رکھتے ہوئے کیا ہمیشہ متحد رہ سکیں گے؟ کیا نوآبادیوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دیدینا انشقاق کا پیش خیمہ نہیں ہے؟ اس سوال کے جواب میں کوئی یقینی پیشین گوئی غالباً نہ کیجا سکے۔ مگر موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہو کہ نوآبادیوں کے محض آزادی حاصل کرلینے اور برطانیہ عظمیٰ کے مساوی درجہ پاجانے سے سلطنت برطانیہ کا شیرازہ نہیں بکھریگا۔ یہ آزادی حقیقتہً اجزائے سلطنت کے اتحاد کو ممکن بنانے کے لئے روا رکھی گئی ہے جو اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اتحاد زیادہ سے زیادہ مفید اور کم سے کم

نقصان دہ ہو۔

جس خیال پر سلطنت برطانیہ نے آج عمل کیا ہے وہ کوئی نیا خیال نہیں ہے ۱۷۷۵ء میں انگلستان کے مشہور مقرر اور مدبر ایڈمنڈ برک نے امریکہ کی نوآبادیوں سے مصالحت کرنیکے لئے پارلیمنٹ میں تجویز پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میرے نزدیک نوآبادیوں کو قابو میں رکھنے کا ذریعہ وہ گہری محبت ہی جو نام و نسل کے اشتراک، اغراض کے اتفاق اور تحفظ میں مساوات کے ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رشتے اگرچہ لطافت میں ہوا کی مانند ہیں مگر پائیداری میں آہنی زنجیروں کی مثل ہیں"

یہ قول صحیح تھا۔ مفاد کا رشتہ ہی مضبوط ترین رشتہ ہے۔ مگر پارلیمنٹ نے اس نصیحت کو نہ سنا اور امریکہ پر زورِ شمشیر اپنا حق حکومت جتانا چاہا۔ تلوار کا فیصلہ امریکہ والوں ہی کے موافق ہوا اور ان نوآبادیوں نے برطانوی جوئے کو اپنے کاندھے سے اتار کر اس عظیم الشان ملک کی بنیاد ڈالی جو آج ممالک متحدہ امریکہ کے نام سے موسوم ہے

اس شکست نے انگریزی ارباب سیاست کو یہ سبق ہمیشہ کیلئے سکھا دیا کہ نوآبادیوں کے ساتھ انہیں ہمیشہ فیاضی اور وسیع النظری کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔ انہوں نے اس بڑے عیب کو سمجھ لیا جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے ایک جماعت کو دوسری جماعت سے ملاتا ہے ... یعنی مفاد۔ چنانچہ اسکے بعد سے ہمیں انگلستان کی نوآبادی پالیسی میں بین تبدیلی نظر آتی ہے

یہ وہی پالیسی ہے جسے آج ہم زیادہ ترقی یافتہ شکل میں پاتے ہیں۔ اس کی ابتدا اندرونی حکومت خود اختیاری سے ہوئی تھی اور اسکی انتہا مکمل آزادی میں ہے۔ اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ خارجی معاملات سلطنت اب بھی برطانوی مدبروں کی رہنمائی میں رکھے گئے ہیں۔ لیکن یہ رہنمائی حاکم اپنے محکوم کی نہ کریگا بلکہ ایک بڑا بھائی دوسرے چھوٹے بھائیوں کی کریگا۔ اور ہر معاملہ میں نوآبادیوں کی رائے کو پوری وقعت دیجائیگی۔ نیز انہیں انفرادی حیثیت سے کارروائیاں کرنے کا بھی اختیار رہیگا۔ چنانچہ انہیں استحقاق حاصل ہوگا کہ وہ سلطنت کے دوسرے ارکین کے ساتھ کسی جنگ میں نہ شریک ہوں، یا کسی

ایسے معاہدہ کی پابندی سے اپنے کو بری کرلیں جو برطانیہ عظمیٰ نے دوسرے ممالک کیساتھ کیا ہے یا دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنی ضروریات کے مطابق انفرادی حیثیت سے خود بھی معاہدے کرلیں۔

سلطنت برطانیہ اتنی وسیع ہے اور نوآبادیاں ایکدوسرے سے ایسی بعید ہیں کہ انکے مفاد بہت سے خانگی معاملات میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور غیر متعلق ہیں۔ اسکے لئے یہی بہتر ہے کہ ہرایک کو اپنے معاملات کا تصفیہ آپ ہی کرلینے دیا جائے۔ اور ہر ایک اپنی پالیسی کا آپ ہی ذمہ دار ہو۔

اور سلطنت کا موجودہ طرز عمل اسی حقیقت کے احساس کا نتیجہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطنت کے ارباب حل وعقد نے اس امر سے چشم پوشی نہیں کی ہے کہ اگر ایک طرف برطانیہ عظمیٰ اور اسکی نوآبادیوں کے بہت سے اغراض مشترک ہیں تو دوسری طرف بہت سے اغراض مختلف بھی ہیں۔ اور آپس کے تعلقات اسی وقت تک قائم رہ سکتے ہیں جب تک اشتراک اغراض کے ساتھ ساتھ اختلاف اغراض کو بھی پوری اہمیت دیجائے۔ اور بجائے اس کے کہ سلطنت کے تمام اجزا کو ایک ہی حکومت کی زنجیر میں جکڑ کر واحد کردیا جائے، انہیں آزادی دے کر اختلاف کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اتحاد پیدا کیا جائے کیونکہ پہلی صورت گلا گھونٹنے والی ہوگی۔ اور اسکا نتیجہ یا تو زنجیر کی شکست ہوگا یا سلطنت کی موت۔ نوآبادیوں کی آزادی سے انکے تعلقات سلطنت کے اندر خوشگوار اور مفید تر ہوجائینگے اور اس لئے سلطنت میں استحکام کا زیادہ امکان ہے۔

برطانیہ عظمیٰ و نیز نوآبادیوں کے اہل الرائے اصحاب کو اس نئی شاہراہ کے "راست" ہونے کا یقین کامل ہے جو سلطنت نے اپنے لئے نکالی ہے۔ یہ کسی دباؤ، خانہ جنگی یا خوف کے سبب سے نہیں ہے، بلکہ انتہائی رواداری اور مصلحت اندیشی پر مبنی ہے۔ اور یہی اسکے صحیح ہونیکی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ کچھ اور تحریر کرنے سے قبل انگریزی کے ایک مضمون کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ سلطنت کی موجودہ روش کو انگریز بالعموم کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

امپیریل کانفرنس نے جو نیا اصول کار سلطنت برطانیہ کے لئے وضع کیا ہے اسپر دوسری قومیں حیرت کا اظہار کرتی ہیں اور بعض لوگوں کے خیال میں تو اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا

لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ لوگوں کی حیرت اور غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ وہ ہمارے اس جدید نقطۂ نظر کو نہیں سمجھ سکتے جو سلطنت کی بابت ہم نے قائم کیا ہے۔ جرمنی اور خصوصاً پروشیا Prussia کے ذہن میں سلطنت کا جو تصور ہے اس سے ہمارا نقطۂ نظر اصولی اختلاف رکھتا ہے۔ اور ان تمام نظریوں کی بین طور پر تردید کرتا ہے جو سیاسی نظاموں کو بزور قوت قائم رکھنے کے حق میں ہیں۔

آیئے ذرا پھر غور کریں اور دیکھیں کہ آیا واقعی دوسری قوموں کے خیال کے مطابق سلطنت برطانیہ کا قائم رہنا ناممکن ہو گیا ہے یا اس کی موجودہ روش میں کوئی نیا طریق کار، کوئی نیا اصول مضمر ہے جو سکھاتا ہے کہ نظام کو افراد کے برضائے خود گروہ میں شامل ہونے اور خیالات کے موافق ہونے سے بننا چاہیئے، اور اس تخیل کی بالکل ضد ہے جسے جنگ عظیم سے قبل پروشیا کی ریاست میں فروغ حاصل ہوا تھا یعنی طاقت ہی حق کا سرچشمہ ہے اور سلطنت بذات خود ایسے حقوق رکھتی ہے جو ان حقوق سے بالاتر ہیں جو اسے افراد نے عطا کئے ہیں۔

امپیریل کانفرنس نے سلطنت کے لیے جو اصول بنایا ہے وہ ان پرانے اصولوں کے خلاف ہے جو صدیوں تک یورپ کے بیشتر حصوں میں رائج رہے ہیں۔ اور انکی بعض ان نئی شکلوں کے بھی خلاف ہے جنہیں پرانے اصول ادھر حال کے تبدیل ہو گئے تھے۔

قرارداد کے الفاظ یہ ہیں:

"وہ (یعنی نوآبادیاں) سلطنت کے اندر خود مختار حکومتوں کا درجہ رکھتی ہیں (یہ) مرتبہ میں مساوی اور اپنے داخلی وخارجی معاملات میں کسی طرح بھی ایک دوسرے کے ماتحت نہیں ہیں۔ البتہ ملک معظم کی مشترک اطاعت انہیں متحد کرتی ہے، اور وہ برطانیہ کی دولت متحدہ اقوام British Common wealth of nations میں بحیثیت آزاد اراکین کے شریک یکجا تی ہیں۔"

اب اسکا انطباق کیونکر ہوگا؟ حریت کا یہ ایک مکمل اعلان ہے۔ مگر حریت ہی کیا چیز ہے؟

اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ محض انفرادی خود مختاری کا نام ہے یا کسی متعین مقصد کو حاصل کرنے کے لئے آزادیٔ عمل کے استعمال کا نام۔ کیا اس کے معنی محض حقوق کو تسلیم کر لینا ہیں بغیر اس کے کہ عوض میں کچھ ایسے فرائض بھی عائد ہوں جنہیں آزادی سے مانا اور ادا کیا جائے؟ کیا انسانوں اور جماعتوں پر اتنا اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ انہیں باہم حسن سلوک سے پیش آنے کی توقع پر چھوڑ دیا جائے؟ کہ یہی اس آزادی کے معنی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو مہذب انسانوں کے آئندہ نظام کا مسئلہ نصف سے زیادہ حل ہو جائیگا۔ اگر نہیں تو ممکن ہے "سلطنت" کا وہ تخیل جو "طاقت" کو "حق" قرار دیتا ہے اور جس کی انتہا سلطنت کو ایک طرح کا "خدائی حق" دیکر فرعون بے سامان بنا دینے پر ہوتی ہے، اتنے عقیدتمندوں کے رکھنے میں حق بجانب ثابت ہو اور انسان اسی طے کئے ہوئے راستہ پر پھر لوٹ جائے جس کی تاریخ تباہیوں اور مصیبتوں کے قصہ سے بھری پڑی ہے۔

ایک طرح سے اس کے نتائج میں جمعیت اقوام کا مستقبل بھی ہوگا۔ جمعیت اقوام جس خیال پر مبنی ہے، فروعات سے قطع نظر بنیادی "برطانوی دولت متحدہ اقوام" (British Commonwealth of Nations) کا ہے یعنی "مطلق آزادی" کے برخلاف "اضافی آزادی" کا اصول۔ ایک "مطلق آزادی" پر عمل کرنے والی سلطنت، اسکا حاکم خواہ کوئی بادشاہ ہو یا ڈکٹیٹر، یا چند سر برآوردہ لوگوں کا ایک گروہ، اس بات کی روادار نہ ہوگی کہ اس کے اختیارات پر حرف گیری کی جائے یا اس کی حاکمیت (Sovereignty) دوسری ریاستوں کے اختیارات و حقوق کو اس کے مساوی قرار دیکر، محدود کر دیجائے لیکن برطانوی سلطنت و نیز جمعیت اقوام کے اندر سلطنتوں کی حاکمیت کا محدود ہونا روا رکھا جاتا ہے۔ اور انکو یہ حق نہیں دیا جاتا کہ دوسروں کے مفاد کا لحاظ کئے بغیر محض اپنے ذاتی اغراض کو حاصل کرنیکی کوشش کریں۔

سلطنت برطانیہ چھوٹے پیمانہ پر ایک طرح کی جمعیت اقوام ہے۔ اس برطانوی جمعیت اقوام نے اپنا ایک خاص اصول، ایک خاص نظر تنظیم سیاسی پیش کیا ہے۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جسے عمل میں پہلے لایا گیا اور لفظوں کی شکل میں بعد کو۔ اگر اس نظریہ پر عمل نہ ہو چکا ہوتا اور اسکی حیثیت محض ایک خیالی یا علمی بحث کی ہوتی، تو اس پر چنداں توجہ نہ کیجاتی۔ لیکن یہ ایک امر واقعہ کا ترجمان ہے۔ یہ ایک چلتے ہوئے کاروبار کا اصول کار ہے اس کی ابتدا جنوبی افریقہ کی جنگ (جنگ بوئر Boer War) اور اسکے نتائج مابعد سے ہوئی۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کناڈا کو برطانیہ کی امداد کیلئے فوج بھیجنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے فوج اپنی مرضی سے بھیجی تھی۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ کوئی ایسی چیز خطرے میں ہے جو سلطنت برطانیہ کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ اور پھر افریقہ والوں کی شکست کے بعد جو صلح ہوئی اس کے شرائط میں انتقامی جذبہ کی جھلک نہ تھی بلکہ انکے مقرر کرنے میں پوری فیاضی سے کام لیا گیا۔ اور سلطنت کے اندر جنوبی افریقہ والوں کو وہی مرتبہ دیا گیا جو دوسری نوآبادیوں کا تھا۔ اگر سخت دلی اور تنگ نظری سے کام لیا جاتا تو ہم ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جنرل لوئی بوتھا، اور جنرل جین اسمٹس جیسے لوگوں کے ہاتھ میں برطانوی افواج کی کمان نہ دیکھتے۔ نہ انہیں کابینہ حرب War Cabinet یا پیرس کی صلح کانفرنس میں برطانوی مدبروں کے دوش بدوش بیٹھا پاتے

معلوم ہوتا ہے کہ کناڈا والے امپیریل کانفرنس کے فیصلہ کو کسی قدر بدگمانی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسے بڑی حد تک جنوبی افریقہ کی خواہش اور اصرار کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک تکلیف دہ شبہ یہ بھی ہے کہ کہیں مساوات مرتبت، کے یہ معنی نہوں کہ اب تحفظ سلطنت کے لئے نوآبادیاں بھی اپنی اپنی حیثیت کے تناسب سے انگلستان کے برابر اعانت کریں۔ حالانکہ اب تک انگلستان ہی تحفظ کے بوجھ کو زیادہ تر برداشت کرتا رہا ہے۔ کناڈا والوں کو ان باتوں کا ذرا بھی خوف نہیں کرنا چاہئے

جنوبی افریقہ یا آئرلینڈ والوں نے اگر آزادی اور مساوات کا مطالبہ کیا تو یہ محض اس لئے کہ انکو سلطنت کے موجودہ اصول (آزادی) کا بہت ناکافی عملی تجربہ تھا۔ اور وہ امتحان لیکر دیکھنا چاہتے تھے کہ واقعتہ ان اصولوں پر عمل بھی کیا جاتا ہے یا نہیں۔ اور جب انہوں نے دیکھ لیا کہ سلطنت اس امتحان میں پوری اتری تو وہ مطمئن ہو گئے اب اکثر یہ دباؤ کا سوال جاتا رہا ہے۔ اشتراک اغراض اور حسن نیت ہی سے سلطنت کے مختلف اجزا متحد رہ سکتے ہیں۔ یہ طرز عمل دنیا کا ایک نرالا واقعہ ہے۔ تاریخ میں پہلی بار ایک عالمگیر حکومت نے بالقصد اپنے وجود کی بنا رکنوں کے حسن نیت پر رکھی ہے۔

کیا یہ حسن نیت آئندہ پیدا ہونیوالی مشکلات کا مقابلہ کرسکتا ہے؟ کیا متضاد مفاد طرانیہ خطے اور نوآبادیوں کو ایک دوسرے سے الگ نہ کردینگے؟ میرے خیال میں ایسا نہ ہوگا بشرطیکہ سلطنت کے اصول کو ترقی دی گئی اور داخلی و خارجی تمام معاملات میں اسپر عمل کرنیکی کوشش کی گئی۔ آزادی کا مطلب فقط "جینا اور جینے دینا" ہی نہیں ہے۔ بلکہ سمجھ بوجھ کر ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے۔ اگر سمجھ سے کام نہ لیا گیا تو محض حسن نیت بیکار بلکہ تکلیف دہ شے ثابت ہوگی۔ اس آدمی کی طرح، جو خیر طلب تو ہے، مگر معاملہ فہم اور موقع شناس نہیں ہے، سلطنت بھی برابر فاحش غلطیوں کا ارتکاب کرتی رہے گی" اصول آزادی" پر کاربند ہونا تمام سیاسی طریق کار پر عمل کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ اس کے لئے دقیق علم اور سمجھ کی اور سخت ضبط نفس کی ضرورت ہے۔ آزادی کے یہ معنی ہیں کہ ہم دوسروں کے اس حق کو تسلیم کریں کہ وہ خیال اور عمل میں ہم سے اختلاف کرسکتے ہیں۔ اسکے لئے محض رواداری کافی نہ ہوگی۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم سمجھیں کہ لوگ ہم سے کیوں اختلاف رکھتے ہیں۔ اس طرح شبہ کے موقعوں پر دوسروں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، کیونکہ دوسروں کو محض اس لئے کہ وہ ہم

سے اختلاف رکھتے ہیں غلطی پر سمجھنے کی بجائے ہمیں یہ خیال ہونے لگیگا کہ اگرچہ ہم خود غلطی پر نہیں ہیں لیکن ممکن ہے دوسروں کا خیال بھی اپنی جگہ صحیح ہو کسی بات کی صحت یا عدم صحت کا انحصار بالکل صورت حالات پر ہے۔ اور جس حد تک ہم گرد و پیش کے حالات کو ایک دوسرے کے لئے برابر اہمیت دینگے تاکہ سب کے سب انکو سامنے رکھ کر ایک ہی فیصلہ پر پہنچ سکیں اسی حد تک سلطنت برطانیہ کے اندر اتحاد اور اشتراک عمل قائم کیا جا سکتا ہے

سلطنت برطانیہ کے لوازمات میں سے ایک منصب شاہی کو برقرار رکھنا ہے۔ اس پر علاً سب متفق ہیں۔ دوسرا قیام امن ہے۔ اس پر بھی عام طور سے اتفاق ہے، اگرچہ یہ بالکل مبہم ہے کہ قیام امن کا بہترین ذریعہ کیا ہے۔ امپیریل کانفرنس میں تو اس بات پر سب کے سب متفق ہوئے کہ فی الحال معاملات خارجیہ کا سر انجام جسکا خاص مقصد یہ ہے کہ امن قائم رکھا جائے بالکل حکومت برطانیہ ہی کے ہاتھوں میں رہے۔ لوکارنو کانفرنس میں برطانیہ نے مغربی یورپ کے امن کی ضامن بنکر جو ذمہ داریاں لیں انکی تائید نوآبادیوں کی حکومتوں نے بھی کی اس تائید سے حکومت برطانیہ کے لئے اور بھی ضروری ہوگیا ہے کہ وہ معاملات خارجیہ میں اپنا رویہ ایسا رکھے کہ اسکو ہمیشہ نوآبادیوں کی اخلاقی اور مادی امداد مل سکے۔ اگر یہ امداد ہمیشہ کیلئے حاصل کرنی ہے تو برطانیہ کی خارجی حکمت عملی ایسی صاف و صریح ہونی چاہئے کہ نوآبادیوں کے لوگ سمجھ سکیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں؟

اس اقتباس کے پڑھنے سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ انگریز سلطنت کے موجودہ طرز عمل سے بالکل مطمئن ہیں۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے سلطنت کی یہ طرز عمل دو متضاد قوتوں کے ماتحت اختیار کیا ہے۔ ایک طرف تو نوآبادیوں کی انفرادیت آزادی کا مطالبہ کرتی ہے۔ دوسری طرف سلطنت کے مشترک اغراض اتحاد کی ضرورت پیدا کرتے ہیں جبتک ان دونوں قوتوں کا توازن قایم رہیگا، سلطنت کی موجودہ شکل بھی قایم رہیگی لیکن اگر انمیں سے کوئی قوت کمزور پڑگئی تو دوسری قوت کو لازمی طور پر غلبہ ہوگا جس کا اثر سلطنت کے

طرزِ عمل پر پورا پورا پڑے گا۔

اس سے ایک بدیہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر موخرالذکر قوت یعنی "ضرورتِ اتحاد" کمزور پڑ جائے تو سلطنت کا اتحاد شکست ہو سکتا ہے۔ آگے ہم جو کچھ لکھیں گے اس سے اندازہ ہو سکیگا کہ آیا واقعی اس موخرالذکر قوت کے کمزور پڑ جانیکا اندیشہ ہے یا نہیں، لیکن یہاں اسکے تسلیم کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اگر یہ قوت کمزور پڑ گئی تو پھر اجزائے سلطنت برطانیہ کا منتشر ہو جانا بالکل ممکن بلکہ لازمی ہے۔

کیونکہ ضرورتِ اتحاد کے کمزور پڑ جانیکا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا میں ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے جس سے اراکین "برطانوی دولت متحدہ اقوام" کا اتحاد یا تو بالکل غیر ضروری یا سرے سے انکے مفاد کے خلاف ہو۔ ایسی حالت میں مدبرین سلطنت اس کے ٹوٹنے کو خوشی سے گوارا کرینگے یہ نتیجہ صرف حال کے طرزِ عمل ہی سے نہیں بلکہ ماضی پر بھی نظر ڈالنے سے نکلتا ہے۔ برطانوی نوآبادیوں کی تاریخ میں نمایاں ترین واقعہ "مفاد" کی بڑھتی ہوئی اہمیت ہے جوانکے اور برطانیہ کے تعلقات کی تعین میں ہمیشہ پیش نظر رکھی جاتی ہے اور تدبر و وسعت نظر کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان دنیا کے کاروبار کو افادی نقطۂ نظر سے دیکھے۔ یہی وہ اصول ہے جس پر کاربند ہونا زندگی کے رائج الوقت طریقوں میں آنے والے تغیرات کے مطابق بن جانے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ برطانوی مدبروں کے گذشتہ و موجودہ طرزِ عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انکے نزدیک سلطنت بت بنا کر پوجنے کے لئے نہیں بلکہ قوم کے مفاد کے لئے ہے۔ اور اگر مفاد کا یہی تقاضا ہے، تو سلطنت کو جس طرح کبھی قائم کیا گیا تھا اسی طرح توڑ بھی دیا جائے گا۔

اس موقع پر بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ کیا حالات تھے جن کے ماتحت سلطنت برطانیہ نے موجودہ روش اختیار کی ہے۔ وہ کونسی قوتیں ہیں جو اس کے اجزا کو متحد کئے ہوئے ہیں اور وہ کونسی قوتیں ہیں جو انہیں کامل اتحاد نہیں پیدا ہونے دیتیں اور ہر ایک کا ایک مستقل وجود قائم رکھنے کی ضرورت پیدا کرتی ہیں۔ ان میں سے اس وقت کسکو غلبہ حاصل ہے۔ کونسی قوتیں زیادہ پائدار ہیں وغیرہ

ان سوالوں کا جواب بہت اہم ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ ان سے سلطنت برطانیہ کے موجودہ طرزِ عمل کی توجیہ ہوتی ہے، بلکہ اسلئے بھی کہ اجزائے سلطنت کو متحد کرنے

والے اور متفرق کرنے والے اسباب کی قوتوں کا موازنہ کرنیکے بعد تھوڑا بہت یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ سلطنت کبتک اور کن شرائط کے ماتحت قائم رہ سکتی ہے

ذیل میں ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کیجاتی ہے۔ سب سے پہلے ہم ان خاص خاص اسباب کو ایک ایک کرکے تحریر کرتے ہیں جو بظاہر سلطنت برطانیہ کے مختلف اجزا کو آپس میں متحد رکھے ہوئے ہیں۔

نسلی اور تاریخی تعلق | تقدیر کا لکھا کچھ یونہی تھا کہ انگریز کناڈا، اسٹریلیا، جنوبی افریقہ وغیرہ میں جاکر نوآبادیاں قائم کریں۔ اور شاہ برطانیہ کی رعایا ہونیکے سبب انکی حکومتیں برطانوی پارلیمنٹ کے زیر اقتدار رہیں۔ یہ اقتدار اگرچہ آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا لیکن اسکی تدریجی کمی کیساتھ تعلقات اور بھی خوشگوار ہوتے گئے۔ اتنے عرصہ تک قائم رہنے کے سبب برطانیہ اور نوآبادیوں کا تعلق دونوں کے نزدیک اتنا عزیز اور محترم ہوگیا ہے کہ اسکا ٹوٹنا کسی غیر معمولی سبب سے ہی ممکن ہے۔

شاہ برطانیہ | تمام نوآبادیاں شاہ برطانیہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتی ہیں اور قومی و نسلی تعلق ہونیکی وجہ سے اس کی ذات سے ویسی ہی الفت و محبت رکھتی ہیں جیسی اپنے قومی بادشاہ سے ہوسکتی ہے۔ بادشاہ سے محبت لازمی طور پر وفاداری کا جذبہ پیدا کرتی ہے جو نوآبادیوں کو بادشاہ کی اطاعت سے منہ موڑ کر اور سلطنت کے شیرازہ کو توڑ کر قطعاً آزاد ہوجانے سے ہمیشہ روکے گا۔ بادشاہ کی شخصیت کا جو اثر نوآبادیوں پر ہے اسکی نوعیت و اہمیت کا پورا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنکے ملک میں عرصہ سے ہردلعزیز بادشاہی حکومت رہی ہو اور بادشاہ کی ذات کے ساتھ محبت، احترام، اطاعت اور وفاداری کی روایات قائم ہوں۔ تاہم اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ انسان فطرتاً محبت، اطاعت و وفاداری کے جذبات رکھتا ہے۔ اور جب یہ کسی شے سے خواہ وہ کوئی شخص ہو یا جماعت، یا نظام، ایک بار وابستہ ہوچکتے ہیں تو عام حالتوں میں انکا تعلق مستقل ہوجاتا ہے۔ اگلے وقتوں کے مسلمانوں کے دل میں اپنے خلیفہ کے لئے جو جگہ تھی (اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ شاہ انگلستان بھی عیسائیوں کے ایک فرقہ کا جو "کلیسائے انگلستان" یا (انگلش چرچ) کا پیرو کہلاتا ہے اور جو بڑی حد تک انگلستان اور نوآبادیوں کے انگریزوں پر مشتمل ہے، دینی پیشوا ہے) وہ جمہوریت پسند

فرانسیسیوں کے دل میں اپنی جمہوریت کے لئے جو جگہ ہے وہی جگہ شاہ برطانیہ کے لئے ان انگریزوں کے دل میں جنہوں نے نوآبادیوں کو اپنا وطن بنالیا ہے۔

زبان، طرز معاشرت اور تمدن کی یکسانی | انگریز جب نوآبادیوں میں آکر بسے تو قدرتاً وہی زبان، وہی مذہب وہی طرز معاشرت، اور وہی تخیلات اپنے ساتھ لائے جو انکے اصلی وطن یعنی انگلستان میں رائج تھے۔ اتنے عرصہ تک جدا رہنے کے باعث اگرچہ کچھ تبدیلیاں بھی ضرور پیدا ہوگئی ہیں مگر بحیثیت مجموعی نوآبادیوں کی تہذیب اور طرز معاشرت میں کوئی ایسا بنیادی تغیر نہیں ہوا ہے جس سے آپس کا میل جول ناپسندیدہ سمجھا جانے لگے۔ چنانچہ انگلستان اور نوآبادیوں کے انگریز ایک دوسرے سے بلا تکلف ملتے جلتے ہیں اور اور کوئی غیریت نہیں محسوس کرتے۔ اس سے دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ انگلستان اور نوآبادیوں کے باشندے آپس میں یگانگی محسوس کرتے ہیں جس سے انکا باہمی تعلق مضبوط ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اہل انگلستان کو نوآبادیوں میں جاکر سکونت پذیر ہونے میں ایسی رکاوٹیں نہیں پیش آتیں جیسی اجنبی ممالک پیش آسکتی ہیں۔

| انگلستان اور نوآبادیوں کا تعلق قائم رہنے کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ایک طرف انگلستان کو اپنی زائد آبادی کے لئے ملک درکار ہے تو دوسری طرف نوآبادیوں کو اپنے ملک کی قلیل التعداد آبادی کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ انگلستان کے لئے آسٹریلیا کناڈا وغیرہ نوآبادیوں سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہے جہاں وہ اپنی زائد آبادی کو بھیجے۔ نہ صرف اس لئے کہ یہ مقامات اپنی یگانگی کی وجہ سے موزوں ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ انگریز تارکان وطن جو یہاں آباد ہوتے ہیں قطعی طور پر اور وطن سے جدا نہیں ہوجاتے بلکہ یہاں رہ کر بھی اپنی ترقی اور خوشحالی سے اسکی قوت کو بڑھاتے ہیں۔ نوآبادیوں کے لئے بھی انگلستان سے آکر آباد ہونیوالے لوگ زیادہ قابل ترجیح ہونگے۔ کیونکہ ان کی زبان، نسل، تہذیب، اور معیار زندگی تقریباً ایک ہی ہیں۔

حفاظتی یا فوجی مصالح | انگلستان اور نوآبادیوں کے درمیان سب سے مضبوط اور دیرپا رشتہ اتحاد حفاظتی یا فوجی مصالح ہیں۔ سلطنت برطانیہ دو باتوں کی پوری ضمانت کرتی ہے۔ اراکین سلطنت (یعنی برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیات وغیرہ) کے درمیان دائمی امن اور انکی بیرونی حملوں سے حفاظت۔ اس مقابلہ اور رقابت کے زمانہ میں ہر ملک کی خارجی حکمت عملی کی کامیابی کا مدار توازن قوت کو اپنے موافق برقرار رکھنے پر ہے۔ روز بروز دنیا

مجموعہ کی بہ حالی مانند ہوتی جارہی ہے جس میں ہر ملک ایک عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اور اسکا زندہ رہنا بس اسی پر منحصر ہے کہ اپنے کو بہت سے قوی ملکوں کے زور پر سکے۔ خوشامد سے، دھمکی سے، مراعات کا لالچ دلا کر، طرح طرح سے پٹی پڑھا کر غرضیکہ جس طرح ممکن ہوتا ہے دشمن کے ساتھیوں کو توڑنے اور اپنے جتھے کو مضبوط کرنے کی کوشش برابر جاری رہتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر اتفاق نے انگریزوں کو ایک عظیم الشان سلطنت کا وارث بنا دیا ہے تو اسکے یہ معنی ہیں کہ انہیں دنیا کے مختلف حصوں میں مستقل حلیف مل گئے ہیں جو ہر خطرہ میں ایک دوسرے کی حمایت کے لئے تیار ہیں۔ یہ برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیوں کی انتہائی خوش نصیبی ہے کیونکہ بصورت موجودہ سلطنت کا ہر رکن اپنی پشت پر ایک عالمگیر سلطنت کو نہ ختم ہونے والے ذرائع اور لامحدود قوت کیساتھ پاتا ہے۔ اسی لامحدود قوت کی بدولت انگلستان اور نوآبادیوں نے یورپ، امریکہ، بحر پاسفک، اور ایشیا اور افریقہ کے بہت سے مقامات پر قوت کے توازن کو فیصلہ کن طریق پر اپنے موافق رکھا ہے اور دنیا کے چپہ چپہ میں نہ صرف اپنے حقوق کی مدافعت بلکہ اکثر جارحانہ کارروائیاں بھی کامیابی سے کی ہیں۔ یہاں ان دیگر بیشمار ذرائع کو نہیں بتایا جاسکتا جو اتحاد کی بدولت سلطنت برطانیہ کو اپنی حفاظت کیلئے میسر آسکتے ہیں۔ لیکن فوجی طاقتوں کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے کیونکہ برطانیہ اور نوآبادیوں کے مشترک فوجی طاقتوں پر ہی سلطنت کی بقا منحصر ہے۔ اور فوجی مصالح ہی سب سے بڑھ کر اتحاد کی ضرورت پیدا کرتے ہیں۔

انگلستان زمانہ دراز سے دنیا کی سب سے بڑی بحری طاقت رہا ہے اس کی بدولت وہ نوآبادیوں کے قائم کرنے اور اپنی تجارت کو فروغ دینے میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ دوسرے ممالک نے بھی بحری قوت کافی بڑھالی ہے، انگلستان کو پہلے سے کہیں زیادہ قوی رہنے کی ضرورت ہے لیکن اس کے لئے کثیر اخراجات درکار ہیں۔ اگر نوآبادیوں کی جانب سے تھوڑی بہت مدد بھی برطانیہ کو ملتی رہی تو اسکا بار بہت کچھ ہلکا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ شاید برطانیہ اس معاملہ میں بالکل نوآبادیوں کا دست نگر رہنا مصلحت کے خلاف سمجھے۔

نوآبادیوں کو بھی انگریزی بیڑے کی سخت ضرورت ہے کیونکہ انکے سواحل بہت کافی طویل ہیں

بحری حفاظت کے واسطے زبردست بحری طاقت درکار ہے۔ اور بصورت موجودہ نو آبادیوں کے لئے بہت دشوار ہے کہ وہ اسکا بار تنہا اٹھا سکیں۔

بحری طاقت کی طرح بری طاقت کے مقابلہ میں بھی برطانیہ اور نو آبادیوں کو ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے۔ جنگی تیاریوں کے کثیر اخراجات کے ہوتے ہوئے برطانیہ عظمیٰ کیلئے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ اپنی بری طاقت کو بھی اسی پیمانہ پر جو نو آبادیوں کیلئے کافی ہو تقریباً ناممکن ہے کہ اپنی قلیل التعداد آبادی کے بل پر تنہا ایسی طاقتور فوجیں تیار کر سکیں جو آسٹریلیا اور کناڈا جیسے وسیع ممالک کی حفاظت کر سکے سلطنت کے قائم رہنے سے یہی فائدہ ہے کہ اس کے ہر رکن کی حفاظت کے لئے سلطنت کی متحدہ فوج کام میں لائی جا سکتی ہے۔ اس فوجی اتحاد سے کئی بار فائدہ بھی اٹھایا جا چکا ہے۔ اس کے ذریعہ نازک موقعوں پر جس طرح جنگی دشواریوں کی عقدہ کشائی ہوئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطنت کا اتحاد اپنے اندر ایک عظیم الشان فوجی طاقت پوشیدہ رکھتا ہے۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں جب انگریزوں کو جنوبی افریقہ میں "بوئر" قوم سے جنگ کرنی پڑی تو اسی اتحادی فوج کی مدد سے انگریزوں نے بوئروں کو شکست دی۔ اس جنگ کے حالات کی تحقیق کے واسطے جو رائل کمیشن مقرر ہوا اس نے اپنی رپورٹ کے اندر سلطنت کی جنگی صلاحیت کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا۔

"اگر اس جنگ سے ہمیں کسی بات کا علم ہوتا ہے تو وہ یہ کہ ساری سلطنت یعنی حکومت متحدہ (برطانیہ عظمیٰ)، نو آبادیوں، اور ممالک مقبوضہ میں ایک محفوظ فوجی طاقت موجود ہے جسے بوجوہ چند ہم کسی باقاعدہ فوج کی صورت میں لانا نہیں چاہتے۔ مگر جس کی طرف بروقت ضرورت اسی طرح رجوع کر سکتے ہیں جس طرح ۱۸۹۹ء میں کیا۔"

اسی طرح سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں بھی یہی "اتحادی فوج" برطانیہ کے کام آئی۔ اس موقعہ پر بھی سلطنت کی فوجی صلاحیت کے اعتراف میں کہا گیا کہ "کناڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوجوں نے جو شاندار خدمات انجام دی ہیں ان سے اندازہ ہوا کہ سلطنت کے دور دراز حصوں میں فوجی قوت کا ایک خزانہ موجود ہے۔"

ایک اور فوجی مصلحت بھی نو آبادیوں کے سلطنت برطانیہ کے جزو رہنے کے حق میں ہے یعنی

ان جغرافی مقبوضات سے فائدہ اٹھانے کا خیال جو فوجی کارروائیوں کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں مثلاً سنگاپور ایک طرح سے بحر الکاہل کا دروازہ ہے۔ اس پر برطانیہ کا قبضہ ہونے کی وجہ سے آسٹریلیا اور کو بہت محفوظ کیا کرتا ہے۔ اگر آسٹریلیا سلطنت برطانیہ کا رکن نہ ہوتا، یا سنگاپور برطانیہ کے قبضے میں ہونے کے بجائے جاپان یا کسی اور دشمن طاقت کے قبضے میں ہوتا تو اسکو آسٹریلیا کے خلاف فوجی کارروائی کے لئے بہت موثر طریقہ پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح بحیرہ احمر اور بحر ہند پر برطانیہ کا اقتدار ہونے کی وجہ سے ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے سواحل بہت محفوظ ہیں۔

اقتصادی مصالح | سلطنت برطانیہ کے قائم رہنے سے اس کے ارکین کو کچھ اقتصادی خوبیاں ہیں ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر وہ مراعات ہیں جو برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیاں ایک دوسرے کے ساتھ تجارتی معاملات میں کرتی ہیں۔ یہ مراعات بیشتر "ترجیح" Preference کی شکل میں کی جاتی ہیں۔ "ترجیح" سے مراد یہ ہے کہ ارکین سلطنت ایک دوسرے کے بھیجے ہوئے مال کو خریدنے میں دوسرے ملکوں کے مال پر ترجیح دیں۔ خریداروں کو اس بات کی ترغیب دینے کے لئے کہ وہ سلطنت کے کسی رکن کی بھیجی ہوئی اشیاء کو ترجیح دیں، یا تو ان اشیاء پر ٹیکس بالکل معاف کر دیا جاتا ہے۔ یا دوسرے ملکوں کی اشیاء کے مقابلہ میں کم کر دیا جاتا ہے یا دوسرے ملکوں کی اشیاء پر ٹیکس بڑھا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ اشیاء دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں سستی بکتی ہیں اور زیادہ خریدی جاتی ہیں ان مراعات سے برطانیہ عظمیٰ کو سب سے بڑھ کر فائدہ رہا ہے، کیونکہ اس کی مصنوعات نوآبادیوں میں خوب بکتی ہیں۔ برطانیہ عظمیٰ کو تمام سلطنت کی حفاظت کا بوجھ اپنے سر لینے کا معاوضہ اگر کچھ ملتا ہے تو بس انہیں مراعات کی صورت میں۔

وسائل آمد و رفت و خبر رسانی | دوری ان خاص اسباب میں سے ایک ہے جو سلطنت برطانیہ کے اجزا میں افتراق پیدا کر سکتے ہیں لیکن زمانہ جدید کی سائنس کی ایجادوں نے اس سبب کی اہمیت کو بہت کچھ گھٹا دیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر وسائل آمد و رفت و خبر رسانی اس قدر ترقی یافتہ شکل میں نہ ہوتے تو سلطنت کا شیرازہ کبھی کا بکھر چکا ہوتا۔ جہاز، ہوائی جہاز، تار برقی اور لاسلکی نے سلطنت کے دور افتادہ

اجزا میں اس سے زیادہ قرب پیدا کر دیا ہے جتنا کہ قدرتاً ہے۔ اور فاصلہ کم کرنے والی ایجادوں کی روز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے یہ امید کرنا بیجا نہ ہوگا کہ کچھ عرصہ بعد دوری کی زیادہ اہمیت نہیں رہیگی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیوں کا مفاد کس طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہے اور کیوں انکے لئے ایک مرکز پر آنا ضروری ہے۔ آئیے اب ذرا ان اسباب پر بھی نظر ڈالیں جو ارکین سلطنت کو خود مختاری کیطرف لیجاتے ہیں اور انہیں مرکز سے ہٹا کر سلطنت کے اندر افتراق پیدا کر سکتے ہیں۔

خود مختاری کا جذبہ اور انفرادیت کا احساس

جلد یا بدیر تمام نوآبادیوں نے حکومت خود اختیاری حاصل کر لی۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ جب وہ کسی اصول پر عامل ہوتا ہے تو اس کے منطقی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ نوآبادیوں نے بھی آزادی حاصل کر لینے کے بعد یہی کیا انہوں نے صرف سیاسی آزادی کے حاصل کرنے پر اکتفا نہ کی بلکہ رفتہ رفتہ اقتصادی اور فوجی معاملات میں بھی اپنے آپ کو آزاد کرا لیا۔ اس آزادی سے بہت سی پیچیدگیاں ایسی پیدا ہوتی ہیں جو نوآبادیوں کو سیاسی، اقتصادی اور فوجی حیثیتوں سے الگ رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ انکا تفصیلی تذکرہ بعد میں آئیگا۔ یہاں ہم صرف آزادی کے مجموعی اثر کو لیتے ہیں جس نے دوسرے مقامی حالات (مثلاً اختلاف نسل۱؎، مذہب، موقع، رسوم وغیرہ) سے ملکر نوآبادیوں کے اندر ایک احساس انفرادیت کا بھی پیدا کرا دیا ہے۔ کناڈا، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کے رہنے والے جہاں اپنے آپ کو برطانوی رعایا سمجھتے ہیں، وہاں اپنے اپنے ملکوں کا شہری بھی تصور کرتے ہیں۔ جہاں وہ سلطنت برطانیہ کیساتھ وفادار رہنا اپنا فرض سمجھتے ہیں وہاں اپنے خاص خطوں سے محبت اور مقامی عصبیت بھی رکھتے ہیں۔ کسی طرح انکے دل سے یہ احساس دور نہیں ہو سکتا کہ جس ملک میں وہ رہتے ہیں وہ سلطنت برطانیہ کا جزو ہونے کے علاوہ ایک انفرادی حیثیت بھی رکھتا ہے، اور اپنی تاریخ میں، اپنے رجحانات میں، اپنے مسائل زندگی میں برطانیہ سے بہت بڑی حد تک جدا ہے۔ یہ مقامی عصبیت (Local Patriotism) نوآبادیوں کو سلطنت

۱؎ نوآبادیوں کے باشندے صرف انگریزی نسل کے نہیں ہیں خصوصاً کناڈا اور جنوبی افریقہ میں آبادی کا اکثر حصہ فرانسیسی اور ڈچ نسل کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح مذہب میں بھی اختلاف ہے۔ اگرچہ سب عیسائی ہیں مگر مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

کے اندر ضم ہو کر اپنی شخصیت کو بالکل کھو دینے سے روکتی ہے

کامل اتحاد میں سیاسی مشکلیں اوپر لکھا جا چکا ہے کہ بحالت موجودہ بہت سی ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں جو نوآبادیوں کو اپنا سیاسی، اقتصادی اور فوجی وجود الگ قائم کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور کامل اتحاد[1] کی اجازت نہیں دیتیں۔

پہلے ہم ان سیاسی پیچیدگیوں پر نظر ڈالتے ہیں جو کامل اتحاد میں مانع آتی ہیں۔ ارباب سیاست اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ایک بڑی سلطنت کے لئے، جس کے باشندے نسل، مذہب، مقامی مسائل اور عصبیت میں کافی اختلاف رکھتے ہوں ایسا نظام حکومت ناموزوں ہے جس کے اندر بہت زیادہ مرکزیت ہو۔ چنانچہ ایسی سلطنت میں صوبوں کی مقامی حکومتوں کو بہت زیادہ اختیارات حکومت حاصل ہوتے ہیں تاکہ ہر صوبے کی مقامی حکومت اپنے مقامی مسائل کو جو دوسرے صوبوں سے مختلف یا غیر متعلق ہوں، اپنے طور پر طے کر لیا کرے۔ اور مرکزی حکومت صرف ان معاملات کو اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے جنکا تعلق تمام سلطنت سے بحیثیت مجموعی ہو۔ اس طرح ایک طرف تو مرکزی حکومت کا بار ہلکا ہوتا ہے دوسری طرف انتظام بھی زیادہ بہتر طریق پر ہوتا ہے۔ کیونکہ مقامی حکومتیں ذمہ داریوں کے محدود ہونے کی وجہ سے زیادہ توجہ کیساتھ، اور مقامی حالات و ضروریات سے باخبر ہونیکی وجہ سے زیادہ صحت کیساتھ ان مسائل کا تصفیہ کر سکتی ہیں جو ہر صوبے میں الگ الگ پیش آتے رہتے ہیں۔

سلطنت برطانیہ کا تجربہ بھی یہی ہے، اب تو خیر اسمیں بڑی وسعت آگئی ہے، مگر جب اس کی نوآبادیاں صرف نئی دنیا (امریکہ) ہی میں تھیں اسوقت بھی مرکزی حکومت (برطانوی پارلیمنٹ) اس پالیسی میں ناکام رہی کہ نوآبادیوں کے ہر جزوی معاملہ میں دخل در معقولات دے۔ اور اسکو مجبور ہونا پڑا کہ مقامی حکومت کا اختیار نوآبادیوں کی حکومت کو دے۔ اگرچہ اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برطانوی حکومت اپنے اختیارات کو جا بیجا اپنے فائدے کے لئے بھی استعمال کیا کرتی تھی جس سے نوآبادیوں میں نارضامندی پھیل گئی اور انہوں نے آزادی کا مطالبہ کیا، لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو بھی انتظام میں سہولت کے لئے مرکزی حکومت کے اقتدار میں کمی اور مقامی حکومت کے اختیار میں زیادتی ضرور کرنی پڑتی

[1] کامل اتحاد سے مراد یہ ہے کہ ارکان سلطنت کا سارا سیاسی، اقتصادی اور فوجی نظام ایک ہو

اس لئے کوئی ایسا انتظام نہ ہونا چاہئے جس میں نوآبادیاں صرف ماتحت جماعتوں کی حیثیت
رکھیں، انہیں کوئی شکایت نہ ہو اور سب کچھ ہو لیکن پارلیمنٹ کی سلطنت[1] جدا رہی حالت یہی کہ محض
غلط انگلستان کی حقیقت اور اس کو شک کی تائید کرتا ہے میں اور نوآبادیوں کی حالت کے لئے کوئی آواز نہیں
لیکن کسی فیڈرل طرز حکومت کا خیال بھی آسانی سے ممکن نہیں ہے بعض خیال پیکر لوگ ایسے
ہیں جو ایک برٹش امپیریل فیڈریشن کا خواب دیکھتے ہیں، اور اس کے لئے اسکیمیں بھی پیش کی گئی
ہیں لیکن یہ سب محض خیالی باتیں ہیں۔ حکومت کے ارباب حل و عقد سمجھتے ہیں کہ یہ محال ہے۔ اسی وجہ سے
انہوں نے اس کی تائید نہیں کی

اس کے مختلف وجوہ ہیں جن میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ امپیریل فیڈریشن کی اسکیم سلطنت کے انتظام
اساسی میں بہت سے ناپسندیدہ و بنیادی تغیرات چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ امپیریل فیڈریشن کے لئے ایک
فیڈرل پارلیمنٹ کی ضرورت ہوگی۔ اس پارلیمنٹ کے اختیارات کیا ہونگے؟ انگلستان کی پارلیمنٹ
جو اب تک سلطنت کی واحد حکمران جمعیت رہی ہے۔ اس کا کیا درجہ ہوگا؟ کیا وہ فیڈرل پارلیمنٹ
کی ماتحت ہوگی؟ کیا اس کے اختیارات جو سیاست خارجہ سے متعلق ہیں، اور جو اب تک بلا شرکت
غیرے اس کے ہاتھوں میں رہے ہیں، اس سے لے لئے جائینگے؟ کیا برطانوی مجلس کابینہ، کیا برطانوی وزیر
اعظم، سلطنت کے داخلی اور خارجی حکمت عملیوں کے مقرر کرنے کے مکمل حقوق نہ رکھیں گے؟ کیا برطانوی
پارلیمنٹ کی محض ثانوی حیثیت رہ جائیگی؟ کیا اس کا درجہ وہی رہ جائیگا جو فیڈرل حکومتوں کی ریاستوں
کی مقامی پارلیمنٹوں کا ہوتا ہے؟ فیڈریشن کی اسکیم میں یہ سوالات ناگزیر طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کا کوئی
قابل عمل جواب نہیں ملتا۔ فیڈرل پارلیمنٹ لازمی طور پر برطانوی پارلیمنٹ کی اہمیت اور اس کے اختیارات
کو کم کر دے گی۔ انگریزی رائے عامہ اس کے لئے بالکل تیار نہیں ہے وہ کسی صورت میں بھی اس یادگار
زمانہ پارلیمنٹ کے وسعت اختیارات اور آزادی عمل کو گھٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی جو صدیوں سے انکے
ملی جذبات کی ترجمان اور حقوق کی محافظ رہی ہے۔

اس کی وجہ صرف انگریزوں کی غیرت قومی ہی نہیں ہے، بلکہ مفاد کے تحفظ کا خیال بھی ہے اور

---

[1] یونٹری طرز حکومت

صرف انگلستان یا ملک آبادیوں کے لئے یہی قابل عمل ہے کہ وہ اپنے بہت سے اہم مسائل کو ایک ایسی جمعیت کے ہاتھوں میں دے دیں جو شہنشاہیت کے علاوہ دوسرے ملکوں کے نمائندوں پر بھی مشتمل ہو کیونکہ اگر کسی امر میں متعلق رائے شماری کے وقت یہ طے پایا کہ ان ملکوں میں سے کسی ملک کی اکثریت نے اپنی مرضی کے خلاف فیڈرل پارلیمنٹ کے فیصلہ کو منظور کیا ہو تو کسی طرح گوارا نہیں کیا جائیگا۔ فیڈریشن اگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر مشتمل ہو تو اس کے ایک یا چند اراکین کو کثرت رائے کا پابند بنایا جا سکتا ہے لیکن سلطنت برطانیہ کے اراکین (برطانیہ عظمیٰ، آسٹریلیا، کناڈا، جنوبی افریقہ وغیرہ) اتنے بڑے، قوی اور وسیع مفاد رکھنے والے ہیں کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کسی کے فیصلہ کا پابند ہونا ہرگز پسند نہ کرینگے۔ ممکن ہے اس دشواری کا حل یہ بتایا جائے کہ فیڈرل پارلیمنٹ میں تمام فیصلوں کا اتفاق رائے سے پاس ہونا ضروری قرار دیا جائے مگر اس صورت میں فیڈرل پارلیمنٹ کا کام چلانا بہت دشوار ہوگا اور وقتاً فوقتاً نااتفاقی پیدا ہونیکا احتمال ہے۔

پھر اگر کوئی ایسی اسکیم سلطنت برطانیہ کے لئے ناقابل عمل ہے تو اسے تیسری صورت ہی اختیار کرنی پڑے گی۔ اور یہی کیا بھی گیا کہ اراکین سلطنت کو مساوی الرتبہ اور آزاد قرار دیکر چھوڑ دیا جائے اور انسے توقع کیجائے کہ وہ اپنے نیز دیگر اراکین سلطنت کے مفاد کی خاطر اتحاد و تنظیم رکھیں گے۔ لیکن انکے اندر اس صورت میں کوئی مضبوط کانسٹی ٹیوشنل تعلق نہیں رہتا جس سے اس امر کا بہت کچھ امکان ہے کہ آئندہ کبھی نو آبادیاں سلطنت سے بالکل جدا ہو جائیں۔

اقتصادی پیچیدگیاں | ہم دیکھ چکے ہیں اقتصادی پیچیدگیاں بھی ہر ایک سلطنت کو اپنا مستقل وجود قائم رکھنے پر اسی طرح مجبور کرتی ہیں جس طرح سیاسی پیچیدگیاں۔ اب آئیے ہم دیکھیں کہ وہ کیا ہیں اور ان سے کیا دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔

سیاسی آزادی کی طرح اقتصادی آزادی بھی حریت قومی کا ایک جزو ہے۔ سلطنت کا کوئی رکن اس کو ہرگز پسند نہ کریگا کہ اس کی ملکی تجارت، صنعت و حرفت، زراعت، اور محصولات وغیرہ پر ایسے قوانین کا نفاذ ہو سکے جن کے بنانے والے غیر ملکی ہوں۔ انکے رائج الوقت اصول دولت کی پیدائش تقسیم اور صرف کے متعلق قانون سازی کا حق صرف قومی حکومت کو دیتے ہیں، کہ حسن انتظام و مصلحت اندیشی کا یہی تقاضا ہے

پس اسی لئے کہ دوسرے امور کی نسبت اقتصادی معاملات میں اشتراک اغراض جن کے لئے متفقہ پالیسی کی ضرورت ہے کم ہیں اور بعض اوقات تو اغراض میں تصادم ہونیکا بھی احتمال ہوجاتا ہے علاوہ بریں ہر رکن سلطنت اپنے مخصوص مسائل رکھتا اور اپنے مخصوص خیال کے مطابق اسکا حل تلاش کرنا چاہتا ہے۔

سلطنت کا سارا اقتصادی نظام بالکل ایک رکھنا تو خیر بڑی بات ہے کسی ایک معاملہ میں بھی متفقہ پالیسی ایک متعین حد سے زیادہ مضرت رساں اور اس لئے ناقابل عمل سمجھی جاتی ہے۔ اوپر آپ تجارتی مراعات کا ذکر آچکا ہے جو اراکین سلطنت ایک دوسرے کو بصورت "ترجیح" دیتے ہیں غالباً یہی سب سے بڑا فائدہ ہے جو سلطنت کے قیام سے برطانیہ عظمےٰ اور نوآبادیوں کی تجارت کو پہنچتا ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے نوآبادیاں مصنوعات کے لئے خام پیداوار اور غلہ وغیرہ میں انگلستان کی محتاج نہیں ہیں بلکہ خود انگلستان انکا محتاج ہے۔ پھر اگر نوآبادیاں اپنے ملک کی صنعت و حرفت کو ترقی دیکر انگلستان کے ہم پلہ ہوجائیں تو وہ مراعات جو بصورت "ترجیح" Preferance انگلستان کو دیجاتی ہیں وہ انگلستان کی مصنوعات کو کیونکر دی جائنگی۔ کیا نوآبادیاں اپنی مصنوعات کے مقابلہ میں انگریزی اشیاء کی بکری پسند کرسکتی ہیں؟ یہ دقت یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ فرض کر لیجئے انگلستان نے کسی فائدے کی غرض سے ڈنمارک کی اشیاء از قسم مکھن، پنیر وغیرہ پر ٹیکس کم یا بالکل معاف کرنا چاہا اور کناڈا کا بھی یہ مطالبہ ہوا کہ کناڈا سے آئی ہوئی انھیں اشیاء کے لئے مراعات دیجائیں تو اس صورت میں انگلستان کے لئے کیا چارہ کار ہوگا وہ کس ملک کی اشیاء پر ٹیکس لگانے میں رعایت کریگا۔ کہ انکی بکری زیادہ ہو۔ فرض کر لیجئے انگلستان اور ڈنمارک میں پہلے ہی سے ان اشیا کیساتھ رعایت کرنیکے متعلق معاہدہ ہوچکا ہو۔ کیا انگلستان اس معاہدہ کو توڑکر اپنا نقصان کریگا؟ کیا اگر اس قسم کے معاہدے نہ بھی ہوں، اور اس قسم کی رعایتیں غیر ملکی اشیا کے ساتھ کرنیکی ضرورت بھی نہ ہو تاہم انگلستان نوآبادیوں کی تمام اشیاء کے ساتھ ٹیکس میں رعایت کرسکتا ہے؟ کیا مصنوعات کے لئے استعمال ہونیوالی اشیائے خام جو نوآبادیوں سے آتی ہیں انکی بکری زیادہ کرنیکے لئے دوسرے

ملکوں کی نہیں اشیاء پر ٹیکس لگانا انگلستان کی مصنوعات کو نقصان نہیں پہنچائیگا؟ کیا دوسری ضرورت کی چیزیں مثلاً غلہ وغیرہ جن کے بغیر زندگی محال ہے. مراعات کے سبب مہنگی نہو جائینگی؟ کیا انگلستان کے مزدوروں کے لئے یہ ایک مصیبت نہو گی؟ کیا، اگر ان تمام امور سے قطع نظر کیا جائے، ٹیکسوں کے معاف کرنے سے ملکی خزانہ پر بُرا اثر نہیں پڑیگا؟

مراعات سے جو کچھ فائدہ برطانیہ اور نوآبادیوں کی تجارت کو پہنچتا ہے وہ کتنا بے حقیقت اور عارضی معلوم ہونے لگتا ہے جب ہم ان دشواریوں اور پیچیدگیوں پر نظر ڈالتے ہیں جنکا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان سے برطانیہ کی مصنوعات کو اُسی وقت تک نفع ہے جب تک نوآبادیاں خود صنعت و حرفت میں ترقی نہیں کرتیں اور جبتک اُنکی مالی حالت ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس نقصان کو بآسانی برداشت کرلیں جو ٹیکسوں کے معاف کرنے سے لازمی طور پر ہر رکن سلطنت کو ہوتا ہے. نیز جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مراعات کی پالیسی نہ صرف اراکین سلطنت کو اکثر ممالک غیر سے آزادانہ تجارتی معاہدوں کے کرنے سے روکتی اور ضروریات زندگی کے گراں ہوجانے کا سبب بنتی ہے بلکہ آگے چلکر خود دیسی مصنوعات کے لئے بھی تباہ کن ثابت ہوگی. کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی مراعات سے وسیع پیمانہ پر فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اس کے حدود بہت تنگ اور جلد جلد ختم ہونیوالے ہیں۔

فوجی مصالح | سلطنت کے اندر سب سے مضبوط رشتہ اتحاد فوجی مصالح ہیں لیکن یہی فوجی مصالح ایک حد تک نوآبادیوں کو اپنا جدا جدا وجود قائم رکھنے کی بھی ضرورت پیدا کرتے ہیں. سیاسی آزادی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نوآبادیاں رفتہ رفتہ اپنی فوج کو بالکل اپنے ہاتھوں میں لے لیں. چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس وقت نوآبادیوں کی فوجیں انکے ملکی افسروں ہی کے زیر کمان ہیں اور انہیں کی حکومتوں کے حکم سے نقل و حرکت کر سکتی ہیں۔ برطانوی حکومت نوآبادیوں کی فوج کو صرف اس صورت میں استعمال کر سکتی ہے کہ نوآبادیاں اس پر راضی ہوں۔ بالفاظ دیگر نوآبادیاں برطانیہ کے فوجی اقتدار سے بالکل آزاد ہوگئی ہیں۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ انکے سپاہیوں اور انکی دولت کو جنگ میں اسی وقت کام میں لا۔

جا سکتا ہے جب انکی قوم کا اس میں نفع ہو اور انکی قومی حکومت اس کی اجازت دے۔ وہ ہندوستان کی طرح اپنے وسائل کو اپنے مقاصد کے خلاف استعمال کرنے پر مجبور نہیں ہیں۔ یہی حال جنگی بیڑوں کا بھی ہے اگرچہ بحری جنگ میں بیڑوں کا منتشر رکھنا اصول جنگ کے خلاف ہے اور کامیاب طریقہ یہ ہے کہ تمام بیڑوں کو مجتمع رکھا جائے اور انکی متحدہ قوت سے دشمن کے بیڑوں کو تباہ کیا جائے، لیکن نوآبادیاں اس کو گوارا نہیں کرتیں کہ انکے جنگی بیڑے برطانوی افسروں کے ماتحت رہیں بجز ایسے اوقات کے جنمیں اسکے سوا کوئی چارہ نہو، اور وہ بھی عارضی طور سے۔ اس طرح بروقت ضرورت اراکین سلطنت کی حربی قوتوں کا اشتراک عمل تو ممکن ہے مگر اسی طرح جس طرح آزاد سلطنتیں ایک مشترک دشمن کے خلاف اشتراک عمل کرتی ہیں کسی جبر سے نہیں۔ چنانچہ ان ایام میں بھی ہم ایک مثال ایسی دیکھتے ہیں جس میں برطانیہ کی فوجی کارروائیوں میں نوآبادیوں نے بالکل اشتراک عمل نہیں کیا۔ یہ مثال چین کی ہے۔ جہاں صرف برطانوی اور ہندوستانی سپاہی بھیجے گئے اور نوآبادیاں غیر جانب دار رہیں۔

یہی نہیں بلکہ نوآبادیاں فوجی اخراجات کے لئے کوئی مستقل رقم بھی برطانوی حکومت کو دینا پسند نہیں کرتیں۔ اس کی وجہ بھی حاکمیت قومی کا پاس ہی ہے۔ نوآبادیاں یہ نہیں چاہتیں کہ وہ ایک معتدبہ رقم سالانہ ایسے کام میں صرف کریں جس کے تعین کا انہیں کوئی اختیار نہو۔

برطانیہ کی فوجی امداد سے مستغنی ہونیکے نئے اسباب

آسٹریلیا اور کناڈا دونوں نوآبادیوں کے سواحل بحر پاسفک سے ٹکراتے ہیں۔ اور انکے اہم مسائل بہت کچھ اس سمندر سے وابستہ ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا بھی بحر پاسفک سے گہرا تعلق ہے۔ جاپان انکا اور خصوصًا ریاستہائے متحدہ امریکہ اور آسٹریلیا کا بڑا رقیب ہے۔ اور ان ممالک کو نہ صرف جاپان بلکہ ساری "زرد" نسل[۱] سے جو عنقریب بحر پاسفک میں زبردست طاقت بننے والی ہے خطرہ ہے، اتفاق سے اسٹریلیا کناڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ نسل، مذہب، زبان، اور تہذیب و تمدن میں تقریبًا ایک ہیں لہذا انکے لئے یہ جتنا ضروری ہے اتنا ہی آسان بھی ہے کہ وہ

[۱] زرد نسل سے مراد منگول نسل کے لوگ ہیں جو مشرقی ایشیا یعنی چین، جاپان، برما، سیام وغیرہ میں پھیلے ہوتے ہیں۔

بحرالکاہل میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے زرد مشرقی اور غیر عیسائی اتحاد کے مقابلہ میں سفید مغربی اور عیسائی اتحاد قائم کریں۔ کناڈا اور اسٹریلیا کو اس طرح ایک نیا حلیف مل جاتا ہے جس کی امداد پر وہ بھروسہ کرسکتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ امریکہ کی مدد کی ضرورت و اہمیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ امداد کے اس نئے ذریعے کے پیدا ہوجانے سے نوآبادیوں کو برطانیہ کی امداد کی اتنی شدید ضرورت باقی نہیں رہتی جتنی ہونی چاہئے تھی۔ اوپر ہم بیان کرچکے ہیں کہ حفاظتی مصالح سلطنت کے اندر سب سے مضبوط رشتہ اتحاد ہیں۔ لیکن امریکہ کی امداد برطانیہ سے اتحاد قائم رکھنے کی ضرورت و اہمیت کو بہت کچھ گھٹا دیتی ہے جس سے اتحاد کا سب سے مضبوط رشتہ بھی بہت نتیجہ خیز حد تک کمزور پڑ جاتا ہے۔

جنوبی افریقہ کو بصورت موجودہ غیر ملکیوں سے کوئی اہم خطرہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ بھی حفاظت کے معاملہ میں اپنے کو ایک حد تک مستغنی سمجھتا ہے۔ اور جو کچھ مسائل خارجی یا داخلی اس کے سامنے ہیں انہیں تنہا حل کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پاتا ہے۔ بلکہ وہاں کے سفید باشندے سیاسی حقوق کے معاملہ میں جو استبدادی پالیسی اختیار کرنا چاہتے ہیں (یعنی جنوبی افریقہ کے اصلی اور ہندوستانی باشندوں کو سیاسی حقوق سے محروم کرکے سفید نسل کا استبداد قائم رکھنا) اس میں جنوبی افریقہ سلطنت برطانیہ کا رکن ہونے کی وجہ سے پوری طرح آزاد نہیں ہے۔ کیونکہ برطانوی حکومت جنوبی افریقہ کو حد سے زیادہ استبدادی پالیسی اختیار کرنے سے روکتی ہے۔ انہیں وجوہ سے جنوبی افریقہ زیادہ سے زیادہ آزادی کا خواہشمند ہے۔

یہ باتیں سلطنت کے اسباب اتحاد کو کمزور کرتی اور اسے افتراق کی طرف لیجاتی ہیں۔

<u>نوآبادیوں کی بڑھتی ہوئی قوت</u> | تمام اتحاد پیدا کرنے والے اسباب کو ایک نام سے پکارا جاسکتا ہے . . . کمزوری اور افتراق پیدا کرنے والی قوتوں کے لئے بھی ایک لفظ مستعمل ہوسکتا ہے . . . طاقت۔ کمزوری اراکین سلطنت کو ایک دوسرے کا محتاج بنا دیتی ہے جس کا نتیجہ ہے اتحاد۔ طاقت انکے اندر استغنا پیدا کرتی ہے جس کا نتیجہ ہے افتراق۔

یہ تو اوپر بتلایا جا چکا ہے

کہ کس طرح دولت، آبادی اور فوجی قوت کی کمی ارکین سلطنت کو اتحاد پر مجبور کرتی ہے۔ یہ کمی روز بروز دور ہوتی جا رہی ہے۔ تمام نوآبادیاں زرخیز علاقوں اور قیمتی کانوں سے مالا مال ہیں۔ وہ اپنی ضرورت کے خام پیداوار بہت کچھ اپنے ہی ملک سے حاصل کر سکتی ہیں اور دوسرے ملکوں کی محتاج نہیں ہیں انکے اندر صنعت و حرفت میں ترقی کرنے کی بھی کافی صلاحیت موجود ہے اور قدرت کی طرف سے جو بیشمار ذرائع انہیں حصول دولت کے لئے عطا ہوئے ہیں (مثلاً کانیں، جنگلات، زرخیز زمینیں، موتی والے سمندر وغیرہ) ان سے فائدہ اٹھا کر و نیز ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دیکر وہ دنیا کی دولتمند ترین ملکوں میں سے ہو سکتی ہیں۔ نوآبادیاں ترقی دولت کے ان موقعوں سے بیخبر نہیں ہیں۔ اور ان سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

دولت کیساتھ آبادی بھی بڑھ رہی ہے۔ بلکہ ایک کا دوسرے پر بہت ہی مفید اثر پڑ رہا ہے اگرچہ اس وقت نوآبادیوں کی آبادی بہت زیادہ نہیں لیکن اسکے اندر آبادی کی گنجایش بہت ہے۔ اور یہاں کے باشندوں کی فارغ البال زندگی سے ترغیب پا کر ممالک غیر سے لوگ برابر آ آکر سکونت پذیر ہو رہے ہیں۔ آبادی کے بڑھ جانے سے نوآبادیوں کے وسیع ملکوں کی قوت بھی غیر معمولی طور پر ترقی کر جائیگی کیونکہ انہیں ایک طرف قدرت کی عطا کردہ دولت سے پوری طرح مستفیض ہونے کے لئے کافی آدمی مل جائیگے جس سے دولت میں ترقی ہوگی۔ دوسری طرف ملک کی حفاظت کے لئے بہت بڑی فوج بھی تیار ہو سکے گی جو فی الحال آبادی کی کمی سے ممکن نہیں ہے۔

فوجی طاقت کا بڑھ جانا افتراق کیطرف لیجانیوالی قوتوں کا پلہ بہت اہم حد تک جھکا دیگا۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ سلطنت کی مشترک فوج جنگ کام میں لائی جا سکتی ہے۔ نوآبادیاں اپنی مقامی فوج کو بڑھا کر زیر بار ہونا پسند نہیں کرینگی لیکن موجودہ حالات کے اندر ایسی نشانیاں ہیں جو نوآبادیوں کی زبردست فوجی قوت بنجانے کی پیشین گوئی کرتی ہیں۔ نوآبادیاں اب اس حد تک خودمختار ہو گئی ہیں کہ وہ تنہا ممالک غیر سے معاہدے بھی کر سکتی ہیں۔ اس وقت اگرچہ اس اختیار کی استعمال بہت محدود

ہے۔ مگر کیا آئندہ ایسی وسعت نہیں پیدا ہوسکتی؟ کیا ہر ایک ملک کے اندر تمدن و نسل کے طاقت پکڑ جانے کے بعد آسٹریلیا اور کناڈا کو ایسے خارجی مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا جنمیں انہیں سلطنت سے آزاد اور بے تعلق رہ کر کچھ کارروائیاں کرنی پڑیں؟ کیا اس صورت میں انہیں اپنی پالیسی کی پشت پناہی کے لئے مقامی فوج کو مضبوط کرنا پڑیگا؟ ہم آج دیکھتے ہیں کہ برطانیہ عظمیٰ کی جانب سے چین میں فوجی کارروائیاں ہوتی ہیں اور تمام نوآبادیاں غیر جانبدار رہتی ہیں۔ کیا آئندہ ایسا ممکن نہیں کہ نوآبادیوں میں سے کوئی ایک تنہا فوجی کارروائیوں پر مجبور ہو اور دوسرے اراکین سلطنت غیر جانبدار رہیں۔ کم از کم اس وقت تک انکی غیر جانبداری سے محارب رکن سلطنت کی تباہی کا اندیشہ نہ ہو؟

وہ زمانہ عنقریب آنیوالا ہے کہ اگر دنیا کے اندر دائمی قیام امن کی کوئی صورت نہ نکلی، جب دوسرے ممالک کو خواہ وہ سلطنت برطانیہ کے اراکین ہوں یا نوآبادیوں کے حلیف، اس بات پر مجبور ہونا پڑیگا کہ اپنے سیاسی و اقتصادی مصالح کی بنا پر کسی ایک رکن سلطنت کی خاطر جنگ میں حتی الامکان حصہ لیں اور اسے اپنا معاملہ آپ طے کر لینے دیں۔ اس صورت میں بغیر زبردست بری و بحری فوج کے اراکین سلطنت اپنی دشواریوں کا کیونکر مقابلہ کر سکتے ہیں؟

پھر اگر نوآبادیاں دولت، آبادی اور فوجی قوت میں ترقی کر جائیں تو وہ بڑی حد تک سلطنت کی امداد سے مستغنی ہو جائیں گی۔ یہ استغنا اتحاد کی ضرورت کو بہت کچھ کم کرنیوالا ثابت ہوگا۔

مضمون اب اتنا طویل ہو گیا ہے کہ چند اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو جنکا اس ضمن میں ذکر آنا چاہئے تھا نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جو کچھ تحریر کیا جا چکا ہے وہ اراکین سلطنت برطانیہ کے درمیان اتحاد و افتراق پیدا کرنے والی قوتوں کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چل سکتا ہے کہ سلطنت برطانیہ موجودہ شکل اختیار کرنے پر کیوں مجبور تھی یعنی کیوں، اگر اتحاد کی ضرورت ہے، تو اراکین سلطنت بالکل متحد ہو کر ایک ہی حکومت کے ماتحت نہیں آجاتے، اور کیوں اگر آزادیٔ عمل کی خواہش ہے تو وہ بالکل ایک دوسرے سے جدا ہو کر آزاد نہیں ہو جاتے۔ طوالت ہی کے خوف سے متحد کرنیوالی اور متفرق کرنیوالی قوتوں کا مقابلہ کرنا اور انکا اثر جو سلطنت کے مستقبل پر پڑنیوالا ہے ان پر رائے زنی کرنا خود

ناظرین کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ البتہ ایک کرید جو دل میں باقی رہ جاتی ہے۔ کہ آیا سلطنت برطانیہ کے شکست کا بھی کوئی امکان ہے۔ اور اگر ہے تو کیونکر اس کے لئے ذیل میں چند اسباب لکھے ہیں جن کے پیدا ہو جانے سے سلطنت کے ٹوٹنے کا امکان ہے

(۱) کسی عالمگیر سلطنت کا قیام جس کے رکن دنیا کے تمام ممالک ہوں اور جس میں سلطنت برطانیہ بھی مدغم ہو جائے

(۲) نوآبادیوں کا طاقت پکڑ جانا (آبادی، دولت اور فوجی قوت کی ترقی سے)

(۳) نوآبادیوں کی صنعتی آزادی (یعنی ملکی صنعت وحرفت کی ترقی جس سے ملکی مصنوعات اور غیر ملکی خصوصًا برطانوی مصنوعات کا آپس میں مقابلہ شروع ہو جائے۔ اور نوآبادیاں برطانیہ کی رقیب بن جائیں۔

(۴) دنیا کے نظام اقتصادی میں تبدیلیاں۔

ان میں سے ہر ایک بہت کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اور تفصیل کا محتاج ہے لیکن اس مضمون میں کسی تفصیل کی گنجایش نہیں۔ اس لئے ختم کیا جاتا ہے۔ البتہ صرف ایک امر کیطرف توجہ دلانی ضروری ہے اوپر جو کچھ سلطنت کے بارے میں لکھا گیا ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یقینًا ایسا ہوگا۔ البتہ اسکا امکان ہے۔

سرائے

ہمارے قدیم قصوں اور افسانوں کے موضوعات میں ایک مقبول عام اور دلچسپ موضوع "مسافر اور بھٹیاری" بھی ہے۔ بی بھٹیاری، میاں مسافر کی بیوی تو نہیں ہوتیں مگر رہیں ڈر ہے کہ کہیں کوئی بھٹیارے صاحب خفا نہ ہو جائیں) بعض امور خانہ داری کے انتظام و اہتمام کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ بعض اوقات دونوں کی بحث و تکرار اچھا خاصا میاں بیوی کا سا جھگڑا ہو جاتا ہے۔ یہ مثل کہ "مسافر کا گھر سرائے" کچھ بلا وجہ مشہور نہیں ہو گئی۔ ایک مسافر کے لئے گھر کا تصور اس قدر دل خوش کن ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے سفر کی تمام تکالیف و مصائب کو بھول جاتا ہے لیکن افسوس کہ آج کل جہاں ہماری اور بہت سی پرانی اچھی چیزیں مٹتی جاتی ہیں، انکے ساتھ سرائے بھی معرض خطر میں آگئی ہے۔

ہندوؤں کی شاندار قدیم تہذیب میں ایک انوکھی بات یہ ہے کہ اس میں سرائے کا وجود نہیں پایا جاتا۔ ہندوستان میں سرائے کی بنا، اسلامی عہد میں پڑی۔ اور مسلمان حکمرانوں میں جس نے سب سے پیشتر اس ضروری ادارہ کی اصلاح کی وہ شیر شاہ سوری ہے۔ اس نے سڑک اعظم کے علاوہ ملک کی دیگر شاہراہوں پر پختہ سرائیں تعمیر کرائیں اور بھٹیاریوں کے لئے ایک خاص قسم کا لباس "تلک" مقرر کیا جو تقریباً تمام شمالی ہند میں اب تک رائج ہے۔ اس نے سرائے کے لئے کچھ قوانین بھی وضع کئے۔ اس عہد کی سرائیں آبادی سے علیحدہ پر فضا مقامات میں ہیں۔ شیر شاہ نے بڑی بڑی سراؤں میں ہوشیار ہندو مسلمان باورچی بھی مقرر کئے لیکن سرائے کا دار و مدار ملک کی معاشرت پر ہے۔ حکومت کو اس کی زیادہ ضرورت نہیں! یہ ملک کے تمدن کا آئینہ ہے۔ دکن نے ہزار ہا سال کی عمر کے بعد آج تک کوئی اچھی سرائے نہیں پیدا کی، البتہ کہیں کہیں اسلامی عہد کی ویران سرائیں اپنے بنانے والوں کی تہذیب کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں۔ یہاں ڈاک بنگلہ کو چھوڑ کر مسافر کو کسی تکیہ، خانقاہ، عاشور خانہ، مسجد یا مندر میں

قیام کرنا پڑتا ہے، برخلاف اس کے شمالی ہند کے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں صاف ستھری سرائیں نظر آتی ہیں۔ اس نمایاں فرق کی بڑی وجہ مسلمان آبادی کی قلت ہے۔ یہاں ہندی معاشرت یا چھوت چھات نے اسکا گلا دبا دیا۔ دکنی ہند جس طرح شالباہن کے زمانے میں بیل اونٹ اور ڈور کے ذریعے سے بنارس تک پہنچتا تھا، آج بھی جب کہ ذرائع سفر بہت آسان ہوگئے ہیں، بیک بینی و دوگوش سفر کرتا ہے۔ دکن کے بڑے اسٹیشنوں پر خصوصاً رات کے وقت آریائی تہذیب کا نظارہ قابل دید ہوتا ہے۔ تین تین اینٹوں کے بیسیوں چولھے برابر برابر گرم ہوتے ہیں جن پر ہنڈیاں رکھی ہوتی ہیں اور مسافر (مرد اور عورت) آٹا گوندھتے اور روٹیاں پکاتے نظر آتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑی عہد کے کسی قافلے نے ڈیرہ ڈالا ہے۔

بھٹیاریاں عموماً زندہ دل اور خوش مزاج ہوتی ہیں، انکے لباس اور وضع قطع سے ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اونٹ گاڑیاں یا یکے چلانے والوں کی عورتیں ہیں۔ دن بھر کا تھکا ماندہ مسافر جو کسی یکے والے کی ہنکاریوں یا گاڑیبان کی سلنٹے بازی اور دشنام دہی کے بعد (جس کو بیلوں نے ٹھنڈے دل سے سنکر اپنی رفتار میں کوئی تیزی پیدا نہیں کی) سرائے میں قدم رکھتا ہے تو بھٹیاریوں کا ایک غول اس کو خوش آمدید کہتا اور سامان جھپٹنے کی کوشش کرتا ہے، اس کشمکش میں مسافر کوئی فیصلہ بھی نہیں کرنے پاتا کہ اپنے سامان کے ساتھ مجبوراً کسی ایک کے حوالہ ہو جاتا ہے۔ اس پر غوغائیوں کی طرح (جس کو دلی میں ڈومنی اور نواح دلی میں بھٹیاری کہتے ہیں) سرائے میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ بھٹیاری سامان رکھتی جاتی ہے اور دوسری سے جس سے ابھی ابھی اس نے مسافر کو چھینا ہے، لڑتی جاتی ہے۔ یہ جنگ عموماً گھنٹہ آدھ گھنٹہ اور بعض اوقات مسافر کی روانگی کے بعد دو دو تین تین دن جاری رہتی ہے۔ دوران جنگ میں بھٹیاری اپنے مسافر یا مال غنیمت، کو مخاطب کرکے اپنی حریف کے عیب نکالتی اور اپنے حق میزبانی کو مرجح قرار دیتی ہے۔

رات کو جبکہ تمام مسافر اپنی اپنی کوٹھریوں کے آگے چارپائیوں پر دراز ہو جاتے ہیں تو

سوف سے پیشتر ہر مسافر اپنے برابر والے سے سرگرم گفتگو ہوجاتا ہے۔ اس وقت کسی باقاعدہ تعارف کی ضرورت نہیں ہوتی۔ موضوعات گفتگو میں روداد سفر، خانگی معاملات، گھی نفلہ یا دیگر اجناس کا نرخ غرض معاشی و تمدنی مسائل سے لے کر مذہبی، سیاسی، علمی، یا وہ جو بعض رسالوں کے سرورق پر مرقوم ہوتے ہیں تمام مسائل زیر بحث آجاتے ہیں۔ فجر کو بعض مسافر اپنی چارپائیوں پر جن کے کھٹملوں نے ان کی گہری نیند میں خلل ڈالنے کی بیکار کوششیں کی ہیں، تلاوت قرآن میں مشغول نظر آتے ہیں اور سرائے کا کونہ والا چبوترہ مسجد قلندری بن جاتا ہے۔

دنیا کی تمام چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ شاید سرائے بھی اپنی عمر طبیعی کو پہنچ چکی ہے کیونکہ یہ رونا صرف ہمارے ہی ملک میں نہیں بلکہ انگلستان بھی جو اپنی سرایوں کے لئے مشہور ہے ان کا نوحہ خواں ہے۔

سرائے کے بڑے دشمن، ہم نہیں کہتے کہ دولتمند لوگ، کودن، اندھے، کمزور معدہ والے تنبیہی باز یا اپنے نفس کو دھوکہ دینے والے حضرات ہیں، بلکہ انکے اثرات ہیں۔ دوسروں کی راہ مارنے والے اس قسم کے لوگ آج کل کیوں اس قدر طاقتور ہیں اور کس لئے خدا نے ان کو یہ عارضی اقتدار بخشا ہے، ہم اس راز کو معلوم کرنا نہیں چاہتے۔ یہ اس زندگی کی مخفی باتوں میں مضمر ہے لیکن یہ کہ وہ قوی ہیں، تمام لوگ، سرائے کو پسند کرنے والے یعنی صحیح طور سے زندگی بسر کرنے والے خوب جانتے اور ان پر افسوس کرتے ہیں۔ ان کی طاقت کا اثر ہم پر پڑتا ہے گویا ہمارا گوشت کھاتے اور خون چوستے ہیں، یہ بڑے بدخور ہیں۔

بدخوری سرائے کو تباہ کرتی ہے، اگرچہ بظاہر ہمارا یہ دعوے خلاف عقل معلوم ہوتا ہے کیونکہ زیادہ کھانے والے مسافر عموماً سرائے میں ٹھہرنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بلاخوری جس کو ناپسند شراب پینا یا الابلا چٹ کرجانا کہتے ہیں، دوسری چیز ہے۔ یہ مشروبات سے خباثت تک پہنچتی ہے اور بجائے خود شرمندہ ہے۔ یہ پردہ کی آڑ میں ایک گلاس ڈھکوسلی اور چھپاتی ہے، اس میں کوئی فصاحت نہیں ہوتی۔ یہ ایک گھناونی چیز ہے جو ہماری قدیم

سیدھی سادی سرایوں کو تباہ کرتی ہے اور انکی جگہ پہلے ایک شراب کا محل تیار کرتی اور پھر اس کو ایک نہایت خوفناک مکان کی صورت میں بدل دیتی ہے۔ جہاں چاے قہوہ اور جوش کھاتی ہوئی بوتلیں فروخت ہوتی ہیں۔ انکا ایک گھونٹ منہ سے لیکر معدہ تک آگ لگا دیتا ہے یہ محل مایوسی کی آماجگاہیں ہیں جو افسردہ دلوں کے قلوب کو تھوڑی دیر کے لئے متحرک کر دیتے ہیں۔

سرائے کے دشمنوں میں عیش وعشرت بھی شامل ہے امرا اپنی ایک خاص آبادی شہر کے اس حصہ میں رکھتے ہیں جو معمولی باشندوں سے بارہ پتھر باہر ہو انکے پڑوس میں کوئی سرائے نہیں بن سکتی۔ ہماری سمجھ میں یہ بھید نہیں آیا کہ آخر اس کشیدگی یا تخلیہ کی علت کیا ہے؟

سرائے کی جان کے لئے افلاس بھی ایک وبال ہے جس طرح کسی مفلس کی گزر امرا کے حلقہ میں نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کسی دولتمند شہر میں غریب سرائے بھی نہیں جی سکتی۔ ہمارے ملک کے غدار شہروں میں بعض ایسی خاصی سرائیں ہمارے دیکھتے دیکھتے میدان بن گئیں۔ جہاں کمزور لڑکے فٹ بال اور طاقتور جوان ٹینس کھیلتے ہیں بعض سرایوں کو زمین کے برابر کر دیا گیا اور انکی خاک پر لوہے لکڑی اور کنکریٹ کے ہوٹل تعمیر ہو گئے ہیں، یہ تناسخ نہیں بلکہ قتل ہے۔

بہت سی ایماندار سرائیں ہوٹل کہلاتی ہیں، ہمارا اس میں کوئی حرج نہیں اور نہ غالباً کسی اور مسافر یا انسان کو (تمام انسان مسافر ہیں) ہونا چاہئے کیونکہ یہ صرف نام ہے بعض ہوٹل بھی سرائے کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ ہوٹل نما سرائیں خدا کے سامنے پیش ہونے سے پہلے ہی اپنی کردار کو پہنچ جاتی ہیں۔

قصبات کی سرایوں کو ریل کے انجن نے بھی تنزل کر دیا ہے کیونکہ مسافر قدیم زمانہ میں کوچ در کوچ، منزل در منزل نیا دانہ کھاتے نیا پانی پیتے سفر کیا کرتے تھے اور اب تیر کی طرح سید چلے جاتے ہیں۔ طویل سے طویل سفر میں بھی ان کو کسی سرائے میں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہوتی

وہ سرائیں جو رات کو مسافروں، بیل گاڑیوں، گھوڑوں اور شکرموں سے پر ہوتی تھیں آج کل سا ہو کاروں کے غلہ کے گودام بن گئی ہیں۔

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جس طرح ادیب تمام عمر گاتا ہے مگر اسے گانا نہیں آتا اسی طرح بھٹیاری بھی تمام عمر کھانا پکاتی ہے مگر اسے کھانا پکانا نہیں آتا۔ برخلاف اس کے عالیشان ہوٹلوں کی صاف ستھری میزوں پر انواع واقسام کے کھانوں کی ایک طویل فہرست زبان حال سے فیا ئی آلا ء ربکما تکذبان -- کا ورد لگاتی ہے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ اس فہرست اور کھانے کے بل کی طباعت کا خرچ گھی کے خرچ سے (بشرطیکہ ان کھانوں میں گھی پڑتا ہو) کچھ کم نہیں ہوتا

اس میں بھی شبہ نہیں کہ برسات کے موسم میں ہوٹل کا مقیم اپنے کمرہ کی کھڑکی یا چھجے پر سے بارش کا لطف اٹھاتا ہے اور سرائے کے مسافر کو شب کے وقت، جبکہ ایک طرف اس کی کوٹھری یا چھپر ٹپک رہا ہو اور دوسرے کونہ میں بھٹیاری کی بکری مینہ کی بوچھار سے بھیگ کر اپنی صدا لگا رہی ہو، بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اگر وہ مسافر بیمار یا درد سر کی تکلیف سے ذرا کراہے تو برابر والے مسافر پر اس کی تیمارداری فرض ہو جاتی ہے، یہ نہیں ہوتا کہ عظیم الشان ہوٹل کے کسی کمرہ میں ایک شخص درد قولنج کے مارے تڑپ رہا ہے مگر اس کی کراہٹ برابر والے مقیم کے فلسفیانہ استغراق کو نہیں توڑ سکتی جو اس وقت آئینہ اور شانہ میں مشغول ہے اور اگر کراہٹ سے اس کی کچی نیند میں (بڑے لوگوں کو گہری نیند کم نصیب ہوتی ہے) خلل واقع ہوتا ہے تو نفرت سے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا جاتا ہے۔

سرائے میں سامان تفریح بالکل نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ہوٹل میں ہر قسم کی تفریح ممکن ہے۔ یہاں ٹینس کورٹ، سکیٹنگ ہال، بلیرڈ روم سے لیکر شطرنج، گنجفہ بازی، قمار بازی یا اس قسم کی دیگر بازیوں کا میدان بہت وسیع ہوتا ہے، علاوہ ازیں بعض بڑے ہوٹلوں میں کتب خانے بھی ہوتے ہیں جن میں مختلف علوم وفنون کی کتب، رسالہ موٹررانی، جہازرانی، سینما تھیٹر، شکار، سفرنامے، روزنامے، موسیقی، ہارمونیم نوازی، صابون سازی، گانڈ کیب

ریلوے ٹائم ٹیبل غرض قرآن کے علاوہ تمام رائج الوقت ادب کا معقول ذخیرہ ہوتا ہے جس کو مسافر ضرورتاً یا بلا ضرورت پڑھتا ہے لیکن سب سے پہلے دلچسپ ادبی پارہ وہ ہوتا ہے جس کو ہوٹل کا لڑکا مسافر کی روانگی کے وقت ایک صاف ستھری طشتری میں پیش کرتا ہے۔ شاید یہ مرثیہ انیس کا کوئی بند ہوتا ہے جس کا مطالعہ مقیم کو رلاتا نہیں تو رونے کی صورت ضرور بنا دیتا ہے۔

قصبات سے بہت سی سرائیں نابود ہو چکی ہیں اور شہروں سے تقریباً بالکل غائب ہوگئیں۔ اگرچہ قانون قدرت بھی یہی ہے کہ پرانی چیزیں مٹتی جائیں اور نئی ان کی جگہ لیتی جائیں۔ لیکن یہ مبادلہ گراں بہت ہے۔ سرائے ہمدردی و مواخات کا مدرسہ ہے اور ہوٹل عیش و عشرت اور ظاہر پرستی کی نمائش گاہ۔ برادران ملک تیلون کی یاد میں لنگوٹی تو کھو بیٹھے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہوٹل کے خیال میں ہم کو سرائے سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔

قوت برق

جس طرح مادہ کی تخلیق اور اُسکا فنا کرنا ہمارے حدِ امکان سے باہر ہے اُسی طرح قوت کو بھی ہم نہ پیدا کر سکتے ہیں اور نہ فنا کر سکتے۔ ہماری قدرت میں جو کچھ ہے وہ صرف یہ ہو کہ ہم جس طرح مادہ کی ہئیت بدلکر دوسری ہئیت میں تبدیل کر سکتے مگر اُس کے کسی جزو کو بالکل فنا یا نابود نہیں کر سکتے اسی طرح ہم قوت کے کسی چھوٹے سے چھوٹے جزو یا کسر کو بالکل فنا نہیں کر سکتے، صرف اسکی صورت بدل سکتے ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں ہم کو مادہ کے اجزا فنا ہوتے ہوئے معلوم ہوں۔ ہم ایک پونڈ کوئلہ جلاکر صرف چند اونس راکھ دیکھتے ہیں۔ اور یہ خیال کرتے ہیں کہ بقیہ حصہ کوئلہ فنا ہوگیا۔ اگر ہم اُس کے تمام دھوئیں اور اُن گیسوں کو جو اسمیں سے خارج ہو رہے ہیں احتیاط سے ایک جگہ محفوظ رکھیں تو ہم کو معلوم ہوجائیگا کہ ایک پونڈ کوئلہ کے اجزا نے اپنی صورت مختلف اجزا میں تبدیل کی ہے اور جو چیز ایک کوئلہ کے ڈلے کی شکل میں تھی وہ مختلف گیسوں کی شکل میں تبدیل ہوگئی ہے جسمیں کا ایک جزو راکھ بھی ہے، اسی طرح قوت کی مختلف شکلیں ہیں جو ہمیشہ ایک شکل سے دوسری شکل میں خود تبدیل ہوتی رہتی ہیں یا کیجاسکتی ہیں۔ مثلاً سورج کی گرمی سے ہوا کا چلنا پانی کے بخارات کا بھاپ بنکر سمندر سے اڑنا اور کرہ بالائی پر پہنچ کر منجمد ہوکر پھر برسنا کسی پہاڑی جھیل پر جمع ہوجانا اور پھر آبشار بنکر زمین پر گرنا۔ یہ ایک قدرتی سلسلہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جاری رہیگا۔ قوت کی اس طرح تبدیل شکل کو اصطلاح علمی میں بقائے قوت Conservation of Energy کہتے ہیں۔

ہر قسم کی قوت کو ہم دوسری قوت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ کوئلہ کی مثال کو پھر لو۔ ہم کوئلہ جلاتے ہیں اُس سے حرارتی قوت پیدا ہوتی ہے۔ حرارت کو ہم حرکت میں تبدیل کرتے ہیں۔ حرکت کو ہم برقی قوت میں تبدیل کرتے ہیں۔ یہی برقی قوت دوسرے آلات کو یا تو گرم کرتی ہے مثلاً لیمپ یا برقی چولھا وغیرہ یا پھر حرکت میں تبدیل ہوجائیگی مثلاً برقی موٹر یا محرکہ۔ ان سب قوتوں کو ہم نہایت صحیح آلات سے اگر ناپیں تو معلوم ہوجائیگا کہ جسقدر کوئلہ ہم نے جلایا تھا وہ مختلف قوتوں میں تبدیل ہوگیا ہے

مثلاً ایک پونڈ عمدہ بنگال کے کوئلہ میں ۸ ہزار سے چودہ ہزار بحا ہوتے ہیں۔ اسمیں ۷۰ سے ۹۲ فیصدی جلنے والا مادہ یعنی کاربن ہوتا ہے۔ ۳۰ سے ۶ ہائیڈروجن۔ ۲ سے بیس فیصدی تک آکسیجن۔ ایک سی ڈہائی فیصدی نائٹروجن نصف سی پانچ فیصدی تک گندھک پندرہ فیصدی تک راکھ۔ کچھ پانی وغیرہ ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے آپنے بوائلر بھپکہ میں ایک پونڈ کوئلہ جلایا۔ اسمیں سے ۱۲ ہزار بحا پیدا ہوئے۔ راکھ میں کچھ حرارت ضائع ہوگی۔ بھپکہ کی دیواروں میں کچھ حرارت جذب ہوکر ضائع ہوجائیگی۔ چمنی کے ذریعہ دہوئیں میں بہت سی غائب ہوجائیگی۔ باقی کی حرارت پانی میں جذب ہوکر پانی کو بھاپ میں تبدیل کرتی ہے۔ یہ بھاپ حرکت حاصل کرتی ہے اور اسمیں ڈیڑہ سو دو سو پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ یا دھکیل دینے کی قوت پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ قوت ایک سلنڈر یا اسطوانہ میں جاکر ایک پسٹن کو دھکیلتی ہے۔ یہ پسٹن ایک دھرے کو حرکت دیتا ہے جو ایک سلسلہ مشینوں کو حرکت دیکر مطلوبہ کام انجام دیتا ہے۔ اگر اس تمام تفصیل کے اجزا کو ہم باریک اور صحیح آلات کے ذریعہ ناپینگے تو آخر میں سب کو حرارت میں منتقل کرکے ایک پونڈ کوئلہ کی حرارت کا مجموعہ آجائیگا فرانسیسی طبیعی معلم جول نے تجربہ سے ثابت کردیا کہ ایک بحا میں اسقدر قوت ہوتی ہے کہ وہ ۷۷۸ فٹ پونڈ کام کرسکے۔ یعنی ایک پونڈ کو ۷۷۸ فٹ حرکت دے یا ۷۷۸ پونڈ کو ایک فٹ حرکت دے۔ کسی دو عدد دونکو فٹ اور پونڈ تصور کریں جنکا حاصل ضرب ۷۷۸ ہو اُسے فٹ پونڈ کہتے ہیں[۲]۔ حرارت کی قوت کو ہم نے تمہید میں اس وجہ سے زیادہ تفصیل سے بیان کیا کہ دنیا کی ہر قسم کی قوت حرارت میں بآسانی تبدیل ہوسکتی ہے۔ ایک پتھر اگر اوپر سے گرے تو وہ بھی حرارت پیدا کرتا ہے۔ ہم تالی بجائیں تو حرارت پیدا ہوتی ہے۔ آبشار کا پانی جب زمین پر پہنچتا ہے تو حرارت

---

[۱] بحا مخفف ہے برطانوی حرارتی اکائی کا جسے انگریزی میں British Thermal Units کہتے ہیں اور B. Th. U. لکھا جاتا ہے۔ اگر ۳۹ درجہ فارنہائٹ پر ایک پونڈ خالص مقطر پانی ہو اور اُسے جو مقدار حرارت ایک درجہ گرم کردیگی اُسے ایک برطانی حرارت اکائی کہتے ہیں جس طرح انگریزی اوزان اور پیمانے بے اصول اور غیر سائنٹفک ہیں اسی طرح یہ پیمانہ بھی مہمل ہے۔

[۲] یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایک طاقت اسپ یعنی Horse Power ۳۳۰۰۰ فٹ پونڈ فی منٹ کے برابر ہوتی ہے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک گھوڑا ایک منٹ میں ۳۳ ہزار فٹ پونڈ کام کرتا ہے

پیدا کرتا ہے۔ بہت سے اجزا میں جب کیمیاوی تغیر پیدا ہوتا ہے تو حرارت پیدا ہوتی ہے۔ کوئلہ میں یا لکڑی میں حرارت عرصہ تک مقید رہے مگر جب ہم چاہیں اُسے جلا کر اسمیں سے حرارت لے سکتے ہیں اور ہر حرارت کو ہم دوسری قوتوں میں خصوصاً بجلی میں بآسانی تبدیل کر سکتے ہیں۔ ریڈیم میں سے ہر وقت حرارت خارج ہوتی رہتی ہے۔ خود حرارت دراصل مادہ کے سالمات کے تغیر کا نام ہے۔ ان سالمات کو جس طرح بھی ہم متغیر کر دیں حرارت پیدا ہوگی۔ اور جب حرارت پیدا ہوگی تو اسے مناسب ادوات یا آلات و مشینوں کے ذریعہ ہم حرکت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ایک بحساب ۰۰ فٹ پونڈ کے اور ایک پونڈ کوئلہ میں ۱۲۰۰۰۰۰ ۲۸ طاقت اسپ ہے۔ مگر ہم جب دو سے چار پونڈ کوئلہ جلاتے ہیں تب صرف ایک طاقت اسپ ہم کو دستیاب ہوتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تقریباً پانسو گنا طاقت بیکار ضائع جاتی ہے۔

بلندی پر چٹان رکھی ہو ہم اُسکی قوت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس قدر بلندی پر کتنے وزن کی چٹان ہے۔ یا اس کو توانائی بالقوہ ہے۔ پانی کا خزانہ کسی بلند سطح پر جمع ہے۔ اسمیں بھی اسی قدر توانائی ہے جتنی ہماری کوئلہ کی کان میں ہوتی ہے۔ کوئلہ کو جلا کر ہم اُسکی قوت توانائی کو حرکت میں منتقل کرتے ہیں اسی طرح بلندی پر سے ہم پانی کو گرا کر قوت فعل میں منتقل کر سکتے ہیں۔ ہر قسم کی قوت اور حرارت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ انسان سے چھپنا چاہتی ہے۔ یہ صرف جانوران صحرائی ہی نہیں ہیں جو حضرت انسان سے گھبراتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس طرح گھوڑا، بیل، چھچھوندر وغیرہ ان ذات شریف کے قبضہ میں آگئے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں اُن سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح قوائے فطرت حرارت وغیرہ بھی ہمیشہ چاہتی ہے کہ انکے دسترس سے بھاگے۔ جب انکا داؤ چلتا ہے تو یہ ضرور اسے اپنے قابو میں لاتی ہیں۔

ہم نے جسقدر مثالیں اوپر دی ہیں اُن سے ثابت ہوا کہ جب حرارت کو ہم تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو وہ غائب ہونیکی اور کام نکرنیکی کوشش کرتی ہے۔ یہ قانون حرارت ہے کہ جس طرح پانی ہمیشہ ایک سطح پر رہنا چاہتا ہے اسی طرح حرارت ہر جگہ کی برابر درجہ تپش رکھنا چاہتی ہے۔ لوہے کو سرخ تپالو تھوڑی دیر کے بعد تم دیکھو گے کہ وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اُسکی حرارت کہاں گئی۔ آس پاس کے اجسام

میں سرایت کرکے انہیں قدرے گرم کر دیا۔ اگر مختلف درجہ حرارت نہوں تو تمام دنیا آج فنا ہوجائے یہ اختلاف درجہ حرارت ہی ہے کہ ہم سورج سے گرمی پاتے ہیں۔ اگر سورج کی گرمی کا درجہ حرارت ایک ہو تو انتقال حرارت نہو سکے اور ہم کو گرمی بھی نہ معلوم ہو۔ گرمی اور سردی دنیا کی ہر چیز کی طرح اعتباری ہیں۔ جو حرارت ہمیں ایک پونڈ کوئلہ سے حاصل کی تھی وہ مختلف طریقوں سے فضائے عالم میں پہنچکر ضائع ہوگئی۔ اسی لئے انجنوں کو ایسی مختلف چیزوں سے ڈھکتے ہیں جو حرارت کو روک سکیں یہاں تک حرارت اور قوت کے تعلق کو بیان کرکے ہم بجلی کے پیدا کرنے کے اصول کو بیان کرتے ہیں۔

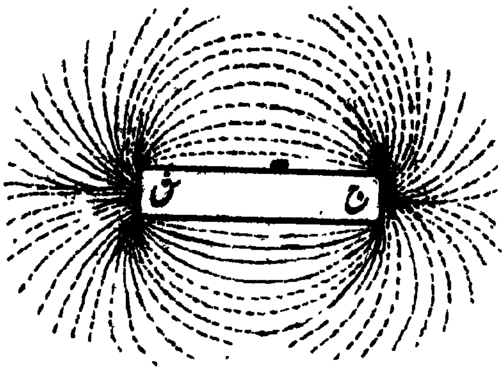
اقتصادی اور تجارتی اغراض کے لئے بجلی پیدا[۱] کرنیکی صرف دو ترکیبیں ہیں۔ ایک بیٹری کے ذریعہ دوسری ڈائنامو کے ذریعہ۔ بیٹری بھی اسقدر سستی نہیں جتنا ڈائنامو۔ البتہ عارضی اور کم مقدار قوت برقی کے لئے بیٹری[۲] کافی ہے

مقناطیس کو زمانہ دراز سے ہم لوگ جانتے ہیں۔ ایک سلاخی مقناطیس کو لو اگر اُسے ایک سوئی پر توازن کیساتھ معلق سادہ دیں تو وہ مڑکر فوراً شمالاً جنوباً ہوجائیگا۔ جو سرا شمال کی طرف ہوگا اُسکا نام "شمال تلاش کنندہ قطب" مگر اختصاراً شمالی قطب اور دوسرے کو اسی طرح مختصراً جنوبی قطب کہینگے ان دونوں قطبوں میں سے مقناطیسی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں اور اگر لوہا یا دوسرا مقناطیس ان شعاعوں کی زد میں آجائے تو وہ اُنکی طرف کھینچنے لگیگا۔ آپکے پاس اگر کوئی قطب نما ہو تو اُسکے پاس ایک لوہے کا ٹکڑا لائیے دیکھئے کہ اُسکی سوئی کس طرح اُنکی طرف متوجہ ہوجاتی ہے۔ یہ شعاعیں اگرچہ غیر مرئی ہیں مگر اُنکے اثرات سے ہم معلوم کرسکتے ہیں بلکہ صحیح طور پر نقشہ کھینچ سکتے ہیں کہ انکا راستہ کیسا ہے ایک سادہ سلاخی مقناطیس کی یہ شکل ہے۔ دیکھو شکل ۱

---

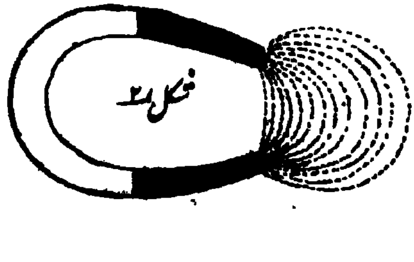
[۱] بجلی پیدا کرنا بلفظ تو غلط ہے مگر اصطلاحاً اس طرح ہی بولتے ہیں اور Generator یا Dynamo بجلی پیدا کرنیوالا اُس مشین کو بولتے ہیں جسکا ذکر یہاں آرہا ہے۔

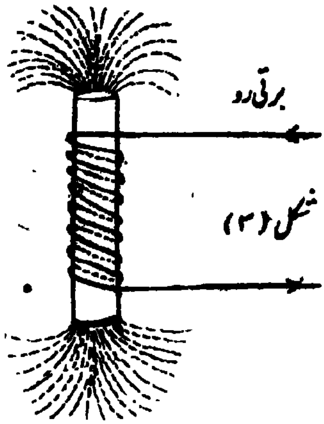
[۲] بیٹری کے متعلق ہم ایک مستقل کتاب لکھ رہے ہیں۔



شکل ۱

اس شکل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قطبین پر شعاعیں زیادہ گھنی ہیں اور جیسے جیسے قطبین سے دور ہوتی جاتی ہیں ان کی شکل چھدری ہوتی جاتی ہے۔ نظریہ یہ ہے کہ شمالی قطب سے نکلنے والی شعاعیں قطب شمالی تک چلی جاتی ہیں اور وہاں سے زمین کے محور میں سے گزر کر قطب جنوبی میں سے ہو کر پھر مقناطیس کے جنوبی قطب میں داخل ہو جاتی ہیں اور یہی دور تسلسل ہمیشہ قائم رکھتی ہیں۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایک جنس کے قطب ایک دوسرے کو دھکیلتے ہیں اور مختلف جنس کے قطب ایک دوسرے کو جذب یا ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً قطب نما کے شمالی قطب کو ایک مقناطیس کے قریب لاؤ۔ اگر مقناطیس کے سرے کی طرف جھکے تو سمجھو کہ یہ مقناطیس کا سرا جنوبی ہے۔ اور اگر وہ اس سے پرے کی طرف ہٹے تو سمجھو کہ یہ سرا شمالی ہے۔ اگر ایک گھوڑے کے نعل کی شکل کا مقناطیس لیں تو ہم دیکھینگے کہ جو حصہ سرے کے پاس ہے وہاں سے زیادہ گھنی یا کثیف شعاعیں نکلتی ہیں اور آخری سرے کی شعاعیں زیادہ منتشر ہوتی ہیں۔



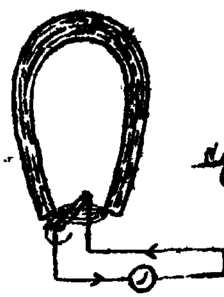


شکل (۳)

مقناطیس جو کانوں سے نکلتا ہے وہ میل کچیل سے بھرا ہوتا ہے اور وہ اسقدر زوردار نہیں ہوتا جتنا مصنوعی۔ مصنوعی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ مقناطیس جسے مستقل Permanent کہتے ہیں۔ دوسرا برقی مقناطیس مستقل مقناطیس بنانیکی ترکیب تو یہ ہے کہ ایک نہایت عمدہ فولادی سلاخ پر کسی دوسرے مستقل مقناطیس کے سرے کو شمالاً جنوباً پھیرتے رہیں تو تھوڑی دیر میں یہ خود مقناطیس ہو جائیگا۔ اور تادیر قائم رہیگا اسے مستقل مقناطیس کہتے ہیں۔

برقی مقناطیس سب سے زیادہ اہم اور تجارتی اغراض کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ہے۔ اگر ایک لوہے کی معمولی سلاخ کے چاروں طرف تانبے کا تار لپیٹ دیں۔ اس تار پر پہلے سوت کا تاگا لپٹا ہوا ہو اور اس تار میں بجلی کی رو چھوڑیں تو اس سادہ لوہے کی سلاخ میں تمام مقناطیسی خصوصیات پائی جائینگی جوقت برقی رو بند کر دی جائیگی تو اسمیں سے وہ تمام مقناطیسی خصوصیات زائل ہو جائینگی تجارتی اور صنعتی اغراض کے لئے یہ اس وجہ سے بھی زیادہ مفید ہے کہ حسب ضرورت ہم برقی رو کو کم و بیش کر سکتے ہیں اور مقناطیس کو بھی کمزور اور قوی بنا سکتے ہیں۔ ان مقناطیسی شعاعوں کے راستے میں اگر ہم ایک تانبے کی سلاخ لیکر اوپر نیچے یعنی شعاعوں کے ساتھ زاویہ قائمہ بناتے ہوئے حرکت دیں تو ہم دیکھینگے کہ اس سلاخ کے دونوں سروں پر بجلی پیدا ہوگی۔ جو آلے سے ناپ سکتا ہے۔ وہ امیر پیما کہلاتا ہے۔ اگر ایک تار ہم ایک سرے سے لیکر امیر پیما میں سے نکال کر دوسرے سرے کے ساتھ ملا دیں تو ہم دیکھینگے کہ سوئی حرکت کرکے اُس مقدار بجلی کو جو پیدا ہو رہی ہے بتادیگی۔

اس متحرک سلاخ کی رفتار کے گھٹنے بڑھنے سے بھی بجلی کی پیدائش میں کمی زیادتی ہوتی رہتی ہے ملاحظہ ہو شکل نمبر ۴۔

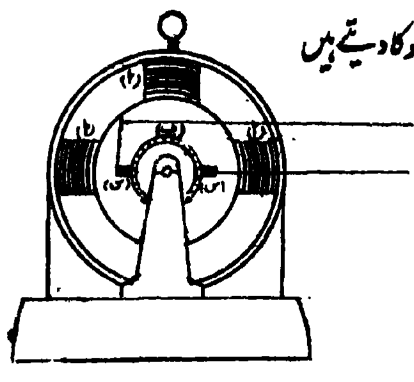


شکل ۱۸

اسی اصول پر وہ مقناطیس بنائے جاتے ہیں جو لوہے کو بغیر پکڑے
ہوئے صرف کشش سے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لیجاتی
ہیں۔ اور جہاں برقی رو کم کردی یا کاٹ دی۔ یہ لوہے کے بڑے
اجسام مقناطیس سے علیحدہ ہوجاتے ہیں۔

یہ اثر کہ بجلی ہو تو تاریں گر لوہے کی سادہ سلاخ میں مقناطیسی اثر پیدا کردے اصطلاح میں امالہ Inducement کہتے ہیں۔ شکل بالا دیکھنے سے معلوم ہوجائیگا کہ جب برقی رو رواں ہوتی ہے تو مقناطیس کی شعاعیں برقی رو سے زاویہ قائمہ بناتی ہیں۔ یہ مقناطیسی شعاعیں اپنے تمام افعال واعمال میں اصل مقناطیس یا نقل مقناطیس کے مشابہ ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم برقی رو اور مقناطیس میں ایک قسم کا گہرا تعلق پاتے ہیں۔ اس نظریہ نے علم البرق کو جس قدر مستحکم کیا ہے کسی اور نظریہ نے نہیں کیا۔ اس نے ڈائنامو (یعنی وہ مشین جو بجلی پیدا کرتی ہے) کی ساخت میں بڑی مدد دی یعنی مقناطیس کی فضا میں جو مقناطیسی شعاعوں سے پُر ہے اگر کسی موصل Conductor کو حرکت دیجائے تو وہ برقی رو پیدا کردے گا۔

یہاں ہم ایک نقشہ تجارتی ڈائنامو کا دیتے ہیں



(ا) = برقی مقناطیس
(ب) = تاروں کا لچھا جو گھومتا ہے
(ص) دو برش جن کے ذریعہ بجلی جمع ہوکر بیرونی
تاروں میں دوڑتی ہے۔

تمام بجلی گھروں میں اسی اصول پر عمل ہوتا ہے کہ ایک ڈائنامو ہوتا ہے جو بجلی پیدا کرتا ہے اور ایک دوسرا انجن ہوتا ہے جو اُس تار کے مجموعہ کو حرکت دیتا ہے جو مقناطیسی شعاعوں کو کاٹتا ہے۔ سب سے پہلے جب انجن چلتا ہے تو ایک ہلکی برقی رو پیدا ہوتی ہے۔ اُس رو سے مقناطیس کے گرد جو تاروں کا لچھا

انہیں برقا لیتے ہیں جسے اصطلاح میں تحریک کردینا کہتے ہیں۔ جب انہیں کافی مقناطیسی قوت پیدا ہوجاتی ہے تب تاروں کے لچھوں میں سے قوت برقی لیتے ہیں۔ یہ ابتدائی برقی رو بقیہ اثر مقناطیس سے پیدا ہوتی ہے اگر یہ بقایا بالکل ضائع ہوجائے تو بیٹری سے تحریک دیکر لے لیتے ہیں۔ مگر اچھی قسم کے انجنوں میں ایسا کم ہوتا ہے۔ اس انجن کو Prime Mover محرک ابتدائی کہتے ہیں۔ اس محرک ابتدائی کیلئے مختلف اقسام کے انجن موجود ہیں جن سے ہم لوگ زیادہ واقف ہیں وہ بھاپ کا انجن ہے۔ اسمیں ایک بھٹی میں آگ جلاکر پانی کو جوش دیکر بھاپ بناتے ہیں یہ بھاپ ایک اسطوانہ میں داخل ہوکر ایک پسٹن کو دھکیلتی ہے اور پیہ کو حرکت دیتی ہے جو ڈائنامو کے پیہ کو حرکت دیتا ہے۔ دوسری قسم کے انجن اندرونی جلنے والے انجن کہلاتے ہیں۔ ایسی بجائے بھٹی میں آگ جلنے اور اس سے بھاپ لینے کے خود اسطوانہ میں تیل یا گیس داخل ہوتی ہے اور اسمیں جب آگ لگ جاتی ہے تو وہ گیس ایک دھماکے کیساتھ پھیلتی ہے اس پھیلاؤ کے عمل میں وہ پسٹن کو دھکیل کر وہی عمل کرتی ہے جو بھاپ کے انجن نے کیا تھا تیسری قسم انجنوں کی وہ ہے جسمیں صرف بھاپ کی رفتار متحرک پردوں پر ٹکرا کر انہیں حرکت دیتی ہیں۔ یہی عمل بھاپ کی ٹربن یا پانی کی ٹربن میں ہوتا ہے۔ میں نے بعض اچھے تعلیم یافتہ لوگوں سے کہتے سنا ہے کہ پانی سے جو بجلی پیدا ہوتی ہے وہ پانی کے اجزا کے ایک دوسرے سے رگڑ کھانے سے پیدا ہوتی ہے یہ خیال غلط ہے حقیقت میں بارش کا پانی جب بلند پہاڑیوں پر جمع ہوجاتا ہے اور وہاں سے گرتا ہے تو فی سو فٹ کی بلندی پر تقریبا ۴۲ پاؤنڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے، اس پانی کو جتنی زیادہ بلندی سے گرائیں گے اسیقدر زیادہ دباؤ ہوگا۔ ہندوستان میں کشمیر۔ پونہ۔ شملہ۔ دارجلنگ وغیرہ میں ایسے بجلی گھر ہیں یہ پانی بعض وقت پندرہ سو فٹ کی بلندی سے گرتا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ ۶۳۰ پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ ہوا۔ اس میں کچھ قوت نلوں میں رگڑنے سے ضائع ہوتی ہے بقیہ قوت ان متحرک پردوں پر آکر ٹکراتی ہے جو ایک پہیہ میں لگے ہوتے ہیں اور وہ بڑی سرعت سے حرکت کرتے ہیں جو ان تاروں کو حرکت دیتا ہے جو فضائے مقناطیس کو قطع کرتے ہیں۔ اور اس طرح لاکھوں گھوڑوں کی قوت پیدا ہوسکتی ہے۔

بعض جگہ ہوا سے چلنے والے بجلی گھر بھی ہیں مگر بجلی کے ڈائنا مو کے لئے یکساں رفتار کا ہونا
چونکہ از بس لازمی ہے اور ہوا کی رفتار میں حرکت بہت بدلتی رہتی ہے یا ۵ میل فی گھنٹہ سے سو میل
فی گھنٹہ تک - لہذا یہ زیادہ قابل اعتبار بھی نہیں ہیں -

اب ہم اس نظریہ کو ایک جگہ پھر جمع کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو سب باتیں یاد ہو جاویں - (۱) مقناطیسی
فضا کا موجود ہونا - (۲) موصل (تار) کا ہونا - (۳) موصل میں حرکت پیدا کرنا - نتیجہ میں بجلی پیدا
ہو جاتی ہے - ذہن نشین کرنے کے بعد ہم کو اب دیکھنا چاہئے کہ اگر ہمارے پاس ایک ڈائنا مو ہو
جس میں ہم بیرونی ذرائع سے بجلی لاکر اس کے مقناطیس کو تحریک دیدیں اور اسکے موصل کے
لچھوں میں بھی برقی رو دوڑا دیں تو کیا نتیجہ ہوگا - تجربہ نے ہم کو بتایا کہ یہ موصل کے لچھے جن میں برقی
رو دوڑا دی گئی ہے حرکت کرنے لگتے ہیں - اور وہ پہیہ جن پر موصل کے لچھے لپٹے ہوئے ہیں زور
سے حرکت کرنے لگتا ہے - اس پہیے سے اگر کسی مشین کا تعلق کر دیا جائے تو وہ مشین چلنے لگیگی یہاں
ڈائنا مو کو جسے کسی محرک ابتدائی یعنی انجن نے حرکت نہیں دی ہے بلکہ برقی رو نے حرکت دی ہے اصطلاح
میں موٹر کہتے ہیں ایسی بجلی باہر سے آتی ہے اور یہ موٹر بہت سے کام کرتی ہے - ٹراموے چلاتی ہے آٹے
کی چکی چلاتی ہے - کولھو چلاتی ہے - وغیرہ وغیرہ - مگر سب کا اصول وہی ایک ہے کہ باہر سے برقی رو آکر
مقناطیسی شعاعیں پیدا کرتی ہے اور بجلی موصل کے لچھوں میں دوڑائی جاتی ہے اور یہ لچھے ایک پہیہ پر
لپٹے ہوتے ہیں چکر کھانے لگتے ہیں - اگر آپ کو مقناطیس کی وہ خصوصیت کہ وہ اپنے ہم جنس قطب کو
دھکیلتی ہے اور غیر جنس قطب کو کھینچتی ہے یاد ہے تو آپ آسانی سے سمجھ جائیں گے - برقی لچھے کے ایک
حصہ میں جب بجلی داخل ہوتی ہے تو انمیں مقناطیسی قوت پیدا کر دیتی ہے اس کے پاس دو مقناطیس
ہوتے ہیں ایک موافق دوسرا مخالف - اسی طرح پہیے میں متعدد مقناطیس لگے ہوتے ہیں - مخالف مقناطیس
اس لچھے کو کھینچتا ہے اور موافق دھکا دیتا ہے یہ دونوں قوتیں ملکر اس پہیے کو حرکت دیتی ہیں - اور
یہ رواں ہو کر اپنے ساتھ تمام مشینوں کو جو اس سے وابستہ ہوتی ہیں چلاتا ہے -

دوامی حرکت

"دیکھئے صاحب۔ کوئی نہیں سنتا۔ وزیر صنعت بھی نہیں سنتا۔ میں نے سب کچھ دیکھا۔ ایک ایک کے پاس گیا۔ ہر ایک کی خوشامد کی لیکن کسی نے پرواہ بھی نہیں کی۔ کیا آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے سکتے ہیں۔ کیوں صاحب۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ دنیا ترقی کرے۔ نوع انسان کو فائدہ پہنچے ....."

رمنی نے ایک شخص کی آستین پکڑ کے جو ایک دوکان کے سامنے اپنی موٹر سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ نہایت بیتابانہ انداز میں کہنا شروع کر دیا۔ وہ پہلے تو متانت کیساتھ سنتا رہا لیکن جب اسکا سلسلہ کلام ختم ہی نہ ہوا تو اس نے روک کر کہا "دیکھو بھائی مجھے زیادہ فرصت نہیں ہے کہ تم سے بے سرو پا باتیں کیا کروں۔ آخر یہ بھی تو معلوم ہو کہ تمہارا مطلب کیا ہے۔ اور ہاں سنو میں تمہیں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اس طرح سڑک پر کسی شخص کا ہاتھ پکڑ کر باتیں نہیں کیا کرتے ہیں"۔ "مجھے معاف کیجئے" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر شرمندگی اور خوشی کے آثار جھلکنے لگے اس کی آنکھیں کامیابی کی امید سے چمک اٹھیں اس نے جاری رکھتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو تکلیف دی۔ اگر آپ سننے کے لئے تیار ہیں تو میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ میں ایک عجیب و غریب ایجاد کر سکتا ہوں جس سے کاروباری دنیا میں زبردست انقلاب ہو جائے گا۔ پٹرول اور کوئلے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ پھر کوئی سٹیم کاہے کو بنائے گا" وہ یہ کہتا جاتا تھا اور اسکا انداز گفتگو زیادہ فاتحانہ ہوتا جاتا تھا۔ اس نے مٹھیاں باندھ کر۔ نتھنے پھلا پھلا کر۔ شانوں کو سمیٹ سمیٹ کر۔ بلند آواز میں کہنا شروع کیا "مجھے معلوم ہے۔ میں ایک ایسا پہیہ ایجاد کر سکتا ہوں جو ایک مرتبہ حرکت دینے پر ہمیشہ ہمیشہ چلتا رہیگا یعنی بغیر چلائے۔ بغیر اس کے کہ کوئلہ جھونکا جائے یا پانی گرم کیا جائے ....."

"خبط ہے قطعی خبط۔ مجھے معاف کیجئے میں کچھ نہیں کر سکتا" یہ کہتے ہوئے اس نے موٹر کی کھڑکی کھولی اور سیٹ پر بیٹھ کر گھومنے والا پہیہ ہاتھوں میں لے لیا "ہمیشہ کیسے چل سکتا ہے" اور اس نے موٹر کا سلف سٹارٹر دبا دیا۔

"اچھا ایک بات تو سنئے"

"جی نہیں۔ بس معاف کیجئے" اور موٹر روانہ ہوگئی۔

"توبہ۔ توبہ کیا بدتہذیب لوگ ہیں کیوں صاحب۔ ایک شریف آدمی کو بات کرنیکے لئے وقت دیکر اس کی پوری بات بھی نہ سننا۔ یہ کہاں کی تہذیب ہے" وہ بڑبڑاتا ہوا ایک جانب کو چلدیا۔ "دنیا کسقدر خودغرض ہے۔ بس اپنے کام میں دیر نہو خواہ دوسروں کا کام۔ سب ہی کے فائدے کا کام یونہی پڑا رہ جائے ارے صاحب کوئی میں اپنے لیے تو کہتا نہ تھا۔ اس میں تو ساری دنیا کا فائدہ تھا۔ ۔ ۔ ۔"

رضی اسی طرح بازاروں میں۔ پارکوں میں۔ ہوٹلوں میں سڑکوں پر گھومتا پھرتا اور ہر ایک کے سامنے اپنی درخواست پیش کر دیتا لیکن آجتک اسکو کسی نے مالی امداد نہ دی جو وہ کام شروع کر سکتا وہ روز صبح اٹھکر اسی طرح چکر لگاتا کہیں تو اسے انتہائی خوشی ہوتی۔ وہ سمجھتا کہ اب کامیابی قریب ہے اور یقینی۔ اور کبھی مایوس ہو کر چاہتا کہ خودکشی کرلے لیکن وہ چیز جو اسکے سینہ کے اندر مدفون تھی اسے اس پر بھی تیار نہونے دیتی۔ رات کو جب وہ تھک کر اپنے بستر پر لیٹتا تو سب کو برا کہتا۔ خودغرض اور ظالم بتاتا سینکڑوں گالیاں دیتا لیکن صبح جب اٹھتا تو پھر انہیں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا۔

(۲)

"بھائی بھائی چلے جاؤ۔ صاحب سے اطلاع کردو" رضی ایک عالیشان کوٹھی کے سامنے کھڑا ہوا چند ملازمین سے کہہ رہا تھا۔

"اجی اپنا کام کرو" ایک ملازم نے کہا "ہمارے صاحب تم جیسے آدمیوں سے ملا کریں تو وہ اسی کے ہوجائیں"۔

"ہاں اور کیا" دوسرا بولا "اور بھائی تمہیں خیال نہیں۔ ابھی پرسوں تیلی گھر کے بڑے صاحب ملنے آئے تھے تو ہمارے صاحب نے ان سے بھی ملنے سے انکار کردیا تھا"

"بھائی مجھے تو وقت دیا ہے۔ خاص طور پر بلایا ہے۔ تم جا کر ذرا اطلاع تو کردو" رضی نے بڑی خوشامد سے کہا۔

"اچھا کھ دیکھ"، ایک نوکر نے دوسرے سے کہا "لیکن بھائی کہیں خفا نہوں"۔
"اب ہوا کریں جہاں دن بھر خفا ہوتے ہیں وہاں ایک دفعہ انکی خاطر بھی سہی"۔
نوکر ادہر اندر داخل ہوا ادہر رضی نے اپنا کاغذوں کا بستہ کھولکر دیکھنا شروع کیا کہ کہیں کوئی چیز گھر چھوڑ تو نہیں آیا۔ خدا جانے کس ترکیب سے آج اس نے مسٹر سہراب جی پستونجی، سے ملنے کے لئے وقت لے لیا تھا۔ علی الصبح اٹھکر غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور تمام نقشے۔ کاغذات رجسٹر اور کتابیں ذخیرہ لے کر روانہ ہوگیا۔ کئی دفعہ تو وہ راستہ سے پلٹا۔ کیونکہ اسے کوئی نہ کوئی بہت ہی ضروری چیز یاد آجاتی۔ جو وہ گھر بھول آیا تھا۔
"چلئے"، نوکر نے ہنسکر کہا "صاحب بلا رہے ہیں" اور رضی جلدی جلدی بستہ باندہتے ہوئے اندر داخل ہوا "آداب عرض ہے مسٹر رضی۔ آیئے اپنی سکیم بیان کیجئے"۔
"جی ہاں"، رضی کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں "میں نے اپنی ساری زندگی اسی کام میں صرف کر دی۔ مجھے ایک بات مل گئی ہے۔ میں نے وہ چیز معلوم کرلی ہے جس کے ظاہر ہونے پر دنیا میں تہلکہ پڑ جائیگا۔ بس آپ کی امداد کی ضرورت ہے۔ آپ کا نام ہو جائے گا۔ اور پھر فائدہ بھی ہے۔ اگر آپنے یہ پیسہ چلا دیا تو لاکھوں، کروڑوں روپیہ کا فائدہ ہوگا"، اور پھر فوراً اس نے بستہ کھولکر تمام کمرے میں نقشے اور کاغذ پھیلا دئے۔ اور کھڑے ہو کر۔ بیٹھ کر۔ ادہر ادہر گھومکر تمام اصول سمجھانے شروع کر دئے۔ اس کے بعد اس نے یہ بھی تبلایا کہ چھوٹے سے پیمانے پر اس نے ایک مشین تیار بھی کی تھی لیکن محض اس وجہ سے کہ سب چیزیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ توازن درست نہوا اور مشین نہ چل سکی "صاحب دنیا میں سارے کام روپیہ سے چلتے ہیں" یہ اس کے آخری الفاظ تھے جو اس نے درخواست کی صورت میں پیش کئے اور ایک آرام کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔ اور امید و بیم کی حالت میں سہراب جی کا منہ تکنے لگا
"میں اس کام میں ضرور تمہاری مدد کر دوں گا" مسٹر سہراب جی نے کہا۔ وہ ایک زبردست تاجر تھا اور بڑا مالدار۔ اسکو اس سے کچھ مطلب نتھا کہ بنی نوع انسان کو اس اسکیم سے کیا فائدہ پہنچیگا وہ تو محض اس وجہ سے راضی ہوگیا کہ اسمیں لاکھوں روپیہ کے فائدہ کا امکان تھا۔

"لیکن تمہاری وہ چھوٹی مشین ابھی موجود ہے"

"جی ہاں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں"

"اچھا۔ تو آج ہی ۱۱ بجے مجھے ۱۱ بجے کے قریب میں اسے چلکر دیکھوں گا"

"بہت خوب۔ ۱۱ بجے میں خود حاضر ہوجاؤنگا" وہ یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا خوشی کی وجہ سے اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کرتا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ہوا میں اڑا چلا جا رہا ہے۔ کچھ دور چلکر وہ ایک دم رک گیا اور جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی" ۸ ½ یعنی ۱۱ بجنے میں صرف ڈھائی گھنٹے ہیں" اس نے اپنے دل میں کہا "اگر میں گھر چلا گیا تو ممکن ہے کہ دیر ہو جائے اور میں ٹھیک وقت پر نہ پہنچ سکوں" اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنا رخ پلٹ دیا اور قریب ہی کے ایک پارک کی جانب چلدیا۔ وہاں پہنچکر بستہ سرہانے رکھکر ہری ہری گھاس پر چاروں شانے چت لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں بحر تخیل میں تیرنے لگا۔ دریا کی موجیں اسے بہائے لئے جا رہی تھیں اور خدا جانے کہاں لئے جا رہی تھیں۔ یہ اُسے بھی معلوم نہ تھا کبھی کبھی ہلکے ہلکے ہچکولوں سے وہ آنکھیں کھول دیتا تھا مگر پھر بند کر لیتا تھا۔ ایک خاص کیفیت اس پر طاری تھی۔ کامیابی کے نشہ کا سرور تھا جس میں وہ مست تھا اور اسے خود اسمیں لطف آ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنے ذہن ہی میں تمام انتظامات کر لئے اور مشین بھی تیار کر لی۔ اس نے دیکھا کہ اخباروں نے اسکی اس حیرت انگیز ایجاد پر بڑے بڑے مقالے لکھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہوائی جہاز۔ ریلیں۔ موٹریں مشینیں سب کی سب اسی کے ایجاد کردہ طریقہ پر چل رہی ہیں بازار میں ایک انقلاب ہو گیا ہے۔ کوئلے تیل پٹرول وغیرہ کا نرخ بالکل گر گیا ہے ..... یہ سوچتے سوچتے وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا" ہائیں گیارہ بجنے میں دس منٹ" اس نے زور سے کہا اور مضطربانہ انداز میں سہراب جی کی کوٹھی کی جانب روانہ ہو گیا۔

(۳)

"آج کم از کم مجھے یہ معلوم ہونا چاہئے" رضی نے بیلی روڈ کے زیر تعمیر مکان میں داخل ہوتے ہوئے کہا "کہ اب اس کی تیاری میں کتنے دن لگیں گے" اس نے اندر پہنچکر کوٹ اور ٹوپی اتار کر کھونٹی پر لٹکادی

اور آستینیں چڑھا کر کام میں مشغول ہو گیا۔ اسی طرح کام کرتے ہوئے اسے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ مکان تقریباً تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ ضرورت کے مطابق اسمیں سیکڑوں در۔ گوشے اور سیڑھیاں تعمیر کی گئی تھیں گودام میں ہزاروں قسم کے پرزے تیار رکھے تھے۔ لاکھوں طرح کے تو پہیئے بنائے گئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بھی۔ بڑے بڑے بھی۔ دندانے دار بھی۔ سادے بھی۔ گول بھی۔ بیضاوی بھی غرضکہ انبار کے انبار پہیوں کے لگے ہوئے تھے۔

"اب کیا دیر ہے"، اس نے دن کا کام ختم کرتے ہوئے داروغہ کو بلا کر پوچھا۔ "آخر بھائی کب تک یہ عمارت ختم ہو گی"۔

"دیر کیا۔ عمارت تو قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ بس ایک تھوڑا سا کام باقی ہے میرے خیال میں ایک ہفتہ کے بعد مکمل ہو جائے گی"۔ اور داروغہ کا اندازہ صحیح نکلا۔ ایک ہفتہ۔ بعد مکان بالکل تیار ہو گیا۔ اور رضی نے فٹنگ شروع کر دی۔ دن بھر اور رات کے بارہ بارہ بجے تک لگا رہتا۔ چند ہی روز میں عمارت میں تمام پہیئے ہی پہیئے نظر آنے لگے۔ کام ابھی جاری تھا اور رضی کے انہماک کی یہ کیفیت تھی۔ کہ داڑھی اور سر کے بال بڑھ گئے تھے۔ کپڑے میلے چکٹ ہو گئے تھے۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کا بیمار ہے۔ لیکن اسے تو کسی چیز کا بھی ہوش نہ تھا وہ تو بالکل خود فراموشی کے عالم میں اپنے کام میں لگا تھا اور سمجھتا تھا کہ اب وہ دن دور نہیں ہے جبکہ وہ کامیاب ہو گا کتنی ہی صبح شام ہوئے اور کتنی ہی شامیں صبح ہو گئیں لیکن رضی برابر پہیئے جوڑتا رہا یہانتک کہ ایکدن گودام کے سب پہیئے ختم ہو گئے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کچھ اسے پاگل سمجھتے اور کچھ تعجب کرتے لیکن نتیجہ کے اشتیاق میں سیکڑوں آدمی دیکھنے کے لئے جمع ہونے لگے۔

"بس ایک پہیہ کی ضرورت ہے"، رضی نے آخری پہیہ لگاتے ہوئے کہا اور یکایک کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی پر انگلی رکھے۔ گردن نیچے کئے۔ کئی گھنٹے متواتر وہ اسی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے"، اس نے اپنے دل میں کہا۔ "کہ کسی جگہ ایک پہیہ کی ضرورت ہے اور بس۔ پھر یہ چلنے لگے گی۔ ذرا سی حرکت دینے سے ہمیشہ ہمیشہ چلتی رہے گی جبتک آگ۔ پانی۔ ہوا۔ اور خاک

کی حکومت قائم ہے اسوقت تک برابر بیعلا کریگی ․ ․ ․ ․ لیکن وہ ایک پہیہ․ توبہ․ بالکل یاد نہیں پڑتا وہ کس قسم کا تھا․ اور کہاں پر تھا․ میں اسے بھولا نہیں ہوں․ اب بھی اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں․ لیکن ذہن کمبخت جواب دے گیا ہے․ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے سامنے موجود ہے مجھے خوب یاد ہے․ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں لیکن اب نہیں خیال آتا․"

اسی طرح وہ بیٹھا بیٹھا سوچا کرتا․ اور سوچتے سوچتے وہیں پڑ کر سوجاتا․ اب اس نے کھانا پینا بھی ترک کر دیا تھا․ اور اس کی حالت دیوانوں کی سی ہوگئی تھی․ بیٹھے بیٹھے وہ چلا اٹھتا "ہاں ہاں․ مل گیا" یہ کہتا ہوا اکثر دوڑ پڑتا "دیکھو دیکھو وہ ہے․ بس یہی ہے" اس کے احباب کو جب اس کے جنون کی خبر ہوئی تو انہیں سے اکثر اسے سمجھانے آئے نذیر تو ایک سے زیادہ مرتبہ اس کے پاس آیا "چھوڑو بھی" نذیر نے اس کے پاس بیٹھکر کہا "سنا بھئی․ اب اس خبط کو جانے دو"

"تمہیں کیا" وہ جھنجلا اٹھتا "کس کس مشکل سے سہراب جی کو راضی کیا․ اتنا روپیہ خرچ کرایا مہینوں محنت کرتے گذر گئے․ اب صرف ایک پہیہ کی کمی ہے․ بھلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں اور پھر یہ بھی نہیں کہ جانتا نہ ہوں․ معلوم ہے لیکن ذہن سے اتر گیا ہے․ اسی لئے سوچتا ہوں کہ یاد آجائے" غرضکہ سب اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے حتیٰ کہ خود سہراب جی نے اس کی حالت پر رحم کھا کر کہا "جانے دو بھئی میرا اتنا روپیہ گیا تو جانے دو لیکن اپنی جان کے پیچھے کیوں پڑے ہو․ ہزاروں آدمیوں نے ایجادیں کرنے کی کوششیں کیں․ کچھ کامیاب ہوئے سیکڑوں ناکام بھی رہے․ تو کہیں انہوں نے اپنی جانیں تھوڑی دیدیں"

"یہ بات نہیں ہے" رمنی نے ایک تنکے سے زمین کریدتے ہوئے کہا "میں تو جانتا ہوں بس ایک پہیہ کی کسر ہے․ صرف یہ یاد نہیں آتا وہ کون پہیہ ہے․ اس کے یاد آتے ہی پھر کیا بات ہے"

(۴)

اب تو کتنے ہی روز اسے جاگتے ہوگئے تھے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے اتنا کمزور ہوگیا تھا کہ اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل تھا․ ایک ہی جگہ پڑا ہوا بڑبڑاتا رہتا․ ایک دن اسی حالت میں خود بخود اس کی آنکھ لگ گئی․ تھوڑی

دیر بعد اسے ایسا معلوم ہوا کہ ایک آواز اس کے کان میں آرہی ہے۔ وہ چونک کر اُٹھا۔ اسکا دل کہہ رہا تھا "اُٹھو اور اپنا کام کرو دائمی حرکت کرنیوالی مشین کائنات عالم ہے۔ اور وہ پہیہ جو تو بھول گیا تو خود ہے" گھبرا کر وہ کھڑا ہوگیا اور بیساختہ چلا اٹھا "یاد آگیا سمجھ گیا۔ بس مجھے اپنا کام کرنا چاہئے۔ یہ سب دھوکا ہے" وہ یہ کہتا ہوا وہ ایک جانب کو چلدیا۔

اس دوران میں نذیر تجارت کے سلسلہ میں باہر گیا ہوا تھا۔ کئی برس کے بعد جب واپس آیا تو خیال کیا کہ لاؤ اپنے دوست کو دیکھ آئیں جانے کس حال میں ہے۔ بیلی روڈ پر پہنچکر اس مکان میں گیا جس میں مشین لگائی گئی تھی۔ دیکھا تو وہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ رضی نے ڈیملی اسٹریٹ میں جوتے کی دوکان کرلی ہے۔ ڈیملی اسٹریٹ پہنچکر دیکھا تو اُسکی حالت کچھ سے کچھ ہوگئی تھی۔ "کہو بھئی" اس نے مذاقاً پوچھا "تمہاری مشین تیار ہوگئی"

"بالکل" رضی نے بھی اسی انداز میں جواب دیا "کبھی نہ رکنے والی مشین تو کائنات عالم ہے اور وہ بھولا ہوا پہیہ میں خود ہوں۔ ٹھیک ہے نا نذیر"

دونوں نے ملکر ایک قہقہہ لگایا اور راستہ چلنے والے اُنکی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔

غزل

از علامہ میر غلام علی صاحب آزاد بلگرامی

(غیر مطبوعہ)

دل غمگین مرا خوش بہ زیارت کردی — خانہ را سوختی و باز عمارت کردی
آنکہ اسلوب مزاج تو شناسد داند — کہ بہ تیغ مژہ خود چہ اشارت کردی
ہیچ از دین و دل و طاقت من باقی نیست — بچہ تقصیر مرا اینہمہ غارت کردی
اے صبا رفتی و پیغام مفصل گفتی — آفریں خوب ادا حق سفارت کردی
دل خریدی و عوض مایۂ حرمان دادی — با دو سود تو فزوں طرفہ تجارت کردی

خوب کردی کہ سحر از پے دریوزۂ فیض
مشہد اقدس آزاد زیارت کردی

دیگر

برون آمد چراغ خلوت خم از نقاب امشب — گذشت از شیشۂ نہ آسمان نور شراب امشب
گل رخسار ساقی پرتوے انداخت در جامم — کہ آید از لب پیمانہ ام بوئے گلاب امشب
کواکب گرد من تا صبح چوں پروانہ مے گردد — کہ شمع طلعت آن ماہ را دیدم بخواب امشب

ز یاراں معنی آموختن آزاد پرسیدم
زبان شمع محفل یافتم حاضر جواب امشب

اقتباسات

جمعیۃ مستشرقین المانی

گذشتہ اکتوبر میں شہر ہامبرگ میں جرمن مستشرقین کی جو کانفرنس ہوئی تھی اسکا ذکر جامعہ کی کسی گذشتہ اشاعت میں ہو چکا ہے۔ اس اجلاس کی مفصل رپورٹ اب ہمارے سامنے ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علوم مشرقی کی تحقیق میں یہ "غیر مہذب" قوم کتنی کوشش صرف کر رہی ہے۔ علاوہ عام تقریروں کے مندرجہ ذیل شعبوں کے جلسے ہوئے

(۱) مصر، اسیریا اور ایشیائے کوچک کی زبانیں اور تمدن۔

(۲) عہد عتیق اور مباحث متعلقہ السنہ سامی۔

(۳) مشرق اسلامی۔

(۴) مشرق بازنطینی۔

(۵) ہندوستان، ایران اور وسطی ایشیا کی زبانیں اور تمدن۔

(۶) چین و جاپان کی زبانیں اور تمدن۔

(۷) جزائر ہند اور بحر جنوبی کی زبانیں اور تمدن۔

(۸) افریقہ کی زبانیں اور تمدن۔

سب شعبوں میں بلند پایہ تحقیقی مضامین پڑھے گئے۔ ان سب کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ اسلامی علوم کے متعلق جو خاص خاص مضامین پیش کئے گئے انکا خلاصہ ہدیہ ناظرین ہے۔

۱۔ سابق وزیر اور موجودہ صدر جمعیۃ مستشرقین ڈاکٹر روزن نے ناصر خسرو کی شاعری، فلسفہ اور سیاحت پر مضمون پڑھا اور پہلی جنگ صلیبی سے قبل کے تمدنی حالات پر روشنی ڈالی۔ ناصر خسرو (ولادت ۱۰۰۳ ع ؛ وفات ۱۰۸۸ ع) کو اسکے کمالات کے تنوع کے باعث پہلے دو مستشرقین دو ہمنام شخصیتوں سے تعبیر کرتے رہے۔ ایک نام نہاد خود تصنیف سوانح عمری نے اس کے حالات پر بہت کچھ پردہ ڈالا

اور مذہبی تعصب کے باعث بھی لوگوں نے اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں باور کر رکھی تھیں۔ بعد میں جا کر کہیں ایتھے اور براؤن نے اسے صحیح شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کا ایک دیوان (مطبوعہ تبریز ۱۲۸۰ھ) اور دو اور نظمیں روشنائی نامہ اور سعادت نامہ عرصہ سے موجود ہیں اور کچھ عرصہ ہوا دو نثر کی کتابیں "وجہ دین" اور "زاد المسافرین" طبع ہو کر شائقین تک پہنچ گئی ہیں۔ اول الذکر تو اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ مصنف یونانی تصور کائنات سے جدا کر کے علمی بنیاد پر ایک اسلامی تصور کائنات پیش کرتا ہے۔ سفرنامہ۔ اس لئے بہت دلچسپ اور مفید ہے کہ جنگ صلیبی سے قبل اسلامی مشرق کے حالات اسی سے ملتے ہیں۔ اور کتاب اس زمانہ کے تمدنی حالات کے متعلق نہایت صحیح معلومات بہم پہنچاتی ہے جنہیں سے اکثر کے آثار کو بعد کے واقعات نے ہم سے ہمیشہ کے لئے پوشیدہ کر دیا۔ خود مصنف کے حالات زندگی اور اس کے تغیرات ذہنی کے لئے بھی فراہمی مواد کا بہترین ذریعہ یہی سفرنامہ ہے۔

فاضل مضمون نگار نے بتایا کہ چارلس شیفر کا شائع کردہ فرانسیسی ترجمہ اکثر جگہ ناقص ہے۔ زر و سکہ پیمانہ و اوزان کے متعلق دیباچہ میں متعدد غلطیاں ہیں جن کی وجہ سے کتاب کے قیمتی حصوں کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس اہم کتاب کو مع حواشی و تشریحات شائع کرنا ازبس ضروری ہے۔

۲۔ گرومان (پراگ) نے "اسلامی مشرق میں سحر اور گنڈے تعویذ" پر مضمون پڑھا اور مختلف قدیم لیفوں سے سحر کی عبارتیں نقل کر کے Gnostic سلسلہ سے اس کا تعلق ظاہر کیا اور نصرانی اور یہودی عناصر کی آمیزش کے ثبوت دئے۔

۳۔ باؤم اشٹارک (بون) نے اپنے مضمون "قران میں عیسائی اور یہودی طریق صلوٰۃ" میں اعداد و شمار کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اصلی اسلامی نماز اور عیسائی طریقہ عبادت عام طور پر بالکل ایک سا ہے۔ لیکن یہودی طریق عبادت کا اثر اسلامی صلوٰۃ پر بہت کم معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ مارگولیس (آکسفورڈ) نے ان قلمی نسخوں کی تفصیل بیان کی جن پر اس نے یاقوت کی معجم الادبار کی جو تھی جلد کی بنیاد رکھی ہے۔ انہیں سے ایک تو کسی قدیم نسخہ کی نقل ہے جو ایک دمشقی کتب فروش

سلہ یہ دونوں کتابیں مکتبہ جامعہ ملیہ سے مل سکتی ہیں۔ مطبوعہ شرکت کاویانی برلن

نے پنسل سے لکھی اور جسے اس نے کوئی ۳۰ برس ہوئے ہالینڈ کے قنصل کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ اس نقل کا عنوان ہے "مجموعہ تراجم ادبا منتخبہ خطیہ قدیمہ" یہ شروع ہوتا ہے الحسین بن الحسن بن دہان کے ذکر سے اور آخری تذکرہ ہے عبید بن شریہ کا۔ اس تذکرہ سے قبل کوئی ۱۲ صفحے غائب ہیں جن میں اکثر عبداللہ نام والے نکل گئے ہیں۔

اسکے علاوہ چند اوراق ہیں جو ایک بڑے قلمی نسخہ کے نمونہ کے طور پر آئے تھے۔ اس قلمی نسخہ کا مالک ایک حلبی شیخ بتایا جاتا ہے لیکن اس کے علمی خزائن کے متعلق اطلاعات نہایت متضاد قسم کی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ الحسن بن محمد الصغانی، سے شروع ہو کر اس قلمی نسخہ میں ۲۳۶ اشخاص کا تذکرہ ہے اور آخر میں اس میں بھی عبید بن شریہ ہے۔

کتاب کی ساتویں جلد کا حوالہ سیوطی نے بغیہ میں کثرت سے دیا ہے البتہ چوتھی جلد کا حوالہ کہیں نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں سالم بن احمد کا تذکرہ قلمی نسخہ میں اور بغیہ میں تقریباً لفظ بلفظ ایک ہے۔

۵۔ اسٹرو تھمان (گیسن) نے تخارجیین، پر مضمون پڑھا اور عمران بن حسان کی نظم اور ابو حمزہ مختار بن عوف کی انقلابی تقریر کے الفاظ سے اس تحریک کی نفسی کیفیت اور اس کے اجتماعی عناصر کو واضح کیا

۶۔ شاخت (فرائی برگ) کے مضمون کا عنوان تھا "آئین بابل سے شرع اسلامی تک" قدیم دستاویزوں کی مدد سے جنکا سلسلہ ولادت مسیح تک پہنچتا ہے مضمون نگار نے بابلی آئین معاہدہ اور عربی قانون رواجی کا تعلق ظاہر کیا ہے جس پر اس کی رائے میں شرع اسلامی کی بنیاد ہے۔ اگرچہ یہ رواجی قانون مسیح سے کوئی ۶۰۰ سال بعد پورا رائج ہوا تھا تاہم اسمیں اور بابلی آئین میں مختلف طریقوں سے رشتہ بتلایا گیا۔

۷۔ اشپیس (بان): فلسفہ یونان اسلامی نظریات شرعی کی بنیاد کی حیثیت سے۔

مثال کے طور پر مضمون نگار نے کسی چیز کے تیاری کے بعد حق ملکیت میں حنفی اور شافعی فقہ کے اختلاف کو پیش کیا ہے جس کی بنا اسکے نزدیک ان دو فقہوں کا مختلف فلسفہ یونانی کے دو مختلف مذاہب سے متاثر ہونا ہے یعنی کسی دوسرے کی چیز سے ایک آدمی بالکل دوسری چیز

بنالیتا ہے تو مالک کون ہے اصل مادہ کا مالک یا نئی چیز کا بنانیوالا۔ شافعی کہتے ہیں جسکا اصلی مادہ تھا وہ مالک ہے حنفی کہتے ہیں جس نے نئی چیز بنائی وہ مالک۔ ان مختلف فیصلوں کی وجہ یونانی فلسفہ میں ویجاتی ہے۔ کیونکہ دراصل سوال فلسفہ کا ہی ہے۔ یعنی مسئلہ ہیولیٰ و شکل حنفی ایک مذہب کے قائل ہیں اور شکل کو اصل مانتے ہیں شافعی دوسرے مذہب کے ماننے والے ہیں اور ہیولیٰ کو اصل تسلیم کرتے ہیں۔

۸۔ کرامرز (لاندن) نے آل عثمان کے بانی کا نام، یہ مضمون پڑھا یہ اسلامی نام اپنے بیٹے ارخان اور باپ ارتغرل کے ناموں کے درمیان کچھ بے جوڑ معلوم ہوتا ہے پھر ایک ایسے احول میں اس کا آنا جہاں کم و بیش شیعی اثر تھا اور بھی عجیب بات ہے۔ لوگوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ کوئی قدیم ترکی نام ہے جسے بعد کو معرب کر لیا گیا ہے۔ سب سے پہلے جو نام آتا ہے وہ عثمانجک ہے جسکا ذکر ابن بطوطہ اور ابن خلدون نے بھی کیا ہے۔ شمالی اناطولیہ میں ایک مقام کا نام عثمانجک ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ نام اسی مقام کے نام سے لیا گیا ہو۔ ابن بی بی نے ۱۳ ویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اس نام کا ذکر کیا ہے مضمون نگار نے تفصیل سے آل عثمان اور شمالی اناطولیہ کے تعلق پر روشنی ڈالی۔

۹۔ یہ ویسٹر نے اپنے مضمون "مغرب اقصیٰ میں شرع و سیاست" میں مراکشی آئین کے جدید رجحانات و ترمیمات کا ذکر کیا۔

۱۰۔ ویترش نے "شعرانی کے حالات اور اسکا مذہب خود نوشتہ سوانح عمری سے" یہ مضمون پڑھا۔ اس میں عبدالوہاب الشعرانی کی کتاب لطائف المنن والاخلاق سے مصنف کے حالات جمع کئے گئے ہیں۔

۱۱۔ لائپزش کے مشہور پروفیسر فشر نے اپنی عربی لغت کی تفصیل بیان کی۔ اس لغت میں بالالتزام مندرجہ ذیل کتب ادب کے جملہ لغات شامل ہونگے۔ جاہلیت سے خلافت بنو امیہ کے ختم تک کے تمام شعرا کا مطبوعہ کلام؛ ضرب الامثال، قرآن، صحیح بخاری، صحیح مسلم، الجامع الصغیر سیوطی، قبل اسلام

اور ابتدا، اسلام کے عہد کے کتبے، قدیم پیاپرس ۱۱ اس کے علاوہ بیانی اور علمی نثر کی کتابوں کے لغات
بھی شامل ہونگے نیز دیوان ابونواس، ابوالعلی المعری، متنبی اور مقامات ہمدانی و حریری کے لغات۔
مختلف مشہور علما نے متذکرہ بالا کام کو تقسیم کرلیا ہے اور جسیم لغات میں مدد دی ہے۔ لغت جرمن
زبان میں چھپیگا یعنی تمام مباحث، اور تفصیلات جرمن میں ہونگی۔ معانی انگریزی میں بھی درج کردے جائینگے
کتاب اس سال چھپنا شروع ہوگئی ہے۔ اور حصہ حصہ کرکے شائع ہوگی۔

شذرات

گوکھلے نے ہندوستان کی سیاسی اور جماعتی زندگی پر جو احسانات کئے ہیں ان میں جمعیۃ خدام ہند کا قیام شاید سب سے اہم سمجھا جا سکتا ہے۔ اس جمعیۃ نے پچھلے دنوں اپنی زندگی کے ۲۲ سال پورے کئے۔ جو لوگ صدر یا ناظم بننے کے شوق سے انجمن سازی کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن جنہیں یہ سعادت چند ماہ سے زیادہ نصیب نہیں ہو سکتی کیونکہ جلد ہی انکی ذہانت کوئی بہتر نام یا زیادہ "چلتا ہوا" "پروگرام" سوجھا دیتی ہے وہ تو ایک روکھے پھیکے کم و بیش گمنامی کے اس کام کو جو اس جمعیۃ کے رکن انجام دیتے ہیں ۲۲ سال تک چلتے دیکھکر متعجب ہونگے لیکن سچ یہ ہے کہ اپنی بے نفسی اور استقلال، غور و فکر اور طالبعلمانہ انہماک سے اس جمعیۃ کے ارکین نے اپنے آپ کو ملک کی سیاسی زندگی کا نہایت اہم جزو بنا دیا ہے۔ بائیسویں سالگرہ کی تقریب کو اس وجہ سے اور بھی اہمیت حاصل ہو گئی تھی کہ جمعیۃ کے صدر مسٹر سرنیواس شاستری صاحب جنوبی افریقہ میں حکومت ہند کے اول وکیل بنکر جا رہے ہیں اور جمعیۃ نے خاص طور پر انہیں اس عہدے کے قبول کرنیکی اجازت دی ہے۔

قوم کے دل میں جمعیۃ کے کام کی خوبی اور اہمیت کا جو خیال ہے اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گذشتہ آتشزدگی سے جمعیۃ کو جو نقصان پہنچا تھا اسکی تلافی قوم نے کافی رقم فراہم کر کے بہت جلد کر دی اور آتشزدہ مطبع کے لئے پہلے سے بہتر اور وسیع تر عمارت کے بننے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ قوم کی یہ بروقت امداد بیشک قومی کام کرنیوالوں کے لئے حوصلہ افزا ہے لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے یعنی جمعیۃ کا پرچہ Servant of India باوجودیکہ ہندوستان کے سب سے بہتر اور موقر ہفتہ وار جرائد میں سے ہے نقصان کیساتھ چلایا جا رہا ہے، قومی بدمذاقی کا اور کیا ثبوت چاہئے جب فحش و دشنام سے پر جرائد کے مالک اپنی جیبیں بھر رہے ہوں اور ایسے متین پرچے اپنے مصارف بھی پورے نہ نکال سکے۔

اس جمعیۃ میں مسلمان رکن بھی رہے ہیں۔ لیکن شاذ کالمعدوم! ہماری بدنصیب قوم سے جو صفات حسنہ نکل گئے ہیں ان میں شاید استقلال کے ساتھ اور پیچھے پڑکر تیاری کرنیکی صفت بھی ہے۔ "وصیت بالصبر" کرنیوالی یہ قوم افسوس کہ آج کسی کام کو چندماہ یا چند سال سے زائد نہیں نباہ سکتی۔ اور اسکے مفلوج اعضاء کے لئے "دھواں دھار" تقریروں اور "سنسنی خیز" اقتباحیوں سے کم درجہ کے محرکات بے اثر ثابت ہوتے ہیں۔ کاش منشیات سے اجتناب کے معاملہ میں دنیا کی یہ قابل تقلید قوم سکرات ذہنی سے بھی اجتناب کی عادت ڈالے اور خاموشی و استقلال سے کام کرنے کا سلیقہ پھر حاصل کرلے۔

حال ہی میں جنیوا میں اعلیٰ تعلیم کا ایک بین الاقوامی انسٹیٹیوٹ قائم ہوا ہے۔ جسکا مقصد سیاست بین الاقوام، قانون اور معاشیات کے عصری مسائل کی تحقیق ہے۔ اس کے مصارف کا کفیل بڑی حد تک مشہور امریکن کروڑپتی راک فلر کا وقف ہے۔ جماعت اساتذہ میں مختلف قوموں کے ماہران علوم شامل ہیں۔ ایک بہت اچھے کتب خانہ کا انتظام کیا گیا ہے اور خاص مسائل کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے کتابوں کی فراہمی کا انتظام بھی ہے۔ عموماً مختلف ممالک کے فارغ التحصیل طلبہ اسمیں داخل ہوں گے اور بین الاقوامی تعاون و اتحاد کی بنیادیں استوار کرینگے۔

ہم اتحاد بین الملل کی ان کوششوں کو جنکا مرکز جنیوا جمعیۃ اقوام کے صدر مقام کی حیثیت سے بنا جاتا ہے نتائج کے اعتبار سے کچھ بہت امید افزا نہیں سمجھتے اور اس حقیقت سے ناآشنا نہیں کہ جب امن و صلح کے پردہ میں بڑی بڑی سلطنتوں کے سیاسی اغراض پوشیدہ ہیں۔ لیکن ہم ان مساعی کو نظر استحسان سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے جو قوموں میں باہمی تفہیم اور تفہم اور واقفیت پیدا کرنیکے لئے اس ضمن میں کیجا رہی ہیں۔ ان کوششوں کے نتائج ظاہر ہے کہ ایک دن میں نہیں نکل سکتے لیکن جہاں سیاسی اغراض کی شطرنج کا نقشہ روز بروز بدلتا رہے گا وہاں یہ علمی کوششیں کچھ نہ کچھ پائدار اثر دکھا چکی ہونگی

چاہئے لئے یہ کوششیں اس لئے عبرت کا سامان ہیں کہ ان میں وہ قومیں شرکت کرتی ہیں جنکے باہمی سیاسی وقومی اختلافات [illegible] "کاوکشی" اور "باجہ" سے کم اہم نہیں ہیں لیکن ہمارا کوئی راک نظر مجبدار ہندو اور مسلمان عالموں کو یکجا کرکے اس براعظم ہند کے "بین الاقوامی" مسئلے کے غیر جانبدارانہ مطالعہ کا سامان مہیا کرنے کے تصور کو بھی اپنے ذہن میں جگہ دینے کیلئے تیار نہ ہوگا -

---

تمام برطانوی سلطنت کی ایک تعلیمی کانفرنس ۲۰ رجون کو منعقد ہونیوالی ہے۔ شہزادہ ویلز نے سلطنت کے تعلیمی مسائل سے واقفیت بہم پہنچانیکے لئے اسمیں شرکت کا قصد ظاہر کیا ہے۔ یہ کانفرنس اپنی قسم کا تیسرا اجتماع ہے۔ پہلا ۱۹۱۱ء اور دوسرا ۱۹۲۳ء میں منعقد ہوا تھا - اس مرتبہ کوئی ۷۰ نمائندے شرکت کرینگے۔ یہ کانفرنس صرف نمائندوں کے لئے ہے، پریس اور پبلک کو شرکت کی اجازت نہیں - ہمارے "ماہرین تعلیم" کے لئے اس قسم کا جلسہ کسقدر دلچسپی سے خالی ہوتا کہ اتنی قلیل جماعت کے نعرہائے تحسین انکی رونق بزم کے لئے کہاں کافی ہوتے ہیں - لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت برطانیہ کے یہ تعلیمی ماہر اس قسم کی گرمی محفل سے گھبراتے ہیں اور اپنا کام قدردانوں اور حواریوں کے مجمع سے علیحدہ ہی کرنا چاہتے ہیں تاکہ طلب تحسین دیانت رائے پر غالب نہ آجائے۔ مختلف حکومتوں کے مشورہ سے جو ایجنڈا ترتیب دیا گیا ہے اسمیں انتظامی امور کے علاوہ عام علمی دلچسپی کی چیزیں بھی ہیں۔ انتظامی کاموں کے متعلق مثلاً مختلف ممالک میں اساتذہ کے تبادلہ اور مختلف محکمہ جات تعلیم میں باہمی تبادلہ معلومات کے متعلق غالباً کمیٹیاں مقرر کردیجائینگی - عام مضامین جن پر بحث ہوگی چار حصوں میں تقسیم کردئے گئے ہیں یعنی (۱) تعلیم کا تعلق متعلم کی بعد کی زندگی سے، اس میں پیشہ کی تعلیم اور ابتدائی تعلیم کے بعد کے مسائل شامل ہونگے۔ (۲) منطقہ حارہ کے ان ممالک کے تعلیمی مسائل جن میں ایک سے زیادہ نسلیں آباد ہیں (۳) دیہی تعلیم (۴) جدید تعلیمی خیالات اور ترقیاں -

ظاہر ہے کہ تمام مسائل پر سلطنت اور ان اجزائے سلطنت کے نقطہ نظر سے غور ہوگا جو کم و بیش آزاد قوموں کی حیثیت سے اس سلطنت کے رکن ہیں - انہیں باہمی روابط کا قیام اور سلطنت کے مفاد

کے اعتبار سے تعلیمی اتحاد یقیناً ہر ایک رکن اور کل سلطنت کی تقویت کا باعث ہوگا لیکن ان غریبوں کے تعلیمی مسائل پر بھی غور ہوگا جنکی غلامی کے قائم رکھنے کی تدابیر نکالنا ہی سلطنت کی تقویت کا مرادف ہو ایسا ہونا فطری ہے اور اس کی شکایت بیکار۔ لیکن افسوس ہے خود ان قوموں پر جو اپنے مفاد اور اپنے قومی اغراض پر خود اپنے ذہن سے غور نہیں کرنا چاہتیں اور جو کچھ دیکھتی ہیں دوسروں کی عینک سے جو کچھ سوچتی ہیں دوسروں کے دماغ سے۔ انکے لئے کانفرنس کی قرار دادیں وحی تنزیل کا مرتبہ رکھیں گی جن کی پابندی میں ہی بس انکے لئے نجات و فلاح ہے۔ اہل بصیرت کے لئے ایک کی دانشمندی کتنی سبق آموز اور دوسرے کا بھولا پن کیا عبرت انگیز ہے!

ٹریڈ یونین بل برطانوی پارلیمنٹ کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ اسکا ظاہر مقصد یہ ہے کہ حزب العمال کو بعض بے اصولیوں سے روکا جائے اور مزدوروں کو قانوناً اتنی آزادی باقی نہ رہے کہ وہ سرمایہ داروں سے جھگڑا پیدا ہونیکی صورت میں اپنے کارخانہ کے علاوہ دوسرے کارخانہ کے مزدوروں کی ہمدردی حاصل کرنے، یا ساری قوم یا اس کے کسی معتد بہ حصہ کو دھمکا یا حکومت پر اپنے موافق مداخلت کرنیکے لئے دباؤ ڈالنے کی غرض سے ہڑتال کریں۔ پارلیمنٹ کے قدامت پسند عنصر میں اس قسم کا ایک قانون پاس کرانیکی پہلے ہی سے تحریک تھی۔ کیونکہ ٹریڈ یونینوں کے ماتحت مزدور طبقہ بہت منظم طریقہ پر قوت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ لیکن اسکے لئے کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ کچھ عرصہ قبل جو عام ہڑتال ہوئی اس سے قدامت پسندوں کو موقع مل گیا۔ اور انہوں نے پارلیمنٹ میں ٹریڈ یونین بل پیش کر دیا۔

جو لوگ اس کے موافق ہیں وہ اسکو قومی مفاد کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ اس کے بغیر صنعت و حرفت میں سکون کے ساتھ ترقی نہیں ہو سکے گی اور ہڑتالوں سے ایک طرف سرمایہ دار تباہ ہونگے دوسری طرف ہڑتالوں کا نقصان حکومت کی غیر جانبداری کو خطرہ میں ڈالے گا۔ لیکن جو لوگ مخالف ہیں وہ اسے مزدوروں پر دست تعدی دراز کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں انکا خیال ہے کہ ٹریڈ یونین بل کے الفاظ میں

[illegible] جس کا مطلب [illegible] سے سرمایہ داروں کو [illegible] پارلیمنٹ میں جو بیتدارانہ جنگ شروع ہوئی ہے اس کے لئے سرمایہ داروں نے ایک کامیاب حربہ حاصل کر لیا ہے۔

فرق صرف یہ ہے جو بھی حق پر ہو۔ پارلیمنٹ میں قدامت پسندوں کی اکثریت اس کے پاس ہونے کی ضمانت ہے۔ گویا آج کل جمہوریت "اکثریت" اور "حق" کو مترادف الفاظ قرار دیتی ہے۔ کسی زمانہ میں "قوت" اور "حق" ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ مگر یہ صرف لفظوں کا ادل بدل ہے ورنہ موجودہ آئینی حکومتوں کے نظام "قوت" ہی کو "اکثریت" کہتے ہیں ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری!

برطانیہ کا یہ طرزِ عمل درحقیقت بالشویک روس کا جواب ہے۔ وہاں استبداد مزدوروں کا ہے یہاں سرمایہ داروں کا
